ہر صدی کا شاعرِ اعظم
میر انیس
ترتیب و تحقیق
علاّمہ ڈاکٹر سیّد ضمیر اختر نقوی

ہر صدی کا شاعرِ اعظم

میر انیس

..... ترتیب و تحقیق .....

علامہ ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی

جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب : میر انیس

تالیف : علامہ ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی

ناشر : مرکزِ علومِ اسلامیہ

I-4 نعمان ٹیرس، فیز-III، گلشنِ اقبال بلاک-11

کراچی۔ فون: 021-4612868
0300-2778856

کمپوزنگ : ریحان احمد شیخ 0300-2787252

مطبع : سید غلام اکبر

سال اشاعت : 2008ء

قیمت : Rs. 500/=

کتاب ملنے کا پتہ

مرکزِ علومِ اسلامیہ

I-4 نعمان ٹیرس، فیز-III، گلشن اقبال، بلاک-11

کراچی۔ پاکستان، فون: 021-4612868

ولادتِ میر انیسؔ کے دوسو برس

انتساب

مایۂ ناز شخصیت

دانشور، محقّقِ ادب، مرثیے کے پارکھ، نقاد، ماہرِ تعلیم

ڈاکٹر کاظم علی خاں

(سابق صدرِ شعبۂ اُردو شیعہ کالج لکھنؤ)

کے نام ....

میر انیسؔ کی حمدیہ شاعری

لاکھ ہاتھ اس کے ہیں دینے کے وہ ایسا ہے جواد
ہم اسے بھولیں تو بھولیں، وہ ہمیں رکھتا ہے یاد
رزق وہ حوصلۂ حرص سے دیتا ہے زیاد
شکر کرتے نہیں معبود کا اس پر بھی عباد

وہ غنی ہے کہ ہے محتاج زمانہ اس کا
کبھی خالی نہیں ہوتا ہے خزانہ اس کا

جس قدر اس سے طلب کیجئے خوشنود ہے وہ
صاحب جود ہے وہاب ہے محمود ہے وہ
ہاتھ پھیلائے جو سو بار تو موجود ہے وہ
بخش دیتا ہے کہ ہم عبد ہیں معبود ہے وہ

پرورش جرم پہ بھی صبح و مسا ہوتی ہے
یاں سے ہوتی ہے خطا واں سے عطا ہوتی ہے

فہرستِ مضامین

میر انیسؔ کو منظوم خراجِ عقیدت

میر انیسؔ کی زمین میں سلام

تضمین برسلامِ انیسؔ

۶۶۳

میر انیسؔ کے کلام کے منظوم ترجمے

۶۷۳

غزلیں برزمینِ میر انیسؔ

۶۸۳

❀❀❀

میر انیسؔ کی نعتیہ شاعری

اُدھر تھی ذاتِ خدا اور اِدھر رسولؐ کریم
سوائے پردۂ چشم اور کچھ حجاب نہ تھا

اللہ ! اللہ قربِ معراج رسولؐ
دو کماں سے فرق ادنیٰ رہ گیا

واہ رے رُتبے ! نکلتے تھے جو گھر سے مصطفیٰؐ
ابر بن جاتا تھا آکر سائباں بالائے سر

گئے پہنے نعلین واں مصطفیٰؐ
فرشتے کا جس جا گزارا نہیں

کریم مجھ کو عطا کر وہ فقر دنیا میں
کہ جس کو فخر رسالت مآب سمجھے ہیں

یوں نور تھا رسولؐ کا آدم کے صلب میں
ہوتی ہے جس طرح سے خبر مُبتدا کے ساتھ

انساں کو چاہیئے کہ خیال قضا رہے
ہم کیا رہیں گے جب نہ رسولؐ خدا رہے

جسے نبیؐ نے بلایا ہوا وہ نخل نہال
ثمر اسے بھی دیئے جو کہ باریاب نہ تھا

ڈاکٹر ماجد رضا عابدی:

مُنادیٔ انیسؔ

یہ قدرت کا اصول رہا ہے کہ ہر زمانے میں کسی بھی صاحب فضل وکرامات نے خود اپنا تعارف نہیں کروایا بلکہ ایسی ہستی ہمیشہ موجود رہی جو اس صاحبِ کرامات کا تعارف کرواتی رہتی تھی اگر ہم یہ سلسلہ رسولؐ اللہ اور حضرت علیؑ سے شروع کریں تو بات سمجھ میں آجائے گی رسولؐ اللہ نے ہر پل ہر لمحہ علیؑ کی شخصیت کا تعارف کرایا اور تعارف کا یہ سلسلہ غدیر پر منتہی ہوا سامنے کی بات ہے لال شہباز قلندر کی سوانح پڑھیں تو اس میں بھی ایک شخصیت ''بودلہ'' کے نام کی نظر آتی ہے جس نے اُس عہد میں عوام الناس کو بتایا کہ یہ عہد بھی ایک صاحب کرامات سے خالی نہیں ہے اور بودلہ نے لال شہباز قلندر کا صحیح تعارف کرایا تو آج لال شہباز قلندر کا مزار مرجع خلائق بنا ہوا ہے۔

علاّمہ ضمیر اختر نقوی بھی انیسؔ شناسی کی اس منزل پر ہیں کہ جہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ برِ صغیر میں انیسؔ کو متعارف کرانے کا سہرا انھی کے سر ہے۔ ہندوستان میں سیکڑوں ادبی کلاسیکی شخصیتوں پر کام ہوتا رہا لیکن اُن میں سے میر انیسؔ کو نکال کر دنیائے ادب کے سامنے پیش کر دینا یہ علاّمہ ضمیر اختر نقوی کا کمال ہے کہ آج انیسؔ کے محاسنِ کلام، حُسنِ نگارش، طرز و اسلوب، معجزات وکمالات شاعری، انیسؔ کا مطالعہ، انیسؔ کا ادراک، انیسؔ کا الہام اور ایسے ہی دیگر موضوعات پر لکھا پڑھا اور بولا جارہا ہے۔ یہ بات ہے غالباً ۱۹۸۸ء کی جب علاّمہ صاحب نے ''قرآن اور میر انیسؔ'' کے عنوان سے الوداعی عشرۂ مجالس سے خطاب کیا اس وقت میں میٹرک کا طالب علم تھا۔

عشرہ اتنا دلچسپ اور معلوماتی تھا کہ میں ڈائری ساتھ لے کر جاتا تھا اور مسلسل سنتا بھی رہتا تھا اور Noting بھی کرتا رہتا تھا، میر انیسؔ سمجھ میں آنے لگے اور میر انیسؔ سے محبت پیدا ہوگئی اور اس محبت اور روحانیت کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج میرے اپنے تصنیف کردہ ۹ مرثیوں کی ایک جلد شائع ہوچکی

ہے اور دوسری جلد اشاعت کیلئے تیار ہے۔

۲۰۰۵ء میں امام بارگاہِ آلِ عبا میں ایک بار پھر علامہ ضمیر اختر نقوی نے ماہِ محرم میں ''میر انیس اور واقعۂ کربلا'' کے عنوان سے عشرہ پڑھا۔ اس عشرے کی تو بات ہی کچھ اور تھی یہ عشرہ علامہ صاحب کی تیس برسوں کی محنتوں کا نچوڑ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ امام بارگاہِ آلِ عبا کا وسیع و عریض ہال سامعین جن میں اکثریت نوجوانوں کی تھی سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ داد و تحسین کے نعروں سے چھتیں اُڑ رہی تھیں۔ یہ عشرہ اتنا یادگار عشرہ تھا کہ اُس کے کیسٹس اور سی ڈیز کی طلب آج تک کی جارہی ہے۔

۱۹۷۰ء سے لے کر آج ۲۰۰۸ء تک اڑتیس سال کے عرصے میں جتنے علمی، ادبی، فکری رسالے جاری ہوئے اُن سب میں علامہ صاحب کے مضامین جو انیس سے متعلق نئے نئے موضوعات پر مشتمل ہیں اگر ان تمام مضامین کو جمع کیا جائے تو ایک ضخیم جلد مرتب ہوجائے گی اور یہ کام راقم الحروف کے ہاتھوں انشاءاللہ عنقریب انجام پاجائے گا۔

بقول علامہ ضمیر اختر نقوی جس نے میر انیس کو نہیں پڑھا وہ شاعری نہیں کرسکتا اس لئے کہ میر انیس کے مرثیے بیک وقت غزل، نظم، حُزنیہ، رزمیہ، طربیہ اور رثائیہ شاعری کا مرقع ہیں، میر انیس کو پڑھنے اور سننے کے بعد شاعر کی حِسِ تخلیق متحرک ہوجاتی ہے میں نے میر انیس پر متعدد مقالے بھی لکھے جس میں تازہ ترین ''میر انیس اور مرزا دبیر کی رباعیات'' کے عنوان سے ۲۰۰۵ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی (انڈیا) میں پڑھا جو پڑھت کے اعتبار سے بھی پسند کیا گیا میں نے اس میں میر انیس اور مرزا دبیر کی مختلف رباعیات کا موازنہ کیا اور سوز خوانی کی پڑھت میں رباعیات پڑھیں پورا ہال دنیا بھر کے دانشوروں اور مفکروں سے بھرا ہوا تھا سب نے داد دی اور بعد میں ناظم جلسہ نے یہ جملہ کہا ''آپ نے مذاکرے کو زندہ کردیا'' علامہ ضمیر اختر نقوی نے ''شاگردانِ دبیر کی ادبی خدمات'' پر مقالہ پڑھا، ہر دو مقالے غالب انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے پروفیسر صدیق الرحمان قدوائی کی مرتب کردہ کتاب ''انیس و دبیر حیات و خدمات'' میں شائع ہوچکے ہیں۔

آرٹس کونسل میں پاک عرب لٹریری سوسائٹی کے یوم میر انیس میں بھی کلام میر انیس پر گفتگو کی آل عبا ریسرچ لائبریری کے زیرِ اہتمام یوم میر انیس میری نظامت میں منعقد ہوا جس میں مجھے اپنا

مافی الضمیر بیان کرنے کا بھرپور موقع ملا اس مذاکرے کو جبوٹی وی نے نشر بھی کیا۔ اس کے علاوہ گاہے بگاہے میں اپنی تقاریر میں چاہے وہ پاکستان کے کسی بھی شہر میں ہوں یا دنیا کے کسی بھی ملک میں میر انیسؔ کا کلام ضرور سناتا ہوں۔ یہ بھی معجزاتِ انیسؔ میں سے ہے کہ پاکستان کے وہ علاقے جہاں سرائیکی اور سندھی بولی جاتی ہے جب میں میر انیسؔ کو پڑھتا ہوں تو وہ لوگ اس طرح سمجھ کے داد دے رہے ہوتے ہیں جیسے اُن کی اپنی زبان میں شعر پڑھا جارہا ہو، یہ میر انیسؔ کے سلاستِ بیان کا معجزہ ہے کہ آج ہر جگہ میر انیسؔ کو سمجھا جارہا ہے اور اس کا Credit بلاشرکتِ غیر علاّمہ ضمیر اختر نقوی کو جاتا ہے کہ انھوں نے ''منادیٔ انیسؔ'' بن کر میر انیسؔ کو عالمی ادب میں اُن کا صحیح مرتبہ دلانے کی کوشش کامیاب کی ہے۔

علاّمہ ضمیر اختر نقوی نے جو تحریکِ انیسؔ پر شروع کی تھی وہ ۱۹۷۱ء سے تاحال جاری ہے اس سلسلے میں پہلا مجلّہ انجمن یادگارِ انیسؔ کے تحت ''یادگارِ انیسؔ'' کے عنوان سے ترتیب دیا، یہ صد سالہ یادگار کے حوالے سے پہلا کام تھا، مارچ ۱۹۷۲ء میں ماہِ نو کا انیسؔ نمبر ترتیب دیا جو واقعاً میر انیسؔ پر بڑا تحقیقی کام ہے۔ ۱۹۷۲ء میں سہ ماہی ''سیپ'' کا انیسؔ نمبر، محرم ۱۹۷۲ء میں ہفت وار ''الحیدر'' کا انیسؔ نمبر ''الحیدر'' نے عشرۂ محرم میں روزآنہ دس دن انیسؔ پر شمارے جاری کیئے، جنوری ۱۹۷۳ء میں پیامِ عمل کا انیسؔ نمبر علامہ صاحب کی عرق ریزیوں کا نتیجہ ہے۔ علامہ صاحب مستقل کسی نہ کسی عنوان کے تحت میر انیسؔ پر یادگار مضامین تحریر کرتے رہے۔ ۱۹۹۴ء میں میر انیسؔ کے حوالے سے ایک بہت عظیم تحقیقی اور حوالہ جاتی کام سامنے آیا یعنی علاّمہ ضمیر اختر نقوی کی معرکتہ الآراء تصنیف ''خاندانِ میر انیسؔ کے نامور شعراء'' سامنے آئی، ۱۹۹۹ء میں میر انیس کی شاعری میں رنگوں کا استعمال'' ۲۰۰۴ء میں میر انیسؔ کی The study of Elegies of Mir Anees انگریزی زبان میں تالیف کی تاحال میر انیسؔ پر کسی نہ کسی طریقے سے کام جاری ہے۔

میں تقریباً لڑکپن سے علاّمہ ضمیر اختر نقوی صاحب کے ساتھ ہوں۔ حیرت انگیز حد تک میر انیسؔ سے مشابہت کی وجہ سے اکثر لوگ انھیں میر انیسؔ ہی کہتے ہیں۔ علاّمہ صاحب کی اکثر تصانیف اور تالیفات میں آپ میر انیسؔ کے مرثیوں کے عنصر کو غالب پائیں گے۔ آج علاّمہ

صاحب دنیائے ادب میں بالعموم کئی شخصیات پر اور بالخصوص میر انیسؔ پر سند تصوّر کیئے جاتے ہیں ایک راز کی بات جو علاّمہ صاحب نے مجھے بتائی جب میں نے اُن سے پوچھا کہ آپ تقریر کرتے ہیں تو ہر منظر آنکھوں کے سامنے ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے ایسا کیوں؟ تو علاّمہ صاحب نے کہا کہ یہ میر انیسؔ کی مدد ہوتی ہے یعنی شاعری تو شاعری آج تقاریر میں بھی میر انیسؔ کام آرہے ہیں لیکن صرف اُس کے جو میر انیسؔ کا قدردان بھی ہو اور روحانی طور پر اُن سے مربوط بھی ہو۔

آج بہت سے محاورے بولے جاتے ہیں جو میر انیسؔ کے مرثیوں کی بیتیں ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار جو میر انیسؔ کے مختلف مرثیوں کی بیتیں ہیں آپ پڑھ کر حیران بھی ہوں گے اور دلبست بھی:۔

انجامِ کار قبر کی منزل نظر میں ہے
ہم ہیں وطن میں عمر ہماری سفر میں ہے

انسان کھو کے وقت کو پاتا نہیں کبھی
جو دم گزر گیا وہ پھر آتا نہیں کبھی

جو منزلِ ہستی سے گیا پھر نہیں ملتا
یہ راہ وہ ہے جس کا مسافر نہیں ملتا

غربت میں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا
شمعیں بھی جلاؤ تو اُجالا نہیں ہوتا

بیٹھے نہیں زمیں پہ خزانے کو گاڑ کے
موت آئی اُٹھ کھڑے ہوئے دامن کو جھاڑ کے

لازم ہے سوچے غور کرے پیش و پس کرے
جو ہو سکے نہ کیوں بشر اس کی ہوس کرے

❀ ❀ ❀

پیش لفظ

بِسمِ اللہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

ہر صدی کا شاعرِ اعظم ''میر انیسؔ'' حاضرِ خدمت ہے۔ یہ کتاب میر انیس پر کام کے چالیس سال پر محیط ہے۔ پوری دنیا کے مفکرین اور دانشوروں نے میر انیس کو کس نظر سے دیکھا، اُن کے فن کو کیسے پرکھا؟ اُن کی حیات سے کیا سیکھا؟ اُن کے اسلوبِ بیان کا کیسے تجزیہ کیا۔ مختلف عنوانات کے تحت جمع کر دیئے گئے ہیں۔ اِس طرح اس کتاب کے ذریعے مصنّفین اور مقالہ نگاروں کے نام اور کام دونوں محفوظ ہو گئے ہیں۔

پاکستان میں میر انیسؔ پر کام کا آغاز ہماری تحریک سے شروع ہوا۔ اپریل ۱۹۷۱ء میں میر انیس کی صد سالہ برسی منانے کے انتظامات شروع ہو گئے، جس میں روزنامہ حریّت کے ذریعے یہ اعلان کیا گیا کہ صد سالہ برسی کے موقع پر نادر کتب شائع کی جائیں گی، خاص تقاریب اور ریڈیو اور ٹیلیویژن پر خصوصی پروگرام ہونگے اس سلسلے میں ہم نے میر انیسؔ اکیڈمی کی بنیاد رکھی، جس کے تحت یہ تمام پروگرام ترتیب دیئے جا رہے تھے۔ نسیم امروہویؔ نے اعلان کیا کہ ''کل پاکستان فروغِ مرثیہ'' نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اِس سال یعنی ۱۹۷۱ء میں میر انیس کی صد سالہ یادگار کے طور پر جامعہ امامیہ میں جدید مرثیوں کی مجالس کے موقع پر جو ۱۳ مارچ سے یکم مئی تک ہر اتوار کو منعقد ہوں گی، جملہ شعراء میر انیسؔ کے رنگ میں نو تصنیف رزمیہ مرثیے پیش فرمائیں گے۔ میر انیس کے نام کی وجہ سے اور اس عظیم شاعر کے طفیل جدید مرثیوں کی یہ مجالس نہایت کامیاب رہیں، اس سے پہلے ان مجالس میں اتنا مجمع کبھی نہیں ہوا تھا۔ انجمنِ یادگار میر انیس کے زیرِ اہتمام اجلاس منعقد ہونے لگے۔ جس میں جوشؔ ملیح آبادی، فیض احمد فیضؔ، رئیسؔ امروہوی، ذہین شاہ تاجیؔ، جمیل الدین عالیؔ اور حکیم سعید کے علاوہ دوسرے صاحبانِ علم بھی شریک ہوئے۔ انجمن یادگار انیسؔ کے عہدیداروں میں صدر پروفیسر

کرار حسین تھے، راقم الحروف سکریٹری اور ڈاکٹر یاور عباس کنوینر تھے۔

پورے پاکستان میں سب سے پہلے بہاولپور میں حلقۂ حیدری کے زیرِ اہتمام تین روزہ تقاریب ۲۳، ۲۴ اور ۲۵ اپریل ۱۹۷۱ء کو منعقد ہوئیں۔ افتتاحی تقریب کے مہمان خصوصی ڈویژنل کمشنر ضیاء الدین خاں اور صدر ڈاکٹر یاور عباس تھے۔ دوسری نشست میں مجلسِ مرثیہ کے سلسلے میں سوز، سلام اور مرثیہ پڑھا گیا اور ۲۴ اپریل کو تقریب کے مہمان خصوصی جوشؔ ملیح آبادی اور صدر سیّد مرتضیٰ حسین فاضل تھے۔ ۲۵ اپریل کو بھی دو نشستوں میں مجلس مرثیہ اور مسالمے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ انجمن یادگار انیسؔ کے تحت ایک مجلّہ "یادگار انیسؔ" مرتب کر کے شائع کیا گیا، جس کی قدر ہوئی اور میر انیسؔ پر کام کرنے کے لئے بے شمار محرکات ملے۔ مختلف اخبارات نے اس مجلّے پر اپنے تبصرے بھی شائع کئے۔ ادارہ یادگارِ غالبؔ اور ایسے ہی دوسرے اداروں کی جانب سے میر انیسؔ کے حوالے سے ادبی محافل کا انعقاد شروع ہو گیا۔ ادارۂ یادگارِ غالبؔ کے تحت جو ادبی محفل منعقد ہوئی جس کی صدارت پروفیسر کرار حسین اور نظامت راقم الحروف نے کی۔ پروفیسر کرار حسین نے اپنے صدارتی خطبے میں یہ بات کہی کہ "ضمیر اختر نقوی میر انیس کا چلتا پھرتا انسائیکلوپیڈیا ہیں۔"

مشہور ادبی ماہنامے "ماہِ نو" نے صد سالہ یادگار انیسؔ کے سلسلے میں مارچ ۱۹۷۲ء میں ایک خصوصی شمارہ شائع کیا، یہ شمارہ تین سو سے زائد صفحات اور ۳۲ نادر تصاویر پر مشتمل ہے۔ اس خصوصی شمارے میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ، ڈاکٹر وزیر آغا سیّد وقار عظیم، مرتضیٰ حسین فاضل، فرمان فتح پوریؔ اور راقم الحروف کے تحقیقی مقالات شامل تھے۔ اس رسالے کی سب سے بڑی خصوصیت ہمارا مرتب کیا ہوا اشاریہ تھا، جو میر انیسؔ کے مرثیوں، سلام اور رباعیات کی مکمل فہرست اور تشریحات پر مشتمل ہے۔ مارچ ۱۹۷۲ء ہی میں سہ ماہی "سیپ" نے بھی انیسؔ نمبر شائع کیا، یہ شمارہ ۳۳۰ صفحات پر مشتمل تھا۔ اس خاص نمبر میں میر انیسؔ کی مرثیہ گوئی، کردار، زندگی اور فن مرثیہ گوئی پر ممتاز ادیبوں کی تخلیقات شامل ہیں اور میر انیسؔ سے متعلق نادر تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں۔ ہفت وار الحیدر نے بھی محرم ۱۹۷۳ء میں انیسؔ نمبر شائع کیا۔

عہد بہ عہد یومِ میر انیس

۱۰ دسمبر ۱۹۷۲ء کو میر انیسؔ کی ۹۸ ویں برسی منائی گئی۔ انجمن یادگار انیسؔ کے بینر تلے یہ برسی امام بارگاہ رضویہ سوسائٹی میں منائی گئی۔ سید ہاشم رضا، ڈاکٹر احسن فاروقی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری،

حسن اختر، مجتبیٰ حسین، پروفیسر منظر کاظمی نے تصاویر اور مقالے پڑھے۔ اس کے علاوہ زیڈ اے بخاری، سبطِ حسن انجم اور اصغر حسین نے میر انیسؔ کے مرثیوں سے اقتباس پیش کیئے۔ جبکہ اشرف عباس اور ضیاء رضوی نے سلام پیش کئے۔ نسیمؔ امروہوی، رئیس امروہوی، سید امیر امام حر، عزتؔ لکھنوی، سید محمد جعفری، حسین اعظمی، ضیاء الحسن، موسی، زائر امروہوی، ڈاکٹر یاور عباس، اعجاز رحمانی، اور سردار نقوی نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

۱۹۷۲ء میں نئی دہلی بھارت میں بھی میر انیس پر بین الاقوامی سمپوزیم کا انعقاد کیا گیا۔ میر انیسؔ پر ایک کتاب ''مہا کوی میر انیس'' مرتبہ صالحہ عابد حسین، ہندی زبان میں شائع کی گئی، جس کا اجراء اس وقت کے وزیرِ تعلیم پروفیسر نور الحسن نے کیا۔

جنوری ۱۹۷۳ء میں ماہنامہ پیامِ عمل نے انیسؔ نمبر شائع کیا جو ۱۶۶ صفحات پر مشتمل تھا۔ امامیہ مشن پاکستان کے تحت شائع ہونے والے اس مجلّے میں میر انیسؔ سے متعلق خصوصی مقالات شامل کیئے گیئے۔

۱۰ دسمبر ۱۹۷۳ء کو راقم الحروف نے ایک اور عظیم الشان ''یومِ انیس'' کا انعقاد کیا، یہ جلسہ امام بارگاہ رضویہ سوسائٹی میں منعقد کیا گیا۔ یہ جلسہ بھی انتہائی کامیاب رہا، پورا امام بارگاہ سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، ہماری نظامت میں یہ جلسہ ۹ بجے صبح شروع ہوا۔ سیّد ہاشم رضا ٹھیک ۹ بجے تشریف لائے انہوں نے ایک انتہائی پُر مغز مقالہ پڑھا، ڈاکٹر احسن فاروقی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، حسن اختر، جناب مجتبیٰ حسین، جناب منظر کاظمی اور راقم الحروف نے خطاب کیا۔ زیڈ اے بخاری، جناب سبطِ حسن، جناب اصغر حسین، جناب کرار نقوی نے میر انیسؔ کے مرثیوں سے اقتباسات پیش کئے۔ جناب اشرف عباس، جناب اختر وصی علی، اور علی ضیا رضوی نے سلام اور رباعیاتِ میر انیس پیش کئے۔ نسیمؔ امروہوی، اعجاز رحمانی، ڈاکٹر یاور عباس، ضیاء الحسن موسوی، زائرؔ امروہوی اور پروفیسر سردار نقوی نے میر انیس کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ سیّد آلِ رضا خصوصی طور پر شریک ہوئے اور میر انیسؔ پر تقریر بھی کی۔

۱۹۷۳ء کے عشرہ ماہ محرم الحرام میں امام بارگاہ شاہ ولایت علی بستی گولیمار میں راقم الحروف نے ''سورۂ یوسف اور میر انیسؔ'' کے عنوان کے تحت مجالس سے خطاب کیا۔

۹ دسمبر ۱۹۷۴ء ہی کو ملتان کے نیشنل سینٹر میں میر انیس کی صد سالہ برسی منائی گئی، تقریب کی

صدارت ڈائریکٹر شعبہ تحقیقات فارسی پاکستان پروفیسر ڈاکٹر علی اکبر جعفری نے کی۔ پروفیسر شاکر علی جعفری، آغا سکندر مہدی، پروفیسر ڈاکٹر سید سبط حسن، ڈاکٹر اسد اریب، اور میں نے تقاریر اور مقالے پڑھے۔ اخبارات نے زبردست کوریج (Coverage) دی۔

۲۱ دسمبر کو تھیوسوفیکل ہال کے یومِ انیس کے بعد ۲۲ دسمبر کو امام بارگاہ حسینیہ سجادیہ بھی ادارۂ یادگارِ انیسؔ کے زیر اہتمام یومِ انیس منایا گیا جس کی صدارت سید آلِ رضا نے کی اور زیڈ اے بخاری نے مرثیہ انیس سنایا۔ جبکہ نسیم امروہوی، رئیس امروہوی، ڈاکٹر یاور عباس اور دیگر نے میر انیس کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

نومبر ۱۹۷۴ء میں میر انیس کی صد سالہ تقریبات کا آغاز ہو گیا اور ملک بھر میں اس سلسلے میں تقریبات منائی جانے لگیں جس کی تفصیلات اسی پیش لفظ میں آپ پڑھیں گے۔

راولپنڈی میں ۱۹۷۴ء میں ڈاکٹر سیّد سبط حسن نے دبستانِ انیس کے تحت میر انیسؔ کی برسی کا انعقاد کیا، جس کی صدارت اس وقت کے وفاقی وزیر برائے مذہبی امور مولانا کوثر نیازی نے کی اور میر انیسؔ پر ایک یادگار خطبہ دیا۔ دوسرا جلسہ یادگارِ انیسؔ کے تحت ۳ دسمبر ۱۹۷۴ء کو پنجاب یونیورسٹی لاہور اور تیسرا جلسہ پشاور میں ہوا۔ آخری تین جلسے کراچی میں ہوئے جن کی صدارت علی الترتیب محترمہ نصرت بھٹو (خاتونِ اوّل)، غلام مصطفیٰ جتوئی (اس وقت کے وزیر اعلیٰ سندھ) اور پیارعلی الانہ (اس وقت کے صوبائی وزیر تعلیم) نے کی۔ جوشؔ ملیح آبادی، فیض احمد فیضؔ، پیر حسام الدین راشدی، جی الانہ، عبادت بریلوی، مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر محمود حسین (وائس چانسلر جامعہ کراچی)، شان الحق حقی، پروفیسر ممتاز حسین، ڈاکٹر احسن فاروقی، جمیل الدین عالی، منور عباس، پروفیسر ابن حسن نجفی، سید آل رضا، زیڈ اے بخاری، نسیم امروہوی، رئیس امروہوی، ڈاکٹر یاور عباس اور دیگر مفکرین بطور مہمانان خصوصی شریک ہوئے، بزمِ ادب ضلع بھکر کے زیر اہتمام ٹاؤن ہال بھکر میں تقریب منعقد کی گئی۔ احسن جالندھری نے صدارت کی۔ خواجہ قریشی علی پانی پتی، فضل حیدری اور ڈاکٹر سردار خالد نے میر انیس پر مقالے پڑھے اور منشا پانی پتی، اقبال حسین خان، اقبال بسمل، کلیم بخاری، منصور واسطی، انجم عابدی، دریہ خان، قلزم مشہدی، اثر ترمذی، خلش پیر اصحابی اور دیگر نے میر انیسؔ کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

نیشنل سینٹر کے لائبریری ہال میں بھی ایک تقریب منعقد ہوئی جس کی صدارت علامہ نصیر

الاجتہادی نے کی دیگر شرکاء میں مولانا جیلانی، مولانا حسین حیدر اور شفیق پراچہ شامل تھے۔

۴ جنوری ۱۹۷۵ء کو جامعہ کراچی کے طلباء اور اساتذہ کی جانب سے میر انیس کی صد سالہ برسی کی تقریبات کے سلسلے میں ایک جلسہ شعبہ نباتیات میں ہوا۔ مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر احسن فاروقی، پروفیسر ممتاز حسین، ڈاکٹر عالیہ امام، فیض احمد فیض، صہبا اختر، رئیس امروہوی، وغیرہ نے خطاب کیا۔

۶ جنوری ۱۹۷۵ء کو رضویہ سوسائٹی میں یومِ انیس کا انعقاد کیا گیا سیّد آل رضا، ضیاء الحسن موسوی، ڈاکٹر احسن فاروقی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور نسیم امروہوی نے منظومات پیش کئے اور تقاریر کیں۔

۱۰ دسمبر ۱۹۷۵ء کو دبستان انیس کے تحت راولپنڈی کلب میں جلسہ کیا گیا جس کی صدارت ڈاکٹر علی اکبر جعفری نے کی۔ جوشؔ ملیح آبادی مہمان خصوصی تھے۔ اس تقریر میں مولانا کوثر نیازی کی کتاب ''انیس شاعرِ انسانیت'' کا افتتاح ڈاکٹر اجمل حسین نے کیا۔ اقتدار علی مظہر (پشاور) رضا علی عابدی ایڈووکیٹ، ذوالفقار علی جعفری، ڈاکٹر سبطِ حسن رضوی، پروفیسر عبادت بریلوی، (لاہور) پروفیسر وزیر الحسن عابدی (لاہور)، پروفیسر مرتضٰی جعفری (پشاور) محمد حسین تبیجی، ڈاکٹر اسد اریب (ملتان) ڈاکٹر ظہیر فتحپوری، محسن احسان، قیصر بارھوی، وحید الحسن ہاشمی، سیّد فیضی، ضمیر جعفری، کرم حیدری، صادق نسیم، جعفر طاہر، الطاف پرواز، رفعت سلطان، سلطان رشک، سلمان رضوی، رشید نثار، نیساں اکبر آبادی، شید النقوی اور دیگر معززین شریک گفتگو رہے۔

۱۹۸۶ء میں ہم نے میر انیسؔ اکادمی کی طرف سے ''میر انیسؔ ایوارڈ'' کا اعلان کیا۔ مرثیوں کا بہترین مجموعہ ''سرِ نینوا'' (اُمید فاضلی) میر انیسؔ پر بہترین کتاب ''انیسؔ ایک مطالعہ (ڈاکٹر احراز نقوی) بہترین تنقیدی کتاب ''جدید اُردو مرثیہ'' (محمد رضا کاظمی) بہترین تحقیقی وتنقیدی کتاب اُردو مرثیہ پاکستان میں (راقم الحروف) بہترین تذکرہ ''مطلعِ انوار'' (مرتضٰی حسین فاضل) لسانیات کے موضوع پر بہترین کتاب ''پراچین اُردو'' (بشیر علی کاظمی) اخلاقیات کے موضوع پر بہترین کتاب ''بچوں کی باتیں'' (مترجم ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی) بہترین فلسفیانہ کتاب ''معرفت الٰہی'' (راحت حسین ناصری) بہترین پی ایچ ڈی کا مقالہ ''اُردو میں تاریخ نویسی'' (ڈاکٹر ظفر اقبال) خصوصی ایوارڈ مرزا علی اظہر برلاس کو اُن کی عظیم الشان کتاب ''کنگ واجد علی شاہ آف اودھ (انگریزی) کو دیا گیا۔ یہ تمام ایوارڈ ''میر انیسؔ سند'' کے ساتھ ایک تقریب میں پیش کئے گئے۔

ہر برس کسی نہ کسی Platform سے یوم انیسؔ اب تک منایا جارہا ہے۔۲۰۰۲ء میں پاک عرب لٹریری سوسائٹی کی جانب سے آرٹس کونسل کراچی میں یوم انیسؔ منایا گیا جس کی صدارت لیفٹیننٹ جنرل ڈاکٹر سید اظہر احمد وائس چانسلر بقائی یونیورسٹی نے کی، مہمانانِ خصوصی میں راقم الحروف اور جاوید حسن تھے۔ جبکہ پروفیسر سحر انصاری، ڈاکٹر عالیہ امام، جناب قاسم جلالی، جناب طلعت حسین، ڈاکٹر ماجد رضا عابدی اور جناب ضیغم زیدی نے مقالے اور نظمیں پڑھیں۔

پاکستان ٹیلی ویژن نے بھی میر انیسؔ کے حوالے سے مذاکرے ٹیلی کاسٹ کئے، غرض ایک تحریک تھی جو ۱۹۷۱ء سے شروع ہوئی اور تاحال جاری ہے۔ ہر سال ڈاکٹر سبطِ حسن (مرحوم) اسلام آباد میں یوم انیس منعقد کرتے تھے۔ ہم نے اپنی ہر مجلس میں میر انیسؔ کے مرثیوں کا ذکر لازمی قرار دے لیا، جس سے یہ فائدہ ہوا کہ مجلسوں کے سامعین تک پیغام میر انیسؔ مسلسل پہنچ رہا ہے اور نئی نسل مرثیوں کو سن بھی رہی ہے اور سمجھ بھی رہی ہے۔

اس کتاب میں جو منظومات شامل کئے گئے ہیں وہ زیادہ تر اِن شعراء کے ہیں کہ جنھوں نے ہماری فرمائش پر یہ نظمیں تحریر کی تھیں۔ جو مضامین شاملِ کتاب ہیں وہ بہت نادر و نایاب ہیں، ان مضامین میں نئے مرثیہ نگاروں کے لئے بھی مرثیہ کہنے کی نئی راہیں نظر آئیں گی، تنقید نگاروں، تجزیہ نگاروں اور تبصرہ نگاروں کے لئے یہ مضامین سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں کہ کسی کے کلام پر اگر تجزیاتی مضمون لکھا جائے تو وہ کن خطوط پر استوار ہوگا۔ میر انیسؔ پر یہ مضامین بتاتے ہیں کہ دنیا میں کسی بھی صاحب فن پر اتنا کام نہیں ہوا ہوگا جتنا مرزا غالبؔ کے بعد میر انیس پر ہوا ہے۔ لیکن یہاں خاصے کی بات یہ ہے کہ مرزا غالبؔ بھی میر انیس کے مداح ہیں۔ میر انیسؔ فن کی اُن بلندیوں پر ہیں کہ جہاں دنیا بھر کے مختلف النسل شعراء اور مفکرین پست نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر نیر مسعود حیات میر انیسؔ پر تحقیق کے کئی برس صرف کر چکے ہیں اس موضوع پر اُن کی ایک مفصل کتاب آ چکی ہے۔ لیکن یہ مضمون کتاب سے پہلے کا ہے لہٰذا یہ مضمون اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ یہ مضمون ایک کتاب کی بنیاد بن چکا ہے۔

ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز نے میر انیسؔ کے مرثیے ''جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے'' کا اُردو ترجمہ کر کے انگریزی ادب کو اُردو ادب سے روشناس کرایا ہے۔ مرثیے کے انگریزی ترجمے سے پہلے ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز نے جو پیش لفظ انگریزی میں لکھا تھا اس کا اُردو ترجمہ ڈاکٹر ماجد رضا عابدی

نے بڑی کاوش اور تحقیقی انداز میں کیا ہے۔ اس پیش لفظ میں ڈیوڈ نے کربلا اور اس کے پس منظر پر گفتگو کی ہے۔ کچھ مغالطے بھی تھے جنہیں ڈاکٹر ماجد رضا عابدی نے فٹ نوٹس دے کر درست کیا ہے۔ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

میر انیسؔ کے مرثیوں میں عباسؑ کا علم میں نے یہ مضمون ۱۹۷۱ء میں تحریر کیا تھا، بعد میں اسی مضمون کو بنیاد بنا کر شہید صفی پوری نے ایک مضمون ''عباس کا علم'' تحریر کیا، اس مضمون کو بھی شامل کتاب کیا گیا ہے۔

سلیم احمد کا مضمون ''چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے'' ایک تنقیدی مضمون ہے۔ جس میں اُردو زبان کے چار بڑے شاعروں میں میر انیسؔ کا مرتبہ متعین کیا گیا ہے۔ میر تقی میرؔ، مرزا غالبؔ اور اقبالؔ پر انہوں نے میر انیسؔ کی فوقیت کو ثابت کیا ہے۔

''حسینؑ اور نماز میر انیسؔ کی نظر میں'' اس موضوع پر انیسؔ کے مختلف مرثیوں میں مناظر بکھرے ہوئے تھے، میں نے سوچا کہ اس کا تجزیہ کیا جائے۔ لہٰذا ایک مضمون اس موضوع پر تحریر کیا جو ماقبل ''ارشاد'' میں شائع ہو چکا تھا اور یہاں بھی شائع کیا جا رہا ہے۔

سید افضال حسین نقوی کا مضمون اُردو کا ایک منفرد مرثیہ۔ میر انیسؔ کا مشہور مرثیہ ''ہوتے ہیں بہت رنج مسافر کو سفر میں'' افضال حسین نقوی نے تفصیل سے اس مرثیے کا تجزیہ کیا ہے جو لائق مطالعہ ہے۔ میرا ایک اور مضمون ''اصحابِ حسینؑ کلام میر انیس کے آئینے میں'' پہلے شائع ہو چکا ہے اور بارِ دیگر یہاں بھی شامل کیا جا رہا ہے۔ متعدد مرثیوں میں انیسؔ نے اصحاب کا ذکر کیا ہے اُن کو ایک جگہ جمع کر کے تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد حسن کا مضمون ''مراثی انیس میں آویزش کی نوعیت'' ایک خالص تنقیدی مضمون ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر شارب ردولوی کا مضمون ''اُردو پر تنقید'' یہ مضمون کراچی میں مرکز علوم اسلامیہ کے تحت منعقدہ شامِ انیسؔ میں ڈاکٹر شاربؔ ردولوی نے خود پڑھا تھا شاملِ کتاب ہے اور خاصے کی چیز ہے۔

''میر انیسؔ کے مسدس کی ٹیپ'' ڈاکٹر سہیل بخاری کا منفرد مضمون ہے جس میں انہوں نے انیسؔ کی بیتوں کا جائزہ لیا ہے یہ مضمون بھی اہم تھا۔ لہٰذا شامل کتاب ہے۔

ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی کے دو مضامین ''اُردو شاعری پر انیسؔ کا اثر'' اور ''میر انیسؔ کے ایک

مرثیے میں استعارے کا نظام'' یہ دونوں مضامین شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔

''موازنۂ انیس و شیکسپیئر'' سیّد غلام امام ایڈوکیٹ کا مضمون ہے اور اِن کی کتاب ''انیس اینڈ شیکسپیئر'' سے اقتباس ہے۔ شیکسپیئر کی نظموں کے اُردو ترجے نہیں تھے جو یہاں شامل کئے گئے ہیں اور بذاتِ خود بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ سید احمد امام نے اُردو ترجمہ کیا، اصل مضمون میں انگریزی عبارتیں نہیں تھیں، لیکن ہم نے یہاں شامل کر دی ہیں جس سے مضمون کی دلچسپی میں اضافہ ہو گیا ہے اور مضمون کی قدر و قیمت بڑھ گئی ہے۔

''مرزا غالبؔ اور میر انیسؔ'' سیّد فیضی کا ایک ایسا مضمون ہے جو بڑی تلاش کے بعد دستیاب ہوا۔ ایک ہی عہد کے دو بڑے شاعر مرزا غالبؔ اور میر انیسؔ کے طرز کلام کا نہایت ہی عمدگی سے موازنہ کیا گیا ہے۔

میر انیسؔ کا نو دریافت کلام سیّد علی احمد دانش (آلِ انیس) کا مضمون ہے۔ جس میں انیسؔ کے مشہور سلاموں اور مرثیوں کے چند نئے دریافت شدہ شعر اور بند کو شامل کر کے ایک گراں قدر مضمون بنا دیا گیا ہے۔

''انیسؔ کی معجز بیانی'' علی سردار جعفری کا ایک مضمون نہایت قیمتی مضمون ہے، بڑے شاعرانہ انداز میں علی سردار جعفری نے میر انیسؔ کے مرثیوں میں پھیلے ہوئے مختلف مناظر کی نشاندہی کی ہے۔ یہ مضمون بالخصوص مرثیہ نگاروں کے پڑھنے کی چیز ہے۔

قمر حسین رضوی کا مضمون ''میر خورشید علی نفیسؔ بنام شیعانِ میر انیسؔ'' ایک تحقیقی اور تنقیدی مضمون ہے۔

محمد عباس نقوی کی ایک رپورٹ ''جشن یادگارِ انیسؔ'' جو امام بارگاہ آل عبا گلبرگ کراچی میں ہوا تھا، شامل کتاب ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں منظومات شامل کئے گئے ہیں۔ یہ منظومات شعراء کے دل کا نذرانہ ہیں جو انہوں نے بارگاہ انیسؔ میں پیش کیا ہے۔

کتاب پڑھئے اور جھومتے رہیے۔

ڈاکٹر محمود حسین مرحوم:
(وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی)

انیسؔ بحیثیت معلّمِ اخلاق

انیسؔ کی شاعری، ان کی مرثیہ گوئی اور اَدبی حیثیت مسلّم ہے۔ انہوں نے اُردو اَدب کو بلند مرتبہ بخشا۔ ان کے کلام سے اَدبی دنیا میں نئی تحریک کی بنیاد پڑی۔ مرثیہ نگاری کو اُنہوں نے اپنے کمالِ فن سے اُردو اَدب کا ایک اہم اور لازمی جُزو بنا دیا، یہ سب باتیں بالکل بجا ہیں اور اس پر اُردو اَدب کے عالموں اور تنقید نگاروں نے بہت کچھ لکھا ہے اور ابھی اور بھی لکھا جائے گا۔

لیکن میں اس وقت انیسؔ کے سلسلے میں صرف ایک بات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں اور وہ ہے "انیسؔ بحیثیتِ معلّمِ اخلاق" کے طور پر، میرا خیال ہے انیسؔ نے کردار کی بلندی، اخلاق کی عظمت، ایثار وقربانی کے جذبے کو، حق کی حمایت اور باطل کے خلاف جدوجہد کرنے کو جس خوبی سے پیش کیا ہے وہ صرف اُدبی شہ پارہ ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کے ایمان کا ایک حصہ ہے، تعلیمی حیثیت سے درس وتدریس میں آج تک جس چیز کی کمی رہی ہے اور آج جس چیز کی شدت سے زیادہ کمی محسوس کی جا رہی ہے وہ بچوں اور بالغوں کی تعلیم میں کردار سازی اور ذہنی نشو ونما میں اسلامی زندگی کے اس حصہ کی کمی ہے جس سے انفرادی اور اجتماعی

کردار بنتا ہے۔ ایک سادہ مگر غیر مؤثر طریقہ اخلاقی تعلیم کا یہ ہے کہ جسے انگریزی میں Do's and Dont's کہتے ہیں وہ بتا دیئے جائیں۔ ''ایسا کرو اور یوں نہ کرو'' اپنے اثر کے اعتبار سے اس طرح چیزوں کو پیش کرنے سے کامیابی مشکل ہوتی ہے۔ انیسؔ نے یہ نہیں کیا۔ انیسؔ نے اعلیٰ اخلاق کا ایک مثالی کردار لیا اور حضرت امامِ حسینؑ کی زندگی کے ہر پہلو کو ایسے الفاظ میں پیش کیا کہ وہ زندگی جن اقدار کا بہترین نمونہ تھی وہ اقدار انیسؔ کے طفیل لوگوں کے دلوں میں جاگزین ہوگئیں۔ اس اعتبار سے انیسؔ کو نہ صرف اعلیٰ درجہ کا شاعر بلکہ نہایت کامیاب معلم سمجھتا ہوں۔ ایک پوری قوم کے ذہن پر وہ اثر انداز ہوئے اور وہ اثر اُس وقت تک باقی رہے گا جب تک اُردو زبان زندہ ہے۔

ہم جب قوموں کے عروج و زوال کے اَسباب پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اسی قوم نے مجموعی حیثیت سے زیادہ ترقی کی ہے جس نے اپنی ذہنی ترقی میں کردار کی بلندی کا خیال رکھا ہے۔

قوموں کی ترقی سے صرف صنعت و حرفت اور ٹیکنالوجی کی ترقی مراد نہیں ہوتی ہے، نہ ایک خاص زمانہ میں کسی خاص ملک یا قوم کی ترقی کو پیمانہ بنایا جاسکتا ہے۔ بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ تمام بنی نوع انسان کی ترقی میں اس قوم کا کتنا حصہ ہے اور کتنے عرصہ تک اس کے اثرات جاری رہے۔

یہی وہ بنیادی بات ہے جس کو ہم اسلامی اقدار سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ میرا خیال ہے اس حیثیت سے اگر انیسؔ کے کلام کا تجزیہ کیا جائے اور اسے نصاب کا حصہ بنایا جائے تو یہ اُردو ادب اور پاکستانی قوم کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔

انیسؔ پر میرا مطالعہ بہت محدُود ہے۔

ممکن ہے اس حیثیت سے بھی انیسؔ پر لکھا گیا ہو اور کچھ کام ہوا ہو لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ اگر واقعی ہم اس عظیم شاعر اور مفکر سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں تو تعلیمی طبقہ کو اس طرف خاص طور سے توجہ کرنا چاہئے۔

میں جب کبھی انیسؔ کا کلام پڑھتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں اُن کے کلام میں ایک ایسی تاثیر،

دل نشینی اور حلاوت ہے جو خود بخود دل و دماغ پر قبضہ جما لیتی ہے۔ یہ بات بہت کم شاعروں کو نصیب ہوتی ہے۔ جو مرثیے اور رُباعیاں، نصاب میں داخل ہیں اُنہیں طلبہ جلد یاد کر لیتے ہیں، اس جگہ میں یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ میری مراد صرف یہ نہیں ہے کہ ان کا کلام ہر جگہ نصاب میں داخل کر کے اس خیال کی تکمیل کر دی جائے بلکہ میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ ملک کے دانشور اور ماہران تعلیم باقاعدہ غور کریں کہ اِن کے کلام سے کردار سازی میں کس طرح صحیح طور پر کام لیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں:
(وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی)

انیسؔ کے فن میں توازن

انیسؔ کے نقادوں نے ان کی شاعری کے متعلق جو رویے اختیار کئے ہیں ان کی وضاحت ان تین سمتوں سے ہوتی ہے۔ مثلاً حالیؔ کا مرثیوں کی اخلاقی اہمیت پر زور دینا اور نوجوانوں کو ان کا یہ مشورہ کہ جو صنف سخن انتہائی کمال کو پہنچ چکی ہو اس پر مزید طبع آزمائی نہ کی جائے۔ یا بیسویں صدی میں جو تنقید کی گئی ہے اس میں انیسؔ کی شاعری کے لئے خانے بنا لئے گئے۔ انیسؔ کی شاعری تاریخی صداقت کو شعری صداقت میں ڈھالتی ہے۔ انیسؔ نے عربی یا عجمی تمدن کی نمائندگی نہیں کی۔ انہوں نے قصہ عرب سے ضرور لیا ہے مگر اس کے سہارے لکھنوی تہذیب و معاشرت کو اپنے مرثیوں میں پیش کیا ہے۔ ان کے کردار کا رنگ ہندوستانی ہے۔ ان کے مرثیوں میں تاریخی صداقت ضمنی ہے جبکہ شعری صداقت بنیادی ہے۔ انیسؔ کے فن میں وہ توازن ملتا ہے جو متوازن تخیل، متوازن جذبہ اور متوازن انداز سے عبارت ہے۔ ان کے یہاں ایک پیغام ہے جو ان کے فن کو پیغمبری کے درجے تک پہنچا دیتا ہے اور یہی ان کی شاعرانہ عظمت کا راز ہے۔

❁ ❁ ❁

پنڈت آنند نرائن مُلّا ایم۔ پی:
صدر، مرکزی انجمن ترقی اُردو ہند، دہلی
سابق جج الٰہ آباد ہائی کورٹ

انیسؔ نہ ہوتے تو اُردو ادب کا کیا حال ہوتا

میرا خیال ہے کہ انیسؔ یا کسی بھی عظیم فنکار کی عظمت ناپی نہیں جا سکتی۔ عظیم فنکار کسی ایک چوٹی کی مثال نہیں ہوتا بلکہ ایک طویل سلسلۂ کوہ ہوتا ہے۔ اس کی مجموعی تصویر پیش کرنا بڑی محنت اور ہمت اور جانفشانی کا کام ہے۔ میرانیسؔ اِن عظیم فنکاروں میں ہیں جن پر سطحی انداز سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ انیسؔ کے ادبی مقام و مرتبے اور اُردو ادب کے ارتقا میں اِن کے رول پر اپنی بات میں یوں شروع کروں گا کہ ایک عرصے تک اُردو ادب میں اَربابِ ثلاثہ کا تصور بہت عام ہے۔ یعنی میرؔ، غالبؔ اور انیسؔ، بیسویں صدی میں اقبالؔ بھی اِس زمرے میں شامل ہو گئے اور اربابِ ثلاثہ نے اربابِ اربعہ کی شکل اختیار کر لی۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انیسؔ نہ ہوتے تو اُردو ادب کا کیا حال ہوتا، کیا مقام ہوتا انہوں نے ہماری ادبی روایت کے ارتقا میں کیا رول ادا کیا؟ کچھ ادیب، شاعر انسان ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی دوڑ میں لگے رہتے ہیں اور ختم ہو جاتے ہیں۔ انیسؔ ایسے ریس کے دوڑنے والے کی طرح اپنے بعد کئی ادوار تک چلے۔ اِن کے کلام میں حیاتِ جاوید رکھنے والی ایسی قدریں موجود ہیں جو کبھی ختم نہ ہوں گی۔

اُردو ادب کی بدنصیبی یہ رہی ہے کہ یہ ادب ایک داخلیت زدہ ادب بن کر رہ گیا ہے۔ اُردو

نے خارجیت کو توجہ کا مستحق سمجھا ہی نہیں۔ سب کے سب غزل کہنے والے بن گئے۔ وہی اشعار مقبولِ خاص و عام ہوئے جن میں عشق یا دوسرے جذبات قلب کا اظہار کیا گیا۔ خارجیت کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا گیا جسے دراصل شاعری کی قدرِ اوّل کا مقام ہونا چاہئے تھا۔ ادب کو ادب بنانے کے لئے، اسے انسان سے قریب لانے کے لئے خارجیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ میں یہ کہوں گا کہ نظیر اکبرآبادیؔ کے استثنا کے ساتھ اگر مرثیے نہ ہوتے تو یہ گوشہ بالکل ہی خالی رہ جاتا۔ انیسؔ نے اُردو ادب کو زندگی کے صحیح تقاضوں سے متاثر ہونے کے قابل بنایا۔

پروفیسر ڈاکٹر نورالحسن :
(وزیر تعلیم حکومت ہند۔ دہلی)

انیسؔ کے مرثیوں میں فن کی عظمت

ہمارا کلچر ایک گلدستے کی طرح ہے جس میں رنگ رنگ کے پھول شامل ہیں۔ اُردو بھی اس گلدستے کا ایک سدا بہار پھول ہے۔ مختلف پھولوں کی یکجائی ہی نے اس گلدستے کو ایک انفرادی شان عطا کی ہے۔ ہم میں سے بہت سے لوگوں نے انیسؔ کی رباعیوں، سلاموں اور مرثیوں ہی سے زبان کھولنا سیکھا ہے۔ اِن کی شاعری کی اہمیت کا سبب محض مذہبی اور جذباتی عقیدت ہی نہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ اس سے اُنیسویں صدی کے لکھنؤ کی تہذیب اور اسی تہذیب کے مختلف النوع مظاہر کی ایک بڑی موثر تصویر مرتب ہوتی ہے۔ انیسؔ کے مرثیوں میں فن کی عظمتوں کے نشان بھی ہیں، اعلیٰ اقدار اور روایات کا پرتو بھی اور انتہائی قیمتی تاریخی اور تہذیبی مواد بھی۔ انیسؔ کی بڑائی اس میں ہے کہ انہوں نے واقعات کربلا کے بیان میں آفاقیت پیدا کر دی ہے۔ انہوں نے اگرچہ واقعاتِ کربلا کا بیان کیا ہے لیکن اس بیان میں ایسے عناصر شامل کر دیئے ہیں جو اِن کے گرد و پیش کی زندگی کا رنگا رنگ خاکہ بھی ترتیب دیتے جاتے ہیں۔ انسانی جذبات کی گہرائیوں تک انیسؔ نے جس طرح رسائی حاصل کی ہے اور جس بصیرت کے ساتھ اس کا اظہار کیا ہے اسے ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انیسؔ کی

زبان شائستگی کے آداب رکھنے کے علاوہ ہندوستانی زندگی کے آہنگ کی بھی ترجمانی کرتی ہے۔ انہوں نے زبان کا ایک ایسا انداز پیش کیا جس کی مثال روزمرہ اور محاورات کو اس طرح برتا اور اُردو کو شائستگی کے ایسے انداز سکھائے جس کی مثال ہماری ادبی روایت میں نہیں ملتی۔ زبان کو فارسی یا عربی الفاظ کے تسلط سے گرانبار کر کے یا انگریزی محاوروں کو اپنی زبان میں منتقل کرنے سے زبان کی لفظیات کا دائرہ تو وسیع ہوسکتا ہے مگر اس سے زبان کا فطری حُسن ماند پڑ جاتا ہے۔ چنانچہ اس کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی کو بھی اس سے نقصان پہنچتا ہے۔ اُردو کی کشش اس کی لطافت اور شیرینی کی وجہ سے ہے جو عوامی کوششوں سے ہی زندہ رہ سکتی ہے۔ انیسؔ کی زبان ٹکسالی بھی ہے اور دلفریب بھی۔ نشست الفاظ اور محاوروں کے چوکھے پن کی وجہ سے بھی ان کے کلام میں دلکشی پیدا ہوئی ہے۔ فی الحقیقت زبان کو فصاحت اور شستگی کے جس درجے پر انیسؔ نے پہنچایا ہے۔ اس کی وجہ سے ان کا نام اُردو زبان کی تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔

ہندوستان کی تمام زبانوں کی طرح ہماری حکومت اُردو کو بھی عزیز رکھتی ہے، اس کی ترقی کو اپنا فرض سمجھتی ہے اور ان تمام افراد یا اداروں کی مدد کر رہی ہے جو اس لطیف اور شیریں اور ہمہ گیر زبان کی ترقی کے لئے کوشاں ہیں۔

سیّد ضمیر اختر نقوی:

میر انیسؔ، ایک مطالعہ

تعریف کریں خاص تو ہے کام کی تعریف
کب اہلِ سخن مانتے ہیں عام کی تعریف

انیسؔ ناسخؔ کی نظر میں:

ناسخ نے پیشینگوئی کی تھی کہ انیسؔ ایک دن عظیم شاعر ہوں گے اور ایسا ہی ہوا۔ ناسخؔ اپنے شاگردوں کو (جن میں خواجہ وزیرؔ، صباؔ، میر اوسط علی رشکؔ، محمد رضا برقؔ، شیخ امداد علی بحرؔ، منیرؔ شکوہ آبادی وغیرہ مشہور ہیں) اِن الفاظ میں ہمیشہ نصیحت کی کہ:-

''اگر تمھیں صحیح معنی میں اُردو زبان سیکھنا ہے تو میر انیسؔ اور اُن کے خاندان کی طرف رجوع کرنا ہوگا''۔ (واقعاتِ انیسؔ)

انیسؔ آتشؔ کی نظر میں:

میر انیسؔ مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ خواجہ حیدر علی آتشؔ بھی مجلس میں موجود تھے۔ میر انیسؔ نے تلوار کی تعریف میں یہ بند پڑھا:-

قد کتنا خوشنما ہے، بدن کس قدر ہے گول — جوہر شناس ہے تو اسے موتیوں میں تول
مفتاحِ فتح ہے درِ نصرت کو اس سے کھول — وہ تیغ ہے خراجِ صفاہاں ہے جس کا مول

اور جب یہ بیت پڑھی:-

اشراف کا بناؤ ، رئیسوں کی شان ہے
شاہوں کی آبرو ہے ، سپاہی کی جان ہے

تو آتش پہلے سے جھوم رہے تھے اور عالم وجد طاری تھا نصف قد سے کھڑے ہو گئے اور با آواز بلند کہا کہ کون بیوقوف کہتا ہے کہ تم محض مرثیہ گو ہو۔ واللہ ثم باللہ شاعر گر ہو۔ اور شاعری کا مقدس تاج تمہارے سر کے لیے موزوں بنایا گیا ہے۔ خدا مبارک کرے"۔

"آتش ہمیشہ میر انیس کی شاعری کی مدح کرتے رہتے اور کہا کرتے تھے کہ انیس کے مرثیہ پر سیکڑوں دیوان صدقے کئے جا سکتے ہیں"۔

انیس غالب کی نظر میں:

"ہندوستان میں انیس اور دبیر جیسا مرثیہ گو نہ ہوا ہے نہ آئندہ ہوگا"۔ (یادگارِ غالب)

انیس مرزا دبیر کی نظر میں:

آسماں بے ماہِ کامل، سدرہ بے روح الامیں
طورِ سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس

فرانسیسی ادیب گارساں دتاسی: (عہدِ انیس)

محمد حسین آزاد دو باتوں کے خواہش مند ہیں ایک تو یہ کہ اُردو مروجہ تشبیہات و استعارات سے پاک ہو جائے اور انگریزی اسلوب اختیار کر لے، دوسری بات یہ کہ شعرائے اُردو عشقیہ مضامین باندھنا چھوڑ دیں اور زبان محض مناظرِ قدرت اور مضامین حقیقت ادا کرے۔ میرا جواب یہ ہے کہ اُردو شاعری محض حسن و عشق پر مبنی نہیں ہے بلکہ ہر قسم اور ہر نوع کے مضامین بڑے خاص اور دلکش انداز سے ادا کئے گئے ہیں مثال کے طور پر میر انیس اور مرزا دبیر کی شاعری کو لیجئے ان کے کلام میں فصاحت، خیالاتِ عالیہ، حرکت و حیات، احساس و تاثر، تشبیہ و استعارات کا تجمل، مختصر یہ کہ شاعری کے جملہ محاسن ہیں یا نہیں؟ کیا ان کے کلام میں ان نامناسب مضامین کی ذرا بھی جھلک ہے جن کے مولانا محمد حسین صاحب شاکی ہیں؟ اگر وہ ان دو شعرا کے کلام کو حاصل کر کے غور سے پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ شاعری ان تمام نقائص سے بری ہے جن کے وہ شاکی ہیں اور اس میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جن کی انہیں خواہش ہے اگر مولوی صاحب کو شاعری کا ذرا بھی شوق ہے تو وہ

سرکاری اداروں (یونیورسٹی اور کالجوں میں) ان دونوں شاعروں (میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ) کے کلام کی تدریس کا مشورہ دیں۔ (مقالات گارساں دتاسی جلد دوم صفحہ ۲۶)

مولانا محمد حسین آزادؔ:

''انیسؔ نے ثابت کردیا کہ حقیقی اور تخئیلی شاعر ہم ہیں کہ ہر رنگ کے مضمون، ہر قسم کے خیال، ہر ایک حال اپنے الفاظ کے جوڑ بند سے ایسا طلسم باندھ دیتے ہیں، چاہیں رُلا دیں، چاہیں ہنسا دیں۔ چاہیں تو حسرت کی مورت بنادیں''۔ (آبِ حیات)

صفیرؔ بلگرامی:

اللہ رے مرثیہ میں سلاست انیسؔ کی　　مشہور ہے جہاں میں فصاحت انیسؔ کی
اک بحرِ بیکراں تھی طبیعت انیسؔ کی　　کیا ہو بیاں زباں سے طلاقت انیسؔ کی
کہنا تو کہنا پڑھنے کا وہ رنگ ڈھنگ تھا
مصرع سے اُن کے بلبلِ خوش لہجہ دنگ تھا

لفظوں کی شُستگی کہوں یا بندشوں کا رنگ　　سلمان ساوجی کا بھی یاں قافیہ تھا تنگ
جس وقت انتظام کی آئی انہیں اُمنگ　　کیا واقعہ نگاریوں کا نکلا رنگ ڈھنگ
ایسے تھے اس بیان کے نقشے پڑے ہوئے
گویا کہ سننے والے وہیں ہیں کھڑے ہوئے

اور اس بیان پہ پڑھنے کا اُن کے وہ انتظام　　لفظوں کی خوبیاں وہ اشاروں میں اُن کے کام
ہر بات میں وہ جنبشِ دستی کا اہتمام　　سانچے میں ڈھل کے منہ سے نکلنا سخن تمام
سدرہ سے سُن کے بلبلِ قدس اُس بیان کو
کہتا تھا دیکھ دیکھ کے منبر کی شان کو

اے بُلبلِ حدیقۂ اسلام آفریں　　اے لنگرِ سفینۂ ارقام آفریں
پڑھنے پہ کہہ رہے ہیں در و بام آفریں　　اے آفریں، انیسِ خوش انجام آفریں
سب گوش دیدہ ور ہوئے تیرے بیان سے

لفظوں کو آبرو ملی تیری زبان سے

شاؔد عظیم آبادی:

''میر انیسؔ نے جو احاطہ کھینچا ہے اور دنیا بھر کے اعلیٰ مضامین کا دریا اس طریقے سے بہا دیا ہے کہ تازہ مضمون کا پیدا کرنا محال ہو گیا ہے''۔ (فکرِ بلیغ)

مولانا الطاف حسین حالیؔ:

''میر انیسؔ کو اُردو شعرا میں سب سے برتر ماننا پڑے گا''۔ (مقدمۂ شعر و شاعری)

مولانا شبلی نعمانی:

''میر انیسؔ نے سیکڑوں ہزاروں مرثیے لکھے ہیں اور ہر مرثیہ بجائے خود ایک قصہ یا حکایت ہے۔ لیکن کوئی واقعہ ایسا نہیں لکھا جو اقتضائے حال کے خلاف ہو''۔ (موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ)

مولوی ذکاءاللہ دہلوی:

میور کالج الٰہ آباد میں پروفیسر تھے۔ میر انیسؔ کی ایک مجلس کا حال بیان کرتے ہیں جو الٰہ آباد میں منعقد ہوئی تھی۔

''خاص و عام ہزاروں آدمی جمع تھے۔ کمال اور کلام کی کیا کیفیت بیان کروں۔ محویت کا عالم تھا۔ وہ شخص منبر پر بیٹھا پڑھ رہا تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ جادو کر رہا ہے۔ یہ بیت پڑھتے تھے اور مزے لیتے تھے''۔

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیرؑ کی مدّاحی میں

(''مراۃ الشعراء، ۴۴۶'' اور ''حیات انیسؔ'')

عبدالحلیم شررؔ:

زمانہ میر انیسؔ کو ناموری کے شہ نشین پر لایا اور انہوں نے مرثیہ خوانی میں ایسے ایسے کمالات شاعری دکھائے کہ شعر و سخن کے آسمان پر آفتاب بن کے چمکے۔ میر انیسؔ میں ساری بے تکلف اور

جذبات انسانی پر حکومت کرنے والی زبان کی وہ خوبیاں تھیں جو سوا مبداء فیاض کے عنایت کے سیکھنے سے نہیں آسکتیں انہوں نے فن مرثیہ گوئی کو شاعری کی اور تمام اصناف سے بڑھا دیا اور ادب اردو میں وہ نئی چیزیں پیدا کردیں جن کو انگریزی میں تعلیم کے اثر سے طبیعتیں ڈھونڈ ھنے لگی تھیں''۔

(گذشتہ لکھنو)

ڈپٹی نذیر احمد دہلوی:

''بیان کرتے ہیں، میں میر انیسؔ کی ایک مجلس میں شریک تھا۔ میر انیسؔ پڑھ رہے تھے۔ جس وقت اُنھوں نے یہ مصرع پڑھا:-

''وہ دشت ، اور وہ خیمۂ زنگار گوں کی شان''

تو اہلِ مجلس کے سامنے ایک وسیع دشت اور کالے کالے خیموں کا نقشہ پھر گیا اور ہر شخص محویت کے عالم میں آگیا''۔ (نوائے انیسؔ)

رتن ناتھ سرشار:

انیسؔ مغفور کو خدا بخشے باللہ العظیم کلام کیا۔ جواہرات کے ٹکڑے، قندونبات کے ریزے، نور کے مرثیے ہیں۔

''جوہر شناس ہے تو انھیں موتیوں سے تول''

فصحائے خطۂ پاکِ ایران تک کہتے ہیں کہ کجا فردوسؔی، کجا کمر بندِ مرصع کجا مثال طوسؔی''

بزم میں وہ ڈھنگ رزم میں وہ رنگ کہ:-

مضمونِ انیسؔ کا نہ چربا اُترا اُترا بھی تو کچھ بگڑ کے نقشا اُترا

نقاش نے سو طرح کی نقشت کھینچی تصویر نہ کھنچ سکی تو چہرا اُترا

(فسانۂ آزاد)

نظم طباطبائی:

''انیسؔ نے الفاظ میں نفسیاتِ انسانی کو سمو دیا ہے۔ جن سے ان کے گہرے اور عمیق نفسیاتی تجزیہ کا ترشح ہوتا ہے''۔ (مراثی انیسؔ مرتبہ نظم طباطبائی)

نوبت رائے نظر:

میر انیس نے ثابت کر دیا کہ ذہن رسا اور کمالِ فن وہ چیز ہے کہ ناقص سی ناقص زمین کو بھی آسمان سے زیادہ بلند دکھا سکتا ہے۔ ان کی شاعری، شاعری نہ تھی بلکہ ایک معجزہ تھا۔

(زمانہ کانپور فروری ۱۹۰۸ء)

عزیز لکھنوی:

"آج انیس کے کلام کی جتنی قدر و منزلت تعلیم یافتہ اصحاب کے دلوں میں ہے۔ اتنی شاید ہی کسی شاعر کے کلام کی ہو۔ میرے خیال میں جو حضرات اردو شاعری کو اصولِ فطرت کے خلاف سمجھتے ہیں وہ صرف کلام انیس کے مطالعہ سے سیراب ہو سکتے ہیں۔ مناظرِ قدرت کی مصوری میں انیس کی دستگاہ دیکھیے۔ انیس نے احساسات کی ترجمانی اور جذبات انسانی کی مصوری میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ غرضیکہ مناظرِ قدرت اور رزم و بزم کی لاکھوں تصویریں انیس کے معجز نما قلم نے ایسی کھینچی ہیں جن کے آگے مصوروں کے مُوقلم شکستہ ہیں"۔ (نیرنگ خیال لاہور۔ اکتوبر ۱۹۲۴ء)

تاجور نجیب آبادی:

ایک دفعہ کسی خوش مذاق شخص نے میر انیس سے یہ شکایت کی کہ آپ بھی لفظی رعایتوں کا بہت لحاظ فرمانے لگے۔ میر صاحب نے فرمایا کہ جی کیا کریں۔ لکھنؤ میں رہنا ہے۔ اس سے انداز ہو سکتا ہے کہ مجلسی اور ذکلی شاعر کو مذاق عوام اور حالات حاضرہ کا کس حد تک ساتھ دینا پڑتا ہے۔

نیاز فتحپوری:

یہ ماننا پڑے گا کہ شاعری کی صنف میں جسے مرثیہ کہتے ہیں غیر معمولی ترقی کی اور شاہان اودھ کے عہد میں فطرت کی طرف سے اس نے انیس و دبیر کو پیدا کر دیا۔ مرثیہ گوئی کم و بیش ہر زبان اور ملک میں پائی جاتی ہے لیکن مذہبی و قومی اہمیت کے لحاظ سے جو مرثیہ لکھنؤ کی مرثیہ گوئی کا ہے اس کی نظیر دنیا میں کہیں نہیں مل سکتی۔ (نیاز فتح پوری کی ڈائری ۱۹۲۹ء۔ صفحہ ۱۳۵)

مولانا عبدالسّلام ندوی:

''میرانیسؔ نے واقعہ نگاری کو جس کمال کے درجہ تک پہنچایا ہے اُردو کیا فارسی میں بھی اس کی نظیریں مشکل سے مل سکتی ہیں۔ اس وسعتِ بیان کے علاوہ میرانیسؔ نے زبان میں بھی نہایت وسعت پیدا کی اور جو الفاظ اور محاورے اب تک صرف اہلِ زبان تک محدود تھے ان کو شعرا کے لیے وقفِ عام کر دیا''۔ (شعرالہند جلد دوم)

امجد علی اشہری:

تمام شہر عظیم آباد کے ہر فرقہ و مذہب کے لوگ کثرت سے شریک مجلس تھے۔ ہزاروں آدمیوں کا مجمع تھا اور جب میرؔ صاحب کو خبر ہوئی کہ مجلس تیار ہے تو خراماں خراماں تشریف لائے اور منبر پر جا کر سر اُٹھایا اور پیشتر سے زیادہ بھری ہوئی مجلس کو دیکھ کر کہا کہ حضرات مجھ کو اس کا اندازہ کرنا مقصود تھا کہ انیسؔ کے دیکھنے والے کتنے ہیں۔ بحمد اللہ کہ آپ صاحبوں نے میری قدردانی کا ثبوت دیا۔ یہ کہہ کر مجلس کو اپنا گرویدہ بنالیا اور دو چار رُباعیاں اور ایک سلام پڑھ کر مرثیہ شروع کیا:۔

جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے　　جلوہ کیا سحر کے رُخِ بے حجاب نے
دیکھا سوئے فلک شہ گردوں رکاب نے　　مُڑ کر صدا رفیقوں کو دی اُس جناب نے
آخر ہے رات حمد و ثنائے خدا کرو
اُٹھو فریضۂ سحری کو ادا کرو

اِس مرثیہ کے مسجع بندوں نے سخن شناس طبائع پر جو اثر کیا اس کا بیان نہیں ہوسکتا۔ رزمیہ بندوں کے ہر شعر پر واہ واہ سبحان اللہ کی پُر جوش آوازوں سے تمام مکان گونج رہا تھا اور رنج والم کے جانکاہ بندوں پر دلوں میں بجلیاں تڑپ رہی تھیں۔ میر صاحب نے کئی مرتبہ چاہا کہ اب مرثیہ ختم کریں لیکن ساری مجلس کے اصرار پر اور ان بے قرار دلوں اور اُن کی خواہشوں کے جب تک پورا مرثیہ ایک ایک بند کر کے سن نہ لیا ان کا منبر سے اُترنا قبول نہ کیا بلکہ اکثر اصحاب مقطع کا بند سن کر مایوس ہوگئے کہ ابھی کیوں مرثیہ ختم ہوگیا اور کیوں میرؔ صاحب کی معجز بیانیوں کے لطفِ مزید کا موقع نہ رہا''۔

(حیاتِ انیسؔ)

اُحسن لکھنوی:

''حق تو یہ ہے کہ میر انیس کے کلام پر نقادی کچھ آسان کام نہیں ہے۔ فلسفہ اور سائنس کے مہتم بالشان مسائل کو حل کرنے کے لیے اکتسابی قابلیت کی ضرورت ہے اور انیس کے پُراسرار مضامین سمجھنے کو قدرتی مذاق درکار ہے۔ نہ یہ گریجویٹ کا کام ہے نہ علما کا حصہ ہے۔ جس وقت تک وہاں سے مذاقِ سلیم وقوت امتیاز یہ عنایت نہ ہوں جہاں سے میر انیس کو یہ نعمت عنایت ہوئی تھی

ہے سہلِ ممتنع یہ کلامِ اَدق مرا
برسوں پڑھے تو یاد نہ ہووے سبق مرا

آخر میں میرا ارادہ تھا کہ فردوسی و نظامی وغیرہ کے کلام سے میر انیس کے کلام کا موازنہ کر کے پیش کروں۔ مگر امجد علی اشہری نے ''حیاتِ انیس'' میں اس کمی کو پورا کر دیا ہے''۔ (واقعاتِ انیس)

چودھری نظیر الحسن فوق:

امیر مینائی۔ عبدالحئی، مولوی فیض الحسن، مولوی غلام حسنین کنتوری، علی حسن جائسی وغیرہم سب یہی کہتے تھے کہ دونوں (انیس و دبیر) آفتاب ہیں ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ مظفر علی خاں اسیر نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا تھا کہ دونوں اُستاد ہیں'' (المیزان)

امیر احمد علوی:

انگلستان کے مشہور سخن سنج ملٹن نے کہا تھا کہ ''بہترین نظم وہ ہے جس میں سادگی، نازک خیالی اور تاثیر ہو''۔ یہ تمام اوصاف اس خوبی سے کلامِ انیس میں خود بخود جمع ہو گئے ہیں کہ ایک ظریف کے قول کے مطابق ملٹن کے مقولہ کو زمانۂ حال میں یوں ترمیم کرنا چاہیئے کہ ''بہترین نظم وہ ہے جو جناب انیس کی زبان مبارک سے نکلی ہو''۔

ان کا پاکیزہ کلام بہترین اصناف سخن کا جامع ہے اس میں ڈرامہ بھی ہے اور ایپک بھی۔ تشبیب و غزل بھی ہے اور رباعی و مسدس بھی۔ واقعہ نگاری بھی ہے اور اظہار جذبات بھی۔ بلاغت کا انداز بھی ہے اور فصاحت بھی۔ استعارات اور تشبیہات بھی ہیں اور صنائع و بدائع بھی۔ مناظر قدرت کے

فوٹو بھی ہیں اور خیال آفرینی بھی۔ فخر و خود ستائی بھی ہے اور عجز و انکساری بھی۔ رزم بزم بھی ہے اور اصلاحِ اخلاق بھی۔ محاورہ بندی و روزمرہ بھی ہے اور توازن و تناسبِ الفاظ بھی''۔ (یادگارِ انیس)

مولانا ابوالکلام آزاد:

''ادبیاتِ اُردو اور زبانِ اُردو کو قعرِ گمنامی سے نکال کر انیس کے مراثی نے بین الملّی ادبی سطح پر پہنچادیا''۔

اکبرالہ آبادی:

''انیس کے کلام پر غور کرنا ذوقِ شعر فہمی، نکتہ سنجی اور زبان شناسی کا فائدہ دیتا ہے''۔

مہاراجہ سرکشن پرشاد شادؔ:

''اگر انیسؔ نہ ہوتے تو نئی شاعری کے لیے آزادؔ، حالیؔ، چکبستؔ اور کیفیؔ کو بڑے ہمّت شکن تجربے کرنے پڑتے اور شاید کامیابی نہ ہوتی''۔

چکبست:

''زبان اور شاعری کی آئندہ اصلاح و ترقی کے لیے میر انیسؔ کے اندازِ سخن اور رنگِ بیان کا صحیح اندازہ کرنا ہمارے لیے نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ جس غیر صحیح مذاقِ سخن کی بنیاد پر ہم قدیم رنگِ سخن کی قدر نہ کر سکے اس کی مدد سے ہم زبان و شاعری میں نئے جوہر نہیں پیدا کر سکتے''۔

(مضامین چکبست... صفحہ ۲۶۸)

سرعبدالقادر:

انیسؔ کی شاعری میں علاوہ صداقت و اثر کے شاعری کے دیگر لوازمات تمام و کمال پائے جاتے ہیں، تشبیہ و استعارے کے وہ بادشاہ ہیں اور کبھی تشبیہ کے معاملے میں اپنے طبقے کے دیگر شعرا کی تقلید میں صحتِ مذاق کا خون نہیں کرتے بلکہ غیر معمولی نازک خیالی وحُسنِ بیان کا ثبوت دیتے ہیں۔

(مخزن لاہور، اگست ۱۹۰۶ء)

امداد امام اثرؔ:

درحل جو ہومر کا متبع ہے اسے میر صاحب کا ہرگز ہم پایہ نہیں قرار دیا جاسکتا اور نہ اس ہم پائیگی کا

استحقاق فردوسی کو حاصل ہے۔ میر صاحب کو فردوسئ ہند کہنا بے شک میر صاحب کی ایک بڑی ناقدر ناشناسی ہے۔ میری دانست میں ہومر ایک بڑا رزمی شاعر تھا لیکن اگر ہومر سیر تھا تو میر صاحب سوا سیر تھے۔ اس فزونی کی وجہ یا یہ تھی کہ میر صاحب خود نفس قوت شاعری میں ہومر سے زیادہ تھے، یا یہ کہ میر صاحب کو (Subject) یعنی شاعری کا موضوع ایک ایسا بزرگ ہاتھ لگا ہے جس کا جواب دنیا میں نظر نہیں آتا''۔ (کاشف الحقائق)

سر تیج بہادر سپرو:

''مولانا شبلی نعمانی کی معیاری کتاب (موازنۂ انیس و دبیر) کے بعد کسی ایسے شخص کا جو ادبی نقاد ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا، اردو شاعری کے اساتذہ کی فہرست میں انیس کی صحیح جگہ متعین کرنا چھوٹا منہ اور بڑی بات کا مصداق ہوگا۔ پھر بھی میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ اس اُردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے کی تعلیم افسوسناک طریقہ پر ناقص ہوگی جس نے انیس کی اُردو کے طاہر و شفاف کنویں کا پانی نہیں پیا ہے''۔ (شاہکار انیس)

مولوی محمد یحییٰ تنہا:

رزم کا اُستاد فردوسی خیال کیا جاتا ہے اور بعض لوگ نظامی کو اس پر ترجیح دیتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ دونوں بزرگ میر انیس کے مقابلے میں لڑائی کا نقشہ ایسا عمدہ نہیں کھینچتے جیسا کہ میر صاحب کے مرثیوں میں جا بجا موجود ہے۔ پھر رزم کیا۔ بزم کیا، تلوار کیا، گھوڑا کیا، غرض جس بات اور جس واقعے کو لیا ہے اس خوبی سے اور ایسے عمدہ الفاظ میں ادا کیا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ قدرتی مناظر ایسی خوبی کے ساتھ دکھائے ہیں کہ مغربی شعرا بھی ان کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے۔''

(مرأة الشعرا...ص ۴۴۴)

سر رضا علی:

شائقین ادب کے لیے یہ امر موجب طمانیت ہے کہ زمانے نے غالب کے مرنے کے بعد وہ قدر کی جس کے وہ مستحق تھے۔ انیس کی تو اُن کی زندگی میں بھی وہ قدر تھی جس کی مثال ہمارے ملک کی شاعری میں نہیں ملتی۔ شیریں زبانی۔ بیساختگی اور قادر الکلامی کے علاوہ میر صاحب ایسے غیور

تھے جیسے قدیم یونان کے بعض نامور فلسفی۔ (اعمال نامہ، ایک اہم آپ بیتی۔ ۱۹۴۳ء)

سری رام:

میر انیسؔ مرحوم صرف مرثیہ گویوں ہی کے سرتاج نہ تھے بلکہ زبان اُردو کے ایک بڑے محترم اور مستند سرپرست فنِ سخن کے مسلم الثبوت اور قادر الکلام اُستاد تھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ میر انیسؔ صرف مرثیہ گو تھے۔ دیگر اصناف سُخن سے انہیں تعلق نہ تھا اور کسی کا یہ عامیانہ مقولہ پیش کرتے ہیں کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا گوّیا مرثیہ خواں بن جاتا ہے۔ ہمیں اس خیال سے مطلق اتفاق نہیں۔ ان کے مرثیوں اور سَلاموں کو دیکھئے کیا چیز اُن میں نہیں ہے۔ رُباعیوں کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں۔ ان کی عمدگی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ صدہا ضرب المثل کی طرح زبانوں پر چڑھی ہوئی ہیں۔ ہمارے خیال میں تو جملہ اصنافِ سخن میں سے مرثیہ گوئی ہی ایک ایسی دقیق جامع اور مشکل چیز ہے جس پر قدرت رکھنے والا تمام اصناف سخن پر قادر ہونے کا ثبوت دے سکتا ہے۔''

(خم خانۂ جاوید جلد دوم)

ڈاکٹر گراہم بیلی:

انیسؔ نے سب سے زیادہ الفاظ استعمال کئے لیکن ہمیشہ سادہ، آسان اور سلیس طرز بیان کو ترجیح دی۔ ان کا گھرانہ صحیح اور بامحاورہ اردو زبان بولنے کے لیے شہرت رکھتا ہے۔ وہ حیرت انگیز قدرت بیان کے مالک تھے۔ جذباتِ انسانی کی سچی ترجمانی، غم واندوہ کے مواقع، شجاعت والولعزمی کی مرقع کاری، مناظر قدرت کی تصویر کشی، میدانِ کارزار کا پورا نقشہ کھینچنا صرف انھیں کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ ان واقعات کو اس طرح شعر میں ادا کرتے ہیں۔ جیسے وہ خود موقعِ واردات پر موجود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے ہوں۔

جو الفاظ وہ جس کردار کی زبان سے ادا کرتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے گویا واقعی من وعن وہ اُسی کے الفاظ ہیں۔ (تاریخ ادب اُردو، ۱۹۲۹ء.....لندن)

چودھری خلیق الزّماں:

''لکھنؤ نے مرثیہ گوئی کے فن کو جو عروج دیا وہ اس کی اردو زبان کی خدمت کا سب سے نادر

سرمایہ ہے۔ میر انیس اور مرزا دبیر کی مرثیہ گوئی کو تقریباً سو برس سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے مگر آج تک اس صنفِ شاعری میں ان کا کوئی ہمسر پیدا نہ ہوا۔

میر انیس کی زبان کی سادگی، واقعہ نگاری کی شان، جذبات انسانی کا درک اور تخئیل کی بلندی انھیں کا حصہ تھی جس کو بعد کے آنے والے نشان راہ بنائے ہوئے ہیں مگر منزل آج تک ان کے ہاتھ نہ آسکی۔ محرم کے دس دنوں میں معلوم نہیں میر انیس کے کتنے مرثیے کتنی کتنی بار پڑھے جاتے ہیں۔ جن کو سن کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اگلے پہر لکھے گئے ہیں اور پچھلے پہر پڑھے جا رہے ہیں۔ لکھنؤ کا محرم جس کی شان و شکوہ ہندوستان کے ہر گوشے سے عزادار کو کھینچ لاتی تھی بہت کچھ انھیں مرثیہ گویوں کی مرہونِ منت تھی۔ (شاہراۂ پاکستان... صفحہ ۱۹۹)

ابوالعلا ناطق لکھنوی:

مرثیہ کے مجتہد مرزا دبیر و میر انیس
اِک بلاغت میں لطیف اور اک فصاحت میں نفیس

انیس کی کیا تعریف ہو سکتی ہے کہ اُردو ادب کا فرشتہ بشر کی شکل میں تھا۔ ان کا بہت سا کلام ایسے الہامات کا مجموعہ ہے جس سے رُوح متاثر ہوتی ہے، زبان و قلم اس کی شرح نہیں کر سکتے۔ واقعہ نگاری میں فردوسی، قادرالکلامی میں انوری۔ جامعیت میں سعدی، تاثیر میں حافظ، اور فصاحت و بلاغت میں اپنے اجداد سے آگے۔ دنیا بھر کے شاعروں اور نازک خیالوں میں ممتاز۔ میر انیس اپنی ادبی نزاکتوں کو محسوس کر کے کہا کرتے تھے کہ اہلِ لکھنؤ کے سوا اور کسی شہر کے لوگ میرے کلام کو تمام و کمال نہیں سمجھ سکتے۔ جذبات کی تصویر جتنی اُنھوں نے کھینچی ہے دنیا کے کسی شاعر نے اتنا کام نہیں کیا۔" (نظم اُردو)

رام بابو سکسینہ:

بحیثیت شاعر انیس کی جگہ صفِ اوّل میں ہے اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اُن کو زبانِ اُردو کے تمام شعرا سے بہترین اور کامل سمجھتے ہیں اور اُن کو ہندوستان کا شیکسپیئر اور خدائے سخن اور اُردو کا ہومر،

ورجل اور بالمیک خیال کرتے ہیں۔ (تاریخ اُدبِ اُردو)

پنڈت سندر نرائن مشرا آں:

حضرت انیسؔ مرحوم جن کے پڑھنے کی دھاک بندھی ہوئی تھی اور جن کا ایک ایک شعر نشتر کا کام کرتا تھا جس کے ایک ایک لفظ میں خونِ جگر کی چاشنی ہوتی تھی۔ (خطبات مشران)

پروفیسر حامد حسن قادریؔ:

طرز بیان کی خوبصورتی میر انیسؔ سے بہتر کسی اور شاعر میں نہیں ہے۔ انیسؔ کے مرثیوں کی کسی جلد کو اُٹھا کر کہیں سے کھول لو اور دس پانچ بند مسلسل پڑھ کر دیکھو حیران رہ جاؤ گے کہ جس بات کو بیان کرتے ہیں کس حُسن وخوبی سے کہ اس سے بڑھ کر تصوّر میں نہیں آتی۔'' (مختصر تاریخ مرثیہ گوئی)

پروفیسر محی الدین قادری زورؔ:

''دنیا کی عظیم الشان نظمیں جن کی زُبان اور خیالات نے اپنے اپنے ملک وقوم کی ذہنیت اور اخلاق وعادات کی اصلاح کی حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) ایلیڈ (۲) مہابھارت (۳) رامائن (۴) پراڈائزلاسٹ (۵) شیکسپیئر کے بعض ڈرامے (۶) شاہنامہ۔

گو اِن تمام کے مصنفین زندۂ جاوید فلسفی ممتاز شاعر اور بلند خیال معلّم اخلاق ہیں ان کے دماغوں کی ساخت میں یکسانیت نمایاں ہے اور اِن کے خیالات میں اس درجہ وسعت نظر آتی ہے کہ اِن کا کلام انسانی طاقت سے باہر نظر آتا ہے لیکن ان سب شہکاروں پر ظاہری ومعنوی دونوں حیثیتوں سے مراثئ انیسؔ کو فوقیت حاصل ہے۔''

پروفیسر حسن عسکری:

انیسؔ کی شخصیت اور ان کی شاعری ایک پیغامِ غم بھی ہے اور ایک وعدۂ سحرِ درخشاں بھی، وہ ہندوستان کا ہمیشہ باقی رہنے والا ایک قابلِ قدر ورثہ ہیں۔ (سوینیئر یوم انیسؔ ۱۹۶۳ء، حیدر آباد دکن)

ڈاکٹر جعفر حسن: (صدر شعبۂ سماجیات جامعۂ عثمانیہ)

سچ تو یہ ہے کہ انیسؔ کی واقعہ نگاری تصویر کھینچنے سے بہتر ہے کیوں کہ تصویر میں حرکت ظاہر نہیں ہوتی اور نہ ربط و تسلسل پایا جاتا ہے، ہر تصویر ایک خاص وقت یا ایک لمحہ بلکہ اس کے سویں حصے کی حالت و کیفیت ظاہر کرتی ہے۔ اس کے برعکس واقعہ نگاری میں ربط و تسلسل دونوں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ انیسؔ کے واقعہ نگاری سے متعلق ہر بند واقعیت کی متعدد تصویریں پیش کرتا ہے، مانو آنکھوں کے سامنے ہی واقعہ ہو رہا ہے۔ (سوینیر یومِ انیسؔ ۱۹۶۳ء حیدرآباد دکن)

پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیبؔ:

''اخلاقی شاعری کے اعتبار سے انیسؔ کا پایہ بہت بلند ہے۔ ان کے تمام کلام میں بلند اخلاقی کی لہر دوڑی ہوئی ہے۔ جن اخلاقِ فاضلہ کی تعلیم انیسؔ کے مرثیوں سے ہوتی ہے وہ اخلاق و نصائح کی کسی کتاب یا وعظ و پند کے ذریعہ سے ممکن نہیں۔ نفسِ انسانی کی انتہائی شرافت کے نقشے جن مؤثر پیرائیوں میں کھینچتے ہیں ان کا جواب ممکن نہیں اور ان کو انتہائی رذالت کی تصویر کے مقابلے میں رکھ کر ان کے اثر کو اور بھی قوی کر دیا ہے۔'' (روحِ انیس)

جوشؔ ملیح آبادی:

''اے انیسؔ تیری شاعری کی مہکتی اور گھنی چھاؤں میں اس قدر معنی و بیان کے شہر آباد ہیں کہ جب انہیں گنا جاتا ہے تو اعداد کی سانسیں رُک جاتی ہیں، تیرے پروازِ تخیل کے رو میں سلیمان کا تخت ہوا کے دوش پر چکرانے لگتا ہے، تیری زبان کی روانی کے سامنے دجلہ و نیل کی موجوں میں زنجیر پڑ جاتی ہے، تیرے قلم کے سامنے تلوار تھرتھرانے لگتی ہے اور تیرے سلمائے سخن کے مکھڑے کی چھوٹ کو دیکھ کر تڑپتی ہوئی بجلیوں کی نبضیں ڈوب جاتی ہیں'' ۔ (اقلیمِ انیسؔ)

مخمورؔ اکبرآبادی:

میر صاحب نے گھوڑے کی رفتار پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ لڑائی کے دوران اُس کے عمل، اس کی ہوش مندی و فراست اور اُس کی وفا کی جزئیات نگاری کی ہے۔ مگر یہ سب کچھ قیاس آرائی، مضمون

آفرینی اور نازک خیالی ہے۔

لیکن شیر کے ذکر کا انداز بالکل جداگانہ اور اس شہنشاہ صحرا کی فطرت سے بہت قریب ہے۔ شیر کے ناموں، شیر کی تشبیہوں اور شیر کے استعاروں سے میر صاحب نے بہ افراط و فیاضی اور نوع بہ نوع انداز سے کام لیا ہے، گونجنے کا ذکر ہے، ہونکنے کا ذکر ہے، ڈکارنے کا ذکر ہے، جھپٹنے کا ذکر ہے، بپھرنے کا ذکر ہے، چھلانگ کا ذکر ہے۔ ہمہمے کا ذکر ہے، دَب کر نکل جانے کا ذکر ہے۔

صحرا سے دَب کے شیر نیستاں نکل گئے
بیٹھا ہے شیر پنجوں کو ٹیکے ترائی میں

(روحِ انیس، ص ۱۵۴)

ان تنوعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ماہر علم حیوانات (زولوجسٹ) کی طرح شیر کے عادات و خصائل کا مطالعہ کیا ہے۔

مرزا جعفر علی خاں اثرؔ:

مُردہ دلوں اور ادبی لطافتوں سے لطف اندوز ہونے کا بہرہ نہ رکھنے والوں کا ذکر نہیں۔ میں نے غیر مذہب کے پڑھے لکھے لوگوں کو دیکھا ہے کہ انیسؔ کی نوشتہ رزم و بزم کو پڑھ پڑھ کر جھومے ہیں اور مصائب کے بیان پر آبدیدہ ہو گئے ہیں۔ کیا یہ ممکن تھا کہ اگر انیس کے قلم نے حقائق میں رعنائی و رنگینی و دل گدازی نہ بھری ہوتی اور حقیقت عروسِ نو کی طرح بجی سجائی (نہ کہ اپنے جامۂ اصلی میں) گل فروش نظارہ نہ ہوتی اور روح کی گہرائیوں میں تلاطم برپا نہ کرتی۔ جمالیاتی احساس کو بیدار نہ کرتی۔ ابھی ایسے لوگ موجود ہیں جنھوں نے پنڈت بشن نرائن درؔ اور پنڈت برج نرائن چکبستؔ آنجہانیاں کو دیکھا ہے۔ وہ میرے قول کی تصدیق کریں گے کہ انہیں انیسؔ کے کلام سے کیا عشق تھا۔ چکبستؔ کی شاعری میں تو انیسؔ کی شاعری کے مطالعے کو بہت کچھ دخل تھا۔

(انیسؔ کی مرثیہ نگاری اور اُن پر چند اعتراضات کا جواب)

علی عباس حسینی:

مرثیے مجالس عزا میں پڑھنے کے لیے لکھے گئے، مجالس عزا عشرۂ محرم میں۔ ان رات ہوتی ہیں اور

لکھنؤ میں اب بھی ہوتی ہیں۔ سامعین ان میں سے اکثر مجلسوں میں شریک ہوتے ہیں اور انیس و دبیر جیسے صاحبانِ کمال کو کم سے کم دس مجلسیں ضرور پڑھنا پڑتی تھیں اور مجلس کی کامیابی و ناکامی کا انحصار گریہ و بکا کی زیادتی و کمی پر ہوتا تھا۔ اس لیے وہ مجبور تھے کہ ہر مرثیہ کے ختم پر بینیہ اشعار ضرور لکھیں۔ (تذکرہ اُردو مرثیہ)

پروفیسر احتشام حسین:

''میر انیس کی شاعری کا وہ پہلو جس میں دنیا کے بہت کم شاعر اُن کے مدِ مقابل قرار دیئے جاسکتے ہیں وہ ان کی انسانی نفسیات سے واقفیت اور اسی کی مصوری ہے۔ اس میں محاکاتی شاعری، جذبات نگاری، اجتماعی مواقع کی ہل چل اور ان کی مرقع کشی اور انفرادی کشمکش کے منظر اور اس کی مصوری تمام چیزیں شامل ہیں۔ انہیں جگہوں پر اُن کے کمالِ فن کا مظاہرہ ہوتا ہے۔''
(عالمی ادب اور میر انیس)

ڈاکٹر مسیح الزّماں

انیس کا شمار اُردو کے اُن عظیم شعرا میں ہے جن کے احسان سے اُردو شاعری کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتی۔ (ادبی زینے)

اختر علی تلہری:

''انیس کے کرداروں کی تصویروں کے خط و خال بہت زیادہ ہندوستانی ہیں اور یقیناً ایک مؤرخ تاریخی نقطۂ نظر سے کرداروں کے خط و خال کی اس واضح ہندوستانیت پر اعتراض کرسکتا ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ ان مرثیوں کی تحریر سے انیس کا مقصد کسی تاریخ کی کتاب کا مرتب کرنا نہیں تھا کسی ''غیر شعوری بہاؤ'' کے نتیجے کی بنا پر نہیں بلکہ شعوری فیصلے کی بنا پر انیس ان شخصیتوں کو جو انہیں سب سے زیادہ محبوب تھیں اپنے ہندوستانی رنگ میں پیش کرنا چاہتے تھے۔ ایسی حالت میں اگر ''فرات میں گومتی کا پانی بہتا ہوا دکھائی دے'' تو محلِ تعجب نہیں ہے۔ البتہ گزارش یہ ہے کہ ان کے اس طرزِ عمل سے ان کی شاعرانہ حیثیت کی آب و تاب میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جو مقصد انہوں

نے اپنے سامنے رکھا تھا اس کی معجزانہ ترجمانی پُر کیف خوشگواری اور نشست الفاظ کی پُر ترنم موزونیت کے ساتھ ساتھ پیش نظر رکھتے ہوئے نہایت حُسن سے کی، نہایت خوبصورتی سے کی اور یہی چیز انہیں شاعری کے اس درجے پر پہنچا دیتی ہے۔ جہاں کمال سر بسجود اور جہاں اعجاز سر بگریباں دکھائی دیتا ہے۔ سچ ہے۔

کسی نے تری طرح سے اے انیسؔ
عروسِ سخن کو سنوارا نہیں

ناؔدم سیتاپوری:

میر انیسؔ نے ''اردو مرثیہ'' میں انسانی نفسیات کو اس طرح سمویا ہے کہ پتھر سے پتھر دل انسان بھی کربلا کے اندوہناک المیہ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کربلا کا المیہ مذہب وعقیدت سے ہٹ کر بھی انسانی کردار و اخلاق کا ایک ایسا سانحہ ہے جس کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ میر انیسؔ نے اس خون آشام ٹریجڈی کو جذبات نگاری کا جو روپ دیا ہے وہ اردو شعر وادب کے انمٹ نقوش ہیں جنہیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ (میر انیسؔ مطبوعہ فیروز اینڈ سنز)

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی:

میر ببر علی انیسؔ ہمارے ادب کے وہ عظیم شاعر ہیں جن کا شمار دنیا کے چند بہترین شعرا میں کیا جا سکتا ہے۔ وہ تمام خصوصیات جو شاعری سے مخصوص کی جاتی ہیں ان کے کلام میں کمالِ عروج پر نظر آتی ہیں۔ (نوائے انیسؔ)

ہاشؔم رضا:

''اگر کوئی مجھ سے کہے کہ تم کو چاند پر جانا ہے لیکن اس زمین سے صرف تین چیزیں ہی اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو تو میں جن تین چیزوں کا انتخاب کروں گا اُن میں:۔

اوّل.............. قرآن پاک

دوم.............. دیوانِ غالب، اُردو

علی سردار جعفری:

''میرے بچپن میں جن آوازوں نے میرے ذوق کی تربیت کی ہے ان میں سب سے زیادہ اہم انیس کی آواز ہے، انیس کے مرثیے محرم کی مجلسوں میں پڑھے جاتے تھے اور مجلسوں سے الگ بھی ان کا مطالعہ جاری رہتا تھا، بچپن کے کھیلوں میں بیت بازی بھی شامل تھی اور اس میں اساتذہ کی غزلوں کے علاوہ انیس کے مرثیوں کے اشعار بھی استعمال ہوتے تھے''۔

وحید الحسن ہاشمی:

''اردو شاعری میں غزل تو ابجد کا رُتبہ رکھتی ہے اور مرثیہ معراج کلام ہے کیونکہ مرثیوں میں تغزل کی پوری روح کارفرما ہوتی ہے لیکن غزل میں مرثیے کی جزئیات نگاری، نفسیاتی ژرف بینی اور گمبھیرتا کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ میرے اس دعوے کے ثبوت میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اگر انیس مرثیہ نگار نہ ہوتے تو بہترین غزل گو ہوتے لیکن غالب اگر غزل گو نہ ہوتے تو مرثیہ نگار نہیں بن سکتے تھے۔'' (عظمت انساں، مرثیہ)

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی:

شبلی، حالی، سکینہ نے لکھا ہے کہ جدید اُردو داں طبقے میں پرانی شاعری کی اگر کوئی چیز مقبول ہے تو وہ میر انیس کی مرثیہ نگاری ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ سادگی، اصلیت اور جوش بقول حالی ایک اچھے شاعر کی صفات ہیں، ان کے کلام میں بکثرت موجود ہیں۔ (لکھنؤ کا دبستانِ شاعری)

ڈاکٹر سید فدا حسین: (پی ایچ ڈی، ڈی لٹ)

فردوسی کے مقابلے میں انیس کے یہاں تنوع زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ مرثیے کا خاکہ چھوٹا ہونے کی وجہ سے انیس کو بعض واقعات حالات اور کیفیات کا بار بار اعادہ کرنا پڑا اور ہر جگہ انھیں تکرار سے بچانے کے لیے نیا انداز و طرز بیان اختیار کرنا پڑا ہے۔

فردوسی کو اس کے مواقع بمقابل کم ملے ہیں اس تنوع کی وجہ سے یہ احساس ہوتا ہے کہ میر انیس

بعض حیثیتوں سے زیادہ قادرالکلام معلوم ہوتے ہیں۔ (انیسؔ اور فردوسیؔ کا تقابلی مطالعہ)

فیض احمد فیضؔ:

مرثیہ نویسوں کا کلام اس لئے قابلِ قدر ہے کہ اُنہوں نے اُمراء سے ہٹ کر دوبارہ عوام کی طرف رُجوع کیا۔ اُنہیں دنیوی حالات کا احساس تھا اور اُنہیں سے برگشتگی نے اُنہیں مذہبی مضامین کی جانب راغب کیا۔ انیسؔ لکھتے ہیں:

ناقدریٔ عالم کی شکایت نہیں مولا
کچھ دفترِ باطل کی حقیقت نہیں مولا
باہم گل و بلبل میں محبت نہیں مولا
میں کیا ہوں کسی رُوح کو راحت نہیں مولا

عالم ہے مکدّر کوئی دِل صاف نہیں ہے
اس عہد میں سب کچھ ہے پہ انصاف نہیں ہے

''واقعات کی یکسانیت کو دلچسپ بنانے کا دُوسرا طریقہ تھا خوبصورت الفاظ، دلکش اور تازہ الفاظ کا استعمال اور الفاظ کے فن میں اُردو شاعری ابھی تک انیس کا جواب پیدا نہیں کر سکی'' (میزان صفحہ ۱۲۹)

پروفیسر کرار حسین:

''میر انیسؔ اور دبیرؔ کے توسط سے جس مرثیے کو ہم جانتے ہیں وہ خاص ہماری تہذیب کی علامت اور ہماری سرزمین کی پیداوار ہے''۔

راجندر ناتھ شیداؔ:

انیسؔ کی شاعری جس میں ہندوستانیت کی آمیزش ہے آج کے قاری کو بھی کیوں مسحور کر لیتی ہے۔ اس کی وجہ وہی ہے جو اس نوع کی دوسری عالم گیر شہرت کی مالک نظموں کی ہے جن میں محیرّ العقول اور فوق الفطرت عناصر ہونے کے باوجود انھیں آج کا قاری بھی شاہکار سمجھنے پر مجبور ہے۔ (ادب فکر اور سماج)

انتظار حسین:

کربلا انسانی روح کی جدو جہد کا ایک جاوداں استعارہ ہے۔ جس عہد میں بھی ظلم کی صورت حال پیدا ہوئی، انسانی روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔ اس کا مؤثر اور بامعنی اظہار اس استعارے کے ذریعہ ممکن ہوتا ہے اور لکھنؤ کے محاذ پر جو لوگ انگریز کے خلاف صف آرا تھے، ان کے شعور میں یہ استعارہ رچا بسا تھا مگر یہ کام صرف انیسؔ کو کرنا تھا۔ انہوں نے لکھنؤ کی اس صورتِ حال میں اس استعارے کی کارفرمائی کو شناخت کیا۔ (پیامِ عمل انیسؔ نمبر)

ڈاکٹر سلام سندیلوی:

میر انیسؔ کی منظر نگاری بہت حسین ہے۔ اس کے دو اسباب ہیں اول تو میر انیسؔ کے اشعار میں بے حد سلاست اور روانی پائی جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے دریا کی موجیں اپنے دامن میں ساز و بربط لیے ہوئے ایک ساحرانہ ترنم کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہیں۔ دوسرے میر انیسؔ نے منظر نگاری میں نہایت دلکش تشبیہات کا استعمال کیا ہے، اس وجہ سے ان کی منظر نگاری کا حسن بڑھ گیا ہے۔ (اردو شاعری میں منظر نگاری)

رشید حسن خاں:

انیسؔ نے جذبات کی سچائی، زبان کی سادگی اور بیان کی سلاست کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اُن کی عظمت کے لیے یہ دلیل کافی ہے کہ انھوں نے اُس عہد میں اس انداز و روش کے ساتھ اور اس کے باوجود، قبول عام کی عزت حاصل کی، اُس لکھنؤ میں، اس رنگ دہلی کی نمود، اُن کا کارنامہ ہے۔
(انتخاب مراثی انیسؔ و دبیرؔ)

صالحہ عابد حسین:

اور انیسؔ جیسے قادر الکلام شاعر کے کلام کا نمونہ دیکھئے۔ جو بظاہر شہدائے کربلا کا مرثیہ کہتا ہے لیکن اس محدود صنف میں کیا کیا جوہر نہیں دکھاتا اس کی شاعری میں حقیقت نگاری، منظر نگاری، سیرت نگاری اور ساتھ ہی جذبات کی عکاسی احساسات کی نزاکت کیا نہیں آجاتا۔ صبح کا سماں دکھاتا ہے تو ہو بہو نقشہ کھینچ دیتا ہے۔

اس کا نام جب تک اُردو زبان باقی ہے۔ تابندہ رہے گا اور شاعری کی پہلی صف میں سب سے اُونچی جگہ اس کو حاصل ہوگی۔" "ادبی جھلکیاں (اُردو شاعری پر ایک نظر)

ڈاکٹر عالیہ اِمام:

انیسؔ حقیقی معنوں میں ماہرِ نفسیات ہے، اس نے زندگی کو قریب سے دیکھا ہے۔ انسانی دل کی دھڑکنوں کو محسوس کیا ہے۔ زندگی کے مسائل میں ڈوب کر حقائقِ انسانی کا پتہ لگایا ہے۔ انسانی حِس کو ناپا ہے غرض کہ انیسؔ کی شاعری کیا ہے اور کیا نہیں، یہ صرف آپ کو انیسؔ ہی بتا سکتا ہے:

ہے سہل ممتنع یہ کلام ادق مرا
برسوں پڑھے تو یاد نہ ہووے سبق مرا

قرۃ العین حیدر:

انسانی رِشتے بڑے نازک، بڑی گنجلک بنیاد پر قائم ہیں، برابر یہ رشتے ٹوٹتے بھی رہتے ہیں۔ اِسی لئے میر انیس نے کہا تھا:

"خیال خاطر احباب چاہئے ہر دم"

(آگ کا دریا)

رئیس اَمروہوی:

جس طرح حسینؑ فقط مسلمانوں کے حسینؑ نہیں بلکہ انسان کی اگلی پچھلی موجودہ اور تمام آنے والی نسلوں کے ہیرو ہیں۔ اسی طرح انیسؔ بھی کسی ایک عہد اور کسی ایک طرز کا شاعر نہیں بلکہ وہ اپنی شاعرانہ شخصیت میں عالمی اُدب کے بہترین جواہر پاروں کو اور انسان کی شاعرانہ جبات کی اعلیٰ ترین خصوصیت کو سمیٹے ہوئے ہے۔" (انتخاب میر انیس)

عالم حسین ایم۔اے:

دنیا کے اکثر اہلِ علم اور اُردو کے تقریباً ہر ادیب نے میر انیسؔ کے کمالِ فن کے متعلق اتنے زریں اقوال اور بیش بہا مضامین کا ذخیرہ جمع کر دیا ہے جو بجائے خود اُردو زبان کے لئے سرمایہ افتخار ہے۔" ("رباعیات انیسؔ"... نظامی پریس لکھنؤ)

امیر امام حُر:

انیسؔ اور غالبؔ کا دَور ایک نہایت ہنگامی دَور تھا۔ اِن دونوں شاعروں نے اپنے عہد کی سماجی خرابیوں کو ایک حساس شاعرانہ مزاج سے محسوس کیا اور اپنے اپنے منفرد رنگ میں اپنے مشاہدات کے تاثرات کو پیش کیا۔ غالبؔ کی شاعرانہ گہرائی اور انیسؔ کے نفسیاتی اخلاقی اور حماسی مضامین ان کے عہد کے اِجتماعی حالات کا ردِ عمل بھی نظر آتا ہے۔ اجانب کے تسلّط اور بڑھتے ہوئے اقتدار کو دیکھ کر انیسؔ کو اپنی ثقافتی تاریخ میں جو واقعہ غیرت دِلانے اور ہمت بڑھانے کے لئے نظر آیا تو وہ کربلا کا عظیم الشان اور جلیل القدر معرکہ تھا۔ اس میں انیسؔ کو اخلاقیات، نفسیات، خود داری، شُجاعت اور صبر و حریت کے جوہر نظر آئے۔ جنہیں اس باکمال شاعر نے سلکِ نظم میں پرو کر اُردو ادب میں ایک غیر فانی اور گراں مایہ اضافہ کر دیا۔ (صنفِ مسدّس پر ایک نظر)

عابد علی عابد:

''انیسؔ کا کام فقط یہی نہیں کہ ہمیں اپنی طبع حسّاس کی نزاکتوں سے کام لے کر آہ و بُکا پر آمدہ کرے بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنے اظہار کو شعری ابلاغ کی حسین ترین صورت دے اور فطری مناظر کی تصویر کشی اتنی کم ہے کہ کلامِ انیسؔ سے ایسے بندوں کا انتخاب نہ کرنا انیسؔ پر اور اُردو شاعری پر ظلم ہے۔ انیسؔ اس معاملے میں اُردو شعر کی آبرو ہیں۔ اُنہوں نے ایسی نزاکت و نفاست سے مناظر کی تصویریں کھینچی ہیں کہ مصور کا مؤقلم اِن کے آگے سر بسجدہ ہے۔'' (مقدمہ موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ)

نثار احمد فاروقی:

میر انیسؔ اردو کے نہایت ممتاز شعرا میں شامل ہیں۔ ان کا سرمایہ مرثیے ہیں مگر ان مرثیوں کی صرف مذہبی اہمیت نہیں بلکہ انیسؔ و دبیرؔ اور اُن کے اسلاف و اخلاف کی بدولت مرثیہ اصناف ادب میں شامل ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم: (صدر انجمن ترقی اردو ہند، دہلی)

حضرت امام حسینؑ کا عشق انیسؔ کی سب سے بڑی طاقت ہے، اسی طاقت نے انھیں سب سے

بڑا مرثیہ گو بنایا۔ (انیسؔ شناسی)

مرزا محمد جعفر:

''قناعت غُربت و اِفلاس میں بھی با عزت اِنسان کے بلند مقام اور اُس کے وقار کو قائم رکھنے والی ایک شے ہے۔ قناعت کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ انسان ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ رہے بلکہ بقولِ شاعرِ اعظم میر ببر علی انیسؔ:

سدا ہے فکرِ ترقّی بلند بینوں کو

کاہلی و سستی تو جسمِ انسانیت کے ناسور ہیں۔ جس طرح جہل و ظلم بڑے گھناؤنے اور مہلک امراض ہیں۔'' (ثقلین)

اسد اریبؔ:

''انیسؔ نے ایک فلسفی کے مانند سُوچا یا کچھ کہا ہے۔ نفرت و محبت کے وجود سے بحث کی ہے۔ قید خانوں میں ناکردہ گناہوں کی سزا کاٹنے والوں کی کیفیت لکھی ہے۔'' (نقدِ انیسؔ)

وقار عظیم:

سوداؔ نے گرمی کے موسم کا جو حال بیان کیا ہے۔ اس میں سچائی پر مبالغہ کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ انیسؔ نے البتہ اس موسم کا حال اس طرح بیان کیا ہے کہ اس کی چھوٹی چھوٹی جزئیات بھی ہماری نظر کے سامنے آجاتی ہیں۔

گرمی کی سحر اور وہ پھولوں کا مہکنا
مرغانِ چمن کا وہ درختوں پہ چہکنا

آب رواں سے منہ نہ اُٹھاتے تھے جانور
جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر ادھر اُدھر

وہ گرم ہوا اور وہ آندھی کے بگولے
اُٹھے جو ترائی سے تو دم شیر کا پھولے

(نئے زاویے.... مرتبہ: کرشن چندر)

شان الحق حقی:

دنیا میں بعض عظیم برگزیدہ موضوعات پر بڑے ایپک لکھے گئے ہیں جیسے ہبوط آدم پر ملٹن کی Paradies Lost، یا مہابھارت، یا فردوسی کا شاہنامہ، ٹینی سن کی نظم آرتھر کی موت جو وکٹوریا کے عہد کا آدمی، انیسؔ کا معاصر تھا۔ میں انیسؔ کے مراثی کو کلاسیکی ادب کے اسی زمرے میں شمار کرتا ہوں۔ مرثیہ اردو ادب کی آبرو ہے، انیسؔ کی ذات مرثیے کی آبرو۔ ان کے گونا گوں محاسن اور دلچسپ معنوی ولغوی پہلوؤں پر ابھی بہت سا کام کیا جاسکتا ہے، میں نے اپنے مقالے ''انیسؔ کی ڈرامانگاری'' میں ان کے مرثیوں کے ڈرامائی پہلوؤں پر بحث کی تھی۔ اب میں ان کے استعارات کے تجزیے کا ارادہ رکھتا ہوں جس کی ابتدا اس مقالے سے ہو رہی ہے۔

عمر فیضی:

''میر انیسؔ کی شاعرانہ عظمت مسلّم ہے۔ اُنہوں نے شاعری کی کل کائنات کو مرثیہ میں سمو کر اس صنف کو زندۂ جاوید کر دیا۔ دُنیائے اَدب میں اس مرثیہ کی مثال نہیں ملتی جو میر انیسؔ نے تخلیق کیا۔ غالب نے کہا تھا۔

بقدرِ شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے

مرثیہ کا میدان غزل سے بھی زیادہ تنگ تھا مگر میر انیسؔ کے شاعرانہ کمال کی داد دیجئے کہ انہوں نے اس میں ایسی وسعت پیدا کی کہ مرثیہ میں وہ سب کچھ سما گیا جو اُردو کی تمام اَصناف میں تھا بلکہ وہ بھی جو کسی صنف میں نہیں تھا۔ میر انیس کے مرثیہ میں وہ سب کچھ ہے جو عظیم شاعری کے لئے ضروری ہے۔ (رباعیات انیسؔ طبع لاہور)

شارِب رَدولوی

انیسؔ کا یہ عظیم کارنامہ ہے اور اُن کے کردار نگاری کا یہ کمال ہے کہ وہ تقریباً بنے بنائے اور تاریخی کرداروں کو زندہ اور متحرک بنا کر پیش کرتے ہیں۔ میر انیسؔ نے جس طرح مراثی میں کردار پیش

کئے ہیں ان میں یہ بڑی خصوصیت ہے کہ سامع اس بات کو محسوس کرتا ہے کہ یہ شخص اس کے قریب کا کوئی آدمی ہے۔ میر انیسؔ کردار کو زندگی کے تقاضوں سے اس قدر ہم آہنگ کر دیتے ہیں کہ ان کے مثالی یا تاریخی ہونے کا شبہ تک نہیں ہوتا۔ وہ پوری حد تک مرثیہ کے کردار کو ڈرامے کے کردار سے ملا دیتے ہیں جو خوبیاں ایک ڈرامے کے کردار کے لیے ضروری ہیں اور جن کی تخلیق کے لیے ڈرامہ نگار بہت بڑی حد تک آزاد ہے۔ انہیں خوبیوں کے ساتھ تاریخی اور مذہبی کردار کی پابندی میں رہ کر میر انیسؔ کردار کو پیش کرتے ہیں۔ یہ اُن کے فن کا معجزہ ہے۔ (مراثیِ انیسؔ میں ڈرامائی عناصر)

ڈاکٹر کاظم علی خاں:

ہمارے خاندان اور خاندانِ انیسؔ کے درمیان یہ دوستانہ تعلقات حضرتِ نفیسؔ کی وفات ۱۹۰۱ء کے بعد بھی جاری رہے۔ مجھے یہ لکھتے ہوئے فخر محسوس ہوتا ہے کہ میرے والد مرحوم جناب نواب مرزا محمد ذکی علی خاں صاحب نے حضرتِ نفیسؔ کے صاحبزادے اور خدائے سخن میر انیسؔ کے حقیقی پوتے جناب دولھا صاحب عروجؔ سے مرثیہ خوانی سیکھی تھی اور اسی طرز کو ارادی یا غیر ارادی طور پر مرثیہ خوانی میں راقم بھی اپنائے ہوئے ہے۔ یہ لکھتے ہوئے بھی میں فخر محسوس کرتا ہوں کہ میر نفیسؔ کے صاحبزادے جناب دولھا صاحب عروجؔ مرحوم نے ایک عرصہ تک ہمارے خاندانی مکان (واقع کٹرہ ابوتراب خاں لکھنؤ) میں قیام و سکونت فرمائی تھی۔ (انتخاب مراثی میر نفیسؔ)

مجتبیٰ حسین

اُدب اگر کسی مذہبی عقیدے کو قبول بھی کرتا ہے تو روشِ عام سے ہٹ کر وہ اسے عام انسانوں کی زندگی اور اس کے مطالبات کے ذریعے تلاش کرتا اور پرکھتا ہے تب جا کر اسے قبول کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب سے متاثر ہونے والا ادب مذہبی ادب کبھی نہیں بن سکا۔ وہ بہر صورت ادب رہا ہے۔ انیسؔ کے مرثیے اس کا ثبوت ہیں، مذہب اور عقیدے پر ان کے مرثیوں کی اساس ہے۔ لیکن وہ مذہبی اَدب نہیں بن سکے۔ ان میں انیسؔ نے ایسے واقعات بھی داخل کئے ہیں جن کا کربلا کی تاریخ میں کہیں پتہ نہیں۔ بعض واقعات تو اُنہوں نے خود ایجاد کئے ہیں۔ انیسؔ کے مرثیوں میں جس معاشرت کا نقشہ ہے وہ غالباً کیا یقیناً وہ نہیں ہے جو عرب کی تھی لیکن اس کی وجہ سے ان پر

مذہب سے انحراف کا الزام نہیں لگایا جاسکتا۔ اِس انیسؔ میں جو مذہبی تھا اور اس انیسؔ میں جو شاعر تھا ایک سمجھوتا ہو چکا تھا کہ ہم تمہارے مذہب میں دخل نہ دیں گے، تم ہماری شاعری میں دخل نہ دو۔ کربلا کی تاریخ تمہارے بھی پیشِ نظر ہے اور ہمارے پیشِ نظر بھی ہے مگر تم اس تاریخ کو صرف ایک مسلمان یا زیادہ سے زیادہ ایک محقق کی نظر سے دیکھتے ہو۔ ہم اسے ایک شاعر کی نظر سے دیکھتے ہیں جو ایثار اور قربانی کو عام اِنسانوں کی ملکیت سمجھتا ہے اور جو تاریخ کو جامد اور ساکن نہیں، زندہ اور متحرک سمجھتا ہے تمہارے لئے کربلا صرف عرب کا واقعہ ہے۔ ہمارے لئے ساری دُنیا کا۔

اس سمجھوتے نے انیسؔ کے مرثیے کو فن کی عظمت اور زندگی کی برکت دی۔ ورنہ شاعری اگر صرف مذہبی ہو کر رہ جائے تو وہ زیادہ سے زیادہ ''مولود شریف'' ہو کر رہ سکتی ہے اور کچھ نہیں۔ لوگوں نے بڑی عقیدت مندی کے ساتھ قرآنِ مجید کا منظوم ترجمہ کیا ہے مگر اسے شاعری کہنا بہت بڑی جسارت ہوگی۔ (مذہب اور ادب)

شاہد احمد دہلوی:

انیسؔ کے کلام میں فنی خوبیوں کے علاوہ اثر آفرینی بدرجۂ اُتم موجود ہے۔ جو سنتا ہے سر دُھنتا ہے اور ہمیشہ یاد رکھتا ہے۔ مجالسِ عزا میں سوز خواں زیادہ تر اُن ہی کا کلام پڑھتے ہیں اور سامعین سے داد لیتے ہیں۔ انیسؔ کو مناظرِ قدرت میں بڑا کمال حاصل تھا۔ پوری نفسیات نگاہوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ مناظرِ عکاسی سے بھی زیادہ واقعہ نگاری میں انہیں یدطولیٰ حاصل تھا اور سچ پوچھو تو اسی نے اُنہیں مقبولِ عام بنوایا تھا'' (اُردو نظم پر تنقیدی نظر)

کلیم الدین احمد

انیسؔ کی زبان صاف اور دلکش ہے اس کی سلاست، اس کی فصاحت و بلاغت مثل روزِ روشن ہے۔ برش ذوالفقار کی سی ہے۔ اثر میں تیر و نشتر سے کم نہیں۔ تنوّع بھی بہت کم ہے۔ کبھی سخت و درشت ہو جاتی ہے تو کہیں نرم و ملائم، کبھی نالہ ہے اور کبھی پُر جوش آہنگ، مختلف اشخاص کی گفتگو کا الگ الگ رنگ ہے۔ لب و لہجہ کا فرق، آواز کی بلند آہنگی و آہستہ روی، سمندر کی سی طغیانی اور سکون

سب ہی کچھ تو موجود ہے۔ اس میں شیرینی بھی ہے اور موسیقیت بھی اور شگفتگی وشادابی بھی۔''

(انیس اور دبیر)

ڈاکٹر اعجاز حسین: (ایم اے ڈی لٹ)

انیس کے فن کردار نگاری کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ جذبات برانگیختہ کرنے کے لئے الفاظ کو بہترین موقع سے صرف کرنے کے علاوہ نفسیات کو متحرک کرنے والے اشارات [illegible] انداز گفتگو حسن فن کارانہ حیثیت سے میر انیس کام میں لاتے ہیں اس کی مثال [illegible] شاعری میں اب تک نہیں ملتی۔ (مذہب وشاعری)

پروفیسر محمد طاہر فاروقی: (صدر شعبہ اُردو، پشاور یونیورسٹی)

انیس نے اتنے کثیر اور ایسے طویل مرثیے لکھے اور مختلف مضامین [illegible] مطالب بیان کئے گئے کہ ان سے زبان کا دائرہ غیر معمولی طور پر وسیع ہو گیا اور شاعرانہ حسنِ بیان اور طرز ادا کے [illegible] کھل گئے اور اس معاملے میں یقیناً مرثیے نے غزل اور مثنوی سے کچھ کم خدمت انجام نہیں دی۔ اسی طرح محاورات اور الفاظ نے انیس کے ہاتھوں نئی زندگی اور تابناک رُوپ پایا۔ سادہ، عام فہم اور سلیس زبان استعمال کر کے انیس نے فطری شاعری کا ایک معیار قائم کیا۔''

(انتخاب مراثی انیس ودبیر)

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی:

انیس کے کلام پر اعتراضات بھی کئے گئے ہیں لیکن اس سے ان کے کمالات پر حرف نہیں آتا۔ مرثیہ کے ساتھ ساتھ انھوں نے اردو زبان کی جو خدمت کی ہے اور اس کو جو جامعیت و وسعت، فصاحت و سلاست، دلکشی و رعنائی، گہرائی و گیرائی عطا کی ہے اس سے وہ زندہ جاوید ہو گئے۔ بحیثیت مجموعی اردو شاعری میں انیس کا مرتبہ بہت بلند ہے، وہ صرف ایک مرثیہ گو شاعر ہی نہیں، بلکہ ان کو رزمیہ، بزمیہ، المیہ اور کسی حد تک طربیہ شاعری پر پورا پورا عبور ہے۔ فنی اعتبار سے ان کا کلام بے مثل اور جامع کمالات وصفات ہے جس میں ہر قسم کے انسانی جذبات کی ترجمانی پائی جاتی ہے۔

(تعارف مرثیہ)

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ:

زبان، ادب اور تاریخ کو کھنگال کر انیس ایسی چیزیں پیش کرتے ہیں، جن سے قوم کا کردار بنتا ہے، رزمیہ روایات تازہ ہوتی ہیں، بہترین انسانی جذبات بیدار ہوتے ہیں اور فرض کا احساس جلا پاتا ہے۔ یہی انیس کی عظیم شاعری کی سماجی افادیت ہے۔ (سوئنیر یوم انیس ۱۹۶۳ء)

ڈاکٹر گیان چند جین:

جدید شاعر کی افراتفری اور بے شمار آزادیوں سے ہٹ کر جب ہم انیس کے مرصع کلام کی جانب آتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک تاج محل، ایک اہرام مصر کے سائے میں کھڑے ہیں۔ اُن کے کلام میں ایک عظمت ہے ایک خود اعتمادی ہے۔

شعر کے لیے نہ محض جذبہ کافی ہے نہ محض فکر اُسے فن کی تہذیب و ترتیب کی بھی ضرورت ہے۔ انیس وہ فنکار ہے جس کے کلام میں لکھنؤ کا ستھرا ادبی مذاق پوری رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ آج کے شعرا کلام انیس کی گاہے گاہے بازخوانی کرتے رہیں تو بہت سے بے راہ رویوں سے محفوظ رہیں گے۔ (سوئنیر یوم میر انیس... ۱۹۶۳ء، حیدرآباد دکن)

احمد ہمدانی:

ہم یہ بات وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ میر انیس ایک سچے اور کھرے آدمی، ایک مکمل شاعر اور منفرد فکر کے مالک تھے۔ جسے نہ صرف اردو ادب بلکہ دنیائے ادب میں بھی ہمیشہ احترام کے ساتھ یاد کیا جائے گا۔

ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی: (صدر شعبۂ اُردو، مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ)

انیس نے حسی صورت گری کے اپنے اس فن میں بشری تقاضوں اور انسانی نفسیات کا جو پاس اور لحاظ رکھا ہے اس کا غالب عنصر ان کے پیکر تراشی کے پورے نظام سے وابستہ ہے۔ اس لیے اگر محولہ بالا معروضات کی روشنی میں میر انیس کو انسانی جذبات و احساسات کا ایسا عارف قرار دیا جائے جس کی فنی قدریں بھی بشری اور ارضی سرچشموں سے قوت نمو حاصل کرتی ہیں تو کوئی غلط بات نہ

ہوگی۔ یہی انیسؔ کی شاعرانہ حُسن کاری کا راز بھی ہے اور تہذیبی حوالوں کا جواز بھی۔

ڈاکٹر سیّد عبداللہ:

انیسؔ نے زخموں کا یہ گلستان لگایا ہے مگر اس کو ''خون کی ہولی'' نہیں بنایا۔ اسے سلیقہ مند مہذب آدمی کے لیے گوارا بھی بنایا ہے۔ اس میں صنعت بھی لائے ہیں، لب ولہجہ بھی ہے، متانت بھی ہے روزمرہ بھی ہے، سلاست بھی ہے اور جیسا کے اوپر بیان ہوا۔ دبدبہ اور توصیف بھی ہے۔ ان ساری باتوں کے باوجود مرثیہ کے ان عناصر ترکیبی میں یہ ایک عنصر ہے:-

مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے

(ماہِ نو انیسؔ نمبر)

ڈاکٹر وزیر آغا:

میر انیسؔ کے مراثی میں صبح عاشور کے متعدد پہلوؤں کو بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک پہلو تورات اور اس کے کرداروں کی شکست وریخت سے متعلق ہے اور دوسرا شگفتن حیات کی ساری تمثیل کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ (ماہِ نو انیسؔ نمبر)

مولانا مرتضیٰ حسین فاضل:

انیسؔ کا مطالعہ زبان میں لوچ، شُستگی حُسن، جن دیانت کا سبب ہے اس سے مشاہدے کی قوت میں وسعت و گہرائی حاصل ہوتی ہے نفسیات کے نکتے اُجاگر ہوتے ہیں۔ احساسات میں توازن و جوش آتا ہے۔ اسلامی تاریخ سے ربط اور مجاہدۂ کربلا کے لیے بصیرت، عکاسی، تصویر کشی کے ماہرانہ خطوط، ثقافت اور تاریخ کے واضح مجسمے، تخئیل و شاعری کے مثالی ارتقا کو سمجھنے کے لیے مراثی انیسؔ کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ (مرثیہ، زندگی اور پیام)

علامہ جمیل مظہری:

نصاب کی کتابوں کے مرتبین نے بھی انیسؔ پر بڑا ظلم کیا ہے۔ انیسؔ کا جو کلام انتخاب کیا ہے وہ دوم بلکہ سوم درجے کے مراثی سے ماخوذ ہے اور تو اور مسلم یونیورسٹی کے ایک نصاب میں انیسؔ کا پورا

مرثیہ دیا گیا ہے:-

طے کرچکا جو منزلِ شب کاروانِ صبح

اہلِ نظر جانتے ہیں کہ یہ انیسؔ کا دوم درجے کا مرثیہ ہے جس میں انیسؔ کا کمال سخنوری نمایاں تو ہے لیکن بھرپور نمایاں نہیں ہے۔ضرورت یہ ہے کہ ایک ایسا انتخاب کلامِ انیسؔ کا مرتب کیا جائے جو مراثیٔ انیس کے المیہ، رزمیہ اور مدحیہ اجزا کی پوری نمائندگی کر سکے لیکن ایسا انتخاب اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ اہلِ ذوق کی کمیٹی باہمی مشورے سے ترتیب دے۔

مولانا کوثر نیازی:

میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا کہ کلامِ انیسؔ میں کس ثقافت کی جھلک ہے۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ یہاں جو رشتوں کا احترام ہے، جو ادب آداب ہیں، انسانی کردار کی جو اعلیٰ قدریں یہاں پائی جاتی ہیں، اپنے اور بیگانے کے ساتھ یکساں محبت و مودت کا جو انداز ہے، اس میں گفتگو کا جو طریقہ، وقت وقت کے لیے جو علیحدہ اسلوب اور قرینہ ہے، اس میں جو تہذیب نظر آتی ہے، پیار اور محبت کی بات کرنے کے لیے جو مختلف اسالیب دکھائی دیتے ہیں۔ان تمام پہلوؤں کو جب میں دیکھتا ہوں تو کہتا ہوں کہ ان دانشوروں کو آواز دینی چاہئے جو آج پاکستان کے اس معاشرے میں یہ نعرہ بلند کرتے ہیں کہ اسلامی ثقافت کوئی چیز نہیں ہے۔ایسے دانشوروں کو میرا یہ مشورہ ہے کہ دور جانے کی ضرورت نہیں۔آؤ! اسلامی ثقافت کی جھلک دیکھنا چاہتے ہو تو کلامِ انیسؔ میں دیکھو، انیسؔ اسلامی ثقافت کا آئینہ ہے۔(انیسؔ، شاعرِ انسانیت)

آلِ احمد سرور:

انیسؔ کی شاعری کی عظمت کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انیسؔ نے اپنے سلاموں اور مرثیوں میں وہ شاعری کی ہے،جس میں بقول حالی،''حیرت انگیز جلوؤں'' کی کثرت ہے،جس میں زبان پر فتح ہے،جن میں شاعر کی قادرالکلامی، جذبے کا ہر نقش نظر آتا ہے۔(انیسؔ شناسی)

ظ۔انصاری:

سچ یہ ہے کہ اردو کی فطرت، اس کے مزاج اور اس کی سمائی سے گہری آشنائی کے لیے میر انیسؔ

کے فن کا گہرا مطالعہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا الفاظ کی صحیح آوازوں کا احساس۔ اُن کے کلام نے ہمارے ذوق شعری کی تربیت کی ہے، وسعت میں بھی گہرائی میں بھی۔ (انیس شناسی)

سیّد سخی حسن:

مراثیٔ انیس سپہگری کی کتاب نصاب کا کام دیتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ کتاب نصاب میں جو خشکی ہوتی ہے وہ ان میں نہیں ہے، بلکہ ادب لطیف والی تری ہے، جسے پڑھ کر یا سن کر قاری یا سامع کا دل اُکتاہٹ محسوس نہیں کرتا۔

ڈاکٹر وحید اختر:

انیس نے اس فلسفۂ حیات کے اظہار کے لیے جو لباس تراشا وہ ہندوستانی تہذیب نے تیار کیا تھا۔ اس لباس کے اندر جو روح کارفرما ہے وہ کرداروں کی گہری مذہبیت و روحانیت کی وجہ سے اسلامی ہوتے ہوئے بھی آفاقی قدر و صداقت کی حامل ہے۔ (آج کل انیس نمبر)

علی جواد زیدی:

انیس نے جگہ جگہ خود اپنی شاعری پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ کبھی وہ موتی پرونے کی بات کرتے ہیں، کبھی اپنے شعروں کو ''شعرنو'' سے تعبیر کرتے ہیں، کبھی مضامینِ نو کے انباروں کی طرف اشارہ کرتے ہیں، کبھی پُر گوئی اور طلاقت کا دعویٰ کرتے ہیں، کبھی طبیعت کی رنگینی اور کلام کی نمکینی کی طرف توجہ دلاتے ہیں، کبھی وہ شاعری کو دلھن کی طرح سجاتے ہیں اور کبھی باغ کی روشوں کی طرح۔ مختصر یہ کہ وہ بڑی محنت، ریاضت اور خوش ذوقی سے اپنے کلام کی نوک پلک درست کرتے ہیں۔ انہیں موقع و محل کے مطابق بات کرنے کا سلیقہ خوب آتا ہے۔ وہ روایات سے انحراف کی ہمت رکھتے ہیں۔ انہوں نے مشکل زمینوں میں بھی رنگین بیانی کا مظاہرہ کیا ہے لیکن انہیں صرف قافیہ پیمائی سے نفرت ہے۔ انہیں اس کا احساس ہے کہ کس زمین میں شگفتگی کی کتنی صلاحیت اور نظم کے لیے کتنی وسعت ہے۔

غبار یاور:

انیسؔ فصاحت و بلاغت، روزمرہ، محاورہ، صنائع و بدائع، حسن تعلیل اور تلمیحات کے بادشاہ تسلیم کئے جاتے ہیں۔ مرثیہ کی طرح ان کی رباعیات میں بھی یہ اوصاف بدرجۂ اُتم موجود ہیں۔
(طلوعِ افکار)

ڈاکٹر جمیل جالبی:

میر انیسؔ اردو کے ان چند شاعروں میں سے ایک ہیں جن کا نام اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا، مرثیہ قدیم صنفِ سخن ہے لیکن انیسؔ نے جس طرح مرثیے کو ایک نیا انگ، نیا روپ دیا ہے، وہ نہ صرف ان کی انفرادیت بلکہ اردو شاعری میں ایک نیا باب کھولتا ہے۔ انیسؔ کے مرثیوں کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ انہوں نے سننے والوں کی مذہبی عقیدت مندی کا پورا خیال رکھا ہے اور ساتھ ہی اس میں شاعری کی شیرینی ملا کر ایک ایسا رنگ نمایاں کیا ہے جو صرف انیسؔ کے مراثی کا رنگ ہے، ایک بات قابلِ ذکر یہ ہے کہ اردو مرثیہ اپنے ارتقاء سے گذرتا ہوا، جس طرح قصے کے روپ میں سامنے آیا ہے اُس کا اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ''نو سر ہار'' سے لے کر اور میر انیسؔ تک مرثیے میں بیان ہونے والا قصہ اپنا رنگ بدلتا رہا ہے۔ میر انیسؔ نے جو واقعات بیان کئے ہیں ان میں نہ صرف جدت ہے کہ آج انیسؔ کے مراثی سننے والوں کا عقیدہ بن گئے ہیں اور یہ کوئی معمولی بات نہیں یہی باعث ہے کہ میر انیسؔ اردو شاعری کے حوالے سے ہمیشہ زندہ و باقی رہیں گے۔

ڈاکٹر سلیم اختر:

(میر انیسؔ و دبیرؔ) ان حضرات کی کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ بگڑا شاعر، مرثیہ گو والی بات غلط ہی ثابت نہ ہوئی بلکہ انیسؔ و دبیرؔ جو کچھ لکھ گئے اس پر اضافہ تو کُجا وہاں تک کوئی بھی نہ پہنچ سکا۔
(اردو ادب کی مختصر تاریخ)

پیرزادہ قاسم: (وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی)

میر انیسؔ بڑے شاعر تھے، ان کی شاعری کی جہتیں اس قدر زیادہ ہیں کہ ان پر ابھی بہت زیادہ

تحقیق کی ضرورت ہے لیکن ابھی تک Discover نہیں کیا جا سکا ہے، اب شکر ہے کہ میر انیسؔ کی دوصد سالہ برسی کے حوالے سے تقریبات کا آغاز کیا جا رہا ہے اور امید کی جاتی ہے کہ ان کی شاعری اور فن مرثیہ گوئی کی درست سمتوں میں Discover کیا جا سکے گا تا کہ ان کے اسرار و رموز کو سمجھا جا سکے۔ اب تک یہی ہوا ہے کہ موازنہ چھاپ لیا گیا اور ایک عرصے تک اسی موازنے کی بازگشت چلتی رہی حالانکہ میرے خیال میں موازنہ کرنا کچھ مناسب نہیں ہوتا۔

حسینہ معین:

میر انیسؔ کے مطالعے کے بغیر نہ تعلیم مکمل ہوتی ہے نہ کورس، میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ نے مرثیے کو نہایت بلند مقام تک پہنچا دیا ہے، بلکہ میں تو یہ کہوں گی کہ یہ لوگ نہ ہوتے تو بہت کچھ نہ ہوتا۔ یہ بدقسمتی ہے کہ موجودہ میڈیا میر انیسؔ کا صرف ذکر کرتا ہوا گذر جاتا ہے حالانکہ ان کے مذہبی تاثر سے ہٹ کر بھی میر انیسؔ کے یہاں زبان و بیان، لفظوں کی بہتات، اور زبان پر جو عبور ملتا ہے وہ آج کے نوجوان کی تعلیم و تعمیر کے لیے ضروری تصور کیا جاتا ہے، اب کا تو مجھے نہیں معلوم البتہ ہمارے زمانے میں تو کورس میں میر انیسؔ و دبیرؔ کے مرثیے لازمی شامل ہوتے تھے۔

الطاف حسین (بانی و قائد متحدہ قومی موومنٹ):

میں ماہنامہ ندائے حق اور مدیرانِ گرامی کا تہہ دل سے مشکور و ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے موقع فراہم کیا کہ میں ممتاز شاعر میر ببر علی انیسؔ کے حوالے سے شائع کئے جانے والے خصوصی ایڈیشن کے لیے اپنے تاثرات رقم کرسکوں۔

میر انیسؔ کے دوصد سالہ جشن ولادت کے حوالے سے یہاں یہ کہنا ہرگز بے جا نہ ہوگا کہ شائد اب اردو ادب کو میر انیسؔ جیسا جلیل القدر، قادر الکلام اور قد آور شاعر نصیب نہ ہو۔ میر انیسؔ اردو ادب کی عزت و آبرو ہیں۔ خصوصاً نظم کے حوالے سے، جیسے جیسے میر انیسؔ کا قد بلند ہوتا گیا ویسے ویسے اردو ادب کا قد بلند ہوتا چلا گیا اور انہوں نے اردو نظم اور بالخصوص اردو رزمیہ شاعری کو اپنے مرثیوں کے توسط سے دنیا کی سب سے بڑی رزمیہ شاعری بنا دیا۔ مغربی دنیا نے اگر ہومرؔ، ملٹنؔ، اور شیکسپیئرؔ جیسے رزمیہ شاعر پیدا کئے تو اہل مشرق نے کالی داسؔ، فردوسیؔ، دبیرؔ اور انیسؔ کو جنم دیا۔ یہاں

میں اس نکتے کی وضاحت بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ کثرت اشعار اور فنی محاسن دونوں کے اعتبار سے تمام مغربی اور مشرقی شعرا خصوصاً رزمیہ شاعری میں میر انیسؔ سے دو قدم پیچھے ہی نظر آتے ہیں۔ ارسطوؔ کی معرکتہ الآرا تصنیف بوطیقا اس حوالے سے کسوٹی کا درجہ رکھتی ہے۔

میر ببر علی انیسؔ نے جہاں اردو ادب میں منظر نگاری کے شاہکار تخلیق کیے وہیں انہوں نے اردو زبان کو بے شمار استعارے اور تشبیہات سے نوازا جس سے اردو ادب اور خصوصاً اردو شاعری میں بے شمار نئے موضوعات کو جنم دے کر اردو زبان کو ہمہ جہت بنا دیا۔ بقول اردو کے ایک اور قد آور شاعر علی سردار جعفریؔ، ''اردو ادب اور خصوصاً اردو شاعری میں چراغ کو بطور استعارہ میر انیسؔ نے ہی استعمال کرنا شروع کیا اور ان کا یہ خوبصورت شعر اس ادبی حقیقت پر دلالت کرتا ہے''۔

انیسؔ دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

اردو شاعری میں حضرت امام حسین علیہ السلام کے فکر و فلسفہ اور پیغام حق پرستی کے فروغ و ابلاغ کے حوالے سے جو کردار میر انیسؔ نے ادا کیا وہ کسی اور سے نہ ہو سکا۔ اور یوں میر انیسؔ نے اردو ادب کے دامن کو شہادت کے فکر و فلسفہ سے بھی مالا مال کر دیا۔ اور چونکہ شہادت ہی دنیا کی سب سے بڑی سچائی ہے اسی لیے حق پرستی کے سچے فکر و فلسفہ کو اردو شاعری میں تراش کر جڑ دیا۔ جو کہ میر انیسؔ کا ادب پر ایک اور بڑا احسان ہے۔

نہ جانے کتنے ہی ایسے موضوعات ہیں جن کے حوالے سے میر انیسؔ اور اردو زبان کے تفصیل طلب موضوع پر بات کی جا سکتی ہے۔ مگر وقت اور صفحات شائد ساتھ نہ دے سکیں۔ آخر میں بس یہی کہنا چاہوں گا کہ زندہ باد وہ رسائل و جرائد جو اردو ادب کی خدمت میں مشغول ہیں اور خوشا وہ تمام لوگ جو ان کے مہتمم ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی ہمتوں اور وسائل میں اضافہ کرے۔ آمین ثمہ آمین۔

(مونس انیس الطاف حسین)

❀❀❀

ڈاکٹر نیّر مسعود

حیاتِ میر انیسؔ

۱۸۷۴ء میر ببر علی انیسؔ کی زندگی کا آخری سال تھا جس کے آخری مہینے میں ان کی وفات ہوگئی۔ (۲۹۔شوال ۱۲۹۱ھ) مرض الموت میں وہ اپنے منجھلے بھائی میر مہر علی اُنسؔ سے آزردہ تھے۔ اسی زمانے میں میر اُنسؔ نے انیسؔ کے ایک عقیدت مند حکیم سیّد علی کو خط میں لکھا:

''میر ببر علی صاحب کی طبیعت بہت علیل ہے رجب کے مہینے سے ماندے ہیں، میں نے جانے کا قصد کیا تھا لیکن فرمایا کہ اگر وہ آئیں گے تو میں چھریاں اپنے ماروں گا اور میرے جنازے پر بھی آئیں گے تو جب تک وہ نہ جالیں گے تو اگر تین دن گزر جائیں تو میرا جنازہ نہ اٹھانا اور اس طرح بہت کلمات کہلا بھیجے ہیں میں ابھی تک نہیں گیا مگر میرا دل نہیں مانتا۔'' [۱]

کچھ دن بعد انھیں حکیم سیّد علی کو میر اُنسؔ نے لکھا:

''تمام ماہ رمضان میں دن بھر تو میں اپنے حال میں بہ سبب صوم گرفتار رہتا تھا اور بعد افطار کے بھائی صاحب کی علالت کی خبر سن سن کر رویا کرتا تھا اور دُعائیں پڑھ پڑھ کر نصف شب کو اُن کی صحت کی دعائیں کیا کرتا تھا اور بے تاب ہو کر میں میر نواب سے کہتا تھا کہ ''بھائی، اب میں گھٹ گھٹ کے اُن سے پہلے مر جاؤں گا۔'' تو وہ کہتے تھے کہ ''خدا کے واسطے آپ نہ جایئے، کس واسطے کہ وہ اپنے لڑکوں سے وصیت کر چکے ہیں کہ میر مہر علی کو میرے جنازے پر نہ آنے دینا۔'' [۲] یہ سن کر میں چپ ہو رہتا تھا۔ عید کے دن میر نواب میرے پاس آئے تو میں مثل بیماروں کے منہ لپیٹے پڑا تھا۔ جب وہ آئے تو میں اُٹھا اور بھائی کا حال میں نے پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ ''میں وہیں سے آتا ہوں، آج نہایت غشی ہے کہ آنکھ نہیں کھولتے اور پاؤں پر نہایت ورم آ گیا ہے۔'' بس یہ سنتے ہی

میں قریب تھا کہ غش کھا کر گر پڑوں اور اس طرح میرا خون اُونٹا کہ میں چیخیں مار مار کر رونے لگا۔ ساری گھر کی عورتیں بھی رونے لگیں۔ جب بعد دیر کے میرا دل تھما تو میں نے میر نواب سے کہا کہ ''بھائی، اب مجھ کو تاب نہیں ہے۔ آج شام کے قریب میں ضرور جاؤں گا۔'' الغرض چار پانچ گھڑی دن رہے، میں عالم بے تابی میں اپنے گھر سے چلا تو بہ خدائے لم یزل راہ میں میرے آنسو بہے چلے جاتے تھے۔ جب پہنچا تو میں دیوان خانے میں دم بھر بیٹھا اور میر خورشید علی کو اور عسکری کو اُن کے گھروں سے بلوا بھیجا۔ جب وہ آئے تو سہمے ہوئے تھے۔ میر خورشید علی کا رنگ بھی فق ہو گیا اور عسکری کا بھی۔ میں نے پہلے کیفیت مزاج کی پوچھی تو کہا کہ ''آج غشی بہت ہے۔'' میں نے کہا کہ ''کوئی چھپنے والا تو نہیں ہے؟'' کہا کہ ''فقط خالہ آپ سے چھپتی ہیں۔'' میں نے کہا کہ ''تم بڑھو اور ان سے فقط کہہ دو کہ ہٹ جائیں، اور کچھ اطلاع بھائی سے نہ کرنا۔'' وہ اندر گئے اور میں بھی اندر گیا تو تینوں لڑکے دوسرے دالان میں مارے خوف کے چھپ گئے اور بہنیں میری بھی ہٹ گئیں۔ الگ الگ سب تھر تھر کانپتے تھے کہ دیکھئے کیا ہوتا ہے غرض جہاں بھائی کا پلنگ تھا وہاں میں گیا تو دیکھا میں نے آنکھیں بند کئے ہیں۔ میں نے سرہانے بیٹھ کے گال پر گال رکھ کر رو رو کے کہا کہ ''میں اس نقاہت کے تصدق ہو گیا ہوتا اور میری آنکھیں اندھی ہو گئی ہوتیں کہ یہ حال نہ دیکھتا۔ برائے خدا آنکھیں کھولیے کہ میں مہینا بھر سے تڑپتا ہوں'' یہ جو میں نے چلا چلا کے کہا اور عالمِ بے تابی میں منہ سے منہ ملا تو گو غشی میں تھے مگر میری آواز پہچانی اور ایسا روئے کہ آنسو تکیے پر ٹپکنے لگے اور میں نے رو رو کر عالم بے تابی میں کہا کہ ''خداوندا، واسطہ اپنی خدائی کا، مجھ سے ان کی نقاہت کی صورت نہیں دیکھی جاتی، ان سے پہلے مجھ کو اٹھا لے۔'' تو پھوٹ پھوٹ کر خود بھی رونے لگے اور آہستہ فرمایا کہ ''ارے بھائی، کیوں اپنے تئیں مارے ڈالتے ہو، میں تو اب اچھا ہوں، اور میرے سر کی قسم، سکوت کرو نہیں تو میرا دم اکھڑ جائے گا۔'' اس مابین میں تینوں لڑکے اور لڑکیاں اور بہنیں سب کا ہجوم ہوا، بس، پھر میں چپ ہوا تو آہستہ آہستہ ساری حقیقت مجھ سے کہی۔ پاؤں کا ورم دکھلایا۔ دس بجے شب تک میں بیٹھا رہا اور باتیں رہیں پھر مجھ سے کہا کہ ''رات بہت آتی ہے، گھر دور ہے اب تم جاؤ۔'' میں گھر پر آیا۔ عید کے دن سے میں سہ پہر کو جاتا ہوں اور دس بجے شب کو آتا ہوں۔''

اس بیان سے انیس کی نازک مزاجی کے ساتھ ساتھ اُن کی شخصیت کے اُس رُعب اور دبدبے کا بھی اظہار ہوتا ہے جو مرض الموت کی بے بسی میں بھی برقرار تھا۔ یہ انیسؔ کی شخصیت کے نمایاں

عناصر تھے جنھوں نے اُن کے دوسرے اوصاف، خصوصاً شاعرانہ کمالات کے ساتھ مل کر ان کو ایک بادشاہ کی سی حیثیت دے دی تھی۔ انیسؔ کی اس شخصیت کی تعمیر فیض آباد سے شروع ہوتی ہے۔ جہاں ۱۸۰۳ء (۱۲۱۸ھ) میں اُن کی ولادت ہوئی۔

انیسؔ کے والد مستحسن خلیقؔ، دادا میر حسنؔ اور پردادا میر ضاحکؔ اردو ادب کی معروف شخصیتیں ہیں، میر ضاحکؔ اردو اور فارسی کے اچھے شاعر تھے لیکن اُن کی انفرادیت یہ تھی کہ انھوں نے معیاری اور ٹکسالی اردو کو مسخ کر کے ایک مہمل نما زبان اختراع کی تھی جس میں وہ مزاحیہ اور ہجویہ شاعری کرتے تھے۔ میر حسنؔ بہت عمدہ غزل گو اور اردو شاعروں کے ایک اہم تذکرے کے مصنف تھے لیکن ان کا شاہکار ان کی مثنوی ''سحرالبیان'' تھی جو آج بھی اردو کی بہترین مثنویوں میں شمار ہوتی ہے۔ میر خلیقؔ نے غزل گو کی حیثیت سے شہرت اور استادی کا درجہ حاصل کیا۔ ان کے بہت شاگرد تھے (جن میں نواب سیّد محمد خان رندؔ اور میر علی اوسط رشکؔ بھی شامل تھے) لیکن خلیق کے اصل جوہر مرثیہ گوئی میں کُھل کر سامنے آئے۔ انھوں نے میر ضمیرؔ، مرزا فصیحؔ اور میاں دلگیرؔ کے ساتھ مل کر اردو مرثیے کو ایک ادبی صنفِ سخن کی حیثیت سے احسان بخشا اور مرثیے کے ان چاروں ستونوں میں خلیقؔ کی زبان سب سے مستند سمجھی جاتی تھی۔

انیسؔ میر خلیقؔ کی اولاد میں سب سے بڑے تھے اور ان کی ولادت کے وقت خلیق کی عمر پینتیس، چھتیس سال ہو چکی تھی۔ اس زمانے کو دیکھتے ہوئے، جب بیس سال کی عمر سے پہلے پہلے مردوں کی شادی اور اولاد ہو جایا کرتی تھی یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خلیق کے لیے ان کے اس فرزند کی کتنی اہمیت تھی۔ انیسؔ کے ابتدائی حالات پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیق نے ان کی تعلیم و تربیت کسی خاص منصوبے کے تحت اور اس ادبی، تہذیبی اور مذہبی ماحول کو پیشِ نظر رکھ کر کی تھی جس میں آگے چل کر انیسؔ کو زندگی گزارنا تھی۔ اسی منصوبے کے تحت انھوں نے انیسؔ کے لیے استادوں کا انتخاب کیا جن میں مولوی میر نجف علی مشہور شیعہ عالم تھے اور مولوی حیدر علی اہلِ سنّت کے جید علما میں تھے۔ شاعری کی اصلاح کے لیے خلیق نے اپنے بیٹے کو شیخ ناسخؔ کی خدمت میں پیش کیا۔ حالانکہ خلیق خود مصحفیؔ کے شاگرد تھے، اور ناسخؔ کے مدِّ مقابل، خواجہ آتشؔ بھی مصحفیؔ کے شاگرد اور جانشین تھے، لیکن اُس وقت زبان پر ناسخؔ کی اجارہ داری تھی۔ علاوہ بریں آتشؔ فقیر منش اور گوشہ

نشین قسم کے آدمی تھے اور ناسخ کو اودھ کی سرکاروں اور درباروں میں رسوخ حاصل تھا۔ انیس کو رسمی اور وقتی طور پر ناسخ کا شاگرد کرایا گیا تھا لیکن اس طرح ان کو لڑکپن ہی میں ناسخ کی پشت پناہی حاصل ہوگئی اور مہدی حسن احسن کی روایت کے مطابق ناسخ نے ان کا تخلص جو پہلے حزیں تھا، بدل کر انیس تجویز کیا۔[۳]

خلیق نے انیس کو فنِ سپہ گری کی بھی باقاعدہ تعلیم دلوائی اور انیس نے ذاتی شوق سے اس فن میں مہارت حاصل کر لی[۴] جو اُن کے مرثیوں کے رزمیہ حصوں میں بہت کام آئی۔

ابتدا میں انیس نے غزلیں کہیں لیکن جب فیض آباد کے مشاعروں میں انھیں مقبولیت حاصل ہونے لگی تو میر خلیق نے ان کو غزل گوئی سے روک دیا اور مرثیہ گوئی میں لگا دیا۔ اب انیس نے اپنے اصل میدان میں قدم رکھ دیا تھا۔ اس کے بعد وہ برسوں تک فیض آباد ہی میں رہ کر مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی میں غیر معمولی ریاض کرتے رہے اور اس عرصے میں لکھنؤ اُن کے ادبی وجود سے قریب قریب بے خبر رہا۔

انیس کی ولادت سے اٹھائیس سال پیشتر نواب آصف الدولہ نے اودھ کا دارالحکومت فیض آباد کے بجائے لکھنؤ کو بنالیا تھا جس کے بعد سے فیض آباد کی بے رونقی اور لکھنؤ کی رونق بڑھتی جا رہی تھی۔ فیض آباد کے بیشتر ممتاز شہری اور اہلِ قلم لکھنؤ منتقل ہو گئے تھے لیکن میر خلیق اور انیس فیض آباد ہی میں رہے۔ البتہ خلیق مرثیہ خوانی کے سلسلے میں برابر لکھنؤ جاتے رہتے تھے۔ یہ اُن کا ذریعۂ معاش بھی تھا، مگر ان کی آمدنی اتنی نہیں تھی کہ فراغت کے ساتھ بسر کر سکیں اس لیے کہ ان کی سات اولادیں (تین لڑکے، چار لڑکیاں) تھیں البتہ انیس کا بار اُن پر سے کم ہوگیا تھا اس لیے کہ انیس فیض آباد کے ایک رئیس مرزا محمد ابراہیم عرف مرزا سیدو کے یہاں مرثیہ خوانی پر مقرر ہو گئے تھے اور اپنی کفالت خود کر سکتے تھے۔[۵]

اس وقت لکھنؤ دنیا کے بڑے شہروں سے ہم سری کر رہا تھا اور بعض غیر ملکی سیاح اسے پیرس، قسطنطنیہ اور قاہرہ پر فوقیت دیتے تھے۔ ہندوستان کے سب سے خوشحال شہر اور سب سے بڑے علمی، ادبی اور تہذیبی مرکز کی حیثیت سے لکھنؤ ہی ملک بھر کے اہلِ کمال کو ایک مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ انیس کو بھی بالآخر لکھنؤ ہی کی سکونت اختیار کرنا پڑی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس شہر کو اپنا مستقر بنانے سے پہلے اچھی طرح اپنا مشتاق بنانا چاہتے تھے۔ لکھنؤ عزاداری کا بھی سب

سے بڑا مرکز تھا اور مجالسِ عزا کے ایک جز کی حیثیت سے یہاں مرثیے کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ خلیق، ضمیر، فصیح، دلگیر کے بعد کی نسل میں ضمیر کے شاگرد مرزا سلامت علی دبیرؔ اپنے چاروں پیش رووں سے زیادہ مقبول تھے اور انیسؔ کے ہم عمر ہونے کے باوجود ان سے بہت پہلے لکھنؤ کے ادبی افق پر چھا گئے تھے۔ اس ماحول میں انیسؔ فیض آباد سے لکھنؤ آتے اور مرثیہ پڑھ کر واپس چلے جاتے تھے۔ اُن کی زبان کی فصاحت، کلام کی قوت اور خواندگی کے کمال نے تیزی کے ساتھ دلوں کو تسخیر کرنا شروع کیا۔ اُن کے ماننے والوں اور قدر دانوں کا حلقہ وسیع ہونے لگا، کئی جگہ اُن کے پڑھنے کی مستقل مجلسیں مقرر ہوگئیں اور جلد ہی انھیں مرزا دبیرؔ کا مدِ مقابل تسلیم کر لیا گیا بلکہ ایک طبقہ انھیں دبیرؔ پر ترجیح دینے لگا۔ رفتہ رفتہ لکھنؤ میں انیسؔ کی طلب بڑھتی گئی اور اب انھوں نے اس شہر میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

انیسؔ امجد علی شاہ کے عہدِ سلطنت (۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۷ء) میں لکھنؤ آ گئے۔[۶] یہ ان کی خوش حالی کا دور تھا۔ کنور درگا پرشاد مہر سندیلوی اُس زمانے میں انیسؔ کی مقبولیت کا حال لکھتے ہوئے بتاتے ہیں۔

''صاحبِ اقتدار امیر، نام دار شہزادے اور عالی خاندان نواب زادے ان دونوں حضرات کے گھروں پر جمع ہوتے اور مناسب خدمت بجالاتے تھے۔ اس صورت میں دونوں صاحبوں کی آمدنی کی رقم ہزاروں تک پہنچ جاتی تھی۔'' (فارسی سے ترجمہ)[۷]

اسی زمانے میں معرکۂ انیسؔ و دبیرؔ بھی گرم ہوا جس میں دونوں باکمال ایک دوسرے کے مقابلے پر سخن کے جوہر دکھاتے تھے اور دونوں کے مدّاح اپنے اپنے ممدوح کی حمایت میں مباحثے سے لے کر مجادلے تک پر تیار رہتے تھے۔ لیکن خود انیسؔ و دبیرؔ کے مراسم خوشگوار تھے اور دونوں ایک دوسرے کے کمال کی قدر کرتے تھے۔ دبیرؔ بہت منکسر المزاج اور صلح کل انسان تھے لیکن انیسؔ بڑے بڑوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ اُن کی پیچیدہ شخصیت اور نازک مزاجی کے واقعات اور ان کی مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی نے انھیں افسانوی شہرت دے دی تھی اور وہ ہندوستان کے ممتاز ترین شہریوں میں شمار ہوتے تھے ان کے یہ شعر غالباً اسی زمانے کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

کنجِ عزلت میں مثالِ آسیا ہوں گوشہ گیر | رزق پہنچاتا ہے گھر بیٹھے خدا میرے لیے
آبرو و مال و فرزندانِ صالح عزّ و جاہ | کس کی خاطر یہ ہوا جو کچھ ہوا میرے لیے

بھر دیا دامن کو مولا نے دُرِ مقصود سے　　　زر دیا زر پر، عطا پر کی عطا میرے لیے

لیکن انیس کی فراغت کا یہ زمانہ طول نہیں کھینچ سکا۔ ۱۸۵۶ء میں انگریزوں نے اودھ کی سلطنت پر قبضہ کرلیا اور دیکھتے دیکھتے لکھنؤ کی خوشحالی رخصت ہوگئی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں فتح پانے کے بعد انگریزوں نے لکھنؤ کی بے شمار خوبصورت عمارتوں کو مسمار کرادیا اور پورے پورے محلے کھدوا دیئے اس طرح لکھنؤ کا ظاہری حسن بھی جاتا رہا۔ انیس کا مکان اور امام باڑہ بھی منہدم کردیا گیا۔ ۸؎ ان کے قدردان رئیسوں میں کچھ موت کے گھاٹ اتر گئے، کچھ ترکِ وطن کر گئے اور کچھ خود محتاج ہوگئے۔ اب انیس کو معاش کی فکر ستانے لگی۔ شاہی کے وقت تک ان کو مرثیہ خوانی کے لیے لکھنؤ سے باہر جانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی لیکن اب گھر بیٹھے رزق کا سلسلہ ختم ہوگیا تھا اس لیے وہ دوسرے شہروں کے سفر پر مجبور ہوئے۔ ۱۸۵۹ء سے انھوں نے مرثیہ خوانی کے لیے لکھنؤ کے باہر جانا شروع کیا اور عظیم آباد، بنارس، الٰہ آباد، کانپور، حیدرآباد وغیرہ میں مجلسیں پڑھیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ دور دور تک لوگ ان کے کلام اور کمال سے واقف ہوکر ان کے مداح بن گئے لیکن خود انیس نے آزردہ ہوکر لکھنؤ میں مرثیہ پڑھنا چھوڑ دیا، حالانکہ ان کی مرثیہ خوانی کا لطف لکھنؤ ہی میں آتا تھا۔ انھیں اس بات کا ملال تھا کہ اہلِ لکھنؤ نے انھیں کسبِ معاش کے لیے باہر نکلنے سے روکا نہیں اور روایت تو یہاں تک ہے کہ انھوں نے ۱۲ سال کی عمر تک لکھنؤ میں مرثیہ نہیں پڑھا۔ ۱۸۷۰ء میں اودھ اخبار لکھنؤ نے لکھا:

''ہم کو نہایت افسوس ہے کہ میر انیس صاحب نے مرثیہ پڑھنا ترک فرمایا ہے اور شاید تصنیف فرمانا بھی چھوڑ دیا ہے۔ غیر ملکوں کے آدمی جو لکھنؤ میں وارد ہوتے ہیں، بیشتر حسرت و افسوس سے کہتے ہیں کہ ہم نے میر صاحب کو نہیں سُنا۔'' ۹؎

۱۸۷۱ء میں انیس مرثیہ خوانی کے لیے حیدرآباد گئے تھے۔ وہاں سے ان کے ایک میزبان شریف العلماء مولوی سید شریف حسین نے اپنے بھائی کو لکھا:

''میر انیس کا پڑھنا قابلِ وجد ہے۔ جو لطف اہلِ لکھنؤ کو میسّر نہیں وہ یہاں ہوگا۔'' ۱۰؎

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں انیس لکھنؤ میں مرثیہ پڑھنا ترک کیے ہوئے تھے۔ اسی سال انیس حکیم سید علی کو ایک خط میں بتلاتے ہیں کہ میں کئی سال بیمار رہا۔ مرثیہ خوانی کا شغل بالکل ترک تھا۔ مرثیہ کہنے کی طرف بھی توجہ نہیں ہوتی تھی۔ بعض احباب کے اصرار پر دو مرثیے

کہے ہیں جو نامکمل ہیں۔''[۱۱]

لیکن ترک کے اس زمانے میں انیسؔ اپنے خاص قدر دانوں اور عزیزوں کی التجا پر گاہے گاہے لکھنؤ میں مرثیہ پڑھ دیتے تھے۔ ایسے موقعوں پر انھیں سننے کے لیے خلقت ٹوٹ پڑتی تھی۔ ایسی ایک مجلس کا بیان انیسؔ کے پوتے دولھا صاحب عروجؔ کے سوانح نگار سید حسن رضا نے اس طرح کیا ہے: ''جیٹھ بے ساکھ کا زمانہ تھا، دُھوپ سخت پڑ رہی تھی، میدان میں نمگیروں کے نیچے مجلس تھی، دھوپ نمگیروں سے چھن رہی تھی، تمام شہزادگان اور رؤسا اور شرفا کا مجمع تھا، صراحیاں پانی کی چار جانب رکھوادی تھیں، پنکھے بے شمار لوگوں کے لیے تقسیم کردیئے تھے اس پر لوگ گرمی سے بے تاب تھے۔ میر صاحب نے آن کر یہ رنگ دیکھا، منبر پر تشریف لے جاکر فوراً رباعی نظم فرمائی۔

دھوپ آتے ہی یاں پہ زرد ہوجاتی ہے   آندھی آتی ہے، گرد ہوجاتی ہے
پنکھے آہوں کے، آنسوؤں کا چھڑکاؤ   یاں گرم ہوا بھی، سرد ہوجاتی ہے

اس مجلس کا اندازہ آپ کو اس سے ہوسکتا ہے کہ ایک مصرع جو میر انیسؔ صاحب پڑھتے تھے، اسی مصرعے کو مونس صاحب درمیانِ مجلس میں کھڑے تھے وہ پڑھتے تھے، تب تمام مجلس تک آواز جاتی تھی۔ اتنی بڑی مجلس کوئی نہیں ہوئی۔[۱۲]

جس طرح انیسؔ کا کلام سحر آمیز ہے اُسی طرح اُن کا پڑھنا مسحور کن تھا۔ منبر پر پہنچ کر اُن کی شخصیت بدل جاتی تھی اور وہ بوڑھے سے جوان اور بیمار سے تندرست نظر آنے لگتے تھے۔ آواز کے زیر و بم، لہجے کے اتار چڑھاؤ، آنکھوں کی گردش اور ہاتھوں کی خفیف سی جنبش سے وہ اہلِ مجلس پر نظر بندی کا سا عالم طاری کردیتے تھے اور جو کچھ وہ مرثیے میں بیان کرتے حاضرین کو وہ اپنے سامنے نظر آنے لگتا تھا۔ یہ بات عام طور پر تسلیم کرلی گئی ہے کہ تحت اللفظ خوانی کے فن کا اُن سے بڑا کوئی ماہر پیدا نہیں ہوا۔ اُن کی مرثیہ خوانی کے جو متفرق بیان ہم تک پہنچے ہیں وہ ہم کو اُن کے کمالِ فن کا تھوڑا اندازہ کراسکتے ہیں۔ نواب تہور جنگ کی دعوت پر انیسؔ حیدرآباد گئے تھے لیکن وہاں پہنچ کر بیمار پڑ گئے۔ چھ دن تک غذا ترک رہی اور رات کو تیز بخار سے ان پر بے ہوشی طاری ہوجاتی تھی۔ میر مونسؔ کے نام حیدرآباد سے انھوں نے خط بھیجا اس میں یہ تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جب میں غش سے آنکھ کھولتا تو دیکھتا تھا کہ میر عسکری (رئیس) رو رہے ہیں کہاں تک لکھوں کہ یہی حال پہلی محرم تک رہا۔ پہلی تاریخ قریب پانچ ہزار کا مجمع ہوگیا تھا۔ تہور جنگ بہادر نے

میرے پاس آ کر کہا کہ اگر آپ میں طاقت ہو تو مجلس میں شریک ہوں، شاید مجلس کی برکت سے مرض میں تخفیف ہو جائے۔ میں عجب حالِ زار سے مجلس میں پہنچا۔ میر محمد (سلیس) سے پڑھنے کو کہا۔ انھوں نے چند بند پڑھ کر ختم کر دیا۔ میں اسی حال میں اُٹھ کر منبر پر گیا اور چند بند آہستہ آہستہ پڑھے۔ فقط سیّد الشہدا کی تائید تھی کہ مجلس کا حال دگرگوں ہوگیا۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ لکھنؤ میں پڑھ رہا ہوں۔ پڑھنے کے بعد ساری مجلس، جو امرا اور اہلِ خلاف سے مملو تھی، میرے قدموں پر گر پڑی۔'' (فارسی سے ترجمہ) ۱۳

شادؔ عظیم آبادی بتاتے ہیں کہ عظیم آباد میں انیسؔ کو سُننے سے کچھ دن پہلے وہ اُن سے ملے تھے لیکن انیسؔ نے اُن کی طرف توجہ نہیں دی تھی اس لیے شاد اُن سے آزردہ تھے۔ وہ انیسؔ کی ابتدائی مجلسوں میں شریک بھی نہیں ہوئے لیکن چوتھی محرم کو داد و تحسین کا شور سن کر وہ مجلس میں پہنچ گئے اُس وقت میر صاحب یہ بند پڑھ رہے تھے: ''وہ دشت اور وہ خیمۂ زنگار گوں کی شان''۔

''وہ دشت، کو سُریلی آواز سے ایسا کھینچا کہ وسعت دشت کی آنکھوں میں پھر گئی۔ اللہ اللہ! وہ لفظوں کا ٹھہراؤ، وہ لب و لہجہ، وہ سُریلی دل کش آواز، وہ لبوں پر مسکراہٹ، غرض کہ کس بات کو کہوں۔ اس وقت میر انیسؔ کی جو بات تھی کلیجے کے اندر اُتری جاتی تھی۔ وہ میر انیسؔ ہی تھے کہ جن کو چند دن پہلے دیکھا تھا۔ چوتھا مصرع:

بیت العتیق، دیں کا مدینہ، جہاں کی جان

تو اس خوبی سے ادا کیا کہ تعریف کرتے کرتے لوگ کھڑے ہو گئے...... غرض چہرے سے لے کر صف آرائی، رُخصت، لڑائی، شہادت، بَین سب پورا پڑھا۔ آخر پسینے سے کُرتا بدن میں، ٹوپی سر پر بھیگ کر چپک گئی۔ ہاتھ تھام کر منبر سے اتارے گئے۔ سیدھے فرودگاہ کو چلے۔ میں بھی ننگے پاؤں حیرت زدہ ساتھ ہو لیا۔'' ۱۴

شمس العلما مولوی ذکاء اللہ دہلوی نے الٰہ آباد میں انیس کو سنا تھا۔ اُن کا بیان ہے:

''جب میں اس مجلس میں پہنچا تو تمام عالیشان مکان آدمیوں سے بھر چکے تھے، بلکہ سیکڑوں مشتاق فرش کے زمین پر دھوپ میں کھڑے محوِ سماعت تھے۔ جب میں پہنچا تو مرثیہ شروع ہو چکا تھا اور میر مجلس کے اندر جگہ پانا مشکل تھا اس لیے میں بھی وہیں دھوپ میں کھڑا ہو کر سننے لگا اور دور سے ٹکٹکی باندھ کر میر انیس کی صورت اور اُن کے ادائے بیان کو دیکھنے لگا۔ میں میر انیس کی فصاحت

بیانی اور اُن کے طرزِ بیان کی دلفریب اداؤں کی تصویر نہیں کھینچ سکتا صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اس سے پہلے کبھی ایسا خوش بیان نہیں سنا اور نہ کسی کے ادائے بیان سے یہ مافوق العادت اثر پیدا ہوتے مشاہدہ کیا۔ میر انیسؔ بوڑھے ہو گئے تھے مگر ان کا طرزِ بیان جوانوں کو مات کرتا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ منبر پر ایک کل کی بڑھیا بیٹھی ہوئی لڑکوں پر جادو کر رہی ہے۔ جس کا دل جس طرف چاہتی ہے پھیر دیتی ہے اور جب چاہتی ہے ہنسا دیتی ہے اور جب چاہتی ہے رُلا دیتی ہے۔ میں اسی حالت میں دو گھنٹے کے قریب کھڑا رہا۔ میرے کپڑے پسینے سے تر اور پاؤں خون اُترنے سے شل ہو گئے تھے لیکن میں جب تک میر انیسؔ کی صُورت دیکھتا رہا اور اُن کا مرثیہ سنتا رہا مجھ کو یہ بات محسوس نہیں ہوئی۔'' ۱۵

انیس کے ایک ملاقاتی میر حامد علی سے آرہ ضلع شاہ آباد میں غالباً صغیر بلگرامی نے بیان کیا:

''میں کلامِ دبیرؔ کا شیدائی تھا کلامِ انیسؔ کا قائل نہ تھا۔ ایک مرتبہ اتفاقاً انیسؔ کی ایک مجلس میں شرکت ہوئی اور میں بے ادبی سے اُن کو سننے لگا لیکن دوسرے ہی بند کی...... بیت

ساتوں جہنم ، آتشِ فرقت میں جلتے ہیں
شعلے تری تلاش میں باہر نکلتے ہیں

انھوں نے اس انداز سے پڑھی کہ مجھے شعلے بھڑکتے ہوئے دکھائی دینے لگے اور میں اُن کا پڑھنا سننے میں ایسا محو ہوا کہ تن بدن کا ہوش نہ رہا یہاں تک کہ جب ایک دوسرے شخص نے مجھے ہوشیار کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ میں کہاں ہوں اور کس حال میں ہوں۔'' ۱۶

آرزوؔ لکھنوی کے والد میر ذاکر حسین یاسؔ نے بھی انیسؔ کو سنا تھا۔ ان کا بیان ہے کہ ''ایک مجلس میں انیسؔ نے جب یہ مصرع پڑھا:

''صحرا زمرّدی تھا پھریرے کے عکس سے''

تو مرثیے کو اس طرح ذرا سا پلٹ دیا کہ پھریرے کا لہرانا آنکھوں کے سامنے آ گیا۔'' ۱۷

انھیں یاسؔ کا یہ بھی بیان ہے کہ ''ایک سال میر انیسؔ نے جو مرثیہ ایک دن پڑھا تھا وہی مرثیہ دوسرے دن بالکل دوسری طرح پڑھا''۔ ۱۸

انیسؔ کو قدرت کی طرف سے مرثیہ خوانی کے لیے بہت موزوں اور مترنم آواز ملی تھی جس پر وہ اس زمانے میں موسیقی کے [illegible] ذریعے فخر بھی کرتے ہیں۔

ہر بات میں ہے نغمۂ جاں بخش کا مزا ڈنکا ہو اس کلام کا کیوں کر نہ جا بجا
پردے کے دل سے آتی ہے احسنت کی صدا دکھلا رہی ہے طبعِ سخن ور نئی ادا

لہجہ سنو زبانِ فصاحت نواز کا !
تارِ نفس میں سوز ہے مطرب کے ساز کا [۱۹]

شادؔ نے بھی اپنے بیان میں انیس کی ''سریلی آواز'' کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ انیسؔ کے شاگرد سیّد آغا میر کے بیٹے سیّد محمد جعفر نے بھی انیسؔ کو سُنا تھا، اُن کا کہنا تھا:

''میر انیسؔ کی آواز میں جو دل کشی تھی وہ کسی انسان کا کیا ذکر، کسی خوش الحان پرند اور کسی باجے کی آواز میں بھی نہیں ہے۔'' [۲۰]

یہاں بھی انیسؔ کی آواز کی غنائیت پر زور دیا جا رہا ہے اور آواز ہی نہیں انیسؔ کی پوری ہیئت مرثیہ خوانی کے لیے موزوں ترین معلوم ہوتی تھی۔ محمد حسین آزادؔ لکھتے ہیں:

''اُن کی آواز، اُن کا قد و قامت، اُن کی صورت کا انداز، غرض ہر شے اس کام کے لیے ٹھیک اور موزوں واقع ہوئی تھی۔'' [۲۱]

اور حکیم شفاالدولہ کے داماد مرزا دلاور حسین کا کہنا ہے:

''مرثیہ پڑھنے کا کیا ذکر، انیسؔ کی طرح منبر پر بیٹھنا کسی کو نہیں آیا۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ منبر کے اوپر تشریف فرما نہیں ہیں بلکہ منبر ہی سے اُگ کر باہر نمودار ہو گئے ہیں۔'' [۲۲]

بینیہ بند پڑھنے میں بھی انیسؔ کو کمال حاصل تھا۔ مولوی سیّد باقر حسین جون پوری نے بنارس میں انیسؔ کو سنا تھا، وہ اُن کی مجلس کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جب جناب میر صاحب منبر پر سے اُترے تو آٹھ نو آدمی فرش پر بے ہوش تھے۔ [۲۳]'' شادؔ عظیم آبادی بھی انیسؔ کے کچھ بینیہ بند نقل کر کے لکھتے ہیں:

''مجلسوں میں ان بندوں کے پڑھے جانے پر میں نے جیسے جیسے کہرام دیکھے ہیں اُن کو کیا بیان کروں۔ روتے روتے آٹھ آٹھ آدمیوں کو غش آ گئے۔'' [۲۴]

فن میں محویّت اور استغراق اور اپنی نازک مزاجی کی وجہ سے انیسؔ مرثیہ خوانی کے دوران ذرا بھی بدنظمی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ مہدی حسن احسنؔ لکھتے ہیں:

''وہ منبر پر پہنچ کر اپنے جذباتِ غیظ کو روک نہیں سکتے تھے۔ اُن پر ایک عالمِ محویّت طاری ہوتا تھا

اور اُن کا نشہ کمال ان کو عالمِ قدس کی اس منزل پر پہنچا دیتا تھا جہاں سے اہلِ دَوَل کی شان نہایت پست دکھائی دیتی تھی۔''۲۵

اس سلسلے میں احسنؔ یہ واقعہ بھی بیان کرتے ہیں:

''دورانِ مرثیہ خوانی میں ایک رئیس مجلس میں تشریف لائے اور چاہا کہ کسی طرح مجمعے کو طے کر کے منبر کے قریب پہنچ جائیں۔ میر صاحب ارادہ سمجھ گئے اور اپنی رعب دار آواز سے فرمایا کہ ''بس وہیں بیٹھ جاؤ، ایک قدم آگے نہ بڑھانا۔'' رئیس صاحب نے وہیں غوطہ مارا اور جوتیوں کے پاس آرام سے بیٹھ گئے۔''۲٦

شادؔ عظیم آبادی لکھتے ہیں:

''عظیم آباد میں شیخ خیرات علی مرحوم پنکھیا ہلاتے ہلاتے ذرا جھک گئے۔ آپ نے وہیں منبر پر سے ڈانٹا کہ ''مرثیہ سنتے ہو یا سوتے ہو؟''۲۷

شادؔ ایک اور واقعہ بیان کرتے ہیں:

''چوک میں میر صاحب کی مجلس تھی۔ بعض رؤسا جو بہ سبب مجلس کے بھرے ہونے کے پائین میں بیٹھے تھے، کسی شدید ضرورت کے پیش آنے کے سبب چپکے سے عین اس وقت جب میر صاحب جوش میں پڑھ رہے تھے، مجلس سے اُٹھ گئے۔ آپ نے مرثیہ روک کر کہا کہ ''لکھنؤ میں سخن فہمی اور قدر شناسی کا مادّہ نہ رہا۔'' ہر چند اصرار ہوئے مگر پھر نہ پڑھا اور اُتر آئے۔''۲۸

مرزا حیدر لکھنؤ کے ایک بڑے رئیس تھے جن کے بارے میں مولانا سیّد آغا مہدی لکھتے ہیں:

''مرزا حیدر صاحب امیر کبیرِ لکھنؤ تھے...... اُن کے خصوصیات سے تھا کہ وہ جس محفل میں آ جاتے تھے اُن کا آبدار خانہ اور گلوریوں کا ساز و سامان، خاص دان ہمراہ لایا جاتا تھا اور سو ڈیڑھ سو حُقّے اُن کے ساتھ چلتے تھے۔ اوسط طبقے کے لوگوں کو اُن کے مدعو کرنے سے حُقّے پان کی غیر معمولی راحت ملتی تھی۔''۲۹

انھیں مرزا حیدر سے متعلق میر معصوم علی سوز خان نے سیّد مسعود حسن رضوی ادیبؔ مرحوم کو اپنا چشم دید واقعہ سنایا:

''شہر کی مجلس میں میر انیسؔ پڑھ رہے تھے...... نواب مرزا حیدر...... تشریف لائے اور منبر کے قریب جا کر بیٹھے...... دستور کے مطابق اُن کا بھنڈی خانہ، آب دار خانہ اور دست بقچہ وغیرہ بھی آنا

شروع ہوا۔ اِس میں دیر ہوئی۔ میر صاحب خاموش مگر غصّے میں بیٹھے رہے۔ اسی اثنا میں حاضرینِ مجلس میں سے کسی نے کہا ''جنابِ میر صاحب، بسم اللہ، آپ مرثیہ شروع فرمائیں۔'' انیسؔ نے جھلاّ کر جواب دیا کہ ''کیا شروع کروں۔ آپ کا جہیز تو آلے۔'' ۳۰؎

لیکن اس نازک مزاجی کے باوجود انیسؔ عام آدمیوں کے ساتھ رعایت بھی کر جاتے تھے۔ سیّد خورشید حسن بجنوری کا بیان ہے:

''ایک دفعہ میں دل آرام کی بارہ دری میں میر انیسؔ کی مجلس سننے گیا، مرثیہ شروع ہو چکا تھا مجمع اس قدر تھا کہ میں منبر سے بہت دور پڑ گیا۔ میں نے چاہا کہ مجمع میں گھستا ہوا منبر سے کسی قدر قریب ہو جاؤں مگر مجمع نے راہ نہ دی۔ میں مرثیہ سننے کے اشتیاق میں ایسا بے چین تھا کہ بہ آواز بلند خود میر صاحب کو مخاطب کر کے میں نے کہا کہ ''حضور میں دور سے آپ کو سننے کے اشتیاق میں آیا ہوں۔ یہ لکھنؤ والے تو روز آپ کو سنا کرتے ہیں، مجھ کو یہ موقع کہاں نصیب ہے۔ مگر یہ لوگ مجھ کو جگہ نہیں دیتے کہ میں آپ سے کچھ قریب ہو جاؤں۔'' یہ سن کر میر صاحب نے مرثیہ روک لیا اور مجھ سے فرمایا کہ ''آیئے، تشریف لایئے'' جب تک میں منبر کے قریب نہ پہنچ گیا انھوں نے پڑھنا شروع نہ کیا۔'' ۳۱؎

''انیسؔ کی مستند ترین تصویر وہ ہے جو اُن کے ایک قدر دان نے کسی باکمال مصوّر سے ہاتھی دانت ۳۲؎ کی تختی پر بنوا کر ان کی خدمت میں پیش کی تھی ۳۳؎۔ میر انیس کی جو تصویریں عام طور پر چھپتی رہتی ہیں وہ اسی ہاتھی دانت والی تصویر کا نقشِ مستعار ہیں، لیکن ان نقشوں میں اصل کے موقلم کی باریکیاں نہیں آ سکیں۔ اصل تصویر میں میر انیسؔ کی غلافی آنکھیں، آنکھوں کے نیچے باریک جھرّیاں، رُخساروں کی ہڈیوں کا ہلکا سا اُبھار، ذرا پھیلے ہوئے نتھنے اور بھنچے ہوئے پتلے پتلے ہونٹ مل کر ایک ایسے شخص کا تاثر پیدا کرتے ہیں جو بے حد ذکی الحس اور ارادے کا مضبوط ہے۔ دنیا کو ٹھکرا دینے کا نہ صرف حوصلہ رکھتا ہے بلکہ شاید ٹھکرا بھی چکا ہے۔ وہ کسی کو اپنے ساتھ زیادہ بے تکلف ہونے کی اجازت نہیں دے سکتا اور کسی سے مرعوب نہیں ہو سکتا اور اس کی خاموش اور بہ ظاہر پُرسکون شخصیت کی تہہ میں تجربات اور تاثرات کا ایک طوفان برپا ہے۔ میر انیسؔ کے جو حالات ملتے ہیں ان سے بھی ذہن میں بعینہٖ ایسے ہی شخص کی تصویر بنتی ہے۔ ۳۴؎

انیس کی ذکی الحسی کبھی تو نازک مزاجی اور نازک مزاجی سے بڑھ کر غضب ناکی کی حد تک پہنچ

جاتی تھی اور کبھی انھیں افسردگی، یاس، اکتاہٹ اور احساسِ تنہائی کے دورے میں مبتلا کر دیتی تھی۔ اُن کی کہی ہوئی منقبت کے یہ مصرعے انھیں ایسے ہی ایک دورے میں مبتلا دکھاتے ہیں:

مصرع ''مبتلائے غم دلِ ناشاد ہے۔'' ہے ہجوم حسرت و رنج و محن۔ دکھ تو یہ اور ہم نفس کوئی نہیں۔ میں تنِ تنہا ہوں بس، کوئی نہیں۔'' بجھ گیا ہے خود بخود دل کا کنول۔ خود بخود افسردہ رہتا ہے مزاج۔ گھر نہ بھاتا ہے، نہ صحرا اور نہ باغ۔ کل نہیں اک آن دل کو آج کل۔ ان دنوں ہے دل کو رنج واضطراب۔

اسی کے ساتھ وہ یہ التجا کرتے ہیں:

''طبع کو مولا روانی دیجئے، طاقتِ رنگیں بیانی دیجئے، دل کو شوقِ مدح خوانی دیجئے۔'' ۳۵

اس منقبت کے کچھ مصرعوں میں انیسؔ نے زمانے کی ناسازگاری کا شکوہ بھی کیا ہے لیکن جو مصرعے اوپر درج کئے گئے ہیں اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ احساسِ تنہائی اور بے دلی کی یہ کیفیت اپنے آپ پیدا ہوگئی ہے۔ اس کیفیت کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کو اپنی تخلیقی صلاحیتیں کند معلوم ہو رہی ہیں اور شاعری میں ان کا دل نہیں لگ رہا ہے۔ انیسؔ کے اُس بیان کا حوالہ دیا جا چکا ہے جس میں وہ بتاتے ہیں کہ انھوں نے دو نامکمل مرثیے کہے ہیں۔ یکے بعد دیگرے دو نامکمل مرثیے کہنے کا مطلب ہوا ایک مرثیہ ادھورا چھوڑ کر دوسرا مرثیہ شروع کر دینا اور اس کو بھی ادھورا چھوڑ دینا، یہ بھی اسی بے دلی اور اپنے فن سے ناآسودگی کی علامت ہے اور ناآسودگی کے اسی احساس کی ایک مثال ذیل کا بیان بھی ہے:

''میر انیسؔ اکثر کہا کرتے تھے کہ ''افسوس ہے جو دل میں ہوتا ہے وہ پورے طور پر قلم سے ادا نہیں ہوتا۔ جیسا کہنا چاہتا ہوں ویسا نہیں ہوتا۔ میر حامد علی کہتے تھے کہ آپ کا کلام اس پائے کا تو ہوتا ہے، اب اس سے بہتر اور کیا ہوتا۔ مگر میر انیسؔ پھر بھی فرماتے تھے کہ اس کو میرا دل ہی جانتا ہے کہ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ ٹھیک طور پر ادا نہیں ہوتا۔'' ۳۶

اسی ذکی الحسی نے انیسؔ کو نازک مزاج اور مغلوب الغضب بھی بنا دیا تھا جس کی وجہ سے لوگ اُن سے بہت محتاط ہو کر ملتے اور اُن کے مزاج کا یہاں تک لحاظ رکھتے تھے کہ احسنؔ کے بقول ''اُن کے غصے کے وقت بڑے بڑے صاحبِ اقتدار لوگ آنکھیں نیچی کر لیتے تھے۔''

کتاب ''وضع دارانِ لکھنؤ'' کے مصنف کا بیان ہے کہ اودھ کے وزیر اعظم نواب علی نقی خان کی

بڑی خواہش تھی کہ انیسؔ کو اپنے یہاں پڑھوائیں، لیکن انیسؔ اُن کی ملاقات کو جانے سے بھی گریز کرتے رہے آخر نواب نے انیسؔ کے ایک معتقد داروغہ محمد خان سے ساز باز کر کے خود کو بیمار مشہور کر دیا۔ داروغہ محمد خان نے انیسؔ کو اُن کی عیادت کے لیے جانے پر یہ کہہ کر آمادہ کر لیا کہ آپ تلوار ساتھ لیتے چلیں، اگر نواب صاحب آپ کی تعظیم و تکریم میں ذرا بھی کمی کریں تو اسی وقت میرا سر قلم کر دیجئے گا جب انیس وہاں پہنچے تو نواب صاحب نے بظاہر اس بیماری ہی میں میر صاحب کی سروقد تعظیم کی۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں جب میر صاحب رُخصت ہونے لگے تو نواب صاحب نے مجلس پڑھنے کا وعدہ لیا۔'' ۳۸؎ اس کے بعد ایک واقعہ مہدی حسن احسن یوں بیان کرتے ہیں:

''آٹھویں محرم کو ایک مجلس میر انیسؔ نواب علی نقی کے یہاں پڑھتے تھے۔ ایک روز حسبِ معمول مجلس شروع ہونے کا وقت آیا تو نواب صاحب نے وزیر خان چیلے کے ہاتھ میر انیسؔ کو پیغام بھیجا کہ میں اس وقت دردِ سر کے سبب نہایت بے چین ہوں، حاضریِ مجلس سے معاف فرمایا جاؤں۔ میر صاحب نے جواب دیا کہ آج میرا مزاج بھی درست نہیں مناسب ہے جو مجلس موقوف رکھی جائے انشاء اللہ سال آئندہ دیکھا جائے گا۔ نواب صاحب گھبرا کر باہر نکل آئے اور میر صاحب سے معافی مانگی اور اسی تکلیفِ مرض میں آخر مجلس تک بیٹھے رہے۔'' ۳۹؎

شریف العلماء مولوی شریف حسین کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ حیدرآباد میں انیسؔ کی آمد کی خبر سن کر ریاست کے مدارالمہام سر سالار جنگ مختار الملک بہادر نے انیسؔ کے میزبان نواب تہوّر جنگ کو خاص طور پر تاکید کی کہ انیسؔ بہت نازک مزاج ہیں، اُن کی مہمان نوازی میں کوئی کسر نہ رہ جائے، نہ کوئی خلافِ احتیاط بات ہونے پائے اور اُن کی خاطر داری کی کوشش کی جائے۔ ۴۰؎

اِس سلسلے میں میر انیسؔ کے بڑے فرزند میر خورشید علی نفیسؔ کے ایک اور خط کا اقتباس دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہ خط لکھنؤ سے مرزا غلام محمد کے نام فیض آباد بھیجا گیا تھا۔ نفیسؔ لکھتے ہیں:

''اور جنابِ والدِ ماجد آج تک تمبا کو کی راہ دیکھتے ہیں اور یہاں کا تمبا کو، کہ اُن کے خلافِ مزاج ہے، بے دلی سے پیتے ہیں۔ یقین تھا کہ قبل ماہِ رمضان کے ضرور بالضرور بھیجئے گا۔ جب یہ مہینا بھی آخر ہوا تو مجھ سے شکایت کی اور آزردہ خاطر ہوئے کہ مرزا غلام محمد صاحب ہمیں بالکل بھول گئے۔ اُن سے یہ توقع نہ تھی۔ اب کبھی ان سے نہ منگواؤں گا بلکہ یہ کہا کہ اب نہ بھیجیں تو بہتر ہے۔ قریب سال بھر کے ہوا، کب تک انتظار کروں۔ لہٰذا لازم ہے کہ اسی مہینے میں اُن کا تمبا کو خشک تحفہ لے کے اور

اپنے سامنے بنوا کے کسی مزدور کے ہاتھ برائے خدا بھجوا دیجیے کہ اُن کا ملال رفع ہو۔''۴۱

انیسؔ بڑے پابندِ وضع تھے اور لکھنؤ کے شہر میں بھی، جہاں وضع داری تہذیب کا ایک لازمی جزو تھی انیسؔ کی پابندیِ وضع کی خاص طور پر شہرت تھی اور دوسروں کو بھی ان کی وضع کا پاس کرنا پڑتا تھا۔ مثلاً ان سے ملاقات کرنے والوں کو اُن کے اوقات کی پابندی کرنا ہوتی تھی۔ امجد علی اشہری لکھتے ہیں:

''میں نے جناب حامد علی خان بیرسٹرایٹ لا اور نواب بدھن جیسے اکابرِ لکھنؤ سے سُنا ہے کہ میر صاحب تک پہنچنے اور ان سے ہم کلام ہونے کے لیے درباری قسم کے چند قواعد کی پابندی لازم تھی۔ کوئی یوں بے تکلف سامنے نہ جا سکتا تھا جب تک میر صاحب اس کے آنے کی اجازت نہ دیں یا ملاقات کا وقت مقرر نہ ہو جائے۔ روز مرّہ کے آنے جانے والے بھی ایک اطلاع کے بعد باریاب ہوتے تھے۔''۴۲

اپنے یہاں متواتر آنے والوں کے لیے بھی انیسؔ نے ملاقات کے وقت مقرر کر دیے تھے اور کوئی ملاقاتی اپنے لیے مقرر شدہ وقت کے سوا اُن سے نہیں مل سکتا تھا۔ میر حامد علی سے ملاقات کے لیے انیسؔ نے رات کا وقت مقرر کیا تھا۔ ایک بار انہوں نے بارہ بجے دن کو ملاقات کرنا چاہی تو انیسؔ نے انکار کر دیا۔ اس پر میر حامد علی نے آزردہ ہو کر انیسؔ سے ملنا چھوڑ دیا۔ کچھ دن بعد خود انیسؔ نے بارہ بجے دن کا وقت مقرر کر دیا اور میر حامد خود اُن کے یہاں جانے لگے۔ کچھ عرصے بعد گرمیاں آ گئیں اور اب انھیں دوپہر کے وقت انیسؔ کے یہاں جانے میں بڑی زحمت ہونے لگی۔ تب انیسؔ نے اُن سے کہا کہ میں نے رات کا وقت تمہاری ہی سہولت کی خاطر مقرر کیا تھا۔ میر حامد علی کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ انھوں نے انیسؔ سے معافی مانگی اور پھر ان کے لیے رات کا وقت مقرر ہو گیا۔۴۳

انیسؔ کی نازک مزاجیوں، پابندیوں اور رعب داب کے اور بھی بہت سے واقعات ملتے ہیں۔ ان واقعات سے ذہن میں ایک ایسے شخص کا نقش بنتا ہے جس سے ملاقات بہت دلچسپ ثابت نہ ہوتی ہوگی لیکن حقیقت یہ ہے کہ انیسؔ کی شخصیت بڑی دل نواز تھی اور ان کی صحبت بہت خوشگوار ہوتی تھی جس کی وجہ سے لوگ ان کی عاید کی ہوئی پابندیوں کے باوجود اُن سے ملنے کے مشتاق رہا کرتے تھے۔ وہ اپنے کلام کی طرح اپنی گفتگو سے بھی سننے والوں کو مسحور کر لیتے تھے۔ حیدرآباد میں ان کے پہنچنے کے چوتھے دن شریف العلما نے اُن کی ہم نشینی کا ذکر کرتے ہوئے اپنے بھائی کو لکھا:

''عرض نہیں کر سکتا ہوں کہ کیا لطف حاصل ہوتا ہے۔'' ۴۴؎

اور آٹھ دن بعد پھر لکھا:

''میر انیسؔ کے پاس اکثر بیٹھتا ہوں...... فی الواقع بے نظیر آدمی ہیں۔ بڑے غیور، خوش اخلاق، نیک مزاج اور نہایت خوش تقریب ہیں کہ انسان محو ہو جاتا ہے۔ اگر کسی بات کا ذکر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بہتر کچھ نہیں ہو سکتا۔'' ۴۵؎

میر حامد علی کا بیان ہے:

''میر انیسؔ نہایت خوش گفتار تھے۔ جب کسی کی صحبت میں وہ گفتگو کرنے لگتے تھے تو کوئی شخص کسی دوسری طرف متوجہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ۴۶؎

یہ واقعہ بھی انہیں میر حامد علی سے متعلق ہے:

''میر حامد علی کی شادی کے انتظام میں میر انیسؔ بھی شریک تھے۔ جب دستر خوان بچھا اور لوگ کھانا کھانے بیٹھے تو میر صاحب نے بعض بہت باتکلف مہمانوں کے پاس جا جا کر اُن کو اپنی باتوں میں ایسا محو کر لیا کہ وہ اپنا تکلّف بھول گئے اور زیادہ کھانا کھا گئے جس کا خود ان لوگوں نے اعتراف کیا۔'' ۴۷؎

محمد حسین آزاد بتاتے ہیں:

''میں ۵۷ء میں خود بھی اُن سے ملا اور لوگوں سے بھی سنا، کم سخن تھے اور بولتے تو وہ فقرہ کہ موتی کی طرح ٹانکنے کے قابل۔'' ۴۸؎

اور امجد علی اشہری لکھتے ہیں:

''اُن کی معمولی باتوں میں ادائے کلام سے اعجازِ فصاحت کا اثر ظاہر ہوتا تھا اور وہ معجز بیانی اُن کا حصہ تھی جو دوسری جگہ نہ مل سکتی تھی اور ان پر ختم ہو گئی جس کو اُن کے دیکھنے والے آج بھی یاد کرتے اور نہ دیکھنے والوں کو محوِ حیرت بناتے ہیں۔'' ۴۹؎

شادؔ عظیم آبادی کا بیان ہے:

''میر انیسؔ ہرگز بد مزاج، خود پسند، بد اخلاق نہ تھے۔ میں بھی پہلے یہی غلط خیال رکھتا تھا مگر جب ملا اور صحبتیں ہوئیں تو معلوم ہوا کہ اُن سے زیادہ خوش مزاج، منکسر، خوش اخلاق شاید ہی کوئی ہو...... خندہ روئی کے ساتھ لوگوں سے جھک کر صاحب سلامت اور تعظیم کرنا، ہاتھ جوڑ جوڑ کر جناب، آپ اور حضور کے کلمات سے مخاطب کرنا، اہلِ فن کی حُرمت کرنا، بزرگوں کے نام کو تعظیم کے

ساتھ لیناسرِ مُواس میں فرق نہ آتا تھا۔'' ۵۰ؔ

قربان علی بیگ سالکؔ، شریف العلماء، شادؔ عظیم آبادی، کلّنؔ صاحب سعیدؔ نے انیسؔ کی صحبتوں کے جوتذکرے کئے ہیں اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ انیسؔ کے پاس دلچسپ واقعات، مختلف النوع معلومات، اردو، فارسی، بھاشا کے اشعار وغیرہ کا نہ ختم ہونے والا خزانہ تھا اور اُن سے ایک بار کا ملنے والا بھی اُن کی صحبت اور گفتگو کو بھول نہیں سکتا تھا۔ آزاد نے ''آبِ حیات'' میں خواجہ آتش کی نماز کا جو دلچسپ واقعہ لکھا ہے وہ انھیں انیسؔ نے ہی سنایا تھا۔۵۱ؔ نجی صحبتوں میں انیسؔ اپنے شعر بالعموم نہیں سناتے تھے لیکن دوسروں کے شعر اس طرح پڑھ دیتے تھے کہ سننے والوں کے سامنے مضمون کی تصویر کھنچ جاتی تھی۔ وہ اچھے شعروں سے خود بھی متاثر ہوتے تھے اور اُن پر عمدہ تبصرہ کرتے تھے۔ مختلف صحبتوں میں انیسؔ نے جو شعر پڑھے اور پسند کئے اُن میں سے کچھ یہ ہیں:

سانولے رنگ سے بھا گو حسن کیا اس میں تمہارا جاتا ہے ایسے دھند لکے بیچ مسافر مفت میں مارا جاتا ہے ۵۲ؔ

نہ کچھ شوخی چلی بادِ صبا کی بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی ۵۳ؔ

ہمارے سر پہ چھائی ہیں بلائیں شامِ ہجراں کی وہ اپنے شغل میں ہیں بال ادھر کھولے ادھر باندھے ۵۴ؔ

کوئی آوارہ تیرے نیچے اے گردوں نہ ٹھہرے گا ولیکن تو بھی گر چاہے کہ میں ٹھہروں، نہ ٹھہرے گا ۵۵ؔ

تیری گلی میں ہم نہ چلیں اور صبا چلے یوں ہی خدا جو چاہے تو بندے کا کیا چلے ۵۶ؔ

اور جب اُن کے سامنے یہ شعر پڑھا گیا:

روشن ہے اس طرح دلِ ویراں میں داغ ایک
اجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک

تو ''میر صاحب لیٹے تھے۔ یہ شعر سن کر اُٹھ بیٹھے۔ ایک اُف کی اور فرمایا کہ میں اب بڑھاپے میں ایسے شعروں کی تاب نہیں لاسکتا، اس سن میں ایسے تیر نہیں کھا سکتا۔ اس کے بعد حسبِ معمول اس شعر پر تبصرہ ہونے لگا۔ میر صاحب نے اس کی شرح کے سلسلے میں فرمایا کہ پُرانے زمانے میں جب کسی بستی پر عتابِ شاہی نازل ہوتا تو وہ بستی ویران کر دی جاتی تھی اور اس میں کسی نمایاں مقام پر ایک چراغ جلا دیا جاتا تھا۔'' ۵۷ؔ

انیسؔ کے نواسے اور میر نفیسؔ کے داماد میر سید علی مانوسؔ جو انیسؔ کی زندگی کے آخری اٹھارہ سال تک اُن کے ساتھ رہے۔ انھوں نے ادیبؔ مرحوم کو انیسؔ کا حسبِ ذیل حلیہ لکھوایا تھا۔

''میر انیسؔ کا قد درمیانہ، مائل بہ درازی، ورزش کی وجہ سے جسم ٹھوس، اعضا متناسب وچُست، چھریرا بدن، چوڑا سینہ، صراحی دار گردن، خوبصورت کتابی چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، گیہوں رنگ، مُونچھیں ذرا بڑی، ڈاڑھی اتنی باریک کترواتے تھے کہ دُور سے منڈی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔'' ۵۸

ایک اور بزرگ میر عبدالعلی، جنھوں نے انیسؔ کو دیکھا تھا، بتاتے ہیں:

''میر انیسؔ کا قد لمبا، میانہ سے کچھ زیادہ، اُن کا بدن چُست، ٹھوس اور چھریرا تھا اور رنگ گندمی تھا۔'' ۵۹

انیسؔ کے لباس کے متعلق مانوس کا بیان ہے:

''سر پر حباب کی شکل کی قالب پر چڑھی ہوئی ٹوپی جو گرمیوں میں سفید اور جاڑوں میں ریشمی کام کی رنگین ہوتی تھی، نیچا نیچا خوب گھیر دار کُرتا جو گھٹنوں سے کچھ نیچا اور سفید رنگ کا ہوتا تھا۔ جامدانی یا ململ کا۔ گرمیوں میں صرف یہی کُرتا مگر جاڑوں میں انگر کھے کی قطع کا روئی دار دگلا یا خوب گھیر دار لبادہ پہنتے تھے جو پیروں کے گٹّے تک پہنچتا تھا۔ گرمیوں میں ڈھیلی مُہری کا سفید پائجامہ جسے عرض کا پائجامہ کہتے تھے۔ جاڑوں میں اِسی وضع کا ریشمی رنگین پائجامہ جو اودے، سبز یا گلابی مشروع کا ہوتا تھا یا گل بدن کا۔ گھر میں زرد مخمل کا گھیتلا، باہر اسی وضع کا زردوزی جوتا جو اس وقت پچیس تیس روپے کا بنتا اور اکثر کاریگر گھر پر بلوا کر بنوایا جاتا تھا۔ ہاتھ میں چھڑی اور رومال۔ کبھی کبھی دوپٹا بھی کندھے پر آڑا کر کے ڈال لیتے تھے۔'' ۶۰

میر نفیس کے ایک خط کے مندرجہ ذیل اقتباس سے بھی انیسؔ کے لباس کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوتی ہے۔

''گل بدن کے تھانوں کا حال معلوم ہوا۔ ان کے آنے میں بڑی دیر ہوگئی۔ اکثر جناب والد ماجد مدظلہ نے مجھ سے اس تاخیر کی شکایت کی کہ میں نے گرمیوں کے لئے منگائے تھے اور اب جاڑے آپہنچے مگر ہنوز نہیں آئے جناب والا، اگر پارچے ہوں تو ہر پارچہ سوا دو گز کا ہو اور عرض ایک گز ہو اور اگر تھان ہوں تو ساڑھے چار گز سے کم نہ ہوں۔ کیوں کہ ایک تھان میں دو پائجامے مع نیفے اور مغزی کے بنتے ہیں اور جناب میر صاحب کے موافق مزاج ہوتے ہیں'' (فارسی سے ترجمہ) ۶۱

انیسؔ کے نظام اوقات کے بارے میں مانوسؔ کا بیان ہے:

''میر صاحب کے زمانۂ شباب کے معمولات کا تو کوئی علم نہیں، لیکن اس کے بعد کے زمانے میں ان کا معمول تھا کہ نو دس بجے رات کو دیوان خانے سے اُٹھ کر زنانے مکان میں جاتے تھے اور

کھانے پینے سے فراغت کر کے مرثیہ کہنے بیٹھ جاتے تھے۔ زیادہ تر دوزانو بیٹھتے تھے۔ دونوں ہاتھ رُخساروں پر ہوتے تھے۔ لکھتے وقت صرف بایاں ہاتھ رُخسار پر ہوتا تھا۔ سامنے کنول روشن رہتا تھا۔ پہلوؤں میں کتابیں رہتی تھیں۔ قریب قریب روزانہ ساری رات جاگتے تھے۔ نمازِ صبح پڑھ کر آرام کرتے تھے، نو بجے کے قریب سو کر اُٹھتے تھے، دس بجے کے قریب کھانا کھاتے تھے۔ اس کے بعد اپنے چھوٹے بھائی میر مونسؔ اور بڑے بیٹے میر نفیسؔ اور دوسرے شاگردوں کے کلام پر اصلاح دیتے تھے۔ یہ شغل دو بجے تک جاری رہتا تھا۔ اس سے فراغت کر کے پھر سو رہتے تھے۔ عصر کے وقت اُٹھ کر نماز پڑھی اور دیوان خانے میں جا بیٹھے۔ اس وقت سے نو دس بجے رات تک لوگوں سے ملنے کا وقت تھا۔'' ۶۲

مانوسؔ کا یہ بھی بیان ہے کہ انیسؔ غذا بہت سادہ اور مقدار میں کم کھاتے تھے، اور یہ بھی کہ وہ:

''پانی بھی بہت کم پیتے تھے۔ ہم لوگوں کو جب کبھی زیادہ پانی پیتے دیکھتے تو منع کرتے۔'' ۶۳

مرثیہ خوانی کے وقت وہ ضرورت پڑنے پر بھی پانی نہیں پیتے تھے۔ حیدر آباد کی مجلسوں میں:

''مرثیہ خوانی کے درمیان میں اگر اُن کا حلق سوکھ بھی جاتا تو پانی نہیں پیتے تھے۔'' ۶۴

عظیم آباد میں انیسؔ کی خواندگی کا بیان کرتے ہوئے شاد لکھتے ہیں:

''درمیان میں پانی پینا، کھنکھارنا، اس کا نام نہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ دو دو گھنٹے تک گرمیوں میں شدّومد سے پڑھ گئے مگر کیا مجال کہ پانی پئیں یا کھنکھاریں۔'' ۶۵

۱۸۷۴ء کا قریب قریب پورا سال انیسؔ کا بیماریوں میں گزرا۔ یہ ہجری سال ۱۲۹۱ تھا۔ رجب کے مہینے (ستمبر ۱۸۷۴ء) سے ساڑھے تین مہینے تک وہ شدید بیمار رہے۔ رمضان کے مہینے سے ورمِ جگر کی صورت میں اُن کا مرض الموت شروع ہوا۔ اُن کے بھائی میر مہر علی انس کے جس دوسرے خط کا اقتباس شروع میں دیا گیا ہے اس کے آخر کے کچھ فقرے یہ ہیں:

''حکیم میر باقر حسین، مرزا محمد علی حکیم کے شاگرد ہیں، وہ معالج ہیں اور معدے سے قوتِ ہضم کی بالکل جاتی رہی ہے، مگر ایسا علاج کر رہے ہیں کہ سب حکیم اُن کے نسخوں کو دیکھ کر مدح کرتے ہیں۔ علاج اور دعا دونوں ایسے ہو رہے ہیں کہ اگر بادشاہ بھی بیمار ہوتا تو اس کے لئے خلقت اس طرح دعا نہ کرتی...... آگے تقدیر اللہ سے کسی کا چارہ نہیں۔'' ۶۶

اسی زمانے میں انیسؔ کے ایک دوست میر آغا حسین دہلوی انھیں دیکھنے آئے۔ اس ملاقات کا

حال انھوں نے شوکت بلگرامی سے اس طرح بیان کیا:

''میں ایک دفعہ حالتِ مرض الموت میں میر صاحب کی عیادت کو گیا تو معلوم ہوا کہ زنان خانے میں تشریف رکھتے ہیں۔ اطلاع کی تو پردا کرواکے بلوایا۔ اندر گیا تو دیکھا کہ میر صاحب مرحوم لحاف سے منہ ڈھانپے لیٹے ہوئے ہیں اور میر نفیس مرحوم پہلو میں بیٹھے ہیں میں بھی انھیں کے پاس بیٹھ گیا اور پکار کے پوچھا ''میر صاحب، مزاج کیسا ہے؟'' اس کے جواب میں لحاف کے اندر ہی سے میر صاحب نے فرمایا کہ کیا کہوں؟

ضعف و نا طاقتی و سستی و اعضا شکنی

ایک گھٹنے سے جوانی کے گھٹا کیا کیا کچھ

میں چوں کہ اُن کی خدمت میں گستاخ تھا اس لیے بے باکانہ عرض کیا ''حضرت، یہ تو آپ میر تقی مرحوم کی زبانی اپنا حال بیان فرمارہے ہیں۔'' یہ سُن کے میر صاحب نے منہ پر سے لحاف اٹھایا، چند سیکنڈ تک بغوری میری طرف دیکھتے رہے اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کے فرمایا:

اک جوانی کیا گئی سو درد پیدا ہوگئے

تو ہی اے پیری بتا ہم کیا تھے اور کیا ہوگئے ۶۷

انھیں شوکت بلگرامی سے انیسؔ کے شاگرد اور خاص ملاقاتی سیّد علی یونس نے بیان کیا:

انتقال کی صبح یا اس کے ایک دن پہلے کا ذکر ہے کہ میر صاحب مرحوم سو کر اُٹھے تو میر مونسؔ مرحوم کو بلایا اور فرمایا کہ شب کو ایک مطلع خیال میں آیا ہے اس کو لکھ لو۔ ہمارے بعد خواہ اس پر سلام کہنا، خواہ غزل، چوں کہ میر مونسؔ مرحوم کو میر صاحب ہمیشہ غزل گوئی سے منع کرتے تھے اس لیے غزل کہنے کا اشارہ اس غرض سے کیا کہ ہمارے بعد تم کو غزل گوئی سے کون روکے گا اور اس کے بعد یہ مطلع جو حقیقتاً ان کی شاعری کا مطلع تھا۔ پڑھا کہ:

سب عزیز و اقربا نا آشنا ہوجائیں گے

قبر میں پیوند جتنے ہیں جدا ہوجائیں گے ۶۸

اور انھیں آخری دنوں میں میر مہر علی انسؔ نے حکیم سیّد علی کو پھر ایک خط لکھا:

''اب کیفیت مزاج کی یہ ہے کہ غذا بالکل ترک ہے۔ اگر سامنے آتی ہے تو اُبکائی آتی ہے، فقط

ایک جوجۂ مُرغ کہ آدھ پاؤ کا ہوتا ہے وہ یخنی بہ جبر پلوا دیتے ہیں اور کیفیت لاغری کی یہ ہے کہ پوست ہڈیوں پر لپٹا ہوا ہے اور ورم داہنے پاؤں کا گھٹنے تک پہنچ گیا ہے اور بائیں پاؤں کا گٹّے تک ہے۔ حکیم کہتے ہیں کہ کبد (جگر) پر ورم ہے، تبرید اور عرق جو حکیم تجویز کرتے ہیں فوراً تیار ہوتا ہے، کوئی دوا فائدہ نہیں کرتی۔ دن رات مجھے روتے گزرتی ہے۔ گھر میں آتا ہوں تو حضرت عباسؑ کے حال کا مرثیہ پڑھتا ہوں اور چیخیں مار مار کر روتا ہوں کہ میرے رونے سے سارا گھر چونک پڑتا ہے اور سب میرے ساتھ رونے لگتے ہیں۔ حکیم صاحب میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ اگر بھائی کو کچھ ہو گیا تو میری زندگی نہ ہوگی، بعد ان کے میری تیاری ہوگی اور آثار مجھے اچھے معلوم نہیں ہوتے...... شہروں شہروں دعا اُن کی صحت کی ہوتی ہے، کسی کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ حکیم بھی اپنی جان لڑائے علاج کر رہے ہیں، مگر مشیت ایزدی نہیں معلوم کیا ہے۔'' [۶۹]

مشیت ایزدی ۱۰ دسمبر ۱۸۷۴ء کو معلوم ہوگئی۔ اس دن (پنج شنبہ ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ) غروبِ آفتاب سے کچھ پہلے میر ببر علی انیسؔ نے اپنی محل سرا چوبداری محلّہ، چوک لکھنؤ میں انتقال کیا۔

اودھ اخبار لکھنؤ نے انیس کی وفات کی خبر دیتے ہوئے لکھا:

''کہتے ہیں حضرت مرزا دبیر...... اُن کی نعش پر جا کر بہت روئے اور فرمایا کہ ایسے معجز بیان، فصیح اللّسان اور قدر دان کے اُٹھ جانے سے اب کچھ لطف نہ رہا۔'' [۷۰]

انیسؔ کے مرثیوں کا یہ مجموعہ انیسؔ کی شاعری پر تبصرہ وتنقید کے بغیر پیش کیا جا رہا ہے تاکہ پڑھنے والے غیر مشروط ذہن کے ساتھ اس کلام کو پڑھ کر اپنا تاثر خود قائم کریں اور دیکھیں کہ انیسؔ کے یہاں کیا کیا ہے جو اردو شاعری میں اور کہیں نہیں ہے۔ ایک بات کی طرف اشارہ البتہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ انیسؔ کا ہر مرثیہ ایک مسلسل اور تیز رفتار طویل نظم ہے جس کی مجموعی کیفیت اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب اسے ایک ہی بار میں مکمل پڑھا جائے۔ اس طرح پڑھنے میں مرثیے کے مصرعے، بیتیں اور بند ایک بڑے کُل کے جز بنتے اور پورے مرثیے کی تشکیل میں صرف ہوتے چلے جاتے ہیں لیکن خود ان اجزا میں اپنی اپنی جگہ پر جو تہ در تہ معنویتیں اور پہلو بہ پہلو کیفیتیں ہیں ان کا صحیح علم اور احساس اُس وقت ہوتا ہے جب مرثیے کے ہر بند کو ایک نظم کی حیثیت سے پڑھا جائے اور اس پر غور کیا جائے۔ یعنی انیسؔ کا ہر مرثیہ خود کو دو طرح سے پڑھوانا چاہتا ہے اور یہ قاری کے ذوق پر منحصر ہے کہ وہ انیسؔ کے مرثیوں کو ایک طرح سے پڑھے یا دوسری طرح سے یا دونوں طرح سے۔

انیسؔ زندگی نامہ

۱: نام	سیّد ببر علی رضوی
۲: عرفیت	لکھنؤ میں بڑے میر صاحب بھی کہلاتے تھے
۳: تخلص	پہلے حزیںؔ تھا، پھر شیخ ناسخؔ نے بدلوا کر انیسؔ تجویز کیا۔
۴: ولادت	گلاب باڑی، فیض آباد، ۱۸۰۳ء
۵: والد	میر مستحسن خلیقؔ (ابنِ میر حسنؔ ابنِ میر ضاحکؔ)
۶: والدہ	ہنگا بیگم
۷: بھائی بہن	۱: میر مہر علی (اُنسؔ)
	۲: میر نواب (مونسؔ)
	۳: پیاری بیگم
	۴: بندی بیگم
	۵: آبادی بیگم
	۶: ہرمزی بیگم (انیسؔ سب سے بڑے تھے)
۸: اساتذہ	۱: حکیم میر کلو (درسیات میں)
	۲: مولوی میر نجف علی فیض آبادی (درسیات میں)
	۳: مولوی حیدر علی فیض آبادی (درسیات میں)
	۴: میر خلیق (غزل، مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی میں)
	۵: شیخ ناسخؔ (وقتی اور رسمی طور پر غزل میں)
	۶: میر امیر علی ابنِ میر کاظم علی سفید پوش دہلوی (سپہ گری میں)
۹: شاعری کی ابتدا	بچپن ہی سے شعر موزوں کرنے لگے تھے۔ گیارہ بارہ سال کی عمر سے غزل گوئی شروع کی۔ جب کلام میں پختگی آ گئی تو میر خلیق نے غزل گوئی سے روک کر مرثیہ وسلام کہنے میں لگا دیا۔ اس سے پہلے تیرہ چودہ سال کی عمر

میں گھر کی زنانی مجلس کے لیے مرثیے کے کچھ بند اور اس سے بھی پہلے ایک سلام کہہ چکے تھے۔

۱۰: مرثیہ خوانی کی ابتدا — قریب انیس سال کی عمر میں فیض آباد کے رئیس مرزا محمد ابراہیم عرف مرزا سیدو کے یہاں پڑھنے پر مقرر ہوئے۔

۱۱: شادی — تخمیناً ۱۸۲۲ء میں

۱۲: اہلیہ اور خسر — فاطمہ بیگم بنت میر احمد علی

۱۳: اولاد — بہ ترتیب ولادت

۱: میر خورشید علی (نفیس)

۲: عباسی بیگم

۳: مہندی بیگم

۴: میر عسکری (رئیس)

۵: میر محمد (سلیس)

۶: آغائی بیگم

۱۴: فیض آباد کی قیام گاہ کا پتہ: — فیض آباد عرف بنگلہ، محلہ راٹھ حویلی، متصل درِ دولتِ نواب شجاع الدولہ مرحوم (انیس کے ایک مرثیے کے قدیم مخطوطے سے منقول)

۱۵: لکھنؤ میں مرثیہ خوانی کی ابتدا: — پہلی مجلس اکرام اللہ خان کے امام باڑے، چوک میں یا مصطفٰے خان کے یہاں تحسین گنج میں پڑھی۔ اس کے بعد برابر لکھنؤ میں بلائے جانے لگے۔

۱۶: لکھنؤ میں مستقل سکونت — قریب ۱۸۴۶ء سے (بہ عہد امجد علی شاہ)

۱۷: لکھنؤ کی قیام گاہیں

۱: شیدیوں کا احاطہ

۲: سُبھٹی

۳: نخاس

۴: منصور نگر

۵: پنجابی ٹولہ (راجا کی بازار)، اور آخر میں
۶: سبزی منڈی، چوک

۱۸: آخری قیام گاہ کا پتہ: شہر لکھنؤ، عقبِ چوک، بہ سبزی منڈی، محلہ آئینہ سازاں، بہ مکانِ گھیسن آئینہ ساز (انیس کے نام ایک خط کے لفافے سے منقول) یہی علاقہ چوبداری محلہ بھی کہلاتا ہے، مکانِ انیس کو جانے والی گلی کا نام "کوچہ میر انیس" رکھا گیا ہے۔

۱۹: ملازمین: ۱: غلام عباس ۲: علی حسین ۳: راحت علی ۴: نجف علی ۵: میر اکبر علی (داروغہ) اور ۶: کسیا (مالی) کے نام ملتے ہیں۔

۲۰: سواری: پینس

۲۱: دلچسپیاں:
۱: کبوتر پالنے کا شوق
۲: ایک بلی پالنے کی بھی روایت ملتی ہے۔
۳: پتنگ لڑاتے تھے، پیچ نہیں لڑاتے تھے۔
۴: ورزش کرتے تھے۔
۵: حُقہ پینے کے عادی تھے اور فیض آباد کا تیز تمبا کو پسند کرتے تھے۔
: آم بہت شوق سے کھاتے تھے، خصوصاً بنارس کا لنگڑا آم
۷: اچھی اچھی چھڑیاں جمع کرنے کا شوق تھا۔
۸: عملیات سے دلچسپی تھی۔
۹: کتابیں جمع کرتے تھے۔ ذاتی کتب خانے میں دو ہزار کتابیں تھیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ایرانی خط میں شاہ نامہ فردوسی کا ایک باتصویر مخطوطہ بڑی قیمت (دوسو روپے) دے کر خریدا۔

۲۲: پسندیدہ شاعر	فردوسی
۲۳: مرثیہ خوانی کی مجلسیں	جب تک اودھ کی سلطنت باقی رہی، لکھنؤ سے باہر پڑھنے نہیں گئے۔ لکھنؤ میں نواب مبارک محل، دیانت الدولہ، وزیر اودھ نواب علی نقی خان، نواب امجد علی خان حضور ممتاز العلما سیّد تقی صاحب مجتہد اور دوسرے رئیسوں، معززین کے یہاں پڑھتے تھے۔ شاہی کے خاتمے کے بعد پٹنہ، بنارس، حیدرآباد دکن، الٰہ آباد کانپور وغیرہ مجلس پڑھنے گئے۔
۲۴: مرثیہ خوانی کا انداز	دیکھئے مقدّمہ
۲۵: حلیہ	" "
۲۶: لباس	" "
۲۷: غذا	" "
۲۸: کردار اور شخصیت	" "
۲۹: بیماریاں	جگر کی خرابی، تپ دق کا بھی شبہ کیا جاتا تھا
۳۰: آخر عمر	بہت دُبلے، کم زور اور دائم المرض ہو گئے تھے۔ مرثیہ پڑھنا تقریباً چھوڑ دیا تھا۔ پھر بھی بہت اصرار پر اگر تھوڑی دیر بھی پڑھتے تو سننے والوں کو مسحور کر لیتے تھے۔
۳۱: آخری مجلس	شیخ علی عباس وکیل کے یہاں (محلّہ پنجاری ٹولہ لکھنؤ) یا آغا ابو صاحب کے یہاں محلّہ ترمنی گنج لکھنؤ۔
۳۲: مرض الموت	ستمبر ۱۸۷۴ء سے بیماری بڑھ گئی۔ جگر پر ورم آ گیا اور پھر بستر سے اٹھ نہیں سکے
۳۳: وفات	۱۰ دسمبر ۱۸۷۴ء کو قریب شام اپنی محل سرا میں انتقال کیا۔
۳۴: تدفین	حکومت سے اپنے باغ میں خاندان کی میتیں دفن کرنے کی اجازت پہلے ہی حاصل کر لی تھی۔ ۱۰ اور ۱۱ دسمبر کی درمیانی شب اسی باغ میں اپنے بنوائے

ہوئے ایک کمرے میں دفن ہوئے۔ اب اس کمرے کی جگہ پر ایک مقبرہ تعمیر ہو گیا ہے۔ (عقب مسجد تحسین، چوک لکھنؤ)۔

۳۵: ۱: غزلیں زیادہ تر تلف کر دیں، پھر بھی کچھ غزلیہ کلام موجود ہے۔
۲: تقریباً دو سو مرثیے۔
۳: سوا سو کے قریب سلام۔
۴: کوئی چھ سو رباعیاں۔
۵: چند منقبتیں اور
۶: نوحے
۷: فارسی میں بعض قطعات اور
۸: کچھ خطوط، چھپ چکے ہیں۔
۹: غیر مطبوعہ کلام باقی ہے مگر نہیں کہا جا سکتا کہ کتنا ہے۔

۳۶: شاگرد: مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی میں پچاس کے قریب شاگردوں کا سراغ ملتا ہے۔ ان میں سے سب سے بڑے نام اور انیسؔ کے بڑے بیٹے میر خورشید علی نفیس ہوئے جن کے بیٹے سیّد خورشید حسن عرف دولھا صاحب عروج پر مرثیہ خوانی کے سحر آمیز فن کا خاتمہ ہو گیا۔

حواشی

۱ مکتوب میر مہر علی انس بہ نام حکیم سیّد علی (رمضان ۱۲۹۱ھ ذخیرۂ ادیب)۔

۲۔ مکتوب اُنس بہ نام حکیم سیّد علی (شوال ۱۲۹۱ھ) ذخیرۂ ادیب۔

۳۔ ''واقعاتِ انیسؔ'': مہدی حسن احسن۔

۴۔ ''حیاتِ انیسؔ''، امجد علی اشہرؔی۔

۵۔ انیسؔ کی ابتدائی زندگی کی تفصیلات کے لیے دیکھئے مضمون انیسؔ ''ابتدائی دور'' از نیّر مسعود، دو ماہی ''اکادمی'' لکھنؤ، جنوری، فروری ۱۹۸۷ء و مئی جون ۱۹۸۷ء اور ماہنامہ ''دائرے'' کراچی شمارے جنوری، فروری، مارچ، اپریل ۱۹۸۸ء۔

۶۔ ''امجد علی شاہ'' سبطِ محمد نقوؔی۔

۷۔ ''بوستانِ اودھ'': مہر سندیلوؔی۔

۸۔ عروجِ اردو'': سیّد خورشید حسن عرف دولھا صاحب عروؔج۔

۹۔ ''اودھ اخبار: لکھنؤ سہ شنبہ ۱۲۔ اپریل ۱۸۷۰ء مطابق یکم محرم ۱۲۸۷ھ (اقتباس بہ شکریہ ڈاکٹر اکبر حیدرؔی)۔

۱۰۔ ''میر انیس کا سفرِ دکن''، مضمون از سیّد آغا حسین ارسطو جاہی (ماہنامہ ''ہمایوں'' لاہور نمبر ۱۹۴۰ء)۔

۱۱۔ مضمون ''میر آل کے نادر خطوط'' از سیّد مسعود حسن رضوی ادیبؔ مشمولہ (''انیسیات'')۔

۱۲۔ سوانحِ عمری عروؔج از سیّد رضا عرف جھمّن مرثیہ خوان (مشمولہ ''دولھا صاحب عروؔج'' مرتبہ نیّر مسعود)۔

۱۳۔ میر انیسؔ کے نادر خطوط۔

۱۴۔ ''فکرِ بلیغ'': شاد عظیم آبادی (قلمی)۔

۱۵۔ حیاتِ انیسؔ۔

۱۶۔ مضمون ''میر انیسؔ کے ایک عقیدت مند رفیق کا بیان'' از مسعود حسن رضوی ادیب مشمولہ ''انیسیات'')۔

۱۷۔ مضمون: ''میر انیسؔ کی خوش آوازی، خوش بیانی اور مرثیہ خوانی'' از مسعود حسن رضوی ادیب (مشمولہ ''انیسیات'')۔

۱۸۔ میر انیسؔ کی خوش آوازی، خوش بیانی اور مرثیہ خوانی۔

۱۹؎ ''جدید جلد پنجم مرثیہ ہائے میر انیسؔ صاحب'' (مرثیہ: سب سے جدا روش مرے باغِ سخن کی ہے)۔

۲۰؎ میر انیسؔ کی خوش آوازی، خوش بیانی اور مرثیہ خوانی۔

۲۱؎ ''آبِ حیات'': محمد حسین آزاد۔

۲۲؎ مضمون ''میر علی محمد عارفؔ'' از۔ مرزا جعفر حسین (ماہ نامہ ''نیا دور'' لکھنؤ جمہوریت نمبر، جنوری ۱۹۷۸ء۔

۲۳؎ مضمون ''میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کا بنارس میں پہلی مرتبہ ورود''۔
اخبار ''طریقت'' جون پور یکم اکتوبر ۱۹۳۴ء

۲۴؎ ''فکرِ بلیغ''۔

۲۵؎ ''واقعاتِ انیسؔ''۔

۲۶؎ ''واقعاتِ انیسؔ''۔

۲۷؎ ''فکرِ بلیغ''۔

۲۸؎ ''فکرِ بلیغ''۔

۲۹؎ ''تاریخِ لکھنؤ'': حصہ اوّل زبدۃ العلماء سیّد آغا مہدی رضوی لکھنوی۔

۳۰؎ بیانِ میر معصوم علی سوز خوان۔ ذخیرۂ ادیبؔ۔

۳۱؎ بیان سیّد خورشید حسن بجنوری، ذخیرۂ ادیبؔ۔

۳۲؎ ہاتھی دانت پر مصوری کا فن لکھنؤ میں دہلی سے آیا تھا۔ لکھنؤ میں ہاتھی دانت کے دہلوی فن کاروں کے سلسلے کے آخری باکمال مصور مرزا مغل بیگ تھے جنھوں نے اپنے فن کی ناقدری سے مجبور ہو کر فوٹو گرافی کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ میرے سامنے والدِ مرحوم پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے انھیں انیسؔ کی مذکورہ تصویر دکھائی تھی۔ مرزا مرحوم نے اسے فن کا اعلیٰ نمونہ بتایا اور یہ خیال بھی ظاہر کیا تھا کہ یہ تصویر انھیں کے بزرگوں میں سے کسی کی بنائی ہوئی ہے (نیر مسعود)۔

۳۳؎ یہ تصویر میر خورشید علی نفیس کے نواسے میر علی محمد عارفؔ کے خاندان میں موجود ہے۔ ذخیرۂ ادیبؔ میں اس تصویر سے مشابہ انیسؔ کی ایک دُھندلی رنگین تصویر ہے۔

یہ اصل میں ایک مٹامٹا سا فوٹو گراف ہے جسے کسی بدسلیقہ مصور نے رنگ پھیر کر اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ شادؔ عظیم آبادی کے بیان کے مطابق انیسؔ کا ایک فوٹو مشکور الدولہ نے کھینچا تھا (فکرِ بلیغ) مشکور الدولہ واجد علی شاہ کے درباری مصور ہیں جنھوں نے شاہی کے خاتمے کے بعد فوٹو گرافی شروع کر دی تھی۔ وہ ہندوستان کے اوّلین فوٹو گرافروں میں تھے۔ ذخیرۂ ادیبؔ والی تصویر مشکور الدولہ کی کھینچی ہوئی ہو سکتی ہے اس پر کچھ عبارت بھی لکھی ہوئی ہے جو قریب قریب اڑ چکی ہے لیکن اس میں انیسؔ کا لفظ پڑھنے میں آ جاتا ہے۔ (نیر مسعودؔ)۔

۳۴ ''مضمون'' میر انیسؔ کی شخصیت اور مزاجی کیفیت (از نیر مسعودؔ ''نیا دور'' لکھنؤ دسمبر ۱۹۷۸ء۔

۳۵ منقبت از انیسؔ (مشمولہ ''انیس المناقب'')۔

۳۶ ''انیسؔ کے عقیدت مند رفیق کا بیان''۔

۳۷ ''واقعاتِ آہ''۔

۳۸ ''وضع دارانِ لکھنؤ'': سیّد محمد ہادی۔

۳۹ ''واقعاتِ انیسؔ''۔

۴۰ مضمون ''میر انیسؔ کا سفر حیدرآباد'' از مسعود حسن رضوی ادیبؔ مشمولہ ''انیسیات''۔

۴۱ مکتوب میر خورشید علی نفیس بنام مرزا غلام محمد، مورخہ ۲ شوال ۱۲۸۰ھ (۱۱ مارچ ۱۹۶۴ء بہ شکریہ میر علی محمد واثق نبیرۂ عارفؔ)۔

۴۲ ''حیاتِ انیسؔ''۔

۴۳ ''میر انیسؔ کے ایک عقیدت مند رفیق کا بیان''۔

۴۴ مضمون ''میر انیسؔ کے سفر حیدرآباد کا روزنامچہ از مسعود حسن رضوی ادیبؔ (مشمولہ ''انیسیاتؔ'')۔

۴۵ میر انیسؔ کے سفرِ حیدرآباد کا روزنامچہ۔

۴۶ ''میر انیسؔ کے ایک عقیدت مند رفیق کا بیان''۔

۴۷ میر انیسؔ کے ایک عقیدت مند کا بیان''۔

۴۸؎ ''آبِ حیات''۔
۴۹؎ ''حیاتِ انیس''۔
۵۰؎ ''فکرِ بلیغ''۔
۵۱؎ ''آبِ حیات'' (احوالِ آتش)۔
۵۲؎ ''فکرِ بلیغ''۔
۵۳؎ ''حیاتِ انیس''۔
۵۴؎ ''حضرتِ رشید'' سیّد آغا شہر لکھنوی۔
۵۵؎ ''دیوانِ ذوق'' مرتبہ محمد حسین آزاد اور ''آبِ حیات''
۵۶؎ ''میر انیس کا سفر حیدر آباد''۔
۵۷؎ ''میر انیس کے ایک عقیدت مند رفیق کا بیان۔''
۵۸؎ ''بیان میر سیّد علی مانوس'' ذخیرۂ ادیب''۔
۵۹؎ مضمون ''میر انیس کے کچھ چشم دید حالات'' از مسعود حسن رضوی ادیب (''مشمولۂ انیسیات'')۔
۶۰؎ ''بیان میر سیّد علی مانوس''۔
۶۱؎ ''مکتوب میر نفیس بہ نام حکیم سیّد علی ذخیرۂ ادیب۔
۶۲؎ ''بیان میر سیّد علی مانوس''۔
۶۳؎ ''بیان میر سیّد علی مانوس''۔
۶۴؎ ''دکن میں مرثیہ اور عزاداری ۱۸۵۷ء تا ۱۹۵۷ء'': ڈاکٹر رشید موسوی۔
۶۵؎ ''فکرِ بلیغ''۔
۶۶؎ مکتوب میر مہر علی انس ۔ بہ نام حکیم سیّد علی۔
۶۷؎ مضمون ''انیس کا ابتدائی اور انتہائی کلام'' از سیّد کاظم علی شوکت بلگرامی (مجلّہ ''اردوئے معلی۔ علی گڑھ جلد ۱۱ نمبر ۶۔ جون ۱۹۱۰ء مدیر حسرت موہانی) اقتباس بہ شکریہ ڈاکٹر اکبر حیدری۔
۶۸؎ ''انیس کا ابتدائی اور انتہائی کلام'' (میر سیّد علی مانوس کا بیان ہے کہ انیس نے

وفات سے دو تین روز پہلے ایک سلام سب عزیز و آشنا...... الخ'' کہا تھا۔ لیکن مونسؔ کی روایت زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کہ انیسؔ نے صرف مطلع کہا تھا۔ انیسؔ کے سلاموں کے مطبوعہ مجموعوں میں اس زمین میں انیسؔ کا کوئی سلام نہیں ہے۔ اسی مطلع کے ساتھ انیسؔ کے بھتیجے میر ہادی وحید کا ایک بہت عمدہ سلام ''ریحان غم'' جلد دوم (قلمی، ذخیرۂ ادیبؔ) میں موجود ہے اس میں اٹھائیس شعر ہیں۔ اس کے سولہ شعر (مع مطلع) سلاموں کے عظیم مجموعے ''شمعِ تعزیت'' (مرتبہ سیّد محمد عنایت حسین متین سامانی سہارن پوری) میں انیسؔ کے بیٹے میر محمد سلیس کے نام سے شامل ہیں۔ میر مونس کے سلاموں کے مجموعے ''دیوانِ فصاحت عنوان'' میں اس زمین میں کوئی سلام نہیں ہے۔ میر علی احمد دانش نبیرۂ عارف کے ذخیرے میں اسی مطلع کے ساتھ گیارہ شعروں کا ایک معمولی سا بے مقطع سلام موجود ہے جس کے کچھ مصرعے وحیدؔ کے سلام سے ملتے جلتے ہیں۔ (نیر مسعودؔ)۔

۶۹ مکتوب میر مہر علی انس بنام حکیم سیّد علی۔ شوال ۱۲۹۱ھ ذخیرۂ ادیبؔ۔

۷۰ مضمون ''مرگِ انیسؔ'' از قاضی عبدالودود (مجلّہ ''معاصر'' پٹنہ، شمارہ نمبر ۱)۔

میر انیسؔ:

نانِ جویں

تھا تارکِ لذآتِ جہاں شاہِ ولایت — جز ''نانِ جویں'' تھی نہ کسی کھانے سے رغبت
مسکینوں سے الفت تھی فقیروں سے محبت — اندھوں کی ضعیفوں کی کیا کرتے تھے خدمت
دے آنا کھلا آنا یہ کام آٹھ پہر تھے
رانڈوں کے تو وارث تھے یتیموں کے پدر تھے

مغموموں کے مظلوموں کے گھر آپ تھے جاتے — اور ہاتھ سے اپنے انھیں کھانا تھے کھلاتے
سر داب‌تے شفقت سے کبھی پاؤں دباتے — آہستہ اُٹھاتے انھیں آہستہ بٹھاتے
عُسرت میں فقیروں کو کھلا آتے تھے اکثر
ننگوں کو ردا اپنی اُڑھا آتے تھے اکثر

فاقوں میں جو کھانا کبھی آتا تھا میسّر — سائل کو کھلا لیتے تھے تب کھاتے تھے حیدرؑ
آدم ہوئے اس کے لیے جنت سے جو باہر — گندم کی نہ روٹی رکھی حضرت نے زباں پر
کیا صبر تھا قبضے میں تو سب روئے زمیں تھی
تھا زور تو یہ اور غذا ''نانِ جویں'' تھی

پروفیسر ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز (صدر شعبۂ اردو لندن یونیورسٹی)
انگریزی سے ترجمہ:- ڈاکٹر ماجد رضا عابدی

اُردو مرثیہ، میر انیسؔ اور جنگِ کربلا

اردو مرثیہ، ایک طویل نظم جو جنگِ کربلا اور شہادتِ حسینؑ کے موضوع پر لکھی جاتی ہے، انیسویں صدی کے درمیان اپنے بامِ کمال پر پہنچا۔ اُس عہد کے نمائندہ شاعر ''میر ببر علی انیسؔ'' تھے جو اُن بہت سے اہم اردو شعرا کی طرح لکھنؤ آئے جن کا تعلق دہلی سے تھا۔ اس کتاب میں انیسؔ کے بہترین مرثیوں میں سے ایک مرثیے ''جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے'' کا انگریزی ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس مرثیے میں محرم کے دسویں دن یعنی عاشور کے واقعات کا ذکر ہے جو حسینؑ کی نتیجہ خیز جنگ کی تیاریوں سے شروع ہوتا ہے اور ان کی شہادت اور افرادِ خاندان کی اسیری پر ختم ہوتا ہے۔

فنِ مرثیہ کو بنیادی طور پر شیعہ مسلمانوں نے ہی ترقی دی اور مرثیہ زیادہ تر محرم کے پہلے عشرے کی مجلسوں میں پڑھا جاتا ہے کہ جب واقعۂ کربلا دہرایا جاتا ہے اور شیعوں کے تیسرے عظیم امام ''حسینؑ'' پر ماتم کیا جاتا ہے۔ شیعہ نقطۂ نگاہ سے حسینؑ اور انصارِ حسینؑ رسولؐ مقدس کے اصل وارث تھے اور حق پر تھے جب کہ اموی دشمن جن کی قیادت یزید کر رہا تھا وہ ظالم، بے اصول اور حسینؑ کے حقوق کے غاصب تھے۔ شاعر کا اصل مقصد صاحبِ فکر و بصیرت سامعین کے جذبات کو اپنی قوتِ بیان سے ابھارنا ہوتا ہے۔ زبانی اور اسلوبی نقطۂ نظر سے مرثیہ ایک عظیم مرقّع ہے، جس میں خوبصورت لفظیات اور قدیم شاعری کے خدوخال نظر آتے ہیں۔

محرم برِّصغیر میں آج بھی شیعوں کے بڑے تہواروں میں سے ہے اور اس کی بہت سی روایتیں اور انداز دنیا کے اسی خطّے میں عام ہیں۔ مرثیہ مجلس کا ایک اہم رکن ہے۔ جس کی مثال اسلامی عربی و فارسی ادب میں بھی نہیں ملتی اور اس کا مقابلہ کوئی دوسری صنف نہیں کر سکتی۔

انیسؔ کو اردو کا قدیم و بہترین شاعر کہا جاتا ہے اور ہم یہ امید کرتے ہیں کہ یہ ترجمہ کسی حد تک انیسؔ کے شاعرانہ فن کی عکاسی کرے گا۔

اردو مرثیہ اور جنگِ کربلا

عربی لفظ ''مرثیہ'' کے معنی ''نوحہ'' کرنے کے ہیں اور یہ اصطلاح کسی بھی ایسی نظم کے لئے استعمال کی جاتی ہے جو کسی کی موت پر ماتم کرنے اور غم منانے کے لئے کہی جائے۔ جب کہ اردو مرثیہ جسے انیسویں صدی میں لکھنؤ کے شاعر انیسؔ اور ان کے معاصرین نے اجاگر کیا ایک ایسی طویل بیانیہ نظم کو کہتے ہیں جو ۶۷۹ء میں وقوع یافتہ شہادتِ حسینؑ کے متعلق لکھی جائے۔ ان مرثیوں میں اُن واقعات کا ذکر ہے جو اس مشہور جنگ کے دوران پیش آئے۔ مرثیہ اس وقت لکھا گیا جب زبان اپنی ترقی کی بلندیوں پر تھی۔ مرثیہ اردو کا خاصہ ہے جس نے ہر زمانے میں اردو شعرا کو متاثر کیا۔ اس جیسی کوئی مثال فارسی اور عربی ادب میں نہیں ملتی۔

اس کتاب میں جس مرثیے کا انگریزی ترجمہ کیا گیا ہے وہ اپنے عہد کے عظیم نمائندے میر انیسؔ (۱۸۰۳ - ۱۸۷۴) کے بہترین مرثیوں میں سے ایک ہے۔ اس مرثیے میں روایتی لکھنوی شاعری کے انداز میں اُن واقعات کا ذکر ہے جو عاشورۂ محرّم کو پیش آئے۔ یہ مرثیہ صبح دم جنگی تیاریوں سے شروع ہوتا ہے اور بوقتِ عصر اپنے ممدوح ''حسینؑ'' کی شہادت پر ختم ہوتا ہے۔ یہ واقعات شیعہ سامعین کے سامنے دہرائے جاتے ہیں جن کے اذہان ان واقعات سے آشنا ہوتے ہیں۔ شاعر کا مقصد اُن لوگوں کے جذبات ابھارنا اور دلوں کو جھنجھوڑنا ہوتا ہے جو اپنے آقا حسینؑ کی شہادت پر رونے کے لئے جمع ہوتے ہیں، وہ آقا کہ جس کا بے دردی سے قتل کیا گیا اور اس کا حق ایک ظالم و بے اصول دشمن یزید کے ہاتھوں چھن گیا۔

بہت سے عظیم مرثیہ نگار شیعہ تھے۔ شاعری کے اسلوب اور اس کے معاشرتی اثرات پر گفتگو کرنے سے پہلے ہم اس تاریخی واقعے کا پس منظر شیعی نقطۂ نظر سے پیش کرتے ہیں۔ وہ تاریخی واقعات جو جنگ کربلا سے متعلق ہیں، عرب مؤرخوں نے تحریر کئے ہیں اور ان حقائق میں تضاد بھی نہیں ہے، غیر متعصبانہ زاویے سے یہ سب کے یہاں ایک سے ہیں۔ جہاں تک واقعات کے تجزیئے اور اُن کرداروں کا تعلق ہے جنھوں نے اپنی ذات میں ایک اہم کردار ادا کیا، ان میں شیعہ و

سنی آپس میں اختلاف رکھتے ہیں۔ انیسویں صدی کے مرثیہ نگاروں کے افکار کی روشنی میں خلاصۂ کربلا مندرجہ ذیل ہے۔

اپنی حیات کے دوران پیغمبر محمدؐ نے جن کا تعلق قریش سے تھا کوئی جانشین مقرر نہیں کیا جب کہ[1] بہت سے عرب یہ سمجھتے تھے کہ انؐ کے قریبی عزیز علیؑ انؐ کی وفات کے بعد جانشین ہوں گے۔ خُم کے مجمع میں محمدؐ نے اپنی تقریر میں کہہ دیا تھا کہ علیؑ میرے لئے ایسے ہیں جیسے ہارونؑ موسیٰؑ کے لئے تھے۔ (یہ حدیث رسولؐ نے غزوۂ تبوک کے موقع پر کہی جب علیؑ کو ساتھ نہیں لے گئے تھے)۔ اس بات نے بھی کچھ لوگوں کے شکوک رفع کر دیئے۔ ایک مرتبہ جب پیغمبرؐ علیل ہوئے تو اپنے صحابی ابوبکر کو نماز کی امامت سونپی اب یہ بات اختلافِ انتخاب کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ محمدؐ کی وفات کے وقت بھی جانشینی کا مسئلہ نزاعی تھا۔ بنی ہاشم علیؑ کے حق میں تھے، باقی قریش کے تمام قبائل انتخاب پر زور دے رہے تھے جو اسلامی جمہوری نظام کے مطابق ہو۔ نتیجتاً ابوبکر کو جو خود بوڑھے تھے خلیفہ منتخب کر لیا گیا۔ علیؑ ایک مضبوط شعورِ انصاف کے مالک تھے، انھوں نے اکثریتی فیصلے کو مان لیا اور پھر انھوں نے عمر اور عثمان کے یکے بعد دیگرے خلیفہ ہونے پر بھی شکایت نہیں کی۔[2]

ابوبکر اور عمر نے اپنے فرائض خوب نبھائے اور اسلامی اعتقادات اور حدود کو پھیلانے کی تگ ودَو کی۔ تیسرے خلیفہ عثمان کافی بوڑھے تھے اور حکمرانی کے لئے کمزور قویٰ رکھتے تھے۔ عام طور سے یہ چیزیں حکمرانی کے لئے ناموزوں خیال کی جاتی ہیں۔ عثمان نے اپنے خود پرست بھتیجے مروان کو اپنا وزیر منتخب کیا اور کُھلے اختیارات کار دے دیئے۔ مروان نے محمدؐ کے پرانے دشمن ابوسفیان[3] کے بیٹے معاویہ کو ایک زرخیز صوبے شام کا گورنر مقرر کیا اور شرابی ولید کو عراق میں کوفے کا گورنر بنا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ بعض اوقات ولید اتنا پئے ہوئے ہوتا تھا کہ منبر تک آنے کے لئے اسے سہارے کی ضرورت پڑتی تھی اور شراب پی کر ہی نماز پڑھاتا تھا۔ معاویہ اپنے شامی محکومین پر تشدد کرتا تھا، ان سے زبردستی رقم وصول کرتا تھا۔ اس کی نظریں ہمہ وقت خلافت کی گدی پر رہتی تھیں جو عثمان کی گرتی ہوئی صحت کے تناظر میں جلد خالی ہونے والی تھی۔ شام وعراق کے گورنروں کی شکایتیں خلیفہ کے پاس آنے لگیں۔ جب زیادتیاں حد سے بڑھ گئیں تو آخر کار ایک جمِ غفیر مدینے پہنچا اور دھرنا دے دیا۔ عثمان کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے۔ علیؑ خلیفہ کی مدد کرنے کے لئے خود آئے اور لوگوں سے وعدہ کیا کہ ان کے مسئلے حل کئے جائیں گے۔ علیؑ نے خلیفہ کو ہدایت کی کہ انھیں تحریری ضمانت دے دیں اور اس بات پر وہ لوگ باطمینان مدینے سے واپس چلے گئے۔ اسی دوران مروان

نے معاویہ کو ہدایت کی کہ جیسے ہی یہ لوگ شام واپس پہنچیں انھیں قتل کر دو۔ وہ جماعت ابھی کچھ دور ہی گئی تھی کہ ان کو معلوم ہو گیا کہ ان کے لئے کیا منصوبہ بندی کی گئی ہے۔ اُن کو اس دھوکے بازی پر غصہ آیا وہ مدینے واپس ہوئے اور عثمان کو قتل کر دیا۔ اس انتشار و خلفشار کے بعد علی کو غیر متنازعہ خلیفہ چن لیا گیا۔ اس انتخاب کو خوش دلی سے قبول کرتے ہوئے علی نے کہا کہ اگر کوئی ان سے بہتر مل جائے تو وہ پیچھے ہٹ جائیں گے۔

علی کی پہلی حکمتِ عملی یہ تھی کہ انھوں نے اُن سب کو حکومت سے ہٹانا شروع کر دیا جن کو عثمان نے نامزد کیا تھا۔ ظاہری بات ہے معاویہ اپنے نفع بخش منصب کو چھوڑنے پر تیار نہ تھا اور بغاوت پر آمادہ ہو گیا۔ علی کے ایک بہادر، وفادار و جاں نثار دوست مالکِ اشتر نے کئی مرتبہ معاویہ کے لشکر کو روندا اور مکمل شکست دینے ہی والے تھے کہ معاویہ قرآن کے صفحات نیزوں پہ بلند کر کے میدان میں آ گیا اور جذباتی تقریروں میں یہ کہا کہ مجھے شکست مت دو اس لئے کہ عرب کی سرحدوں پر ترک اور ایرانی افواج اس بات سے عرب کی مخالفت میں فائدہ اٹھا سکتی ہیں اس لئے عرب اس کے خلاف نہ لڑیں۔ حضرت علی نے مالکِ اشتر کو واپس بلا لیا اور اس بات پر قائم ہوئے کہ مسئلے کا حل ثالثی و مصالحت سے طے ہو گا۔ علی کے چند ساتھیوں نے اس بات کی مخالفت کی اور کہا کہ خدا سب سے بڑا ثالث اور فیصلہ کرنے والا ہے اور علی کو چھوڑ کر چلے گئے۔ یہی لوگ خارجی کہلاتے ہیں۔ معاہدہ یہ ہوا کہ علی اور معاویہ دونوں کو خلافت نہیں ملے گی۔ علی کے ترجمان نے یہی فیصلہ پیش کیا اور علی بھی اس پر رضامند ہوئے لیکن معاویہ کا معتمدِ خاص عمرابن العاص اس بات پر ڈٹا رہا کہ معاویہ کو خلیفہ بنایا جائے۔ کچھ عرصے کے بعد علی کو نماز کے دوران مسجدِ کوفہ میں شہید کر دیا گیا۔ آخری سانسیں لیتے ہوئے علی نے سختی سے منع کیا کہ ان کے قاتل کو بھی صرف ایک ہی ضربت لگائی جائے اور اس پر تشدد نہ کیا جائے۔

خوبصورت اور صوتِ حسن کے مالک علی کے بڑے صاحبزادے حسن کو خلافت کے لئے سامنے لایا گیا۔ معاویہ ایک مرتبہ پھر لڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ حسن نے جنگ کے سدِ باب کے لئے اپنا حق چھوڑ دیا۔ حسن کو معاویہ کے کہنے پر زہر دے دیا گیا اور پھر حسن کے بعد معاویہ خلیفہ بن گیا۔

معاویہ غاصب اور قاتل تھا۔ اپنے مقصد کے حصول کے لئے کوئی چیز اس کے مانع نہیں ہوتی تھی۔ اس کے مختصر لیکن اقربا پرور اور امرا نواز دورِ حکومت میں نئی طرزِ جمہوریت سامنے آئی اور دورِ جاہلیت و بُت پرستی کے طور طریقے واپس آ گئے۔ مرنے سے پہلے اس نے اپنے بیٹے یزید کو خلیفہ

نامزد کر کے اس وعدے کی خلاف ورزی کی کہ حسنؓ کے بعد حسینؓ خلیفہ ہوں گے۔

سنی اور شیعہ دونوں یزید کو بُرا کہتے ہیں۔ امیر علی نے اپنی کتاب ''روحِ اسلام'' میں یزید کے بارے میں لکھا ''اُس کے گھٹیا اور پست کردار میں رحم اور انصاف نہیں تھا۔ وہ انسانوں کو اذیت دے کر خوش ہوتا تھا۔ یزید اور اس کے قریبی ساتھی مرد و عورت دونوں جنسوں کے شوقین تھے۔ ایسا خلیفہ تھا، مومنوں کا حکمران''۔

بالآخر کوفے کے لوگ یزید کی زیادتیوں سے تنگ آ گئے۔ کوفے کے لوگوں نے حسینؓ سے مدد مانگی کہ انھیں اس ظالم خلیفہ سے نجات دلائیں۔ حسینؓ نے جواب دینے کا فیصلہ کیا اور اپنے چچازاد بھائی مسلم ابنِ عقیل کو کوفے کے حالات سمجھنے کے لئے بھیجا۔ مسلمؓ نے حسینؓ کو خط لکھا کہ کوفے کے لوگوں کی اکثریت آپ کے ساتھ ہے۔ اس خط کے ملنے پر حسینؓ نے سفر کا ارادہ کیا۔ اسی اثنا میں کوفے کے گورنر عبیداللہ ابنِ زیاد کو مسلمؓ کی موجودگی کے بارے میں معلوم ہوا اور ان کو گرفتار کر لیا گیا۔ ایک ایک کر کے ان کے تمام کوفے کے دوست خوف زدہ ہو کر انھیں چھوڑ گئے۔

اُدھر حسینؓ نے اپنے بہادر بھائی عباسؓ اور اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ جن میں زیادہ تر بچے اور خواتین تھیں ریگستانِ عرب کو پار کیا اور عراق میں داخل ہوئے ہی تھے کہ مسلمؓ کی شہادت کی خبر ملی۔ ان کو اس بات کا بھی احساس ہو گیا کہ فوجِ یزید سے جنگ کی صورت میں انھیں کوفیوں سے کوئی مدد نہیں ملے گی۔ اس کے باوجود انھوں نے سفر جاری رکھا تاکہ حق اور انصاف کی مکمل ادائیگی ہو۔

تیسری محرم کو حسینؓ اور ان کے رفقائے خاص کی جماعت فرات کے کنارے واقع سر زمینِ کربلا پر پہنچی اور پھر جلد ہی بے رحم اور درندہ صفت[۵] عبیداللہ ابنِ زیاد وہاں آ پہنچا۔ لشکر امیہ ہزاروں کی تعداد میں ہونے کے باوجود علیؓ کی معجزاتی تلوار ''ذوالفقار'' کے سامنے آتے ہوئے ڈر رہا تھا سو انھوں نے اپنی چال بازی اور عیاری سے کام لیتے ہوئے حسینؓ پر پانی بند کر دیا۔ اس ناقابل برداشت صورتِ حال کو دیکھ کر حسینؓ نے ابنِ زیاد کے سامنے تین تجاویز رکھیں کہ: انھیں بلا زحمت و ایذا مدینے واپس جانے دیا جائے یا دوسری ترک سرحدوں کی طرف جانے دیا جائے یا یزید سے مذاکرات کرنے دیئے جائیں۔ اس آخری تجویز سے شیعہ علما اختلاف رکھتے ہیں کہ ایسی کوئی تجویز پیش نہیں کی گئی۔

عبیداللہ ابنِ زیاد اسی بات پر مُصر تھا کہ حسینؓ بغاوت کا اعتراف کریں اور سلطنتِ

بنوامیہ کے باغی کی حیثیت سے خلیفہ کے سامنے آئیں۔ آخر کار حسینؓ نے دشمنوں سے کہا کہ چاہے مجھے قتل کر دو لیکن میرے خاندان والوں اور دوستوں کی جان چھوڑ دو۔ حسینؓ سے والہانہ عقیدت اور نواسۂ رسولؐ پر تسلطِ جنگ سے خوف زدہ ہو کر حر، جو یزیدی لشکر کا سردار تھا جنگی حدود کو پار کر کے حسینؓ کے ساتھ مل گیا اور دوسروں کو بھی ایسا کرنے کی ترغیب دی۔ سنگ دل ابنِ زیاد نے اپنے آدمیوں کو جنگ کی تیاریوں کا حکم دیا۔

دس محرم کی صبح سے لڑائی شروع ہوئی اور اس وقت تک جاری رہی جب حسینؓ اپنے بے کس خاندان کی حفاظت کے لئے تنہا رہ گئے۔ وہ اپنے خیمے میں داخل ہوئے اور اپنے شیر خوار بیٹے علی اصغر کو اپنے ہاتھوں پر اٹھایا، دشمن کی طرف سے ایک تیر آیا اور بچے کے گلے میں پیوست ہو گیا۔ زخمی اور خون آلود حسینؓ نے دشمنوں پر ایک بھرپور حملہ کیا جو حسینؓ کے حملے سے پسپا ہو گئے۔ آخر کار حسینؓ گھوڑے سے گر گئے، سنان (ابنِ انس) کی بزدل فوج نے حسینؓ کو گھیر لیا، ان کا سر کاٹا گیا اور نیزے پر بلند کر کے فتح مندانہ کوفے کی طرف روانہ ہوئے۔ عورتوں کو قید کر کے شام بھیجا گیا جہاں یزید ان کا انتظار کر رہا تھا۔ لشکرِ حسینؓ کے تمام مرد قتل ہو گئے سوائے علی زین العابدین کے جنھیں حسینؓ کی بہن زینبؓ نے قتل ہونے سے بچا لیا تھا۔ زین العابدینؒ جو آخری بادشاہِ فارس یزدجرد کی بیٹی کے بطن سے تھے شیعوں کے چوتھے امام اور روحانی پیشوا ہیں۔

بنوامیہ نے کم و بیش ایک صدی دمشق پر جبر و استبداد کے ساتھ حکومت کی۔ وہ لوگ جنھوں نے حسینؓ کی مدد کی تھی یا تو وہ مار دیئے گئے یا پھر قیدی بنا لئے گئے اور یوں مدینے کو بھی تاراج کر دیا گیا۔ امیر علی کے لفظوں میں: ''وہ شہر جس نے آنحضرتؐ کو بت پرستوں کی ایذا رسانی سے پناہ دی، وہ مقدس زمین جس پر انھوں نے اپنی زندگی گزاری اور جس کا ذرہ ذرہ آپؐ کے وجود اور کارِ عظیم کی وجہ سے مقدس بن گیا تھا بے حرمتی کا نشانہ بنایا گیا۔ مساجد کو اصطبل اور مزار و مقابر کو زیورات کی نمائش کے لئے تہس نہس کر دیا گیا۔ امیہ کے پورے دورِ حکومت میں یہ مقدس شہر درندہ صفت انسانوں کا اڈہ بنا رہا، مکّے کے بت پرست ایک مرتبہ پھر فتح مند ہوئے''۔

مندرجہ بالا تفصیل کربلا لکھنؤ کے مرثیہ نگاروں کی عکاسی کرتی ہے۔ یہ بات باور کرا دینا ضروری ہے کہ بہت سے سنی نہ تو عثمان کے دورِ حکومت کی تفصیل کو مانیں گے اور نہ ہی کردار معاویہ کے تجزیے کو لیکن یہ ضرور مانیں گے کہ یزید کو اپنا وارث بنانا معاویہ کی غلطی تھی۔ حضرت علیؓ کو شیعہ اور سنی دونوں ایک طرح مانتے ہیں اور امام حسینؓ کی شہادت بھی عالمی طور پر منائی جاتی ہے اور محرم میں

سنی بھی شہادتِ حسینؑ مناتے ہیں۔ بہت سے سنیوں کے مطابق یزید بھی پشیمان تھا کہ امام حسینؑ شہید کر دیئے گئے اور ابنِ زیاد کو امام کے ساتھ ایسا سلوک کرنے پر ملامت بھی کی جب کہ دوسری جانب شیعہ کھلم کھلا تینوں خلفا کی مذمت کرتے ہیں اور ان کے مطابق یہ تینوں حقِ علیؑ کے غاصب تھے۔ عام طور سے اردو مرثیہ نگار بہت وسیع تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ وہ یزید اور اس کے حواریوں میں کوئی اچھی صفت نہیں پاتے جب کہ دوسری طرف حسینؑ اور ان کے خاندان کو عظیم اور خدائی صفات کا حامل گردانا جاتا ہے کہ جن کا قول و فعل غلط نہیں ہوتا۔

انیسؔ اور اردو مرثیہ:

میر ببر علی انیسؔ ۱۸۰۲ء میں فیض آباد کے ایک عظیم اور زرخیز خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا میر غلام حسین ضاحکؔ جو کہ مشہور اردو شعرا سوداؔ اور میرؔ کے ہم عصر تھے دہلی میں اپنی ہجویہ اور مزاحیہ شاعری کی وجہ سے پہچانے جاتے تھے۔ سوداؔ نے بھی کئی ہجویں ان کے موضوع پر لکھیں۔ اٹھارھویں صدی کے کئی دوسرے اردو شعرا کی طرح میر ضاحکؔ نے فیض آباد کی طرف ہجرت کی۔ اس دور کے شعرا اپنی گذر بسر کے لئے نوابین و رؤسا وغیرہ کی سرپرستی پر ہی بھروسا کرتے تھے۔ فیض آباد زوالِ سلطنتِ دہلی کے بعد ایک زرخیز ثقافتی مرکز بن گیا تھا۔

میر ضاحکؔ اپنے بیٹے میر غلام حسنؔ (انیسؔ کے دادا) کے ہمراہ تھے۔ میر حسنؔ ایک مشہور مثنوی ''سحرالبیان'' کے مصنف تھے۔ انھوں نے اردو شاعری کا ایک دیوان بھی لکھا جو ان کی زندگی ہی میں بہت سراہا گیا۔ آصف الدّولہ نے اپنا دارالحکومت فیض آباد کے قریب لکھنؤ میں منتقل کیا جہاں بڑی تعداد میں امام باڑے قائم تھے۔ میر حسنؔ نے بھی اپنی رہائش وہاں منتقل کر لی اور ساری زندگی لکھنؤ میں گزار دی کہ جہاں شیعہ حکمرانوں کی حکومت تھی اور اس شہر نے اپنے آپ کو اردو کے مرکز کے طور پر پہچنوایا۔ میر حسنؔ ۱۷۹۵ء میں انتقال کر گئے۔

میر حسنؔ کے بیٹے اور میر انیسؔ کے والد میر مستحسن خلیقؔ اپنی زندگی میں ایک بڑے شاعر مانے جاتے تھے اور مصحفیؔ سے مشورہ کرتے تھے جو شاعری میں نواب سلیمان شکوہ کے استاد تھے۔ گو کہ انھوں نے دوسرے شاعروں کی طرح غزل اور دیگر اصنافِ شاعری میں بھی طبع آزمائی کی لیکن وہ خصوصاً اپنے مرثیوں کی وجہ سے پہچانے گئے جو محرّم کی مجالس کا جزوِ لاینفک بنتے جا رہے تھے۔ ان کے دوسرے مشہور ہم عصر میر ضمیرؔ، میاں دلگیرؔ اور مرزا فصیحؔ تھے، جن کا کلام آج بھی زندہ ہے۔ مگر آج کل صرف مخصوص و منتخب شیعہ طبقہ ہی ان کو پڑھتا ہے۔ فنِ مرثیہ گوئی میں میر خلیقؔ اپنے خاندان کے

ہراول تھے۔اس خاندان سے مرثیے نے فروغ پایا۔ میر انیسؔ کے دو مشہور و معروف بھائی میر انسؔ اور میر مونسؔ مرثیہ نگاری میں فضیلت کے حامل تھے۔ گمانِ غالب ہے کہ اردو مرثیہ اپنی موجودہ ہیئت میں اس دور سے ہی شروع ہوتا ہے۔

دوسرے مشہور اردو شعرا کی طرح لوگ میر انیسؔ کی ابتدائی زندگی کے بارے میں بھی بہت کم جانتے ہیں۔ بلاشبہ ان کو فیض آباد اور لکھنؤ میں روایتی شیعہ تعلیم دی گئی۔ان کی شاعری سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ وہ فارسی اور عربی کی وسیع معلومات رکھتے تھے، ساتھ ساتھ ان کو اپنی مادری زبان کی روزمرّہ پر بھی عبور تھا۔ ان کے پسندیدہ آلاتِ شاعری میں ایک ہی بند میں اردو، فارسی اور عربی مترادفات کو استعمال کرنا تھا۔ زبان پر دسترس کا یہ مظاہرہ بہت زیادہ پسند کیا جاتا ہے اور یہ ایک صفت کئی لکھنوی شعرا کے یہاں دیکھنے میں آتی ہے کہ جہاں شاعر عربی اور فارسی تاریخ کی تفصیلات سے بھی بخوبی واقف ہوتا ہے اور بالخصوص اُن گوشوں کو جنھیں شیعہ ترجیح دیتے ہیں اپنی شاعری میں استعمال کرنا سعادت سمجھتا ہے۔

انیسؔ نے اپنے وقت کے دو عظیم اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ مولوی نجف علی جو شیعہ اسلامی قوانین کے ماہر تھے اور مولانا حیدر علی جو سنّی علمِ دین والٰہیات کے ماہر تھے۔ انیسؔ نے کبھی بھی شاعری میں اپنے کسی استاد کا ذکر نہیں کیا لیکن اندازہ لگایا جاتا ہے کہ ان کے ابتدائی شعر ان کے والد دیکھا کرتے تھے جن سے وہ بہت متاثر تھے۔

انیسؔ اپنے پورے خاندان کی طرح ایک راسخ العقیدہ شیعہ تھے اور ان کے والدین بھی گہرے مذہبی تھے۔ انیسؔ اپنی والدہ سے بہت قریب محسوس ہوتے ہیں جن کی قربت اور گفتگو نے ان کے مرثیوں کے کئی گوشوں کو متاثر کیا۔ مثال کے طور پر جناب زینبؑ جس طرح نرمی سے اپنے دونوں بیٹوں عونؑ و محمدؑ کو تنبیہ کرتی ہیں وہ خواتینِ لکھنؤ کے طریقۂ گفتگو کی یاد دلاتا ہے۔ (بند ۵۹)

شیعہ اس بات پر پختہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ حضرت علیؑ محمد مصطفیٰؐ کے صحیح جانشین تھے اور شیعہ ان کو چوتھا خلیفہ نہیں بلکہ پہلا امام[۶] کہتے ہیں۔شیعہ درحقیقت پہلے تین خلفا کی آئینی حیثیت کو جائز نہیں مانتے۔ محمدؐ، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ، حسینؑ کو ایک خاص اہمیت وفضیلت دی جاتی ہے اور ان کو ''پنجتنؑ'' یعنی پانچ مقدس ہستیاں کہا جاتا ہے۔ یہ پانچ اور دیگر نو آئمہ جو حسینؑ کے بعد آئے وہ ''چودہ معصومینؑ'' کہے جاتے ہیں۔ دنیا اور قانونِ قدرت پر ان کا اختیار مانا جاتا ہے۔ اس رتبے میں تمام آئمہ برابر اور گناہ سے بالکل پاک اور معصوم تصور کئے جاتے ہیں۔

پہلے امام حضرت علیؑ اور تیسرے امام حضرت حسینؑ کا تذکرہ زیادہ کیا جاتا ہے۔ بارھویں امام محمد المہدیؑ کے لئے کہا جاتا ہے کہ وہ ۸۸۰ء سے پردۂ غیب میں ہیں اور شیعہ عقائد کے مطابق واپس آئیں گے اور روزِ انصاف سے پہلے عدل کو قائم کریں گے۔

یزید کے ہاتھوں امام حسینؑ کی شہادت ان کے مداحوں اور مُطبعین کے لئے ایک مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ شیعہ علیؑ کے بعد خلفا کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ وہ بارہ آئمہ پر اعتقاد رکھتے ہیں۔

آج بہت سے شیعہ جنگِ کربلا کو کسی سیاسی نظریئے سے نہیں دیکھتے بلکہ ان کے لئے تو یہ ایک وقیع احساسات سے بھرپور ذاتی المیہ ہے جس میں بدی نے نیکی سے شکست کھائی لہٰذا مرثیے جو اس واقعے کا عکس ہیں ان میں یزید اور اس کے ساتھیوں کی نہایت سیاہ تصویر کھینچی جاتی ہے اور امام حسینؑ اور ان کے رفقا کو ہر الزام اور سرزنش سے مبرا کہا جاتا ہے۔ عام طور سے اب تک کوئی ایسی کوشش نہیں کی گئی جس میں اُن تاریخی حقائق کا تجزیہ کیا جائے جو خالصتاً ایک ہی نقطۂ نظر سے دیکھے اور بیان کئے جاتے ہیں۔ مرثیہ نگاروں کے مطابق علیؑ اور حسنؑ دھوکہ دہی سے قتل کئے گئے۔ صرف حسینؑ اپنے خاندان کی حفاظت کے لئے رہ گئے جن کو فرات کے کنارے سے ہٹادیا گیا۔ خدا اور محمدؐ کے ساتھ اور علیؑ کی معجزاتی تلوار ذوالفقار کی موجودگی میں حسینؑ جنگ جیتنے میں ناکام نہیں ہو سکتے تھے لیکن یہ حسینؑ ہی تھے کہ جنھوں نے رضائے حق کے لئے اپنی جان کا نذرانہ پیش کردیا۔

کربلا کا واقعہ محرم کے پہلے دس دنوں میں ظہور پذیر ہوا۔ یہ اسلامی سال کا پہلا مہینہ ہے اور یہی وہ مہینہ ہے کہ جس سے عزاداریِ حسینؑ شروع ہوتی ہے۔ ایک خوش یقین شیعہ کے لئے محرم الحرام رمضان کے بعد دوسرا بلکہ کچھ کے نزدیک رمضان سے زیادہ اہم مہینہ ہے۔ ان دس دنوں میں ہر صبح ہزاروں لوگ مجالس میں شرکت کرتے ہیں اور ذاکر کی زبانی واقعاتِ کربلا سننے کے لئے جمع ہو جاتے ہیں۔ کچھ ذاکر عراق و ایران کی اعلیٰ درس گاہوں سے تعلیم حاصل کرتے ہیں اور بڑی دسترس اور علم کے ساتھ گھنٹوں تقریر کر سکتے ہیں۔ ذاکر کے خطاب سے پہلے شعرائے شہر مرثیہ اور دیگر مختصر نظمیں پڑھتے ہیں۔ سامعین کو ان مجالس میں شرکت کے لئے کسی ترغیب کی ضرورت نہیں پڑتی اور سامعین اردو مشاعرے کی طرح کسی بھی خوبصورت اور چست شعر پر زور وشور سے داد دیتے ہیں۔ لکھنؤ میں اس قسم کی مجالس صرف شیعہ معتقدین تک ہی محدود نہیں ہیں۔ دونوں سنی اور ہندو شعرا اپنا کلام سنانے کے لئے خوش آمدید کہے جاتے ہیں۔

انیسؔ کے دور سے مرثیہ عام طور سے چھ مصرعوں کے بند (مسدس) میں لکھا جاتا ہے۔ ہر بند کے آخری دو مصرعے (بیت) ایک طاقت ور اور پُر درد نکتہ پیش کرتے ہیں۔ ہر بند کی یہ بیت سامعین کے لئے ایک اشارہ ہوتی ہے جس کو سنتے ہی وہ اپنے سر و سینہ پیٹنے لگتے ہیں اور یا حسینؑ یا حسینؑ پکارتے ہیں۔ سامعین سے متوقع تاثر حاصل کرنے کے لئے صاف اور کھلی درد انگیزیت مرثیے کا ایک اہم جزو ہے۔ عام طور پر خواتین مجمعِ عام میں نہیں آتیں بلکہ مخصوص باپردہ نشست میں بیٹھ کر مجلس سنتی ہیں۔ مجلسیں یعنی وسیع پیمانے کا ہجوم یا گھروں کے چھوٹے مجمعے جس میں میزبان اپنے دوستوں اور جاننے والوں کو مدعو کرتا ہے۔ جہاں بھی مجلس منعقد ہوتی ہے اسی قسم کے اشعار پڑھے جاتے ہیں۔ سوز خوانی کا رواج کم ہے۔ سوز خوانی یعنی ایک مختصر نظم جو روایتی ہندوستانی راگوں میں پڑھی جاتی ہے۔ سوز خوان یا تو کسی آلۂ موسیقی کے ساتھ یا اپنے کسی ہم نوا کے ساتھ سوز پڑھتا ہے۔ بہت سے کٹر مسلمان جو موسیقی کو عبادتوں کا دشمن کہتے ہیں سوز خوانی کے بھی خلاف ہیں جس کی وجہ سے یہ فن ختم ہوتا جا رہا ہے۔ کیونکہ عورتیں اُن مجالس میں جہاں مرد ہوتے ہیں شریک نہیں ہو سکتیں لہٰذا وہ اپنی الگ مجلس کا انعقاد کرتی ہیں۔

واقعاتِ کربلا اور شہادتِ حسینؑ کی یادگاریں ہندوستان میں عہدِ انیسؔ سے بہت پہلے قائم ہو چکی تھیں۔ سولھویں اور سترھویں صدی میں سلاطینِ دکن محرّم کو خاص اہمیت دیتے تھے۔ یہ خود مرثیے لکھتے اور مجلسوں میں پڑھتے تھے۔ یہ مجلسیں بیجاپور، گولکنڈہ اور حیدرآباد میں ہوتی تھیں۔ سولھویں صدی کی پہلی دہائی میں احمد نگر کے شاعر اشرفؔ کا ایک مجموعۂ تاریخ میں ہے جسے ''نوسرہار'' (نوحے) کہتے ہیں۔ وہ منظومات جو دکن کے سلطان محمد قلی قطب شاہ اور علی عادل شاہ نے لکھی ہیں غزل کی طرز پر ہیں جس میں دس سے بارہ اشعار ہوتے ہیں۔ واقعۂ کربلا پر طویل نظمیں بھی لکھی گئیں جن کے آخری شعر یا بیت بڑے ہی دل دوز ہوتے تھے۔ یہ طریقہ اواخرِ عہدِ دکن سے لے کر سترھویں صدی کے اختتام تک رہا لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ مرثیہ نگاری دیگر اصناف کی طرح اٹھارھویں صدی کے دوران دبستانِ دہلی جیسے نئے تہذیبی مرکز کو منتقل ہوئی۔ یہ بات یقینی نہیں کہ انیسؔ کے پردادا مرثیے کہتے تھے لیکن انیسؔ کے دادا بالیقین مرثیہ کہتے تھے۔

مرثیے نے امام حسینؑ کی شہادت کے پُر درد اثرات کے ساتھ مختصر نظم سے ایک ایسی طویل نظم کی صورت اختیار کی جس میں جنگ کی پوری کہانی اور دوسرے قابلِ ذکر واقعات تفصیل کے ساتھ نظم کئے جاتے تھے۔ مرثیے کا یہ ارتقائی عمل اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے شروع میں

فیض آباد اور لکھنؤ میں ہوا کہ جب وہ شیعہ حکمران جن کے آباؤ اجداد ایران سے آئے تھے ان کی ذاتی دلچسپی اور دولت نے مرثیے کی عظیم مجالس کی بنیاد رکھی۔ جو مجالس لکھنؤ، حیدر آباد اور پاکستان و ہندوستان کے دوسرے بڑے شہروں میں ہوتی ہیں وہ شاید ہی دنیا کے کسی اور خطے میں ہوتی ہوں۔ حتیٰ کہ عراق کا تمثیلی کھیل جو کاظمین میں دکھایا جاتا ہے وہ بھی برِصغیر کی عزاداری کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں مرثیے زیادہ تر امام حسینؓ کی یاد میں منعقدہ مجلسوں میں پڑھنے کے لئے کہے جاتے ہیں لہٰذا مرثیہ نگاری کے ساتھ ساتھ مرثیہ خوانی بھی بہت اہمیت کی حامل ہے۔ بعض عظیم شاعر دونوں پر عبور رکھتے تھے۔ انیسؔ بھی انھیں شاعروں میں سے ایک تھے۔ انیسؔ کے طرزِ خواندگی اور دورانِ خواندگی انیسؔ کے اطمینان، سکون اور تفخر سے متعلق کئی واقعات ملتے ہیں۔ ایک جگہ انیسؔ مرثیہ پڑھنے کے لئے آئے کہا جاتا ہے کہ اس مجلس میں اتنا مجمع ہو گیا تھا کہ مجمع کی نشست کے لئے عمارت کی دیوار توڑنا پڑی۔ کہتے ہیں کہ انیسؔ کی آواز بہت طاقت ور تھی کہ انیسؔ کا مرثیہ مجمعے کا آخری آدمی بھی سُن سکتا تھا۔ لکھنؤ کے دوسرے معاصرین کی طرح انیسؔ بھی اعتدال پسند زندگی اور عادات کے حامل تھے۔ انیسؔ روزانہ صبح ورزش، گھڑ سواری اور شمشیر زنی کی مشق کیا کرتے تھے۔ انیسؔ کا قد لمبا، بڑی مونچھیں اور ترشی ہوئی داڑھی تھی۔ وہ ہمیشہ انگرکھا پہن کر باہر نکلتے تھے اور لکھنوی ٹوپی بھی ضرور پہنتے تھے۔ ایک مرتبہ سر عثمان جاہ بہادر نے حیدر آباد میں مجلس منعقد کی اور انیسؔ کو مرثیہ پڑھنے کی دعوت دی گئی مگر منتظمین یہ چاہتے تھے کہ انیسؔ حیدر آبادی ٹوپی پہنیں گے۔ انیسؔ نے منع کر دیا حالانکہ دس ہزار روپے کی پیش کش کی گئی تھی۔

انیسؔ اپنی زندگی میں بہت کم لکھنؤ سے باہر گئے۔ ۱۸۵۶ء میں زوالِ شاہیِ اودھ کے بعد دوسرے معاصرین کی طرح لکھنؤ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ وہ ۱۸۵۹ء میں پٹنہ گئے اور بعد میں حیدر آباد گئے۔ ان کا انتقال ۱۸۷۴ء میں ہوا۔ ان کے شعری کارناموں میں اردو مرثیے اور جنگِ کربلا سے متعلق مختصر نظمیں (سلام) شامل ہیں۔ بے شک انھوں نے مرثیے میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ان کے ہم عصر مرزا سلامت علی دبیرؔ جو خود ایک بہت عمدہ اردو مرثیہ نگار تھے، انھوں نے میر انیسؔ کے لئے، جن کے فن کو مرزا دبیرؔ بہت پسند کرتے تھے ان کی موت پر ایک مصرعۂ تاریخ کہا:

طورِ سینا بے کلیم اللہ منبر بے انیسؔ

عصرِ حاضر میں بھی لکھنؤ میں مذکورۂ سابق طرز پر محرم منایا جاتا ہے۔ محرم کے پہلے دس دنوں میں شیعہ و سنی فاقہ کرتے ہیں یا گھروں میں سادہ کھانا کھاتے ہیں اور روزانہ مجلسوں میں شرکت کرتے ہیں۔ دسویں دن وہ تعزیہ نکالتے ہیں۔ تعزیے امام حسینؑ کے مزار کی کاغذ کی بنی ہوئی تصویر ہوتے ہیں جو سڑکوں پر گشت کرائے جاتے ہیں اور بعد میں امام باڑوں یا کربلاؤں میں دفن کئے جاتے ہیں۔ لکھنؤ کا وہ عظیم امام باڑہ جس کو اٹھارھویں صدی عیسوی میں نواب آصف الدولہ نے تعمیر کرایا اور شاہِ نجف جو حضرت علیؑ کے روضے واقع عراق کی شبیہ ہے دونوں جگہ مجالس کا انعقاد ہوتا ہے۔ دس محرم ہی کو شیعہ سنی اختلافات بھی زور پکڑ جاتے ہیں۔ جب دونوں کے تعزیے آپس میں ملتے ہیں تو شدت پسندی دیکھنے میں آتی ہے اور یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں کہ اس جھگڑے کے نتیجے میں شہر میں کرفیو بھی لگ جاتا ہے۔ پورے محرم میں خصوصاً دس تاریخ کو مختلف نوعیتوں کے ماتم دیکھنے میں آتے ہیں۔ ان میں آگ کا ماتم خاص طور پر مشہور ہے۔ اس ماتم میں حسینؑ کے ماننے والے حسینؑ کا نام لے کر ننگے پاؤں دہکتے ہوئے انگاروں پر چلتے ہیں۔ یہ ماتم آصفیہ امام باڑے میں ہوتا ہے۔ ایک اور قسم کے ماتم میں لوگ زنجیروں سے اپنے آپ کو پیٹتے ہیں یا بعض اوقات ان زنجیروں سے جن کے سرے پر تیز دھار چھریاں لگی ہوتی ہیں اپنی پشت زخمی کرتے ہیں۔ امام حسینؑ کے بڑے صاحب زادے علی اکبرؑ اور بعض کے مطابق حضرت قاسمؑ کے لئے یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی شادی کربلا میں ہوئی، اس کی یاد میں لکھنؤ میں ایک لڑکے کو دولھا کا لباس پہنا کر ہاتھی پر بٹھایا جاتا ہے اور وہ نظمیں جن کو مہندی کہا جاتا ہے اسی خاص موقعے پر پڑھی جاتی ہیں۔

زیرِ نظر مرثیہ جو انیسؔ کے بہترین مرثیوں میں سے ایک ہے جنگِ کربلا کے صبحِ عاشور کے مناظر، جب جوانانِ حق بستروں سے اٹھے اور جنگ کی تیاریاں کیں اور عصرِ عاشور کے منظر کا احاطہ کرتا ہے کہ جب حسینؑ شہید ہو گئے اور آخر میں حضرت زینبؑ کے اپنے بھائی کی لاش پر بین اور ان کی اسیری کے واقعات موجود ہیں۔

فنی لحاظ سے مرثیے کو کچھ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ تقسیم و ترتیب دبیرؔ کے استاد میر مظفر حسین ضمیرؔ نے انیسویں صدی میں رائج کی۔ اس ترتیب کے مطابق مرثیے میں پہلے تعارف یا چہرہ جس میں غم کا تذکرہ، سفرِ کربلا کی مشکلات کا ذکر اور خدا اور رسولؐ کی حمد و نعت ہوتی ہے۔ اس کے بعد اُس حصے کا ذکر ہوتا ہے جب حسینؑ کے جاں نثاران سے میدانِ جنگ میں جانے کی اجازت لینے آتے ہیں، اس کے بعد حسینؑ یا کسی اور رفیق حسینؑ کا ذکر جب وہ گھوڑے پر سوار ہوتا ہے۔

یہاں پر کچھ تعریفی کلمات گھوڑے کی شان میں بھی ہوتے ہیں۔ ایسی شاعری کو قصیدہ یا منقبتی شاعری بھی کہتے ہیں۔ سب سے اہم حصہ وہ ہوتا ہے جس میں جنگ کے میدان کے واقعات، رجز یعنی ممدوحین کے آباؤ اجداد کا ذکر اوران بہادروں کی جنگ کا تفصیلی ذکر بھی خاص طور پر شامل ہوتا ہے۔ امام حسینؑ کے ذکر میں ان کی معجزاتی تلوار ذوالفقار کا ذکر بھی ضروری ہوتا ہے جس سے ہزاروں دشمن مارے گئے۔ مرثیہ امام حسینؑ کی شہادت کے درد انگیز واقعے پر ختم ہوتا ہے۔ مرثیہ نگار شعرا بہت کم اس ترتیب کے مطابق چلتے ہیں، پھر بھی بہت سے مرثیوں میں اوپر بیان کئے گئے ارکان وواقعات ہوتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ ترتیب یہی رہے۔ تلوار اور گھوڑے کی تعریف شاعر کو اپنے فنی کمالات دکھانے کا موقع فراہم کرتی ہے۔

مرثیے کا سب سے غور طلب عنصر جو ایک مغربی قاری کو متاثر کرتا ہے وہ ہے اس میں موجود حقیقت کا فقدان اور غیر فطری تضاد۔ انیسؔ وہ صحرا، جہاں ان کے ممدوح پیاس اور گرمی میں مبتلا تھے اس کو سبزہ زار لکھنے میں کوئی دشواری نہیں محسوس کرتے اور سبزہ زار بھی ایسا کہ جہاں گھنے اور سایہ دار درخت لگے ہیں، جہاں بلبلیں نغمہ سرا ہیں اور پھولوں پر شبنم نظر آ رہی ہے۔ (بند ۱۵-۱۷)۔ کچھ جدید اردو ناقدین جو اپنے ادب کی ان خامیوں کا مغرب سے مقابلہ کرنے میں سرگرم رہتے ہیں، انھوں نے اپنے مشرقی ذوقِ غلو پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اپنے یورپی معلّمین کی تنقید سے متاثر ہو کر اپنے ادب پر تنقیدی رائے ہی قائم کی ہے۔ یورپی ناقدین کے ساتھ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اب تک اردو زبان کی خوبصورتی اور ہمہ گیری سے تعارف نہیں حاصل کر سکے۔ یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ ان تمام باتوں نے انیسؔ کے سامعین کو مایوس کرنے کے بجائے اُن کے حظ وفرحت میں اضافہ کیا ہے اور یہی غیر فطری تضاد وغیر حقیقتی آج کسی بھی شاعر کے فن کی بلند پایگی کا معیار بن گئی ہے اور بغیر کسی شک وشبے کے یہ بحث بھی کی جاسکتی ہے کہ حسینؑ جیسی عظیم وروحانی شخصیت کی موجودگی نے کربلا کے ریگستان کو خوبصورت باغِ جنّت میں تبدیل کر دیا تھا۔

جوش وخروش، لفظوں کا برتاؤ، ذومعنی جملے اور ناقابلِ یقین تشبیہات قدیم زمانے سے اردو ادب کا حصہ رہے ہیں۔ یہ کمالات زیادہ تر دبستانِ لکھنؤ سے متعلق شاعروں کے فن کا جزو رہے ہیں۔ اس سلسلے مین انشاؔ، آتشؔ اور تابعین و تبع تابعین انیسؔ کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ انیسویں صدی کی پہلی دہائی میں لکھنؤ عظیم تہذیب کا مرکز تھا۔ یہ شہر اپنے خوبصورت باغات، بہترین عمارتوں، مغنّیوں اور رقاصاؤں کی وجہ سے مشہور تھا۔ ''شاعری'' جس میں طریقۂ اظہار اور ابلاغ

اہمیت رکھتے ہیں اس معاشرے کے فطری عناصر کی عکاسی کرتی ہے۔ مرثیہ نگار جن کا مقصد پہلے سے وجد میں آئے ہوئے سامعین کو اپنی زبان کی گرفت اور محاورات سے مزید سرور بخشنا ہوتا تھا اپنے فنی کمالات کو کام میں لاتے اور بعض اوقات ان تمام عناصر کو نظم میں شامل کر کے ماحول کو روح پرور بنا دیتے تھے۔ حسینؑ کی موجودگی کے سبب کربلا کا پست ریگ زار عرشِ اعظم سے بھی بڑھ جاتا ہے اور زہرہ ستارہ جو ساتویں جنت میں ہے اور زحل جو نویں اور آخری آسمان پر ہے وہ بھی اپنے اوپر کربلا کی شکل میں دسویں آسمان کو دیکھتا ہے۔ امام حسینؑ کو جس گرمی کا سامنا تھا وہ اس قدر تیز تھی کہ آنکھوں کی پتلیاں پلکوں کی نرم گھاس میں پناہ لینے پر مجبور تھیں اس لئے کہ اگر نظریں آنکھوں سے باہر نکل جائیں تو اس کے پاؤں میں آبلے پڑ جائیں (بند۲۲)۔ سمندر یعنی آگ کا کیڑا جو خود گرم سورج کو پسند کرتا ہے اور پانی سے بچتا ہے وہ بھی اس گرمی کی شدت سے فرات کی موجوں میں تیرتی مچھلیوں کی طرح چھپ رہا ہے اور فرات کی موجیں اتنی تپ رہی ہیں کہ آگ پر تپی ہوتی سیخ بن کر مچھلیوں کو کباب بنائے دے رہی ہے۔ اس طرح کے تعجب انگیز استعاروں کی مثالیں لاتعداد ہیں جو پہلے بھی اور اب بھی اردو شاعری کا حصہ رہی ہیں۔

کچھ باتیں جو مرثیے کے شدت پسند قارئین کو متفکر کرتی ہیں وہ حسینؑ اور ان کے عزیزوں کی مدح میں شاعر کے تصنیف کردہ القابات وخطابات ہیں یعنی "مالکِ کائنات"، "شہنشاہ"، "جنت کا بادشاہ"، "خلق کا حکمران"، "فرماں روائے صداقت" وغیرہ، کچھ بحث کرتے ہیں کہ یہ خطابات صرف خدا کے لئے ہی زیبا ہیں اور یہ کسی فانی ذات کو نہیں دینا چاہئیں۔ اپنے اس معرکے میں حسینؑ سب سے اعلیٰ و برتر، ناقابلِ تسخیر و ناقابلِ شکست تھے یہاں تک کہ انھوں نے اپنی شہادت کا وقت خود پسند کیا۔ دوسرے لفظوں میں وہ اپنی زندگی اور موت کے خود مالک و مختار تھے۔ حسینؑ جہاں بھی کھڑے ہو جائیں وہ جگہ اتنی ارفع و ممتاز ہوتی ہے کہ جنت سے بھی بلند ہو جاتی ہے۔

شاعری میں ایسی مبالغہ آرائی مناسب و معقول معلوم ہوتی ہے اور اس طرح کی مثالیں انیسؔ کے پیش رو عظیم شعرا کی شاعری میں بھی ملتی ہیں۔

اٹھارھویں صدی کے شاعر سوداؔ کی شاعری کا اہم جزو وہ قصیدے اور منقبتیں ہیں جو انھوں نے مشہور مذہبی و غیر مذہبی شخصیتوں کے لئے کہی ہیں۔ یہ نظمیں بھی ایسی ہی مبالغہ آرائی سے مرصع ہیں۔ سوداؔ شیعہ شاعر تھے انھوں نے کئی مقامات پر علیؑ اور حسینؑ کی مدح کی ہے نہ صرف یہ بلکہ کئی غیر اصولی حاکموں مثلاً عماد الملک کی بھی مدح روحانی عقیدتوں کے ساتھ کی ہے۔ بعض اوقات

انھوں نے اپنے آپ کو بھی بڑھایا ہے اور اس خودستائی کے عمل میں وہ خطرناک حد تک آگے بڑھ گئے ہیں۔اس قسم کے خودستائشی مصرعے ان کی نظموں سے الگ نہیں کیے گئے بلکہ ان کی شاعری کے مطبوعہ نسخوں میں بھی موجود ہیں۔

نثر کے برعکس نظم لکھنے والا معنویت و بلاغت میں بہت آگے بڑھ سکتا ہے اور اسی لئے آج تک شاعری حکومتوں کی غیر مرئی تنقید کا نشانہ بن رہی ہے۔شیعہ ذاکروں کے خطبے جو مجلسوں میں دیئے جاتے ہیں ان میں بھی ایسی ہی مبالغہ آرائی دیکھنے میں آتی ہے جو راسخ العقیدہ لوگوں کے لئے باعثِ فکر ہوتی ہے۔

جہاں تک شیعوں کا تعلق ہے ان کا مرثیے سے متعلق اپنا رویہ اور برتاؤ ہے۔تاریخ کے مختلف ادوار میں مرثیہ گریہ و بکا کا ذریعہ رہا ہے۔مسدّس کے بند کے آخری دو مصرعے وہ ہوتے ہیں جن پر سامعین بھرپور تاثر پیش کرتے ہیں۔یہی دو مصرعے پہلے چار مصرعوں کا خلاصہ ہوتے ہیں اور انتہائی مضبوط اور زوردار ہوتے ہیں۔یہاں تک کہ بعض موقعوں پر بچّوں کی کرب ناک کیفیت کو سادہ اور جذبات سے بھرپور مصرعوں میں بیان کیا جاتا ہے مثلاً ''یہ ننھے ننھے بچے'' جو انتہائی گرمی میں بے رحم دشمنوں کے تیروں کا نشانہ بن رہے تھے۔حسینؑ کی بہن زینبؑ کی گفتگو مرثیہ نگار انتہائی سادہ اور روز مرّہ کی اردو زبان میں بیان کرتا ہے جو ہر وہ آدمی جس نے ایک جلالت مآب ماں اور غمزدہ بہن کے بارے میں سنا ہو سمجھ لیتا ہے۔حسینؑ کے فصاحت و بلاغت اور حقائق پر مبنی جملوں اور خطبوں کا مقابلہ ایک بدتہذیب دشمن کی اہانت آمیز گفتگو سے تھا، وہ دشمن دربار میں چتر کے سائے میں کنیزوں اور غلاموں کی خدمتوں کا مزہ لے رہا تھا جب کہ حسینؑ ناقابلِ برداشت پیاس میں مبتلا تھے۔

سامعین کی کثیر تعداد خوش اعتقاد شیعوں کی ہوتی ہے جو اُن تمام حالات و واقعات سے جو مرثیے میں بیان کئے جاتے ہیں بخوبی واقف ہوتے ہیں۔یہ واقعات وہ بچپن سے بارہا سن چکے ہوتے ہیں۔انیسؔ اور ان جیسے عظیم مرثیہ نگاروں نے جو بکائی عناصر مرثیے میں پیدا کئے ہیں آج تک ایسا نہیں ہوا کہ وہ عناصر تعلیم یافتہ و غیر تعلیم یافتہ سامعین کی آنکھوں میں سچے آنسو اور ان کے دلوں میں حقیقی کیفیاتِ غم نہ پیدا کر سکے ہوں۔جو زبان، اشارے، کنائے، تلمیحات اور پیرایۂ گفتگو اردو مرثیہ نگار استعمال کرتے ہیں وہ بلاشبہ مشکل ہوتے ہیں کہ بعض اوقات وہ اردو بولنے والے جو تہذیب و ثقافت سے نابلد ہیں پریشان ہو جاتے ہیں۔یعنی وسیع الفاظ و محاورات استعمال ہوتے

ہیں اور کچھ عربی اور فارسی تراکیب جو بیان میں کھپ جاتی ہیں وہ ایسی ہوتی ہیں کہ ڈھونڈنے سے بھی اردو لغت میں نہیں ملیں گی۔

بچپن سے تہذیب کا برتاؤ اور مجلسوں میں مسلسل حاضری شاعری اور دوسرے تہذیبی عناصر کو سمجھنے کا علم فراہم کرتی ہے۔ یہ بات مبالغہ آرائی نہ ہوگی کہ اُتر پردیش کے کسی قصبے سے تعلق رکھنے والا شیعہ کسان مرثیے کے ایک ایک لفظ کو سمجھنے اور بہترین طریقے سے سمجھانے کی صلاحیت ایک ایسے پڑھے لکھے سنی شہری سے زیادہ رکھتا ہے کہ جس کی روزمرّہ زندگی سے محرم کے معمولات کا ٹکراؤ معمولی نوعیت کا ہوتا ہے۔

کچھ عرصے پہلے میں نے مغربی یوپی کے شہر جونپور کے نزدیکی دیہات کی ایک مجلس میں شرکت کی جس میں لکھنؤ کے ایک مشہور ذاکر نے خطاب کیا۔ سامعین کی کثیر تعداد تھی جن میں زیادہ تر کسان اور مزدور تھے۔ ذاکر کی زبان صاف تھی۔ اُن مشکلات سے قطعِ نظر جو عربی عبارتوں کا اردو ترجمہ کرنے میں پیش آتی ہے، ذاکر کو زبان سادہ اور سلیس بنانے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ اپریل کی سخت گرمی کے باوجود سامعین مسلسل تین گھنٹے توجہ سے مجالس سنا کیے۔ مجلس کے بعد جب لوگوں سے میری گفتگو ہوئی تو معلوم ہوا کہ مجلس کا بہت کم حصہ ایسا تھا جو لوگوں کے اذہان سے محو ہوا ہو۔ کئی سامعین ایسے تھے جو فنِ مرثیہ سے متعلق نہایت تفصیلی اور محکم بیان دے سکتے تھے۔ جس جس سے بھی میں نے بات کی وہ سب انیسؔ سے شناسا تھے یہاں تک کہ جو اردو ادب کے متعلق بہت کم جانتے تھے وہ بھی انیسؔ کے چند مصرعے سنا سکتے تھے۔ ایک بزرگ شخصیت نے فخریہ انداز میں بتایا کہ انھوں نے انیسؔ کو لکھنؤ میں دیکھا تھا۔[۷]

مرثیے کے کردار:

ذیل میں زیرِنظر مرثیے میں موجود کرداروں کی تاریخی ترتیب کے لحاظ سے فہرست دی جاتی ہے۔

''حسینی کردار''

ہاشم: محمدؐ کے پردادا (پیغمبرؐ کے خاندان کو بنی ہاشم بھی کہا جاتا ہے)۔

حمزہ: محمدؐ کے چچا۔

محمدؐ: پیغمبرِ اسلام۔

جعفرؓ: حضور کے چچازاد بھائی۔ یہ جنگِ خیبر میں^ (۶۲۹ ق م) شہید ہو گئے جہاں انھوں نے پیغمبرؐ کا علم اٹھایا تھا اور ان کے ہاتھ اس جنگ میں قطع ہو گئے تھے جن کو خدا نے جواہر کے پروں سے بدل دیا تھا۔ جب سے وہ ''پروں والے جعفرؓ'' (جعفرِ طیّار) کہے جاتے ہیں۔

علیؑ: محمدؐ کے قریبی عزیز اور داماد۔ حسنؑ اور حسینؑ کے والد اور شیعوں کے پہلے امام۔

فاطمہؑ: محمدؐ کی دختر، علیؑ کی زوجہ، حسنؑ اور حسینؑ کی والدہ، جن کو زہراؑ (پاکیزہ) کہا جاتا ہے۔

عقیلؑ: حسینؑ کے چچا، علیؑ کے بھائی۔

مسلمؑ: عقیلؑ کے بیٹے، حسینؑ کے چچازاد بھائی، کوفے میں ابنِ زیاد نے قتل کروایا۔

حسنؑ: علیؑ اور فاطمہؑ کے بڑے بیٹے۔

حسینؑ: علیؑ اور فاطمہؑ کے چھوٹے بیٹے۔

بانوؑ (شہربانو): بادشاہِ فارس کی دختر، حسینؑ کی زوجہ۔

اُمّ البنینؑ: عباسؑ کی والدہ۔

عباسؑ: حسینؑ کے سوتیلے چھوٹے بھائی جن کو لشکرِ حسینؑ کا علم دار منتخب کیا گیا اور جنھوں نے فرات سے پانی کی مشک بھری۔

علی اکبرؑ: حسینؑ کے ۱۸ سال کے صاحب زادے۔

علی اصغرؑ: حسینؑ کے چھ مہینے کے صاحب زادے۔

قاسمؑ: حسنؑ کے سب سے چھوٹے صاحبزادے (۱۳ برس) جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کی شادی کربلا میں فاطمہ کبریٰ سے ہوئی۔

عبداللہ: حسنؑ کے چھوٹے بیٹے۔

عونؑ و محمدؑ: زینبؑ کے چھوٹے صاحب زادے، علیؑ کے نواسے، جعفرؑ کے پوتے، دونوں جنگِ کربلا میں شہید ہو گئے۔ اس مرثیے میں ان کی منصبِ علم داری کی خواہش اور اس کی رد ہونے کا ذکر ہے (بند ۵۵ تا ۷۱)۔

کلثومؑ: حسینؑ کی چھوٹی بہن۔

فاطمہؑ کبریٰ و فاطمہؑ صغریٰ: حسینؑ کی کمسن بیٹیاں۔

سکینہؑ: حسینؑ کی چار سالہ بیٹی۔

یزیدی کردار

حر: سپاہِ یزید کا دلیر سپاہی جو لشکرِ یزید چھوڑ کر حسینؑ کی طرف آ گیا تھا۔

یزید: بنو اُمیہ سے تعلق رکھنے والے شام کے گورنر معاویہ کا بیٹا جس نے عراق میں ظلم و استبداد کیا اور حسینؑ کو کربلا میں گھیر لیا۔

عبید اللہ ابنِ زیاد: کوفے کا گورنر، جس نے حسینؑ کے کٹے ہوئے سر کی، چھڑی سے بے ادبی کی۔

عمر ابنِ سعد: لشکرِ یزید کا افسر۔

حرملہ ابنِ کاہل: لشکرِ یزید کا تیر انداز۔

اعورِ سلمیٰ: لشکرِ یزید کا سپاہی۔

دشمن تھا شہ کا اعورِ سلمیٰ عدوئے دیں
سر پر لگائی تیغ کہ شق ہو گئی جبیں

ازرق: مشہور شامی پہلوان۔

سنان ابنِ انس: لشکرِ یزید کا سپاہی۔

ماری جگر پہ ابنِ انس نے سنانِ کیں
بھالا گڑو کے کوکھ میں برچھی کو اک لعیں

ہند: یزید کی بیوی۔

اہم کرداروں کے خطابات:

بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ اردو مرثیے میں طویل رزمیہ شاعری کے کچھ عناصر موجود ہیں جیسے کہ ہومر اور سنسکرتی مہابھارت کی مثالیں ہمارے پاس ہیں۔ ان نظموں میں ہمیں جنگ کی طویل داستان، مخصوص انداز میں تلوار اور گھوڑے کی تفصیل، زمین پر ہونے والے افعال اور ساتھ ہی ساتھ جنّت میں ہونے والے واقعات بھی موجود ہیں۔ مثال کے طور پر ہومر کے یہاں خداؤں نے اولمپس سے ٹرائے کی جنگ کے متعلق گفتگو کی تھی اور اس کے تغیرات و انقلابات سے متاثر ہوئے جیسے کہ فرشتے اور حوریں کربلا میں پیش آنے والے واقعات پر گفتگو کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے تقابل کو زیادہ دور نہیں لے جانا چاہئے۔ اس لئے کہ مرثیے کے وہ عناصر جو انیسؔ کے یہاں زیادہ ہیں، انیسؔ کے پیش رو اردو شعرا کے یہاں بہت کم پائے جاتے ہیں۔ خاص طور پر خطابات کی تخلیق اور ان کا استعمال، مخصوص صفات اور تعریفی جملے جو کرداروں کی شناخت کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ وہ خطابات جو انیسؔ نے استعمال کئے درج ذیل ہیں:

محمدؐ: پیغمبر، نبی، رسولِ خدا، خاتمِ نبوت، بہترین خلق، مصطفیٰ (منتخب کیا ہوا)۔

علیؑ: شیرِ خدا (اسداللہ)، حیدر (عربی لفظ اسد کا مطلب شیر) مٹی کا باپ (ابوتراب) پیغمبر کا دیا ہوا نام، مرتضیٰ (منتخب کیا ہوا)۔

فاطمہؑ: زہرا (پاکیزہ) کنیزِ خدا، خیرالنسا (عورتوں میں سب سے بہترین)۔

حسینؑ: بادشاہ، بادشاہِ یقین و صداقت، باشاہِ کائنات، شاہِ حجاز، سلطان، مالک، حاکمِ دوجہاں، کربلا کا مسافر، شہید، رہبر، امام، سیّد (پیغمبر کی اولاد) شبیرؑ (محمدؐ کا دیا ہوا نام) اور انھیں خطابات کی مختلف اشکال وتراکیب۔

علی اکبرؑ: ہم شکلِ نبی (جو صورتِ نبی کے مشابہ ہو) موذّن (جو نماز کے لئے بلاتا ہے)۔

زینبؑ: علیؑ کی بیٹی، امام کی بہن، بادشاہ کی پرخلوص ہمشیر۔

اس کے علاوہ اور بھی کچھ خاص و عام خطابات ہیں مثلاً عالی منش، گل بدن، فلک مرتبت، ماہ رُو وغیرہ حسینؑ کے سپاہیوں کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ یزیدی لشکر کے لئے ظالم، سیاہ رُو، سیاہ دل، پتھر دل، پلید، ذلیل اور دوسرے مکروہ مترادفات استعمال کئے جاتے ہیں۔

حسینؑ کے گھوڑے کے بھی کئی خطابات ہیں جو اس کی تیز رفتاری کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور ان کی تلوار ذوالفقار کے بھی کئی خطابات ہیں جو اس کی کاٹ، چمک اور تیزی کو ظاہر کرتے

ہیں۔

ایک تشبیہ جو بار بار سامنے آتی ہے وہ ہے ایک دولھا سے حسینؑ کی تشبیہ جو جنّت میں اپنی دلہن سے ملنے کے لئے جارہا ہے۔ اس کے کپڑوں کی خوشبو دولھا کے کپڑوں جیسی ہے۔ اس نے شادی کا ایک ایسا ہار پہنا ہوا ہے جو موت کے پھولوں سے تیار ہوا ہے۔ وہ میدانِ جنگ میں اس طرح جاتا ہے جیسے دولھا، دلہن سے ملنے کے لئے جاتا ہے، اس کی تلوار اس کا پہلو چھوڑنے پر یوں ناراض ہوتی ہے جیسے دلہن نئے دولھا کو چھوڑتے وقت لیکن جب نیام سے باہر ہو تو اس کی تلوار معرکے کے لئے تیار رہتی ہے۔ ایسے حوالے بھی ملتے ہیں جن میں یہ سمجھا گیا ہے کہ چاہے لاشعوری طور پر ہی کیوں نہ ہو انیسؔ نے حسینؑ کی معرکتہ الآرا جنگ کو ایک دولھا کی جنسی جواں مردی سے جوڑ دیا ہے۔ صوفیانہ اور عارفانہ اردو شاعری میں تو عاشق و معشوق کے ملاپ کو روح اور خدا کے ملاپ سے تشبیہ دے دی جاتی ہے لیکن انیسؔ کے یہاں کہ جہاں انتہائی مذہبی ذکر ہو رہا ہو براہِ راست ایسی رائے دینا حیرت انگیز ہے۔

ترجمہ:

آج تک اردو شاعری وزن اور عروض کے قوانین کی پابندی کے ساتھ لکھی اور پڑھی جا رہی ہے۔ یہ قانون اردو کو فارسی سے ورثے میں ملا۔ حالانکہ آج کل وزن اور بحر سے خارج مصرعے بھی نفع و شہرت کا سبب بن رہے ہیں لیکن اکثریت نہیں تو بہت سے جدید اردو شاعر آج بھی اسی قدیم روایتی انداز کو اپنے کلام میں برت رہے ہیں۔

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ مرثیہ چھ مصرعوں کے بند میں لکھا جاتا ہے (یہ قدیمی ہیئت ہے جسے فنی اعتبار سے مسدس کہا جاتا ہے) جس کے چھ مصرعوں میں قافیہ و ردیف کی ترتیب BBAAAA (الف الف الف الف ب ب) ہوتی ہے۔ یہ ہیئت (مسدس) طویل بیانیہ نظم کے لئے موزوں ثابت ہوئی ہے۔ انیسویں صدی کے شاعر الطاف حسین حالؔی نے اپنی مشہور نظم ''مد و جزرِ اسلام'' جس کو ''مسدس حالؔی'' کہا جاتا ہے اسی ہیئت میں کہی۔ انگریزی نظم کے برخلاف جس میں لفظ اکائی کی صورت میں ہوتے ہیں اردو نظم چھوٹی اور بڑی تراکیب و تنظیم الفاظ کے طریقے پر مشتمل ہوتی ہے۔ ایک بار جو بحر معیّن کر لی جاتی ہے تو اس سے انحراف ممنوع ہو جاتا ہے اور ہر مصرعہ اسی بحر میں ہونا چاہئے جس میں پہلا مصرعہ ہو۔ صاحب بصیرت سامعین بحر کی شناخت رکھتے ہیں اور اس کے بارے میں بہت حساس ہوتے ہیں یہاں تک کہ بحر کی ذرا سی لغزش کو پہچان لیتے

ہیں اور بانگِ دہل ٹوک بھی دیتے ہیں۔

اس مرثیے کے ترجمے میں، میں نے پوری نظم میں قافیے کا خیال رکھا ہے۔ اصل نظم کی ترتیبِ قافیہ سے تھوڑا سا انحراف کرتے ہوئے میں نے قافیہ وردیف کی ترتیب CCABAB (الف ب الف ب ج ج) رکھی ہے۔ یہ طریقہ انگریزی نظم میں رائج ہے۔ انگریزی زبان کے صوتیاتی آہنگ کی وجہ سے یہ تقریباً ناممکن ہے کہ اس کے اصل پیمانے کو بدلنے کی کوشش کی جائے۔ انگریزی نظموں کی پنج مصرعی (مخمس) ہیئت جس میں ایک مصرعہ چھوٹا تو دوسرا بڑا ہوتا ہے جو ''چوسر'' کے زمانے سے شاعروں میں مقبول ہے وہ سب سے زیادہ موزوں ہے۔ اس میں اور انیس کی اختیار کردہ ہیئت میں زیادہ فرق نہیں ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے نشان دہی کر چکے کہ اردو مرثیے کی زبان نہایت صاف، خوبصورت اور اعلیٰ ہوتی ہے۔ کئی حضرات اس بات پر اتفاق کریں گے کہ یہ اردو ادب کی مشکل ترین صنف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انیسویں صدی کے شرفا و امرائے لکھنؤ کی زبان اور نفیس و رسمی گفتگو اُس زمانے میں اعلیٰ خاندان اور اعلیٰ طور طریقوں کا معیار گردانی جاتی تھی۔ آج بھی ایک بالکل نئی دنیا میں وہ لوگ جن کے آباؤاجداد لکھنؤ میں پیدا ہوئے اپنی زبان دانی پر فخر کرتے ہیں اور دوسرے علاقوں میں بدقسمتی سے پیدا ہونے والے لوگوں کے ساتھ ان کا رویہ تحقیر آمیز ہوتا ہے۔ اردو نے جو بنیادی طور پر ہندوستانی زبان ہے قواعدی ڈھانچہ اور لفظیات عربی اور فارسی سے حاصل کئے جو بذاتِ خود وسیع زبانیں ہیں۔ اردو میں گھوڑے، تلوار، جنگ اور صحرا وغیرہ کیلئے لاتعداد مترادفات موجود ہیں جو مرثیے میں فطری انداز میں نظر آتے ہیں۔ ایک لفظ کے لئے آدھے درجن سے زیادہ ہم معنی الفاظ موجود ہو سکتے ہیں جو کسی بھی شاعر کو اپنی زبان دانی کے جوہر دکھانے کے لئے استعمال کرنا ہوتے ہیں۔ انگریزی زبان اپنی وسعت کے باوجود اردو کے مقابلے میں ناقص ہے۔ جس کی وجہ سے اُس مترجم کو بڑی دشواری پیش آتی ہے جو اپنے ذمّے ہونے والے کام کو بہترین طریقے سے انجام دینا چاہتا ہے۔

مرثیے میں جو رسمی مصرعے ہوتے ہیں، ترجمے میں اسی طرح کی زبان کی ضرورت ہوتی ہے اور انگریزی میں اس عمل کے کئی طریقے موجود ہیں۔ میں نے ترجمے میں مبہم، دقیانوسی و فرسودہ محاورات ترک کرنے کی کوشش کی ہے جو بجائے خوبصورتی کے استعجاب پیدا کرتے ہیں۔ اس کے باوجود اس بامقصد تک بندی میں کچھ الفاظ ایسے استعمال ہوئے ہیں جو مفہوم کو واضح نہیں کر سکے۔

عام طور سے اردو شاعری میں بحر کی تکمیل اور اثر انگیزی کی غرض سے جملوں کی نحوی ترکیب اور عمومی ترتیب توڑ دی جاتی ہے۔ یہ بات اردو جیسی نرم زبانوں میں بغیر ابہامِ معانی کے بہت آسان ہوتی ہے اور نحوی قواعد کی موجودگی کے سبب یہ بات بھی صاف ہوتی ہے کہ اس ترتیب کے الٹ پھیر میں فاعل کیا ہے اور مفعول کیا ہے۔ یہ تخریبِ ترتیبِ الفاظ انگریزی میں بھی ہوتی ہے لیکن اتنی نہیں جتنی اردو میں عمل پذیر ہے لہذا انیسؔ کی اس خصوصیت کو اس ترجمے میں بعینہٖ نہیں پیش کیا جاسکا۔ لفظوں کا برتاؤ بھی اردو شاعری کی ایک خوبصورت صفت ہے اور اکثر ذومعنی الفاظ اور ذو معنی جملوں کی ایجاد کو سراہا گیا ہے۔ اس کے باوجود اساتذہ اور تجزیہ نگار اٹھارھویں صدی کے آغاز میں اس ذومعنویت کے خلاف ہوگئے جو پندرھویں صدی کے فارسی شعرا کی تقلید میں رونما ہوئی۔ ان کی اس روش نے ان کے مقلدین پر تھوڑے بہت اثرات مرتب کئے۔ ''ذومعنویت'' جو سنجیدہ انگریزی تحریروں میں نظر نہیں آتی اس کا ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ ناممکن ہے۔ کئی جگہ میں اردو ذومعنویت کو ترک کرنے پر مجبور ہوا اور اس کی جگہ اپنے تئیں اس کا مساوی اور قابلِ قبول انگریزی لفظ دیا ہے لیکن وہ بھی حتمی نہیں ہے۔

یہاں انیسؔ کے پورے مرثیے کا ترجمہ کر دیا گیا ہے اور ترجمے کی ممکنہ حدود میں اصل مفہوم پہنچانے کے لئے احتیاط برتی گئی ہے۔ یہ امید ہے کہ انیسؔ کی تحریر کی خوبصورتی اور اس کی شان و عظمت برقرار رہے گی۔

انگریزی ترجمے کو اصل تحریر کی طرح رکھا گیا ہے لہذا کوئی اضافی گفتگو بھی نہیں کی گئی۔ جو لوگ تاریخی اور اسلوبی نکات کی شرح چاہتے ہوں ان کے لئے چند مختصر وضاحتیں حاشیے کے آخر میں (*) نشان کے ساتھ انگریزی میں کر دی گئی ہیں جبکہ یہ کسی بھی نظم کو سمجھنے اور اس کا لطف اٹھانے کے لئے ضروری نہیں۔

حواشی

(۱) سنی مورخین کا بھی اس بات پر اتفاق ہے کہ حضرت علیؑ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زندگی میں اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔ دعوت ذوالعشیرہ میں بھی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خلافت علیؑ کا اعلان کیا اور غدیرِ خم کے موقع پر خطبہء حجتہ الوداع کے آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ حدیث سنادی تھی "من کنت مولا و فھذا علی مولا"

(۲) نہج البلاغہ کے خطبہ شقشقیہ اور تاریخ کی بے شمار کتابیں شاہد ہیں کہ حضرت علیؑ نے مسلسل احتجاج کیا۔

(۳) شام کی گورنری حضرت عمر کے دور میں ہی اولادِ ابوسفیان کے پاس جا چکی تھی۔

(۴) ابوموسیٰ اشعری سیاستِ اموی کا شکار ہو گئے۔ اور عمرابن ابی العاص کے جھانسے میں آ کر حضرت علیؑ کو خلافت سے معزول کرنے کا اعلان کر دیا۔ اپنے غیر شرعی فیصلے پر وہ ہمیشہ پچھتاتے رہے۔

(۵) مسلمانوں کے عمومی عقیدے میں امام حسنؑ پر خلافت ختم ہوگئی اور بقول مولانا مودودی (خلافت وملوکیت) معاویہ سے ملوکیت کا آغاز ہو گیا۔

(۶) یزید نے عبیداللہ ابن زیاد کو کوفہ کا حاکم مقرر کیا، ابن زیاد نے کربلا کے لشکر کے لئے عمرابن سعد کو سپہ سالار مقرر کیا تھا۔

(۷) شیعہ حضرت علیؑ کو پہلا خلیفہ بھی مانتے ہیں لہذا پانچوں وقت کی اذان میں بھی یہ اعلان ہوتا ہے کہ علیؑ رسولؐ اللہ کے بعد خلیفہ بلا فصل ہیں۔

(۸) میر انیسؔ کے بیٹے میر نفیسؔ یا پوتے دولہا صاحب عروجؔ کو دیکھا ہوگا یا اس نے یہ کہا ہوگا کہ میرے باپ دادا نے میر انیسؔ کو لکھنؤ میں دیکھا تھا۔

(۹) میتھیوز نے غلط لکھا ہے۔ حضرت جعفر طیار جنگ خیبر میں حبشہ سے واپس آئے اور جنگ موتہ میں شہید ہوئے۔

سمندر اور قطرہ

کیونکر بیاں ہو شوکتِ شانِ پیمبری　　عاجز ہیں یہاں فرزدقؔ و حسانؔ و حمیریؔ
طاقت یہ کس میں ہے جو لکھے زورِ حیدری　　دوڑے کمیتؔ خامہ تو کھائے سکندری

قرآں میں جن کا وصف مکرّر خدا کرے
کس کی زباں سے پھر بشر اُن کی ثنا کرے

بینا ہوئی جو چشم تو نورِ خدا کہا　　عُقدہ کُھلا تو عقل نے مشکل کشا کہا
مطلب ہوا حصول تو حاجت روا کہا　　پایا دُرِ مراد تو بحرِ سخا کہا

ہم خوش ہوئے کہ مدح کے دریا بہا دیئے
کیا بڑھ گیا جو بحر میں قطرے ملا دیئے

(میر انیسؔ)

ضمیر اختر نقوی

میر انیسؔ کے مرثیوں میں عبّاسؑ کا علم

ارباب تواریخ کے پیش نظر ہے کہ علَم، رایت، اور نشان، پرچم، مختلف السنہ کی تقریباً ہم معنی لفظیں ہیں۔ان کے استعمال کا سلسلہ زمانہ قدیم سے چلا آ رہا ہے مقام جنگ میں علمبرداری کا عہدہ اک جلیل منصب سمجھا جاتا ہے۔بنی آدم میں سب سے پہلے شیثؑ اور قابیل کے درمیان جنگ ہوئی تھی اس لئے کہ قابیل نے ہابیل کو ناحق بلا جرم وخطا حسد کی وجہ سے مار ڈالا تھا۔ جب جنگ شروع ہونے والی ہوئی اور دونوں میں مقابلے کی ٹھہر گئی تو جناب شیثؑ نے وہ سفید حلّہ زیب تن کیا جس کو خدا نے انھیں کے لئے اس موقع کے واسطے بھیجا تھا اور اس پہلی جنگ میں علمبردار ملائکہ تھے ان کے علم کا پھریرا سفید تھا۔ بالآخر ملائکہ نے قابیل کو جنگ شدید کے بعد گرفتار کر کے مقام عین الشمس میں پہنچا دیا۔ وہ وہیں مر گیا اور اس کی تمام اولاد شیثؑ کی غلام قرار پائی۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ بنی آدم میں سب سے پہلی جنگ شیثؑ اور قابیل والی ہے اس جنگ میں خدا نے حضرت شیثؑ کے لئے ایک سفید جنتی حلّہ بھیجا تھا۔ اس جنگ میں ملائکہ سفید پھریرے والے رایت کو لے کر علمبرداری کرتے تھے گھمسان کی جنگ کے بعد ملائکہ نے قابیل کو گرفتار کر کے مقام عین الشمس میں مقید کر دیا اور وہ وہیں فوت ہو گیا اور ساری ذریّت قابیل حضرت شیثؑ کی غلامی میں آ گئی''۔ (مناقب شہر آشوب، مازندرانی جلد نمبر ۳ صفحہ نمبر ۱۵۹ مطبوعہ بمبئی)

بعض تواریخ سے پتہ چلتا ہے کہ علم زمانۂ قدیم کے مصری فرمانرواؤں کی ایجاد ہے اور زمانۂ

جاہلیت میں بھی اس کا اچھا خاصا رواج رہا ہے ہر ایک قبیلے کا علیحدہ علیحدہ رایت ہوا کرتا تھا جس کے نیچے بوقت نبرد آزمائی تمام قبیلے کے لوگ جمع ہوا کرتے تھے۔ایک حدیث میں ہے کہ پہلے پہل علم کی بنیاد حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے ڈالی ہے۔

''روایت ہے کہ سب سے پہلے علم کی ابتدا حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے کی''۔

(مناقب شہرآشوب صفحہ ۱۵۹ جلد ۳ مطبوعہ بمبئی)

صاحبان تواریخ کا نقطۂ خیال اس مقام پر یہ ہے کہ قریش کا علم قصی ابن کلاب کے ہاتھوں میں رہا کرتا تھا۔ پھر اس کے بعد بنی ہاشم کے ہاتھوں میں رہا کیا۔ جب جناب سرورؐ کائنات مبعوث ہوئے خدا نے ظلمت کدۂ عالم میں سراج منیر کو روشن کیا تو سرور کائنات حضرت محمد مصطفےؐ نے بنی ہاشم میں مستقر کر کے اس علم کو حضرت علی علیہ السلام علمبردار فوج اسلام کے سپرد فرمادیا۔غزوۂ بدر و جنگ احد بلکہ ہر لڑائی میں وہ علم اسد اللہ ہی کے ہاتھوں میں رہا جس کا رنگ سفید تھا اس کے بعد جب مسلمانوں کی متعدد حکومتیں قائم ہوئیں تو ان کے نشان بھی مختلف شکلوں اور رنگوں میں ہونے لگے۔ کسی کا علم سبز کسی کا سرخ کسی کا سفید کسی کا سیاہ ہوتا تھا مگر عباسیوں کا علم درکنار ان کی ساری وردی سیاہ تھی۔

ہر جنگ میں علم کے حامل حضرت علی علیہ السلام ہی رہے۔ جنگ ودان میں لواء کے حامل عبدالدار تھے حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مصعب بن عمیر کو عنایت فرمایا جنگ احد میں جب وہ شہید ہو گئے تو رایت اور لواء دونوں کے حامل حضرت علی علیہ السلام قرار پائے۔

بظاہر رایت اس علم کو کہتے ہیں جو عام لشکر کے سردار کے پاس ہو اور لواء اس کو کہتے ہیں جو کسی قبیلے کا ہو۔ یہی سبب ہے کہ جنگ خیبر میں رایت ہی ان لوگوں کو دیا گیا تھا لواء نہ تھا اس لئے کہ وہاں ساری مملکت اسلام کا علم تھا کسی مخصوص اور چھوٹے موٹے قبیلے کا نہ تھا۔

بعثت کے بعد علمبردار اسلام حضرت علی علیہ السلام رہے پھر بوسائط وہ علم عباسؑ بن علیؑ کے ہاتھوں میں آیا جس کا رنگ بظاہر دھانی تھا۔ مولانا سبط حسن صاحب قبلہ طاب ثراہ فرماتے ہیں

رایت عباس کے پرچم سے بدلا رنگ آب
خضر آیا نہر کی پوشاک دھانی ہوگئی

اسلام کے علم کی مختصر تاریخ و تعارف کے بعد آیئے اب ذرا میر انیسؔ کے مرثیوں کا جائزہ لیں میر انیسؔ علم اسلام کا تعارف کچھ اس طرح کراتے ہیں علمدار کی شان بھی ملاحظہ ہو:-

غل تھا کہ جہاں میں علم ایسا نہیں دیکھا	زر ریز ہے پنجہ کرم ایسا نہیں دیکھا
اقبال و جلال و حشم ایسا نہیں دیکھا	سرداروں میں ثابت قدم ایسا نہیں دیکھا
طوبیٰ ہو تو ایسا مہ کامل ہو تو ایسا
ایسے علم نور کا حامل ہو تو ایسا

عالم میں ہوئے چار اولوالعزم علمدار	اک حضرت حمزہؑ تھے تو اک جعفرؑ طیار
بعد ان کے ہوئے زیب علم حیدرؑ کرار	عباسؑ اب اس منصب والا کا ہے مختار
کرسی کے بھی پائے سے سوا پایا ہے رتبہ
کیا دست بدست اس کو یہ ہاتھ آیا ہے رتبہ

اللہ رے اللہ عجب شانِ علم ہے	سب عالم بالا بھی ثنا خوانِ علم ہے
رحمت کا یہ دریا ہے کہ دامانِ علم ہے!	خورشید ہے یا پنجۂ تابانِ علم ہے!
ہے نور کا عالم علم فوج خدا پر
موسیٰؑ نے موھرا ہے یدبیضا کو عصا پر

یہ شانِ علم اور پھریرے کا وہ عالم	یہ ابرِ کرم ہے تو وہ ہے نیرّ اعظم
پنجے کو ہے پردے سے نکالے ہوئے مریمؑ	انگشتِ شہادت سے اشارہ ہے یہ ہر دم
یہ عرش کا رتبہ ہے نہ افلاک کا رتبہ
ہے سب سے فزوں پنجتن پاکؑ کا رتبہ

سروِ چمن آرائے ہدایت ہے یہ رایت	یا سورۂ والشمس کی آیت ہے یہ رایت
مہر فلکِ لطف و عنایت ہے یہ رایت	دستِ کرم شاہِ ولایت ہے یہ رایت
جو سائے میں اس کے ہے وہ ہے ظلِّ ہما میں
اعجاز ہے عیسیٰؑ کا پھریرے کی ہوا میں

ذکرِ علم حمد ہے قرآن میں آیا	شیعوں کے سروں کا ہے یہی حشر میں سایا

مصروف جو امت کی طرف شاہ کو پایا ۔ ہے بہر دعا ہاتھ علم نے بھی بڑھایا
شکل کف سائل جو ہے پنجہ یہ سبب ہے
اللہ سے امت کی شفاعت کی طلب ہے

یہ وہ ہے علم جس کو پیمبرؐ نے اٹھایا ۔ کس فخر سے حمزہؓ سے دلاور نے اٹھایا
ہاتھ آیا شرف جب اسے جعفرؓ نے اٹھایا ۔ وہ اٹھ گئے دنیا سے تو حیدرؑ نے اٹھایا
ہوگا یہ ہما سایہ فگن اب نہ کسی پر
بس خاتمہ ہے حضرتِ عباسؑ علی پر

ابھی آپ نے صرف ایک مرثیئے کے چند بند ملاحظہ فرمائے۔ ہم میر انیسؔ کے مختلف مرثیوں کا مطالعہ پیش کرتے ہیں دیکھیے میر انیسؔ علم کو مختلف ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ رایت، پرچم، نشان، لوا، علم۔ تاریخ کے مطابق میر انیسؔ کا بھی یہی بیان ہے کہ عباسؑ کے علم کا رنگ سبز، ہرا یا دھانی یا زمردی تھا۔ پھریرے کے رنگ سے میر انیسؔ نے اپنی کوثر و تسنیم سے دُھلی زبان میں بے پناہ لطف پیدا کیا ہے۔

غازی کی وہ شوکت وہ شکوہِ علم نور ۔ کہتی تھی یہ گیتی کہ اَنا الطّور انا الطّور
پرچم تھا کہ بکھرے ہوئے تھے موئے سرِ حور ۔ ہم پنجہ ہو پنجے سے یہ کیا مہر کا مقدور
دکھلاتا تھا سرسبزیٔ افلاک پھریرا
تھا دامنِ مریمؑ کی طرح پاک پھریرا

زر ریز تھا پنجہ تو یہ کہتے تھے خردمند ۔ یہ ہاتھ سخی کا ہے نہ ہووے گا کبھی بند
تھی اس کی ضیاء آئینہ مہر سے دہ چند ۔ کرتا تھا ستاروں کو فلک فخر سے اسپند
سب فوجِ ملائک کی نظر اس سے لڑی تھی
اوڑھے ہوئے اک سبز ردا حور کھڑی تھی

اللہ رے یہ اوجِ علمِ لشکرِ شاہی ۔ تھا زیرِ نگیں ماہ سے تا مسکنِ ماہی
پنجہ جو ہلا پھیل گیا نورِ الٰہی! ۔ دامن جو کھلا رنگ زمیں ہوگیا کاہی!
سبزیٔ حسنؑ سرخیٔ رنگِ شہِ دیں تھی

سونے کا فلک تھا تو زمرّد کی زمیں تھی

علمبردار فوج کو کیسا ہونا چاہیئے :-

اس مقام پر قابل غور ولحاظ یہ امر ہے کہ فوج کا علمبردار (کمانڈر ان چیف) کیسا ہونا چاہیئے اس کے متعلق چند امور بیان کیئے گئے ہیں :-

اول :- یہ کہ علمبردار لشکر کو صاحب ہمت، قوی دل، جری، بہادر اور شجاع ہونا چاہیئے ۔ بڑے بڑے ہولناک جنگاہ میں اپنے کو پہنچا دینا اور دشمنوں سے مقابلہ کرنا اس کا شیوۂ زندگی ہو، بہادری کے محل اور موقع پر اپنے کمال کا مظاہرہ کرادے اور ٹڈی دل فوجوں میں اس طرح ڈوب جائے جیسے بحرنا پیدا کنار میں غوّاص (غوطہ زن) ڈوب جاتے ہیں۔ وہ مقام جنگ میں تلوار کا پانی پی کر حیات ابدی حاصل کرنے کا خوگر ہو اس کو حضرت علیؑ کی طرح اس بات کی پروانہ ہو کہ آیا موت مجھ پر پھٹ پڑے گی یا میں موت کے منھ میں خود چلا جاؤں گا۔ وہ فنا کے گھاٹ اترنے کو خلاصۂ زندگی اور مطلوب حیات تصور کرتا ہے۔

دوسرے :- یہ کہ علمبردار کو مستقل مزاج ہونا چاہیئے ۔ پہاڑ اپنی جگہ سے سرک جائیں مگر اس کے قدم استقلال کو جنبش تک نہ ہو اور جنگاہ میں اس طرح جم کے گھمسان کی جنگ کرنے والا ہو کہ رزم گاہ کی زمین کے ذرّات بھی اڑ کر آیۂ (کانھم بنیان مرصوص) کی تلاوت میں رطب للسان ہو جائیں ۔

تیسرے :- یہ کہ علمبردار کو مولا اور آقا (سردار) کے حکم کا پابند ہونا چاہیئے یعنی جن جن امور کے متعلق سردار کہہ دے اس کے خلاف نہ کرے۔ اگر وہ کہہ دے کہ دیکھو جب تک فتح نہ ہو جائے اس وقت تک واپسی کا قصد نہ کرنا تو علمبردار کو لازم ہے کہ جب تک روح وتن میں نازک سا بھی رشتۂ حیات باقی ہو میدان جنگ کو چھوڑ کر واپس نہ پھرے مختصر یہ ہے کہ علمبردار کو ویسا ہی ہونا چاہیئے جیسے صدر الاسلام میں حضرت علیؑ و جعفرؓ و حمزہ علیہم السّلام وغیرہ اور روز عاشورہ حضرت عبّاس علیہ السّلام تھے۔

میر انیسؔ کربلا کی تاریخ نہیں لکھ رہے تھے لیکن ان تمام صفات کو وہ پیش نظر رکھتے ہوئے بدر سے کربلا تک علمبرداروں کے کردار کی خصوصیات بیان کرنے کے بعد جناب عبّاس علمبردار کو کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں :-

عباسؑ علیؑ حیدرؑ صفدر کا نشاں تھا — بس لشکرِ اسلام میں وہ شیر ژیاں تھا
لکھا ہے کہ بتیسؔ برس کا وہ جواں تھا — چہرے سے جلال اسداللہ عیاں تھا
اعلیٰ نہ ہو کیوں ایسے علم دار کا رتبہ
خالق جسے دے جعفرؑ طیّار کا رتبہ

خود شیر ہے، جدشیر، چچا شیر، پدر شیر — نعرے ہیں جدا شیر کے دل شیر جگر شیر
پلکیں ہیں اگر شیر کا پنجہ تو نظر شیر — کیونکر نہ ہو اس طرح کے شیروں کا پسر شیر
ٹلتے نہیں میداں سے یہ پیشہ ہے انہی کا
کہتے ہیں نجف جس کو وہ بیشہ ہے انہی کا

جاں بازوں سے لے جا نہیں سکتا کوئی بازی — مرجانے کو اک کھیل سمجھتے ہیں یہ غازی
ہے سب سے قوی بازوئے سلطانِ حجازی — کرسکتا ہے شیروں پہ کوئی دست درازی
ساونت ہیں یہ جان کی پروا نہیں ان کو
ہٹتے ہوئے رن سے کبھی دیکھا نہیں ان کو

عباسؑ نامدار جوانوں میں لاجواب — قد سروباغ حسن تو رُخ مثلِ آفتاب
حمزہؑ کا زور جعفرؑ طیّار کا شباب — شبرؑ کا خلق شان و شکوہِ ابوتراب
لڑنے کو فوجِ کیں سے بہادر تلا ہوا
سر پر نشانِ دیں کا پھریرا کُھلا ہوا

زینت وہ علم کی تو علم اس کا حشم ہے — شوکت میں یہ افضل نہ بزرگی میں یہ کم ہے
وہ آیۂ رحمت ہے تو یہ ابرِکرم ہے — بے مثل علمدار ہے نایاب علم ہے
دونوں کا شرف سارے زمانے پہ عیاں ہے
احمدؐ کا نشاں وہ ہے یہ حیدرؑ کا نشاں ہے

جانباز ہے جرّار ہے صفدر ہے وہ غازی — جرات میں ہزاروں کے برابر ہے وہ غازی
بے شبہ و شک ثانیِ جعفر ہے وہ غازی — اے لشکریو رستمِ لشکر ہے وہ غازی
لاکھوں ہیں پہ اس سج کا جواں ہم میں نہیں ہے

ہم کیا ہیں کہ ایسا کوئی عالم میں نہیں ہے

ہاتھ آئی کسے خلق میں اس طرح کی توقیر ہم پنجۂ دستِ احدی بازوئے شبیرؑ

کیا قدرتِ اللہ ہے اللہ ری تقدیر ہے شیر خدا مصحفِ ناطق تو یہ تفسیر

بابا کی طرح صاحبِ شمشیر و علم ہیں

حرمت یہ علاوہ ہے کہ سقائے حرم ہیں

الفت میں ہیں عباسؑ وامام دو جہاں ایک ان دونوں کے قالب تو ہیں دو اور ہے جاں ایک

دل ایک جگر ایک زباں ایک بیاں ایک مرجائے جو ہو ایک کی آنکھوں سے نہاں ایک

سردار ہو ایسا جو ملازم ہو تو ایسا

آقا ہو تو ایسا ہو جو خادم ہو تو ایسا

کیا لکھیئے ثباتِ قدم بازوئے شبیرؑ کاغذ پہ سیاہی نہیں چلتی دم تحریر

مٹتا نہیں خط ان کا مثالِ خطِ تقدیر اقلیم شجاعت ہے انہیں قدموں کی جاگیر

تلواروں کے سو وار اگر سر پہ چلیں گے

یہ پاؤں جگہ سے نہ ہٹے ہیں نہ ہٹیں گے

کون اور کائنات میں ہے دوسرا جواں قابل اسی کے دوشِ مبارک کے ہے نشاں

بازوئے شاہِ دیں جسدِ مرتضٰی کی جاں پیروں کا سرپرست جوانوں کا قدرداں

باتیں پیمبروں کی خدا کے ولی میں ہیں

سب اس میں جمع ہیں صفتیں جو علیؑ میں ہیں

الفت وہی حیا وہی مہر و وفا وہی طاعت وہی وقار وہی اتقا وہی

بخشش وہی کرم وہی جود و سخا وہی جرات وہی جدال وہی دبدبا وہی

گیتی میں اور بھی کوئی ایسا دلیر ہے

خود تھا علیؑ کا قول کہ عباس شیر ہے

علمدارِ لشکر حسینی کی چند خصوصیات:-

آپ کی پہلی خصوصیت یہ تھی کہ ''قمر بنی ہاشم'' تھے جس طرح تاریک رات میں آسمان پر چکر

لگانے والا ماہتاب اپنے قدرتی نور سمیت طلوع کر کے فضا کے دامن کو چاک کرتا ہوا روشنی بخش عالم ہوتا ہے اور اپنے رُخ کی چمک سے سارے ستاروں کی دمک کو دبا کر اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ تمام ستاروں میں اس کو طرّۂ امتیاز حاصل ہے۔ اسی طرح بنی ہاشم کا چاند سارے خاندان میں اپنے حسن و جمال کے سبب سے ممتاز تھا۔

''بے شک حضرت عبّاسؑ نہایت روشن رُو، حسین، وجیہ جوان تھے۔ آپ کو حسن و جمال کے کمال کی وجہ سے قمر بنی ہاشم کہا جاتا تھا''۔ (شرح زیارت ناحیہ'' ناسخ التواریخ جلد نمبر ۶ طبع بمبئی)

میر انیسؔ نے کربلا کے ہر مجاہد کا سراپا لکھا ہے۔ ان کے نقادان پر یہ الزام بھی لگاتے ہیں کہ سراپا لکھتے ہوئے انیسؔ نے خاص لکھنوی غزلیت کو شامل کیا ہے لیکن یہ تاریخی حقیقت ہے کہ ختمی مرتبتؐ کے گھرانے والے وجیہ و شکیل تھے۔ اولادِ ابو طالبؑ حسن میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ میر انیسؔ نے جناب عباسؑ کی خوبصورتی کی جتنی بھی تعریف کی ہے وہ جناب عباسؑ کے حسن خداداد سے کہیں کم ہے۔

استادہ ہے یہ ماہ بنی ہاشم ذی قدر — دکھلائے تو اس شکل و شمائل کا کوئی بدر

یہ دوش، یہ بازو، یہ گلو، یہ کمر و صدر — یہ عارض و گیسو، سحرِ عیدو شبِ قدر

یاں کون سی نسبت ہے تری شمس و قمر کو

اک رات کو قربان کروں ایک سحر کو

آپ کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ آپؑ دراز قد تھے۔ باوجود یہ کہ آپ ہمیشہ دُور کابہ گھوڑے پر سوار ہوتے تھے مگر آپؑ کے پائے اقدس زمین پر خط دیتے جاتے تھے۔ (العبار العین ص ۲۶)

شمشاد سے بالا قد بالائے مبارک — درپیش ہے اب وصفِ قدمہائے مبارک

تعویذ شفا نقشِ کفِ پائے مبارک — جس جا ہو گزر ان کا وہ ہے جائے مبارک

واں آتے ہیں سجدے کو ملک عرش بریں کے

احساں یہ انہیں پاؤں کے ہیں سر پہ زمیں کے

جناب عباسؑ کی تیسری خصوصیت یہ تھی کہ آپ کا لقب ''سقائے حرم'' تھا۔ آپؑ کا لقب سقائے حرم اس لئے تھا کہ آپؑ نے اپنے چاہنے والے بھائی اور ان کے اطفال کے لئے کربلا میں پانی کے حصول میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا''۔ (ناسخ التواریخ جلد نمبر ۶ ص ۲۸۹ طبع بمبئی)

علمداری کا رتبہ اگر امام حسینؑ کی طرف سے ملا تھا تو ''سقائے حرم'' کا لقب جناب سکینہؑ کی وجہ سے ملا۔

---------------حضرت نے کہا جاؤ انہیں مشک بھی لا دو
لشکر کا علمدار تو ہم کر چکے ان کو اب مرتبہ تم پیاسوں کی سقائی کا بخشو
جعفرؑ سے دوبالا ہوا رتبہ ترے عم کا
اب حشر تلک ساتھ رہا مشک و علم کا

آپؑ کی چوتھی خصوصیت یہ تھی کہ آپؑ عابد شب زندہ دار تھے آپؑ کی افق پیشانی پر آفتاب کی طرح ضوفشاں سجدہ کا نشان ہونا آپؑ کی عبادت کا شاہد اعظم تھا۔

''کثرتِ عبادت کے سبب سے پیشانی پر سجدہ کا نمایاں نشان تھا'' (تحفۂ حسینیہ صفحہ ۵۷ طبع ایران)

آ پہنچا قریب اتنے میں حیدرؑ کا وہ پیارا لشکر نے کیا حُسن کے گلشن کا نظارا
تھا شور کہ اللہ نظر کا نہیں یارا سجدے کا نشاں ہے کہ یہ ہے صبح کا تارا
کثرت یہ نہ ہوگی یدبیضا میں ضیا کی
خورشید پہ اختر ہے یہ قدرت ہے خدا کی

پیشانی پہ سجدے کا نشاں ہے کہ ستارا پانی رُخ پُر نور سے روشن ہوا سارا
ہر مردم آبی یہ خوشی ہو کے پکارا عباسؑ کے چہرے کا کرو چل کے نظارا
منہ ملنے لگیں مچھلیاں دامانِ علم پر
اٹھ اٹھ کے حباب آنکھوں کو ملتے تھے قدم پر

آپؑ کی پانچویں اور سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ آپؑ لشکر حسینی کے علمبردار تھے۔

''صادق آل محمدؐ سے روایت ہے کہ روز عاشورہ امام حسینؑ نے اصحاب کو جمع کیا اور حضرت عباسؑ کو علمدار بنایا''۔

حضرت عباسؑ کا منصبِ علمداری

عہدہ جوان بیٹے نے پایا ہے باپ کا:- صبح عاشور نمودار ہوئی۔ فریضۂ سحری ادا کر کے امام حسینؑ حرم سرا میں تشریف لائے۔ اب میر انیسؔ بھائی بہن کی گفتگو اس طرح نظم کرتے ہیں:-

زینبؑ کے پاس آ کے یہ بولے شہِ زمن" - - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - -

بس جس کو تم کہو اُسے دیں فوج کا علم ۔۔۔ کی عرض جو صلاحِ شہِ آسماں حشم!
فرمایا جب سے اٹھ گئیں زہرائے باکرم ۔۔۔ اُس دن سے تم کو ماں کی جگہ جانتے ہیں ہم
مالک ہو تم بزرگ کوئی ہو کہ خرد ہو
جس کو کہو اُسی کو یہ عہدہ سپرد ہو

بولیں بہن کہ آپ بھی تو لیں کسی کا نام ۔۔۔ ہے کس طرف توجہِ سردارِ خاص و عام
گر مجھ سے پوچھتے ہیں شہِ آسماں مقام ۔۔۔ قرآں کے بعد ہے تو علیؑ ہی کا کچھ کلام
شوکت میں قد میں شان میں ہمسر کوئی نہیں
عباسؑ نامدار سے بہتر کوئی نہیں

عاشق، غلام، خادمِ دیرینہ، جاں نثار ۔۔۔ فرزند، بھائی، زینتِ پہلو، وفا شعار
جرّار، یادگارِ پدر، فخرِ روزگار، ۔۔۔ راحت رساں، مطیع و نمودار و نامدار
صفدر ہے، شیر دل ہے، بہادر ہے نیک ہے
بے مثل سینکڑوں میں ہزاروں میں ایک ہے

عباسؑ آئے ہاتھوں کو جوڑے حضور شاہ ۔۔۔ جاؤ بہن کے پاس یہ بولا وہ دیں پناہ
زینبؑ وہیں علم لئے آئیں بہ عزّ و جاہ ۔۔۔ بولے نشاں کو لے کے شہِ عرش بارگاہ
ان کی خوشی وہ ہے جو رضا پنجتنؑ کی ہے
لو بھائی لو علم یہ عنایت بہن کی ہے

رکھ کر علم پہ ہاتھ جھکا وہ فلک وقار ۔۔۔ ہمشیر کے قدم پہ ملا منہ بہ افتخار
زینبؑ بلائیں لے کے یہ بولیں کہ میں نثار ۔۔۔ عباسؑ فاطمہؑ کی کمائی سے ہوشیار
ہوجائے آج صلح کی صورت تو کل چلو
ان آفتوں سے بھائی کو لے کر نکل چلو

کی عرض میرے جسم پہ جس وقت تک ہے سر ۔۔۔ ممکن نہیں ہے یہ کہ بڑھے فوجِ بدگہر
تیغیں کھنچیں جو لاکھ تو سینہ کروں سپر ۔۔۔ دیکھیں اٹھا کے آنکھ یہ کیا تاب کیا جگر

ساونت ہیں پسرِ اسدِ ذوالجلال کے
گر شیر ہو تو پھینک دیں آنکھیں نکال کے

منھ کر کے سوئے قبرِ علیؑ پھر کیا خطاب ذرّے کو آج کر دیا مولا نے آفتاب
یہ عرض خاکسار ہے بس یا ابوترابؑ آقا کے آگے میں ہوں شہادت سے کامیاب
سر تن سے ابنِ فاطمہؑ کے روبرو گرے
شبّیرؑ کے پسینے پہ میرا لہو گرے

ناگاہ آ کے بالی سکینہؑ نے یہ کہا کیسا ہے یہ ہجوم کدھر ہیں مرے چچا
عہدہ علم کا ان کو مبارک کرے خدا لوگو مجھے بلائیں تو لینے دو اِک ذرا
شوکت خدا بڑھائے مرے عموّ جان کی
میں بھی تو دیکھوں شان علیؑ کے نشان کی

عبّاسؑ مسکرا کے پکارے کہ آؤ آؤ عموّ نثار پیاس سے کیا حال ہے بتاؤ
بولی لپٹ کے وہ کہ مری مشک لیتے جاؤ اب تو علم ملا تمہیں، پانی مجھے پلاؤ
تحفہ کوئی نہ دیجے نہ انعام دیجیے
قربان جاؤں، پانی کا اک جام دیجیے

باتوں پہ اس کی روتی تھیں سیدانیاں تمام کی عرض آ کے ابنِ حسنؑ نے کہ یا امام
انبوہ ہے، بڑھی چلی آتی ہے فوجِ شام فرمایا آپ نے کہ نہیں فکر کا مقام
عبّاسؑ اب علم لئے باہر نکلتے ہیں
ٹھہرو بہن سے مل کے گلے ہم بھی چلتے ہیں

اتنے میں طبل جنگ کی آنے لگی صدا رخصت حرم سے ہو کے چلے شاہ کربلا
نکلے علم لئے ہوئے عبّاسؑ باوفا تسلیم ساری فوج نے کی باندھ کر پرا
غل تھا کہ ہوں گے حشر میں اس کی پناہ میں
یہ حیدری نشاں ہے حسینی سپاہ میں

کلامِ میر انیسؔ میں علم کی تعریف

تھا زینتِ سپاہ پیمبرؐ یہی علم — حمزہؑ جہاد کرتے تھے لے کر یہی علم
ہے افتخار حضرت جعفرؑ یہی علم — خود دوش پر اٹھاتے تھے حیدرؑ یہی علم
صدقے میں شہ کے ہم کو یہ عزت نصیب ہو
سایہ میں اس علم کے شہادت نصیب ہو

صلِ علیٰ زہے علم و حاملِ علم — ذرّے سے آفتابِ فلک ہے نظر میں کم
آتی ہے بوئے خلد پھریرے سے دم بدم — یہ شان یہ شکوہ یہ اقبال یہ حشم
ایسا علم ہو دوش پہ ایسے جوان کے
عباسؑ کے نثار، تصدق نشان کے

جب فریضے کو ادا کر چکے وہ خوش کردار — کس کے کمروں کو بصد شوق لگائے ہتھیار
جلوہ فرما ہوئے گھوڑے پہ شہ عرش وقار — علمِ فوج کو عباسؑ نے کھولا اک بار
دشت میں نکہتِ فردوس بریں آنے لگی
عرش تک اس کے پھریرے کی ہوا جانے لگی

لہر وہ سبز پھریرے کی وہ پنجے کی چمک — شرم سے ابر میں چھپ جاتا ہے خورشید فلک
کہتے تھے صلِ علیٰ عرش پہ اٹھ اٹھ کے ملک — دنگ تھے سب وہ سماں تھا زِ سماتا بہ سمک
کہیئے پستی اسے جو اوج ہما نے دیکھا
وہ سماں پھر نہ کبھی ارض و سما نے دیکھا

اس طرح جب علم دلبر زہراؑ جائے — کس سے پھر معرکۂ رزم میں ٹھہرا جائے
سانپ دشمن کی نہ کیوں چھاتی پہ لہرا جائے — لہر میں تا بہ فلک جس کا پھریرا جائے
رفعِ شر کو علم خیر بشر آیا تھا
سورۂ نصر پئے فتح و ظفر آیا تھا

جاتے تھے سواری میں جلال و حشم آگے — غل تھا کہ بڑھے جاؤ قدم با قدم آگے

جلدی تھی ہر اک کو کہ نکل جائیں ہم آگے　　پیچھے تو محمدؐ کا نشاں تھا علم آگے
جنّت کے پھریرے سے ہوا آتی تھی رن میں
طوبیٰ نے جگہ پائی تھی زہراؑ کے چمن میں

کیا اوج تھا نخل علم فوجِ خدا کا　　فردوس بھی شائق تھا پھریرے کی ہوا کا
غل تھا کہ یہ ہے سروِ رواں باغ وفا کا　　پنجہ پہ ہے عالم یدِ بیضا کی ضیاء کا
ٹوکے وہ انہیں بڑھ کے لڑا ہو جو علیؑ سے
یہ شیر گرسنہ نہیں رکنے کے کسی سے

کیا کہوں شانِ جوانانِ جنودِ اللہ　　کوئی ہم طلعتِ خورشید کوئی غیرتِ ماہ
باندھی شیروں نے صفِ جنگ میان جنگاہ　　چمن خلد سے کرنے لگیں حوریں بھی نگاہ
واں لعینوں نے درِ ظلم و ستم کھول دیا
بڑھ کے عبّاسؑ نے یاں سبز علم کھول دیا

دامن سرِ غازی پہ لٹکتا ہے علم کا　　خورشید بھی منھ رشک سے تکتا ہے علم کا
ہر گام پہ اقبال چمکتا ہے علم کا　　بجلی نہیں پنجہ یہ لچکتا ہے علم کا
کس جنگ میں ایسے علم نور کھلے ہیں
پرچم نہ کہو موئے سر حور کھُلے ہیں

کس شان سے اڑتا ہوا آتا ہے پھریرا　　طوبیٰ کو عروج اپنا دکھاتا ہے پھریرا
لہرا کے سر عرش پہ جاتا ہے پھریرا　　ساتھ اپنے ہوا خُلد کی لاتا ہے پھریرا
ایسی کوئی جنت میں رواں نہر نہ ہوگی
سر چشمۂ کوثر میں بھی یہ لہر نہ ہوگی

کیا دوش مبارک پہ ہے اوجِ علم شاہ　　جنت کی ہوا اس کے پھریرے کی ہوا خواہ
پنجہ سے خجل پنجۂ خورشید و رُخِ ماہ　　اللہ کا لفظ اس سے عیاں ہوتا ہے واللہ
دیکھو تو حشم بازوئے شاہِ شہدا کا

سایہ سر پُرنور پہ ہے دستِ خدا کا

ناگاہ بیابانِ بلا نور سے چمکا　　جوں پنجۂ خورشید علم دور سے چمکا
عکس اُس کا فزوں حسنِ رخِ حُور سے چمکا　　تھا نور کا شعلہ کہ رخِ طوُر سے چمکا
کرتا تھا اشارہ کہ نہ کیوں نورفشاں ہوں
میں پنج تنِ پاک کے لشکر کا نشاں ہوں

کھولا جو پھریرے کو علم دار جری نے　　لوٹے گل فردوس نسیم سحری نے
تاروں کو اتارا فلک نیلوفری نے　　پرچم جو کھلا کھول دیئے بال پری نے
عیسےٰؑ نے پکارا کہ نثار اس کے حشم کے
خورشید نے منھ رکھ دیا پنجے پہ علم کے

اللہ رے اوجِ علم فوجِ پیمبرؐ　　جنت کی پھریرے سے ہوا آتی تھی فرفر
تھا سر پہ ہُما سایہ فگن کھولے ہوئے پر　　پنجے کی ضیاء دیکھ کے خورشید تھا ششدر
تابندہ کوئی شے نہیں زیر فلک ایسی
موسیٰ نے تجلّی میں نہ دیکھی چمک ایسی

کھولا جنابِ حضرتِ عبّاسؑ نے علم　　رفعت ہوئی نثار تصدق ہوا حشم
اڑنے لگا ہوا سے پھریرا جو دمبدم　　دشتِ وغا میں پھیل گئی نکہت ارم
پرچم فزوں تھا حسن میں گیسوئے حور سے
خورشید زرد ہوگیا پنجے کے نور سے

صدقے علم کے حضرت عباسؑ کے نثار　　طوبیٰ شکوہ عرش تجمل فلک وقار
شمشاد سبز پوش گلستانِ اقتدار　　حمزہ کا اقتدار تو جعفر کا افتخار
جھکتا ہے جس سے عرش پہ پایہ اسی کا ہے
ظلِ خدا پہ دھوپ میں سایہ اسی کا ہے

دریا خجل ہے سبز پھریرے میں ہے وہ لہر　　سبزہ بھی اُسکے عشق میں کھائے ہوئے ہے زہر
دامن ہے بادبانِ جہازِ امام دہر　　موجیں دکھا رہی ہیں بہشتِ بریں کی نہر
پنجے کا نور سبز پھریرے کے ساتھ ہے
طوبیٰ کی شاخ سبز پہ مریمؑ کا ہاتھ ہے

دامن وہ سبز اور وہ پنجے کا اس کے نور　　نکلا ہوا ہے قصرِ زمرّد سے روئے حور
فرقِ جناب خضر پہ روشن ہے شمع طور　　بے شبہ وہ امام کے ہے نور کا ظہور
اس کا علم ہے یہ جو شہ مشرقین ہے
گویا حسنؑ کے دوش پہ دستِ حسینؑ ہے

پنجہ ادھر چمکتا تھا اور آفتاب اُدھر　　اس کی ضیاء تھی خاک پہ ضو اس کی عرش پر
زر ریزیٔ علم پہ ٹھہرتی نہ تھی نظر　　دولہا کا رُخ تھا سونے کے سہرے میں جلوہ گر
تھے دو طرف جو دو علم اس ارتفاع کے
الجھے ہوئے تھے تار خطوطِ شعاع کے

ناگہ نشاں بڑھائے اُدھر کی سپاہ نے　　کھولا ادھر علم کو علمدار شاہ نے
چوما نشاں کو بڑھ کے ہر اک خیر خواہ نے　　''طوبیٰ لکم'' کہا شہ عالم پناہ نے
رفعت بڑھی زمینِ سعادت سرشت کی
ٹھنڈی ہوا پھریرے سے آئی بہشت کی

رایت وہ سبز لشکر سادات کا نشاں　　دامانِ پاک کشتی امت کا بادباں
پنجہ مثال پنجۂ خورشید زر فشاں　　پرچم تھا بال کھولے تھی یا حورئ جناں
مُشک و عبیر و عود کا بازار سرد تھا
مٹی کا عطر خاک کی خوشبو سے گرد تھا

میر انیسؔ نے ایک مرثیے کے چہرے کا عنوان ''علم'' رکھا ہے اور یہ مرثیہ ان کے شاہکار مرثیوں میں شمار ہوتا ہے:۔

جب رن میں سر بلند علیؑ کا علم ہوا　　فوج خدا پہ سایۂ ابر کرم ہوا

چرخِ زبر جدی پئے تسلیم خم ہوا پنجے پہ سات بار تصدق حشم ہوا
دیکھا نہ تھا علم جو کبھی اس نمود کا
دونوں طرف کی فوج میں غل تھا درود کا

وہ شان اس علم کی وہ عباسؑ کا جلال نخل زمرّدی کے تلے تھا علیؑ کا لعل
پنجے پہ جان دیتی تھیں پریوں کا تھا یہ حال غل تھا کہ دوشِ حور پہ بکھرے ہوئے ہیں بال
ہر لہر آب دار تھی کوثر کی موج سے
طوبیٰ بھی دب گیا تھا پھریرے کے اوج سے

تھا پنجتن کا نور جو پنجے پہ جلوہ گر اعمیٰ کی پتلیوں میں بھی تھا روشنی کا گھر
ذرّے نثار کرتے تھے اُٹھ اُٹھ کے اپنا زر تکتے تھے فوق سے تو ملک تحت سے بشر
اللہ ری چمک علم بوترابؑ کی
تارِ نظر بنا تھا کرن آفتاب کی

قربانِ احتشام علم دارِ نامور رخ پر جلالتِ شہ مرداں تھی سر بسر
چہرہ تو آفتاب سا اور شیر سی نظر قبضے میں تیغ بر میں زرہ دوش پر سپر
چھایا تھا رعب لشکر ابنِ زیاد پر
غل تھا چڑھے ہیں شیر الٰہی جہاد پر

وہ اوج وہ جلال وہ اقبال وہ حشم وہ نور وہ شکوہ وہ توقیر وہ کرم
پنجے کی وہ چمک وہ سرافرازیٔ علم گرتی تھی برق فوج مخالف پہ دم بدم
کیا رفعتِ نشاں سعادت نشان تھی
سائے میں جس نشان کے طوبیٰ کی شان تھی

پنجہ اٹھا کے ہاتھ یہ کہتا تھا بار بار عالم میں پنجتن کی بزرگی ہے آشکار
یہ شش جہت انھیں کے قدم سے ہے برقرار کیوں ہفتہ دوست ہوتے ہوائے قوم نابکار
آٹھوں بہشت ملتے ہیں مولا کے نام سے
بیعت کرو حسین علیہ السلام سے

غرفوں سے جھانک جھانک کے بولی ہر ایک حور صلِ علیٰ علم کی چمک ہے، کہ برق طور

یارب رہے نگاہ بد اس کی ضیا سے دور پنجہ ہے یہ کہ ایک جگہ پنجتن کا نور
جلوے ہیں سب محمدؐ و حیدرؑ کی شان کے
قربان اس جواں کے نثار اس نشان کے

نکلا حرم سرا سے جو وہ آسماں حشم نصرت نے گرد پھر کے لئے بوسۂ قدم
شوکت وہ اس جناب کی وہ رفعتِ علم پنجے کی ضو سے برق چمکتی تھی دم بدم
ذرّوں سے شرمگیں تھے گہر لعل سنگ سے
صحرا زمرّدی تھا پھریرے کے رنگ سے

وہ ضو علم کی وہ رخِ عباسؑ نامور رکھے تھا ہاتھ چہرے پہ خورشید خیرہ سر
پنجہ ادھر علم کا رخ پر ضیا ادھر دو نور سروری تہ و بالا تھے جلوہ گر
یکتا وہ زرق برق میں یہ آب و تاب میں
تھا فرق ایک نیزے کا دو آفتاب میں

پنجے سے نور پنجتنی آشکار ہے پرچم پہ طرّۂ سرِ حورا نثار ہے
دامن بھی ابرِ رحمتِ پروردگار ہے پہنچا جو اس کے سائے میں وہ رستگار ہے
کشتی کا بادباں ہو تو کوثر پہ جا لگے
طوبیٰ نہال ہو اگر اس کی ہوا لگے

اللہ رے شکوہِ علم و شانِ علمدار حمزہؑ کوئی کہتا تھا کوئی جعفرِ طیّار
سائے میں علم کے وہ سلیمانِ زمن تھا
یہ فرق ہمایوں پہ ہما سایہ فگن تھا

پنجہ تھا کہ تھا دستِ خدا سر پہ جری کے پرچم تھا کہ بکھرے ہوئے تھے بال پری کے
ہو جاتی تھی جنبش جو پھریرے کوزری کے جھونکے چلے آتے تھے نسیم سحری کے
کرسی سے جو بالا ہو یہ پایا ہے اسی کا
طوبیٰ جسے کہتے ہیں وہ سایا ہے اسی کا

کہتا ہے کوئی رعبِ علمدار تو دیکھو — روشن ہے زمیں جلوۂ رخسار تو دیکھو
بجلی ہے خجل شوخیٔ رہوار تو دیکھو — شانِ علمِ سیدابرار تو دیکھو
پنجے سے تجلی ید بیضا کی عیاں ہے
دامانِ علم آیۂ رحمت کا نشاں ہے

اس طرح کا صفدر کوئی آفاق میں کم تھا — حقا کہ وہ فخر عرب و روم و عجم تھا
ہمراہ سدا لشکرِ اقبال و حشم تھا — زیبا تھا علم اس کو تو وہ زیبِ علم تھا
شبیرؑ سا سردارِ خوش اطوار نہ ہوگا
عباسؑ دلاور سا علمدار نہ ہوگا

اللہ رے وفاداریٔ عباسؑ خوش اطوار — ہے بعدِ فنا بھی وہی عشق اور وہی پیار
رکھتے ہیں علم شہ کے چپ و راس عزادار — اور بیچ میں ہوتی ہے ضریحِ شہ ابرار
مرنے پہ بھی عشق شہ خوش خو نہیں چھوڑا
اب تک شہ مظلوم کا پہلو نہیں چھوڑا

مرتے رہے شبیرؑ پہ جب تک کہ جیئے ہیں — بے جاں تو ہیں بھائی پہ مگر جان دیئے ہیں
بے دست ہیں ہاتھوں سے مگر سایہ کیے ہیں — آغوش میں فرزندِ پیمبرؐ کو لیے ہیں
عاشور کے دن تعزیہ داری میں ہیں آگے
گھر میں تو ہیں پہلو میں، سواری میں ہیں آگے

پہنچا جو اس حشم سے خدیوِ جہانِ دیں — صف باندھ کر کھڑے ہوئے سب ناصرانِ دیں
کھولا نشان مرتضوی نے نشانِ دیں — غل پڑ گیا کہ آج دوبالا ہے شانِ دیں
قدسی سب اٹھ کھڑے ہوئے تعظیم کیلئے
طوبیٰ کا سر بھی جھک گیا تسلیم کیلئے

کیا اُنس ہے کیا عشق ہے کیا پیار ہے کیا چاہ — مرکر بھی ہیں پروانۂ شمعِ لحدِ شاہ
جب قافلہ نزدیک پہنچتا ہے تو ناگاہ — عباسؑ کو ہوتا ہے یہ حکمِ شہِ ذی جاہ

آج آتے ہیں غم خوار شہنشاہ امم کے
لاؤ مرے زوّاروں کو سائے میں علم کے

تربت سے نکل آتا ہے یوں عاشقِ شبیرؑ کاندھے پہ محمدؐ کا علم ہاتھ میں شمشیر
حیرت سے ملک دیکھتے ہیں چاندسی تصویر ہوتے ہیں جلو میں شہدا صاحبِ توقیر
واں رحمتِ خالق کی طرح آتے ہیں عباسؑ
کس دھوم سے زوّاروں کو لے جاتے ہیں عباسؑ

شانے پہ عجب شان سے لشکر کا نشاں تھا جیسا تھا علم ویسا ہی ذی رتبہ جواں تھا
پنجے سے نشاں آیتِ رحمت کا عیاں تھا اس پر شجر طور کا ہر اک کو گماں تھا
پُر نور تھا پنجہ کفِ موسیٰ سے ضیا میں
تھی نکہتِ فردوس پھریرے کی ہوا میں
کس حُسن سے تیار ہیں اس ماہ کے شانے ہیں جیسے بھرے سیدّ ذیجاہ کے شانے
تھے ایسے ہی حیدرؑ سے شہشاہ کے شانے رکھتے تھے یہی شان یداللہ کے شانے
ہاتھ آیا تھا جعفرؑ کو نہ جاہ و حشم ایسا
اس دوش کے اوپر ہو تو ہووے علم ایسا

دیکھا جو علم رفعتِ طوبیٰ نظر آئی پنجے میں ضیائے ید بیضا نظر آئی
تابندگی برق تجلیٰ نظر آئی کوسوں وہ زمیں نور کا دریا نظر آئی
سائے نے سماں دشت میں نایاب دکھایا
خورشید کو لطف شب مہتاب دکھایا

میر انیسؔ نے مرثیوں میں چند بند خصوصی طور پر علم کی تعریف میں لکھے ہیں اس کے علاوہ بھی کہیں کہیں چند اشعار علم کی تعریف میں ملتے ہیں اور کسی نہ کسی طرح وہ کوئی نیا گوشہ پیدا کرتے ہیں۔

حضرت عباسؑ علم لیکر فرات پر پہنچے ہیں، حضرت عباسؑ فوجِ اشقیا سے فرماتے ہیں۔

ہے چتر سے بہتر علم شاہ کا سایہ

پنجہ یہ نہیں سر پہ ہے اللہ کا سایہ

لشکرِ یزید کہتا ہے

لشکر لئے ساتھ آیا ہے اقبال و حشم کا
ابر اس کو نہ سمجھو یہ پھریرا ہے علم کا

فرات میں "عکس علم" کا ذکر میر انیسؔ نے نئے نئے طریقے سے کیا ہے

پانی میں یکایک جو پڑا عکس علم کا
تھا پنجۂ خورشید کہ آئینے میں چمکا

حضرت عباسؑ رجز پڑھتے ہوئے اسلام کے لشکر کے علم کا ذکر کرتے ہیں۔

اسلام کے لشکر کے علم ہم نے نکالے

حضرت عباسؑ کی جنگ کی دہشت سے لشکرِ یزید بھاگ رہا ہے اس وقت سب پکار کے حضرت عباسؑ سے کہتے ہیں۔

آزاد کر اب ہم کو تصدّق میں علم کے

علم اور علمدار کی تعریف میر انیسؔ اکثر ساتھ ساتھ کرتے ہیں۔

کس نے پایا وہ جو تھا جاہ و حشم ان کے لئے
یہ علم کے لئے تھے اور علم ان کے لئے

جنگ شروع ہونے سے پہلے جب امام حسینؑ کا لشکر آراستہ ہوا اور علم بلند ہوا اس وقت کے منظر کو میر انیسؔ ایک شعر میں پیش کرتے ہیں۔

ہمراہِ علم دھوپ میں تھا ظلّ خدا بھی
جبریل بھی تھے سایہ فگن سر پہ ہما بھی

مشک اور علم:۔

میر انیسؔ نے ''مشک اور علم'' دونوں کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے، مشک حضرت سکینہؑ یعنی پیاسی بھتیجی کی یادگار ہے جس نے چچا کے علم میں اپنی سوکھی مشک باندھ دی تھی۔

منھ تکنے لگی شاہ کا یہ کہہ کے وہ خوش خو حضرت نے کہا جاؤ انھیں مشک بھی لا دو

لشکر کا علمدار تو ہم کر چکے ان کو   اب مرتبہ تم پیاسوں کی سقائی کا بخشو
جعفرؑ سے دوبالا ہوا رتبہ ترے عم کا
اب حشر تلک ساتھ رہا مشک و علم کا

حضرت عباسؑ مشک بھر کر فرات سے واپس آرہے ہیں اس وقت دوش پر مشک اور ہاتھ میں علم ہے۔ میر انیسؔ اس منظر کو اس طرح پیش کرتے ہیں۔

وہ مشک دوش پر وہ لچکتا ہوا علم
غل تھا کہ آج کوثر و طوبیٰ ہوئے بہم

حضرت عباسؑ جنگ کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں، چاروں طرف سے تیروں کی بارش ہو رہی ہے، اس وقت ان کے لب پر ''مشک وعلم'' کے لئے یہ دعا ہے۔

تو مشک کا حافظ ہے نگہباں ہے علم کا
یارب میں بہشتی ہوں پیمبرؐ کے حرم کا

وقتِ شہادت بھی انھیں صرف ''مشک وعلم'' کا خیال ہے۔

پیاسوں کا یا مفارقت شہؑ کا غم کروں
یارب کسے سپرد یہ مشک و علم کروں

جس ہاتھ میں علم تھا وہ قطع ہو گیا۔

وہ ہاتھ بھی ریتی میں گرا جس میں علم تھا

حضرت عباسؑ فرات سے واپس نہیں آئے پیاسے بچےؑ خیمے کے در پر علم اور مشک کے منتظر ہیں میر انیسؔ کہتے ہیں۔

عباسؑ نہ آئیں گے علم آتا ہے لوگو

بیٹھے ہو کیا اٹھو علم آتا ہے خوں میں تر
مارے گئے فرات پہ عباسِؑ نامور

تیروں سے چھدی مشک لٹکتی ہے علم میں

گھوڑا اور علم :-

ایک مقام پر میر انیسؔ نے حضرت عباسؑ کے گھوڑے کو کشتی سے تشبیہ دی ہے اور علم کے پھریرے کو کشتی کا بادبان تصور کیا ہے۔

آغاز جنگ میں وہ تگ و دو وہ آؤ جاؤ   گھونگھٹ نیا تھا چال نئی تھی نیا بناؤ
جاتا تھا یوں اُتار ہو رستے میں یا چڑھاؤ   جیسے ہوا میں جاتی ہے آب رواں پہ ناؤ
تھا صاحب علم بھی جدل پر تُلا ہوا
کشتی کا بادباں تھا پھریرا کُھلا ہوا

فرات میں علم کا عکس :-

پانی میں جلوہ گر تھا جو عکس رخ و علم   تھے مہر و ماہ آئینۂ آب میں بہم

آئی صدا درود کی ہر نخل و سنگ سے   دریا زبرجدی تھا پھریرے کے رنگ سے

علم کا سُنہرا پنجہ اور سبز پھریرا :-

قرآنِ مجید میں علم کا ذکر موجود ہے، میر انیسؔ کہتے ہیں

ذکرِ علم حمد ہے قرآن میں آیا
شیعوں کے سروں کا ہے یہی حشر میں سایا

قرآن کا سورۂ ''زُخرف'' جسکے معنی سونا اور سنہرا رنگ ہے، اتفاق سے اسی سورے میں علم کا ذکر ہے۔

اِنَّہٗ لَعِلْمٌ لِلسَّاعۃِ (سورۂ زخرف آیت ۶۱)

وہ قیامت کی نشانی (علم) ہے۔

امام راغبؔ نے لفظ ''العلم'' کی شرح میں لکھا ہے کہ ایسا نشان جس سے کوئی شے پہچانی جاسکے جیسے علم الطریق اس نشان کو کہتے ہیں جو راستے کی پہچان کے لئے اس میں استادہ کر دیا جاتا ہے اور فوج کے جھنڈے کو ''علم الجیش'' کہا جاتا ہے کیونکہ اس سے فوج کی پہچان ہو جاتی ہے، قرآن کی یہ آیت اس طرح ہے ''وَاِنَّہٗ لَعَلَمٌ''، یعنی وہ نشان جس سے کسی چیز کی پہچان ہو جھنڈے کے ساتھ

تشبیہ کے اعتبار سے، یہ معنی مراد ہوتا ہے۔ (امام راغب صفحہ ۱۹۷ جلد دوم)

علم حمد (لواء الحمد) یعنی محشر میں جو علم نصب کیا جائے گا۔

امام حسینؑ فرماتے ہیں۔

ہو سب کے سروں پر علمِ حمد کا سایا

میر انیسؔ نے کربلا میں ''علم فوجِ خدا'' کی منظر کشی میں علم کی اہمیت کو محسوس کیا اور اپنے مرثیوں میں جہاں جہاں بھی تذکرہ کیا ہے اُسے اللہ کی ایک نشانی کے طور پر خالص جمالیاتی نقطۂ نظر سے اس کے ظاہری حسن کی تصویر کشی کی ہے۔

علم کی مرقع کشی میں میر انیسؔ نے اس کے پنجے کی آب وتاب، چمک دمک، اس کے سنہرے رنگ کی جلوہ نمائی اور نور پاشی کے ساتھ ساتھ تقدس کے التزام کا اہتمام بھی کیا ہے۔

میر انیسؔ کی نظر میں علم صانعِ قدرت کا شاہکار ہے۔

جب کھینچ چکا شکلِ علمدار و علم کو
خود چوم لیا صانعِ قدرت نے قلم کو

علم کی نورانیت

فوجِ خدا کا علم مصدرِ انوارِ الٰہی ہے اس لئے میر انیسؔ علم کو ''منبعِ نور'' کہتے ہیں، علم جوھر ہے اور نورِ علم عرض ہے، میر انیسؔ نے علم کی نورانیت کے پیشِ نظر حضرت عباسؑ کے علم کو ''علمِ نور'' سے تعبیر کیا ہے۔

طوبیٰ ہو تو ایسا مہ کامل ہو تو ایسا
ایسے ''علمِ نور'' کا حامل ہو تو ایسا

غازی کی وہ شوکت وہ شکوہِ ''علمِ نور''
کہتی تھی یہ گیتی کہ انا الطور انا الطور

کس جنگ میں ایسے ''علمِ نور'' کھلے ہیں

اور یہ نورِ علم دراصل ''نورِ الٰہی'' ہے:-

پنجہ جو ہلا پھیل گیا ''نورِ الٰہی''

پنجہ کی چمک:-

علم کی نورانیت اور خصوصاً پنجہ کی چمک سے ایسا نور ساطع ہو رہا تھا کہ ساری فضا اور زمین کربلا منور ہوگئی تھی۔ میر انیسؔ اس نور کے رنگ کو دکھا دینا چاہتے ہیں تا کہ اُن کا سامع اور قاری اپنی حسن بصارت سے سُنہرے رنگ کو دیکھ سکے، میر انیسؔ نے نور کا رنگ نہ خالص سُنہرا اور نہ خالص رُوپہلا بتایا ہے بلکہ کچھ کچھ گنگا جمنی کیفیت ہے، کہتے وہ سُنہرا ہیں لیکن تشبیہ سُنہرے اور رُوپہلے دونوں رنگوں سے دیتے ہیں۔ رنگ اور نور دو مختلف جوھر ہیں، نور لطیف ہے اور رنگ کثیف ہے، نور جب مادّے میں آتا ہے تو رنگ کا وجود ہو جاتا ہے، رنگ جب تک نور ہے اس کا نظر آنا دشوار ہے اسی لئے بہت سے رنگ نظر نہیں آتے، ایسے رنگ ماورائے حسیّات ہوتے ہیں، بہت سے رنگ اللہ نے ایسے بھی خلق کئے ہیں جن کو انسان کی آنکھ اب تک نہیں دیکھ سکی ہے۔ نخلِ طور سے جو نور ساطع ہوا اس کا رنگ کیا تھا ؟ یدِ بیضا کا نور جو حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ سے ساطع ہوتا تھا اس کا رنگ کیا تھا؟ قرآن نے ان رنگوں کو تیز سفید روشنی سے تعبیر کیا ہے لیکن حسِّ بصارت ان رنگوں کا تعیّن نہیں کر سکتی، تجلّیٔ طور یعنی جو صاعقہ کوہِ طور پر چمکا اس کا رنگ کیا تھا؟ قرآن نے اس کو بجلی کہا ہے، بجلی کا رنگ سُنہرا ہوتا ہے لیکن انسان کی آنکھ ان رنگوں کا احصا نہیں کر سکتی۔

میر انیسؔ پنجے کی چمک کو ان روحانی رنگوں سے قریب لے آتے ہیں اور مادّی سُنہرے رنگ جو انسان دیکھ سکتا ہے ان سُنہرے رنگوں کا استعارہ بھی علم سے کرتے ہیں، مثلاً وہ تمام روشن اور چمکدار چیزوں سے پنجے کا ربط قائم کرتے ہیں، مثلاً سورج کی چمک، سونا، خطوطِ شعاع، صاعقہ وغیرہ، یہ وہ چیزیں ہیں جنہیں انسان دیکھ سکتا ہے، میر انیسؔ ''سُنہرے رنگ'' کی تشکیل میں خورشید، آفتاب، سورج کے لفظ استعمال کر کے سُورج کی روشنی کے رنگ کو اجاگر کرتے ہیں:-

خورشید ہے یا پنجۂ تابانِ علم ہے

یہ شانِ علم اور پھریرے کا وہ عالم　　یہ ابرِ کرم ہے تو وہ ہے نیرِ اعظم

اللہ رے نور علم و حُسن علمدار
صحرا کی زمیں بن گئی سب مطلع انوار

پہنچی جو ضیا چرخ پہ پنجے کی زمیں سے
آوازِ درود آنے لگی چرخ بریں سے

پنجہ مثال پنجۂ خورشید زرفشاں

جوں پنجۂ خورشید علم دور سے چمکا

پنجہ نہ تھا نشانِ ثریا مآب کا　　تھا فرقِ جبرئیل پہ تاج آفتاب کا

پانی میں یکایک جو پڑا عکس علم کا　　تھا پنجۂ خورشید کہ آئینے میں چمکا

پنجہ کا سُنہرا رنگ

یہ بات واضح ہے کہ میرانیسؔ پنجہ کا رنگ خالص سُنہرا بتاتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ پنجہ کے نور سے دشت بھی سُنہرا ہو گیا تھا:-

پنجہ وہ سُنہرا نظر آتا ہے علم کا
دیکھو وہ پھریرا نظر آتا ہے علم کا

ناگہہ نظر آیا علمِ دیں کا پھریرا
پنجے کے چمکنے سے ہوا دشت سُنہرا

میرانیسؔ نے علم کی تصویر میں سبز رنگ کے ساتھ سُنہرا رنگ بھی بھرا ہے، اُن کی کوشش ہے کہ سُنہرا رنگ واضح سے واضح تر ہو جائے، ابر میں بجلی چمکنے کا سماں بھی سب نے دیکھا ہے، وہ سُنہرا رنگ بھی میرانیسؔ کی نظر میں ہے:-

بجلی نہیں پنجہ یہ لپکتا ہے علم کا

ایسا نہ ہو کہ اُن کے بنائے ہوئے سنہرے رنگ کو خورشید اور بجلی کا سنہرا رنگ تسلیم کرلیا جائے اس لئے وہ علم کے پنجہ اور خورشید کا تقابل کرتے ہیں اور پنجہ کے سُنہرے رنگ کو خورشید کی چمک سے افضل قرار دیتے ہیں:-

پنجہ کی ضیا دیکھ کے خورشید تھا ششدر

خورشید بھی منہ رشک سے تکتا ہے علم کا

تھی اس کی ضیا آئینہ مہر سے دہ چند

سورج چوتھے آسمان پر ہے اور حضرت عیسیٰؑ بھی چوتھے آسمان پر ہیں، میر انیسؔ رنگ بھی بتاتے ہیں اور عظمت بھی، عبرانی زبان میں عیسیٰ کے معنی سُرخ رنگ ہیں، دیکھئے میر انیسؔ کی فکر میں کیسا رنگ آیا ہے:-

عیسیٰؑ نے پکارا کہ نثار اُس کے حشم کے
خورشید نے منہ رکھ دیا پنجے پہ علم کے

پنجے کی چمک آسمان پر تھی اور سورج کی روشنی زمین پر

پنجہ اِدھر چمکتا تھا اور آفتاب اُدھر
اس کی ضیا تھی خاک پہ ضو اس کی عرش پر

پنجے کی زرریزی کو میر انیسؔ مختلف زاویوں سے واضح کرتے ہیں:-

زر ریزی علم پہ ٹھہرتی نہ تھی نظر
دولھا کا رُخ تھا سونے کے سہرے میں جلوہ گر

پرچم فزوں تھا حُسن میں گیسوئے حور سے
خورشید زرد ہوگیا پنجے کے نور سے

تھا پنجتن کا نور جو پنجے پہ جلوہ گر

اعمیٰ کی پتلیوں میں بھی تھا روشنی کا گھر

اللہ ری چمک علم بوتراب کی
تارِ نظر بنی تھی کرن آفتاب کی

شوکت وہ اس جناب کی وہ رفعتِ علم
پنجے کی ضو سے برق چمکتی تھی دم بدم

زر ریز تھا پنجہ تو یہ کہتے تھے خرد مند
یہ ہاتھ سخی کا ہے نہ ہووے گا کبھی بند

پنجے کی چمک دمک اور سنہرے رنگ کے سامنے سورج کا رنگ پھیکا تھا:۔

کیوں کر نہ جھپکے چشمِ جہاں بینِ آفتاب
پنجے سے اُس کے آنکھ ملانے کی کس کو تاب

لہر وہ سبز پھریرے کی وہ پنجے کی چمک
شرم سے ابر میں چھپ جاتا ہے خورشیدِ فلک

ہم پنجہ ہو پنجے سے یہ کیا مہر کا مقدور

تھی اُس کی ضیا آئینہ مہر سے دہ چند

خورشید کا جلال نگاہوں سے گر گیا
اقبال سر کے گرد ہُما بن کے پھر گیا

میر انیسؔ کہتے ہیں خورشید کے ساتھ چاند بھی علم کے پنجے سے خجل ہے کہ علم نور مصدرِ انوار الٰہی ہے:۔

پنجے سے خجل پنجۂ خورشید و رُخِ ماہ

اللہ کا لفظ اس سے عیاں ہوتا ہے واللہ

پنجہ جو ہلا پھیل گیا نورِ الٰہی

اور چونکہ یہ مصدر انوارالٰہی ہے اسے خورشید نہ سمجھا جائے:-

خورشید نہ سمجھو اسے پنجہ ہے علم کا

علم کے پنجے کا رنگ سونے جیسا یا سورج کی روشنی جیسا نہ سمجھ لیا جائے اس لئے میر انیس یہ بھی وضاحت کرتے ہیں کہ پنجے کا رنگ ہے تو سُنہرا لیکن سونے، چاندی اور سُورج کی روشنی سے زیادہ روشن اور چمکدار ہے:-

پرچم میں تھا حُسن میں گیسوئے حور سے
خورشید زرد ہوگیا پنجے کے نور سے

یدِ بیضا اور پنجہ:-

ید بیضا اور پنجے میں ہاتھ کی مناسبت ہے، قرآنی آیات میں ید بیضا نور ہے، اور اب میر انیس روحانی رنگوں کی طرف حسِ بصارت کو مبذول کرتے ہیں تاکہ پنجے کی چمک، اس کا سُنہرا اور روپہلا رنگ (گنگا جمنی رنگ) اور اس کے تقدس کا بیک وقت تصور پیدا ہو سکے، چنانچہ وہ ید بیضا کی چمک سے معنوی مناسبت پیدا کرتے ہیں:-

پنجے پہ ہے عالم ید بیضا کی ضیا کا

ہے نور کا عالم علم فوج خدا پر
موسیٰ نے دھرا ہے ید بیضا کو عصا پر

پُرنور تھا پنجہ کفِ موسیٰ سے ضیا میں

پنجے سے تجلّی ید بیضا کی عیاں ہے

پنجے نے جلوۂ کفِ موسیٰ دکھا دیا

پنجے میں ضیائے یدِ بیضا نظر آئی

تجلّیٔ طوراور پنجہ :-

یدِ بیضا کے بعد انیسؔ کا ذہن شجرِ طور، شمع طور، تجلّیٔ طوراور رُخِ حور کی طرف جاتا ہے :-

دامن وہ سبز اور وہ پنجے کا اس کے نور
نکلا ہوا ہے قصرِ زمرّد سے روئے حور

فرقِ جنابِ خضر پہ روشن ہے شمع طور

عکس اُس کا فزوں حُسنِ رخِ حور سے چمکا
تھا نور کا شعلہ کہ رخِ طور سے چمکا

پنجہ سے نشاں آیۂ رحمت کا عیاں تھا
اس پر شجرِ طور کا ہر اک کو گماں تھا

لیکن شمع طور، تجلّیٔ طور، شعلۂ طور، اور روئے حور سے علم کے پنجے کی تعبیر میر انیسؔ پنجے کی چمک دمک اور سُنہرے رنگ کو سمجھانے کے لئے کرتے ہیں ورنہ علم کا پنجہ اورزیادہ پُر نور ہے :-

موسیٰؑ نے تجلّی میں نہ دیکھی چمک ایسی

پھر تقدیس اور چمک دمک کی ملی جُلی مناسبت کے لئے میر انیسؔ کی نظرِ انتخاب قرآن کی سُورۂ والشّمس کی آیت پر پڑی "وَالشَّمسِ وَضُحٰھا" قسم ہے سورج کی اور اس کی روشنی کی......

یا سورۂ والشّمس کی آیت ہے یہ رایت

آخر میں میر انیسؔ کو قرآن سے ایک افضل ترین اور محکم دلیل مل ہی جاتی ہے :-

دیکھو تو حشم بازوئے شاہِ شہدا کا
سایہ سرِ پُر نور پہ ہے دست خدا کا

اب میر انیسؔ علم کے پنجہ کو "اللہ کا ہاتھ" کہتے ہیں، قرآن کی آیت ہے "یَدُاللهِ فَوقَ اَیدِیھِم"

اللہ کا ہاتھ سب پر فوقیت رکھتا ہے''۔

نجف اشرف میں حضرت علی علیہ السّلام کے روضۂ مبارک کے گنبد پر جب نادر شاہ دُرّانی نے سونے کا پنجہ نصب کیا تو اس کی تاریخ اسی آیت سے نکلی۔

''یَدُاللہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ'' (سورۂ فتح آیت ۱۰)

''اللہ کا ہاتھ سب پر فوقیت رکھتا ہے''

علم کا پنجہ مصدرِ انوارِ الٰہی ہے اور یہ سنہرا پنجہ ہر رنگ پر فوقیت رکھتا ہے کہ اللہ کا بھی ایک رنگ ہے۔

صِبْغَۃَاللّٰہِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰہِ صِبْغَۃً (سورۂ بقرہ آیت ۱۳۸)

''اللہ کا رنگ سب سے بہتر رنگ ہے اور اللہ کا رنگ اختیار کرو''

دوسرا ترجمہ:- اللہ کا رنگ، اور اللہ سے بہتر رنگنے والا کون ہے''

میر انیسؔ کہتے ہیں:-

پنجہ سے خجل پنجۂ خورشید و رُخِ ماہ
اللہ کا لفظ اس سے عیاں ہوتا ہے واللہ

میر انیسؔ کی شاعری میں ''سبز علم''

دُنیا کی ہر قوم اپنے پرچم کو عزّت وعظمت کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور اُسے مُلکی وقومی وقار کا نشان تصوّر کرتی ہے۔ پرچم کا رواج زمانۂ قدیم سے مسلسل آج تک کرّ وفر کے ساتھ باقی ہے۔ مشرق و مغرب کے مُلک اپنے پرچم کے لیئے آج بھی کوئی نہ کوئی رنگ پسند کرتے ہیں۔ ہر قوم اپنے مقاصد اور مزاج کے مطابق رنگوں کا انتخاب کرتی ہے۔ شرافت اور پاکیزگی کے اظہار کے لئے سفید رنگ پسند کیا جاتا ہے اور اگر کوئی مُلک خونی انقلاب لانا چاہتا ہے یا قہر وغلبہ اور تسلّط کو ظاہر کرنا چاہتا ہے تو سُرخ رنگ منتخب کرتا ہے، کسی کے پیشِ نظر شادابی وخوش حالی، صلح دامن ہوتا ہے تو وہ سبز رنگ کا پرچم بلند کرتا ہے۔ کبھی کبھی ایک ہی قوم کے دو (۲) مختلف رنگ کے پرچم بھی ہوتے ہیں اور دونوں رنگ مختلف مواقع پر استعمال کیئے جاتے ہیں۔ مثلاً سفید رنگ کا پرچم قومی شرافت کی علامت کے طور پر اور سبز رنگ کا پرچم صلح وآشتی کے پیغام کی علامت کے اظہار کے لئے۔

اسلام کی تاریخ میں پرچم کی بے حد اہمیت رہی ہے۔ جنگ صفّین میں حضرت علی علیہ السّلام نے

پرچم کی عظمت پر خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ:

''خبردار پرچم اپنے مرکز سے نہ ہٹنے پائے۔ اسے صرف بہادروں کے پاس رہنا چاہیئے جو شخص مصائب کو برداشت کر سکے اور شدائد کا مقابلہ کر سکے وہی محافظِ علم کہا جا سکتا ہے اور جو محافظت کا اہل ہوتا ہے وہی پرچم کے گرد و پیش رہتا ہے اور چار طرف سے اس کی حفاظت کرتا ہے۔ محافظ افراد اپنے پرچم کو ضائع نہیں کرتے۔ وہ نہ پیچھے رہ جاتے ہیں کہ پرچم دوسروں کے حوالے کر دیں اور نہ آگے بڑھ جاتے ہیں کہ پرچم کو تنہا چھوڑ دیں۔'' (نہج البلاغہ)

اسلام کا پرچم بدر و اُحد میں حضرت حمزہؑ کو دیا گیا، خندق و خیبر و حنین میں حضرت علیؑ علمدارِ لشکر تھے، جنگِ موتہ میں حضرت جعفرؑ طیّار کے پاس لشکر کا علم تھا، کربلا میں حضرت امام حسینؑ نے یہ علم حضرت عباسؑ کو عطا کیا تھا۔

آغازِ اسلام میں پرچم کا رنگ سفید تھا۔ جنگِ بدر میں جنابِ حمزہؑ کے پاس سُرخ علم تھا اور حضرت علیؑ کو زرد علم عطا کیا گیا تھا۔ جنگِ اُحد اور خیبر میں علم کا رنگ سفید تھا۔

اس کے بعد مُسلمانوں کے قبیلوں اور دیگر قوموں نے اپنا ایک مخصوص رنگ قرار دے لیا۔ بنی اُمیّہ نے سُرخ رنگ کا انتخاب کیا اور کبھی اپنا پرچم سیاہ رنگ کا رکھا، بدر کے بعد بنی اُمیّہ سیاہ پرچم استعمال کرتے تھے۔ خارجیوں نے بھی سُرخ پرچم استعمال کیا تھا، بنی عبّاس نے سیاہ رنگ کا پرچم بلند کیا، شروع میں سادات نے اپنے علم کا رنگ سفید رکھا تھا بعد میں سبز رنگ کا انتخاب کر لیا، حضرت امام رضا علیہ السّلام کو جب خلیفۂ بنی عباس مامون رشید نے ولی عہد بنایا تو اس نے اعلان کر دیا کہ اب حکومت کا رنگ سیاہ کے بجائے سبز ہوگا اور سیاہ رنگ کے پرچم ترک کر دیئے گئے۔

یہ حضرت امام رضا علیہ السّلام کا احسان ہے کہ ولی عہدی کا منصب سنبھال کر مسلمانوں کی سیاہی کو زائل کر دیا اور اُنہیں صلح و آشتی کا رنگ ''سبز'' دے دیا۔ اب پوری دُنیا سبز رنگ کو صلح و آشتی، امن و امان، بہار، فخر، شادابی، سرسبزی، دفاع بصارت، کرامت، افادیت کی علامت سمجھتی ہے اور آج بھی سُرخ رنگ جنگ کی علامت سمجھا جاتا ہے، دُنیا کے ۱۲۹ مُلکوں کے پرچموں میں سُرخ رنگ شامل ہے برطانیہ کا پرچم بھی سُرخ تھا سُرخ رنگ غلبہ اور تسلّط کا بھی رنگ ہے لیکن سبز رنگ کو اب اسلامی رنگ سمجھا جاتا ہے کہ یہ تحفہ مُسلمانوں کو کربلا کے علم سے ملا ہے۔ اب دُنیا کے ۱۲۹ اسلامی مُلکوں کے پرچم سبز ہیں، کربلا کا سبز علم اب جلوسِ عزاداری کا بھی نشان ہے۔

کربلا میں امام حسین علیہ السّلام نے اپنے پرچم کا رنگ ''سبز'' ہی رکھا تھا کہ آپ بتانا چاہتے تھے کہ ہم جنگ نہیں چاہتے بلکہ صلح اور امن کے پیغامبر ہیں جبکہ فوجِ یزید سیاہ پرچم بلند کئے ہوئے تھی اور خارجی جو کربلا آئے تھے مثلاً شمر وغیرہ کے پرچم سُرخ رنگ کے تھے:-

میر انیسؔ کہتے ہیں:-

تلواریں چمکتی تھیں علم سُرخ کھلے تھے — دو لاکھ جواں ایک سے لڑنے کو تُلے تھے

ناگہ اُٹھا شمال کی جانب سے اک غبار — رایت سیاہ و سُرخ نظر آئے تین چار

جو مرد ہیں ہر اس کے کرتے نہیں کلام — ہونے دو گر ہیں سُرخ علم یا سیاہ فام

میر انیسؔ نے بنی اُمیہ کے پرچم کا رنگ سیاہ بتایا ہے، یزید کے لشکر میں سیاہ پرچم کھلے ہوئے تھے۔ خارجیوں کے سردار شمر کا پرچم سُرخ تھا:-

ناگاہ بجا فوجِ عدو میں دہلِ جنگ — کھلنے لگے ہر صف کے علمہائے سیہ رنگ

واں فوجِ سیہ رو نے علم کھولے ہیں کالے — ہیں لعل کو زہرؔا کے ادھر جان کے لالے

اٹھا تھا دھواں یہ کہ سیہ رنگ علم تھے — پھل برچھیوں کے آگ کے شعلوں سے نہ کم تھے

جب رن میں فوجِ شام کے کالے علم بڑھے — تیغوں کو تول تول کے اہلِ ستم بڑھے

نیزے اُٹھا کے جنگ پہ اسوار تُل گئے — کالے نشان فوجِ سیہ رو کے کھُل گئے

دس سو جو علم ہائے سیہ کھل گئے یک بار — دن ہو گیا آنکھوں میں لعینوں کے شبِ تار

تلواروں سے واں برق بھی شرمائی ہوئی ہے — اڑنے سے پھریروں کے گھٹا چھائی ہوئی ہے

لشکرِ یزید رسولؐ اللہ کے گھرانے کا خون بہانے پر آمادہ تھا جبکہ حسینؑ ابنِ علیؑ کا سبز علم اُنہیں انسانیت اور ہدایت کی طرف بلانے پر آمادہ تھا:-

واں لعینوں نے درِ ظلم و ستم کھول دیا بڑھ کے عباسؑ نے یاں سبز علم کھول دیا

میر انیسؔ سبز علَم کے رنگ کے اظہار کے لیئے مختلف سبز اشیاء کا ذکر کرتے ہیں تا کہ عام ناظرین یا قاری سبز رنگ کو حسِ باصرہ سے محسوس کر سکے،

طوبیٰ کی شاخِ سبز، سرو، شمشاد، زمرّد، خضر، امام حسنؑ، زبرجد، سبز ردا، کھیتی (زراعت) چرخِ اخضری، کاہی، دھانی وغیرہ، جہاں بھی سبز رنگ نظر آیا میر انیسؔ نے استعارے کے طور پر استعمال کیا، اشیاء کی پاکیزگی بھی اُن کے پیشِ نظر ہے کہ علم ایک پاکیزہ وطاہر نشان ہے اور یہ سادات کا رنگ ہے:-

رایت وہ سبز، لشکرِ سادات کا نشاں دامانِ پاک، کشتیِ اُمّت کا بادباں

حضرت خضر علیہ السّلام سے نسبت:-

زوجۂ حضرتِ عباسؑ فرماتی ہیں:-

ہے ہے علم کے ملنے کی شادی کہوں میں کیا خضرؑ اُن کو مل گئے علمِ سبز کیا ملا

جلوے جو نہر میں علم سبز نے دکھائے اک شور تھا کہ خضر علیہ السّلام آئے

فرقِ جناب خضر پہ روشن ہے شمع طور بے شبہ وہ امام کے ہے نور کا ظہور

آسمان کی سبزی سے نسبت:-

چرخِ زبرجدی پئے تسلیم خم ہوا

دکھلاتا تھا سر سبزیِ افلاک پھریرا تھا دامنِ مریمؑ کی طرح پاک پھریرا

امام حسن علیہ السّلام سے نسبت:- (سبز اور سُرخ)

اس کا علم یہ ہے جو شہِ مشرقین ہے گویا حسنؑ کے دوش پہ دستِ حسینؑ ہے

دامن جو کُھلا رنگِ زمیں ہوگیا کاہی

سبزیٔ حسنؑ، سُرخیِ خونِ شہ دیں تھی سونے کا فلک تھا تو زمرّد کی زمیں تھی

سبزہ زار سے نسبت:-

سرو کا درخت بھی سبز ہوتا ہے، علم بھی سبز ہے، سرو بھی دلکش اور جاذبِ نظر ہوتا ہے اور علم بھی سبز رنگ کی دلکشی اور حُسن رکھتا ہے:-

''سروِ چمن آرائے'' ہدایت ہے یہ رایت

دریا خجل ہے سبز پھریرے میں ہے وہ لہر　　سبزہ بھی اُس کے عشق میں کھائے ہوئے ہے زہر

غُل تھا کہ یہ ہے ''سروِ رواں'' باغِ وفا کا　　پنجے پہ ہے عالم یدِ بیضا کی ضیا کا

شمشاد سبز پوش گلستانِ اقتدار　　حمزہؑ کا اقتدار تو جعفرؑ کا افتخار

طوبیٰ اور علم:-

جنت میں درختِ طوبیٰ بھی سبز ہے:-

حدیث میں ''طوبیٰ'' کے معنی قلبی سکون کے ہیں، سبز رنگ دیکھنے سے قلبی سکون بھی ملتا ہے۔

میر انیسؔ طوبیٰ کی سبزی سے علم کے رنگ کو نسبت دیتے ہیں:-

طوبیٰ ہو تو ایسا، مہ کامل ہو تو ایسا　　ایسے علمِ نور کا حامل ہو تو ایسا

جنت کی پھریرے سے ہوا آتی تھی رن میں　　طوبیٰ نے جگہ پائی تھی زہراؑ کے چمن میں

صدقے علم کے حضرتِ عباسؑ کے نثار　　طوبیٰ شکوہ، عرش تجمّل، فلک وقار

کس شان سے اُڑتا نظر آتا ہے پھریرا　　طوبیٰ کو عروج اپنا دکھاتا ہے پھریرا

چوما نشاں کو بڑھ کے ہر اک خیر خواہ نے　　''طوبیٰ لکم'' کہا شہِ عالم پناہ نے

پنجے کا نور سبز پھریرے کے ساتھ ہے　　طوبیٰ کی شاخِ سبز پہ مریمؑ کا ہاتھ ہے

جھک جاتی ہے شاخِ سرِ طوبیٰ علم ایسا

علم سبز رنگ نے زمین کو سبز بنادیا:-

دامن جو کھلا رنگ زمیں ہوگیا کاہی

اس کے کرم سے زمانہ فیضیاب ہوا:-

سر سبز اُس نے کردیا دُنیا کی کِشت کو

مندرجہ ذیل دو (۲) بند ہیں جس میں پانچ مرتبہ لفظ ''سبز'' استعمال ہوا اور زہر، طوبیٰ، زمرّد، خضر، اور امام حسنؑ سے نسبت دیکر سبز کو بتایا گیا ہے، دوسرے بند کے آخری مصرع میں ''سبز اور سُرخ'' کا امتزاج پیش کر کے تصویرِ علم میں خُوب صورت رنگ بھرے گئے ہیں۔ یہ ہے میر انیسؔ کی رنگ آمیزی...... ''سبحان اللہ''

دریا خجل تھا سبز پھریرے میں تھی وہ لہر — سبزہ بھی اس کے عشق میں کھائے ہوئے تھا زہر
دامن ہے بادبانِ جہاز امامِ دہر — موجیں دکھا رہی ہیں بہشتِ بریں کی نہر
پنجے کا نور سبز پھریرے کے ساتھ ہے
طوبیٰ کی شاخِ سبز پہ مریمؑ کا ہاتھ ہے

دامن وہ سبز اور وہ پنجے کا اس کے نور — نکلا ہوا ہے قصرِ زمرّد سے روئے حور
فرقِ جنابِ خضرؑ پہ روشن ہے شمعِ طور — بے شبہ وہ امام کے ہے نور کا ظہور
اس کا علم یہ ہے جو شہ مشرقین ہے
گویا حسنؑ کے دوش پہ دستِ حسینؑ ہے

پرچم نے لیا باج پرِ بالِ ملک سے
خورشید کا منھ پھر گیا پنجے کی جھلک سے

میر انیسؔ نے علم کی مدح میں جس قدر بھی اشعار لکھے ہیں ان کا انتخاب میں نے آپ کے سامنے پیش کردیا۔ یہ تمام بند اس قدر واضح ہیں کہ تشریح کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ہاں یہ آخری منزل ملاحظہ ہو۔۔۔۔۔۔ اب میں وہ اشعار پیش کرتا ہوں جو حاصل مضمون ہیں:-

مدح علم میں طبع کو تشویش ہے کمال — ہر سمت دوڑ دوڑ کے تھک گیا خیال

بے مثل جو ہو پھر اُسے کس شے سے دوں مثال   طوبیٰ اسے کہوں تو وہ ہوجائے خود نہال
جھک جائے آسماں وہ بزرگی نشاں میں ہے
یہ راستی نہ سرو میں نے کہکشاں میں ہے
کیوں کر نہ جھپکے چشم جہاں بینِ آفتاب   پنجے سے اس کے آنکھ ملانے کی کس کو تاب
دامن خدائے پاک کی رحمت کا ہے سحاب   جس کے کرم سے ایک زمانہ ہے فیضیاب
سرسبز اس نے کردیا دنیا کی کشت کو
اب تک اسی ہوا کی ہوس ہے بہشت کو
پنجہ پہ ابتدا سے رہا نورِ سرمدی   نیچے تھے جس کے قبلۂ عالم کے مقتدی
پرچم سیاہ اور پھریرا زبرجدی   نصرت پناہ زینتِ فوجِ محمدی
کافر رہے نہ لشکرِ اسلام رہ گیا
دنیا میں اس نشاں کا فقط نام رہ گیا

دنیا میں اس نشاں کا فقط نام رہ گیا:- ہر ملک کا ایک نشان ہوتا ہے۔ ہر فوج کے ساتھ علم ہوتا ہے بڑے بڑے بادشاہوں کے علم مشہور تھے لیکن حکومتوں کے ختم ہونے کے بعد اُن کے نشان بھی فنا ہو گئے۔ بظاہر ۶۱ ھ میں حسینؑ کا لشکر قتل کر دیا گیا۔ حسینؑ کا علمدار قتل کر دیا گیا۔ لشکر اسلام بھی ختم ہوا۔ فوج یزیدی بھی نہ رہی لیکن حسینی سپاہ کا علم آج بھی بلند ہے۔ حسینؑ کا لشکر آج بھی زندہ ہے عباسؑ کے علم کا نام موجود ہے۔ اب ''علم'' اردو میں صرف عباسؑ کے ''علم'' کو کہتے ہیں۔ عاشور کے دن عباسؑ کا علم عباسؑ کے ہاتھوں کے ساتھ ٹھنڈا ہوگیا تھا۔ میر انیسؔ کہتے ہیں جب حسینؑ بھائی کی لاش پر پہنچے تو پہلے بھائی کے ہاتھ پڑے ہوئے پائے لیکن شان یہ تھی:-

شہؑ نے عباسؑ کا اک ہاتھ علم پر پایا
دوسرا ہاتھ ملا قبضۂ شمشیر کے ساتھ

علم جہاں گرا وہیں سے بلند ہوا۔ پہلے عباسؑ نے اٹھایا تھا حسینؑ کا علم اور اب فرات سے اٹھایا عباسؑ کا علم حسینؑ نے ------ آج تیرہ سو برس سے جو علم امام باڑوں اور جلوسوں میں نظر آتے ہیں یہ علم سب سے پہلے حسینؑ نے اٹھایا تھا ------ فرات سے خیمے تک یہ علم اس طرح آیا

کہ۔۔۔۔علم حسینؑ کے ہاتھ میں تھا اور جلوس میں چھوٹے چھوٹے بچے ہاتھوں میں خالی کوزے لئے العطش العطش کی صدائیں بلند کر رہے تھے۔ اس علم کا مختصر تعارف مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی بیان کرتے ہیں:۔

''علم'':۔ عربی لفظ ہے۔ بمعنی ''نشانِ فوج''، لیکن اردو میں علم نشانِ فوج حسینی کی شبیہ ہے، جو عزاخانوں امام باڑوں یا مکانوں اور خاص جگہوں پر نصب کئے جاتے ہیں۔ علم شناخت کے لحاظ سے سونے، چاندی، تانبے، پیتل وغیرہ سے بنتا ہے اور کبھی پنجے کی شکل کا ہوتا ہے کبھی اس میں ذرا سی تبدیلی کر دیتے ہیں۔ یہ عراقی آرٹ ہے اس سے تاریخی اختلاف کی کوئی وجہ نہیں ہے لیکن بعض روایات کی بنا پر علم نجف سے ہندوستان آیا ہے۔ علم ایک بانس یا چھڑ پر لگاتے اور چھڑ پر پھریرا یا پٹکا چڑھاتے ہیں کبھی ایک تلوار، تیر اور مشک سے بھی آراستہ کرتے ہیں۔ تعزیے کے ساتھ **علم کا ہونا** ضروری سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ جیسے تعزیہ امام حسینؑ کی طرف منسوب ہے یونہی **علم حضرت** عباسؑ کی طرف منسوب ہے۔ بعض علم جواہرات اور قیمتی ہیروں سے مرصع ہوتے ہیں''۔

(ہفت روزہ رضا کار ''تاریخ عزاداری نمبر'')

علم نصب کرنا سوگ کی علامت ہے:۔ علم نصب کرنے کی رسم دنیا کے ہر ملک میں یکساں ہے۔ اکثر حکومتیں بھی اپنے ملک کے سربراہوں کی موت پر سیاہ پرچم نصب کرتی ہیں لیکن یہ رسم چند روزہ ہے۔ ملت جعفریہ ہر سال محرم میں کربلا والوں کی یاد میں سیاہ پرچم نصب کرتی ہے یہ رسم سب سے پہلے ختمی مرتبتؐ کی وفات پر نظر آتی ہے۔

''۱۱ ھجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت اسامہ بن زید کو جنگ روم کے لئے رخصت فرمایا تو حامل علم بریدہ بن خصیب ابھی زیادہ دور نہیں پہنچے تھے کہ حضرت ام ایمنؓ کا قاصد پہنچا اور اس نے خبر دی کہ:۔

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حالت نازک ہے''۔

یہ سنتے ہی بریدہ بن خصیب چند ساتھیوں کے ہمراہ دولت سرائے نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حاضر ہوئے آنحضرت رفیق اعلیٰ میں منتقل ہو چکے تھے۔ مصیبت زدہ بریدہؓ نے وہ علم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بند دروازہ مبارک کے سامنے نصب کر دیا''۔

(شرح نہج البلاغہ از ابن ابی الحدید ۲/ ص ۵۳ طبع۔ مصر۔ قدیم)

مرتضیٰ حسین صاحب فاضلؔ فرماتے ہیں۔ بعض علاقوں میں عزاخانوں اور امام باڑوں پر نصب علم کا رواج اسی طریقے کا احیاء ہے اور عراق و ایران اور لکھنؤ میں علماء کے جنازے کے آگے علم کا ہونا بھی شاید اسی روایت کی بناء پر ہو'۔ عزاخانوں میں جو علم ہر سال نصب کئے جاتے ہیں اس کی تعریف بھی میر انیسؔ نے خوب کی ہے ملاحظہ ہو:-

منبر پہ روضہ خواں ہے کہ ہے عرش پر مَلک ہے پست اوجِ پایۂ منبر سے نُہ فلک
جس کی چمک زمین سے ہے آسماں تلک پٹکوں کا نور اور علمِ پاک کی جھلک

مجلس میں مومنوں نے جو آنسو بہائے ہیں
دیکھو دعا کو ہاتھ علم نے اٹھائے ہیں

گویا کھُلے ہیں گیسوئے حورانِ ماہرو پیچیدہ عود کا یہ دُھواں اور گلوں کی بو
منبر کے پاس روتی ہیں زہراؑ کشادہ مو بے تاب ہیں علیؑ ولی شاہِ نیک خو

اس بزم میں رسولؐ جو ماتم کو آئے ہیں
سر پیٹنے کو ہاتھ علم نے اٹھائے ہیں

شوکت وہی ہے رعب وہی اور وہی حَشم ہے جلوہ گر جو حضرتِ عبّاسؑ کا علَم
ہیہات ایسے شیر کے بازو ہوئے قلم مشکِ سکینہؑ دیکھ کے لگتے ہیں تیرِ غم

ہر دم رہے نہ کیوں دلِ زہراؑ بھرا ہوا
ہے آج تک لہو سے پھریرا بھرا ہوا

جلوس کے ساتھ جو علَم نکلتے ہیں اس کی تعریف جس طرح میر انیسؔ نے کی ہے اب اس سے بہتر کوئی کیا کہے گا:-

قربانِ شہؑ جن و بشر ہیں اب تک ظاہر وہی الفت کے اثر ہیں اب تک
عبّاسِ علیؑ سینہ سپر ہیں اب تک ہوتے ہیں علَم آگے جب اٹھتی ہے ضریح

حضرت عبّاسؑ زندگی میں بھی اپنے آقا اور مولا امام حسینؑ کے سینہ سپر رہے۔ ان کی سیرت کا یہ پہلو علم سے آج بھی تازہ ہے۔ حضرت عبّاسؑ نے ہمیشہ اپنے آپ کو امام حسینؑ کا غلام سمجھا سیرت کا

یہ پہلو بھی علم کے ذریعے سے زمانے پر روشن ہے۔ ایک دوسری رباعی میں میر انیسؔ اس بات کو اس طرح واضح کرتے ہیں:-

رُعبِ شہؑ ذی جاہ سے تھراتے ہیں　　سب طرزِ غلامانہ بجا لاتے ہیں
آداب یہ ہے کہ تعزیہ خانے میں　　آتے ہیں تو جُھک جُھک کے علم آتے ہیں

اردو شاعری کا علم:- علم عباسؑ کا تھا اور علم عباسؑ کا ہے، قیامت تک اسی ایک نام سے بلند رہے گا۔ بالکل اسی طرح اردو شاعری کا علم میر انیسؔ کا تھا اور میر انیسؔ کا ہے اور قیامت تک یہ علم میر انیسؔ کے نام سے بلند رہے گا۔ میر انیسؔ نے اپنی زندگی میں للکارا تھا کہ کون کہتا ہے میرے ہاتھ میں علم نہیں؟:-

یہ دوات و خامہ ہے مُلکِ فصاحت کا نشاں　　کون کہتا ہے کہ ہم طبل و علم رکھتے نہیں

میر انیس نے سو ۱۰۰ سال پہلے آواز بلند کی تھی، وہ آواز آج بھی گونج رہی ہے:-

ہو ایک زباں ماہ سے تا مسکنِ ماہی　　عالم کو دکھا دے بُرشِ سیفِ الٰہی
جرات کا دھنی تو ہے یہ چلائیں سپاہی　　لاریب ترے نام پہ ہے سکۂ شاہی
ہر دم یہ اشارہ ہو دوات اور قلم کا
تو مالک و مختار ہے اس طبل و علم کا

اردو شاعری میں ہمیشہ میر انیسؔ کا علم بلند رہے گا اور یہ شرف ان کو اہلبیتؑ کی غلامی سے ملا۔ انہوں نے نئے مضامین کے پھریرے میدانِ اردو میں کھول دیئے۔

شامل ہوا افضالِ محمدؐ کرمِ رب　　ہوتے ہیں علم ''فوجِ مضامیں'' کے نشاں اب

میر انیسؔ کے سر پر عباسؑ کا علم سایہ فگن تھا۔ انہوں نے جب پہلی بار منبر پر قدم رکھا تھا تو زندگی کی پہلی رباعی یہ تھی:-

بالیدہ ہوں وہ اوج مجھے آج ملا　　ظلِ علمِ صاحبِ معراج ملا
منبر پہ نشست سر پہ حضرت کا علم　　اب چاہیئے کیا تخت ملا تاج ملا

دنیائے شعروادب میں میر انیسؔ سے زیادہ عظیم اور خوش قسمت شاعر آج تک نہیں گزرا جب پہلی بار منبر پر گئے تو یہ علم سر پر سایہ فگن تھا۔ ان کے سر کا تاج بن کران کے سر پر ہمیشہ رہا۔ جب دنیا سے رخصت ہوئے تو جنازہ اسی علم کے سائے میں ان کی آخری خوابگاہ تک پہنچا۔۔۔۔۔ دیکھیئے ان تین لفظوں میں کتنی عظمت ہے اور کس قدر گہرا ربط ہے۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عباسؑ علمدار۔ علم اور میر انیسؔ

میر انیسؔ کا اثر:- اردو شاعری پر میر انیسؔ کا جو اثر حالیؔ سے اقبالؔ تک نظر آتا ہے۔ اس کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ جوشؔ، نجمؔ، آل رضاؔ وغیرہ نے بھی میر انیسؔ کے زیر اثر مرثیے لکھے۔ دیکھیئے جوشؔ ملیح آبادی علم کی تعریف کر رہے ہیں:-

ہر چند اہل جور نے چاہا یہ بارہا ہوجائے محو، یادِ شہیدان کربلا
باقی رہے نہ نام زمیں پر حسینؑ کا لیکن کسی کا زور عزیزو نہ چل سکا
عباسِ نام ور کے لہو سے دُھلا ہوا
اب بھی حسینیت کا علم ہے کُھلا ہوا

علم سے شاعر کو کتنی محبت ہے اگر چاند کا سفر بھی درپیش ہو تو علم اس کے ساتھ ہوگا۔ نجمؔ آفندی کا ایک بند ملاحظہ ہو:-

اہلِ جہاں کی آج ستاروں پہ ہے نظر ممکن ہے کامیاب رہے چاند کا سفر
ہیں اپنی اپنی فکر میں ہر قوم کے بشر مردانِ حق پرست کا جانا ہوا اگر
عباسِ نام ور کا علم لے کے جائیں گے
ہم چاند میں حسینؑ کا غم لے کے جائیں گے

شہید صفی پوری

عباسؑ کا علَم

میر انیسؔ کے تخئیلی مُناسبات اور تعبیرات کے آئینے میں

اعلیٰ درجے کی شاعری شاعر کی ذہنی صلاحیتوں کی رہینِ منّت ہوتی ہے۔ مشاہدہ، جذباتی خلوص، اور نزاکتِ احساس شاعری کے لئے خام مواد فراہم کرتے ہیں لیکن جب اس خام مواد کو جامۂ اظہار دیا جاتا ہے تو ذہن کی وہ مخصوص تخلیقی صلاحیت متحرک ہوجاتی ہے جو تاثرات وتصورات میں انتخاب کرتی ہے اور پھر اُس میں ربط و نظم و ترتیب پیدا کرتی ہے اور اُن کی ترکیب سے ایک نئی چیز عالمِ وجود میں آجاتی ہے۔ دنیا میں کوئی چیز بھی نئی نہیں ہے لیکن ایک ہی شے مختلف زاویوں سے مختلف نقطہ ہائے نظر سے، مختلف اشیاء کی نسبت سے اور مختلف جذبات کے زیرِ اثر نئی نظر آتی ہے۔ شاعر اشیاء کی مصوری نہیں کرتا بلکہ وہ اشیاء کے جذباتی اور نفسیاتی ردِّعمل کی عکاسی کرتا ہے۔ وہ شے اہم نہیں ہے جس کی وہ تصویر کشی کرتا ہے بلکہ وہ تاثر اہم ہے جو اس کو دیکھ کر پیدا ہوتا ہے۔ شاعر کی کامیابی کا انحصار اس امر پر ہے کہ وہ کس حد تک اپنے سامعین کو اپنے ساتھ سوچنے اور محسوس کرنے اور اپنے نفسیاتی ردِّعمل کو اُن میں منتقل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

شاعر کی عظمت کا درجہ معین کرنے میں ہمیں اِنھی اُمور کو پیشِ نظر رکھنا پڑتا ہے۔ سچی شاعری خلوص کے ساتھ مشروط ہے۔ خلوص کے معنی یہ ہیں کہ شاعر اُنھیں جذبات کا اظہار کرے جو اُس کے تجربہ میں شامل ہوں اور اُنھی خیالات کی ترجمانی کرے جو خود اُس کے ذہن کی پیداوار ہوں۔ اس

کے بعد اُس کے تجربہ کی وسعت کی اہمیت ہے۔ اگر تجربہ محدود ہوگا تو اُس کا نقطۂ نظر اور اُس کا موضوع بھی محدود ہوگا اور اُس کا اسلوبِ اظہار بھی مواد ہی کے تنگ دائرہ میں مقید رہے گا۔ اس لئے شاعر کے مرتبہ کا تعین بھی لازمی طور پر اُس کے تجربات کی وسعت سے کیا جائے گا۔ تیسری بات جو اہم ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں دیکھنا پڑے گا کہ اُس کی تخلیقی تخئیل (Creative Imagination) کس درجہ کی ہے۔ تجربہ اگر وسیع ہے، جذبات اگر نازک، لطیف اور گہرے ہیں تو اُن کے اظہار میں کامیابی اُسی وقت ممکن ہے جب اُس کی تخئیل اتنی پُر طاقت ہو کہ وہ خام مواد سے پورا پورا فائدہ اُٹھا سکے۔

شاعر کی تخئیل میں دو طرح کی صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ وسیع موضوع پر قابو حاصل کر کے بڑے پیمانہ پر اپنی قوت تخلیق کا مظاہرہ کرسکتی ہے اور یہ امر طے شدہ ہے کہ اس کی صلاحیت صرف عظیم شاعروں ہی میں ہوتی ہے اس لئے کہ جس طرح کسی عظیم الشان عمارت میں توازن اور تناسب کا باقی رکھنا اور اُس میں حُسن اور شوکت وعظمت (Beauty and Sublimity) پیدا کرنا ہر معمار کے بس کی بات نہیں اُسی طرح وسیع بنیادوں پر کسی موضوع پر طبع آزمائی ہر شاعر کے لئے ممکن نہیں۔ اس میں صرف اُسی شاعر کو کامیابی ہوسکتی ہے جس کی تخئیل وسیع، گہری اور بلند پایہ ہو۔ دوسرے یہ کہ شاعر کی تخئیل میں باریک بینی، اور دقیقہ سنجی کی صلاحیت بھی ہوتی ہے۔ جس طرح وسیع موضوعات پر خامہ فرسائی میں دشواری ہوتی ہے اُسی طرح کسی محدود موضوع پر قلم اُٹھانا بھی مشکل ہوتا ہے۔ وسیع موضوع میں خام مواد کی افراط دشواری پیدا کرتی ہے اور محدود موضوع میں خام مواد کی کمی مشکلیں پیدا کرتی ہے۔ عام طور پر دیکھا یہ گیا ہے کہ کسی شاعر کی قوتِ تخئیل میں یہ دونوں خصوصیتیں بیک وقت شاذ و نادر ہی پائی جاتی ہیں۔ جس شاعر کی تخئیل میں وسعت، جامعیت اور ہمہ گیری ہوتی ہے اُس میں عام طور پر تفصیل، باریک بینی اور جزئیات سے انصاف کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی اور جس شاعر کی تخئیل جزئیات میں حُسن کاری کر کے ایک چھوٹے موضوع کو جمال کے سانچے میں ڈھال سکتی ہے وہ بلند، وسیع اور ہمہ گیر موضوعات کے ساتھ انصاف کرنے میں قاصر رہتی ہے۔

انیس کا موضوع واقعہ کربلا ہے۔ یہ موضوع وسیع ہے لیکن انیس کے فن پر بندش اس لئے عائد ہوگئی کہ انہوں نے اس پر طبع آزمائی کے لئے مرثیہ کی صنف منتخب کی۔ اگر وہ رزم نگار شاعروں کی طرح

ایک طویل رزمیہ نظم (Epic) لکھ کر واقعۂ کربلا کو نظم کر دیتے تو اُن کا شمار بھی ہومر، ملٹن اور فردوسی جیسے عظیم رزمیہ نگاروں میں ہوتا۔ انیس کا شمار ڈراما نگاروں میں بھی نہیں ہے۔ ڈراما نگار کا کام مشکل ہوتا ہے اس لئے کہ ہر ڈرامے میں اُس کو ایک نئی کہانی اور ایک نئے پلاٹ سے نپٹنا پڑتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُس کو ہر مرتبہ نئے کردار تخلیق کرنا پڑتے ہیں جن کے کیریکٹر کی عکاسی کے لئے اُس کو پلاٹ اس طرح مرتب کرنا پڑتا ہے کہ اُن کی شخصیت کے تمام پہلو مختلف حالات و کیفیات میں اُبھر کر سامنے آجائیں لیکن ڈراما نگار کے فن کی بندشیں اور دشواریاں ہی اُس کی عظمت کی بھی ضامن ہیں۔ اپنے موضوع کی وجہ سے انیس کے فن پر ایک بندش یہ بھی عائد ہوگئی کہ وہ ڈراما نگار کی طرح ہر مرثیہ میں ایک نیا پلاٹ نہیں نظم کر سکتے تھے۔ مرثیہ کی صنف کو جولاں گاہِ فکر بنانے کی وجہ سے انیس نہ حقیقی معنوں میں رزمیہ شاعر بن سکے اور نہ ڈراما نگار لیکن انیس کی اہمیت یہ نہیں ہے کہ اُنہوں نے کوئی رزمیہ نظم لکھی یا ڈرامے لکھے۔ اُن کی اہمیت یہ ہے کہ وہ بیک وقت ایک رزمیہ شاعر اور ڈراما نگار کی تخئیل کے مالک تھے اور اُنہوں نے مرثیہ کی صنف کے امکانات میں وسعت پیدا کر کے اُس میں رزمیہ اور ڈرامہ دونوں کے عناصر شامل کر دیئے اور مکالمہ، واقعہ نگاری، جذبات نگاری، کردار نگاری، منظر نگاری اور رزم کے مناظر سے مرثیہ کو ایک نئی وسعت دی۔ اُنہوں نے ایک ہی واقعہ کو اس انداز سے بار بار نظم کیا کہ اُس واقعہ کے تاثر اور جاذبیت میں کمی نہیں آنے دی یہ دشواری جس پر وہ غالب آئے ایسی تھی جس کا ڈراما نگار کو سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اگر کوئی ڈراما نگار ایک ہی پلاٹ کو بار بار الگ الگ ڈراموں میں اپنا موضوع بناتا تو اُسے کس حد تک کامیابی ہوتی۔ یہ انیس کا امتیازی تفوق ہے جو اُنہوں نے اپنے موضوع کی دشواری کے باوصف ڈراما نگاروں پر حاصل کیا۔ انیس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اُنہوں نے مثالی کرداروں کو جیتے جاگتے انسانوں کی شکل میں پیش کیا۔ اس حیثیت سے انیس کا مدِّ مقابل پورے عالمی ادب میں اور کوئی بھی نہیں ہے۔ مثالی کرداروں کے پیش کرنے کا نتیجہ ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ وہ غیر فطری اور بے جان نظر آتے ہیں لیکن انیس نے اپنے مثالی کرداروں کی فطریت کو بھی برقرار رکھا اور انسان کی حیثیت سے پیش کرنے کے باوجود اُن کو اُن کی بلندی سے نیچے نہیں آنے دیا۔ مکالمے، حرکات و سکنات اور جنگ وجدال کے مرقعوں میں ان مثالی کرداروں کا عام انسانی فطرت کا نمائندہ رہتے ہوئے بھی مثالی اخلاقِ حسنہ کی بلندی پر برقرار رہنا انیس کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس کے انجام

دینے سے دنیا کے عظیم شعرا بھی قاصر رہے۔ انسان جب کمال کا تصور کرتا ہے تو حقیقت پسندی کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور جب حقیقت پسندی سے کام لیتا ہے تو کمال کا تصور نقص سے داغ دار ہو جاتا ہے۔ یہ دشواری صرف شاعروں ہی کی نہیں ہے بلکہ عصمت اور کمال کے حدود متعین کرنے میں بڑے بڑے جلیل القدر مفکرین اور علما بھی ٹھوکر کھا جاتے ہیں اور حدِ اعتدال سے ہٹ جاتے ہیں۔ انیسؔ نہ صرف مثالی کرداروں کا عصمت کے حدود میں تصور کرنے میں کامیاب ہوئے بلکہ اُنہوں نے اپنی غیر معمولی تخئیل سے کام لے کر ہمیں اُن کو گفتگو کرتے ہوئے جہدِ حیات میں حصہ لیتے ہوئے اور حق کے تحفظ کے لئے جہادِ نفس اور نبرد آزمائی کرتے ہوئے اس طرح دکھا دیا جس طرح ہم گوشت و پوست کے بنے ہوئے متحرک انسانوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔

انیسؔ کے موضوع اور فن کی وسعتوں کو اربابِ نقد نے اپنا موضوعِ فکر بنایا ہے لیکن انیسؔ کی عظمت اور اُن کی شاعری کی وسعت کو دیکھتے ہوئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ ابھی صرف ابتدا ہوئی ہے۔ ہر بڑے شاعر کی طرح ہر دور کے نقاد اُنہیں اپنا موضوعِ فکر بناتے رہیں گے اور اُن کی فکر و اسلوب کے بے شمار پہلو روشنی میں آتے جائیں گے۔ اس مختصر مقابلہ میں ہمیں انیسؔ کی تخئیل کے وسیع، بسیط اور ہمہ گیر پہلو پر گفتگو نہیں کرنا ہے۔ ہمارا موضوع اُن کی تخئیل کا دوسرا پہلو یعنی اُس کی باریک بینی اور محدود موضوع میں وسعت پیدا کرنے کی صلاحیت ہے۔ انیسؔ کی انفرادی خصوصیت یہ ہے کہ اُن کی تخئیل تخلیق کے ان دونوں پہلوؤں کی حامل ہے یعنی وہ کسی وسیع موضوع سے انصاف کرنے پر بھی قادر ہیں اور کسی محدود موضوع پر بھی طبع آزمائی کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ وہ وسیع البنیاد، عالی شان اور پُر شکوہ عمارت بھی تعمیر کر سکتے ہیں اور اُس کے ایوانوں میں پچی کاری بھی کر سکتے ہیں۔

اس مقالہ کا موضوع ہے ''عباسؑ کا علَم'' موضوع محدود ہے علَم کا پنجہ اور پھریرا، اُن کی نقش نگاری اور مرصّع کاری کا میدان ہے۔ پردہ (Canvas) بہت چھوٹا ہے لیکن مصور اپنی تخئیل سے اُس کو وسعت دے دیتا ہے، اس میں حُسن کے نئے نئے گوشے پیدا کر لیتا ہے اور اپنی حُسن کاری کے لئے نئے نئے مواقع تلاش کر لیتا ہے۔ تنقید کا پہلا اور آخری فریضہ یہی ہے کہ وہ شاعر کے ذہن کو سمجھے اور اُس کی تخئیل کے ساتھ چل کر اُن راہوں کو معیّن کرے جن سے شاعر گزرا ہے۔ شاعر کے ذہن کو سمجھ لینے سے اُس کے مواد اور ہیئت اور فکر و فن میں رابطہ قائم ہو جاتا ہے اور نقاد خود شناسی اور خود آگہی کی منزل تک پہنچ جاتا ہے جو تنقید اور شاعری دونوں کا ماحصل ہے۔

رایت، پرچم، نشان یا عَلَم جنگ کا وہ نشان ہے جو علمدارِ لشکر کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ عَلَم کی ہیئت اور پھریرے کے رنگ سے مُلک یا قوم کی انفرادیت اسی طرح ظاہر ہوتی تھی جس طرح آج دنیا کے مختلف ملکوں کے قومی جھنڈوں (National Flags) سے ظاہر ہوتی ہے۔ عَلَم کا سرنگوں ہو جانا شکست کی علامت تھی اسی لئے لشکر کی علمداری کا منصب سب سے زیادہ شجاع سپہ سالار کو تفویض کیا جاتا تھا۔ دنیا کی دوسری قوموں کی طرح پیغمبرِ اسلام کی فوج کا بھی ایک عَلَم تھا جو معرکۂ جہاد میں اسلام کی علامت بن گیا تھا۔ چونکہ اسلام کا مقصد رنگ و نسل و ملک و قوم کی تمام تفریقوں کو مٹا کر توحید کا پیغام ساری دنیا میں پہنچانا تھا اس لئے اسلام کا پرچم دین کا عَلَم اور حقانیت کی علامت بن گیا تھا۔ بعد وفاتِ رسولؐ جب خلافت کے مسئلہ پر مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہوا تو دین میں بھی اختلاف پیدا ہو گیا۔ ایک مختصر حلقہ وہ تھا جو اسلام کے صحیح تعلیمات کا محافظ بن گیا اور دوسرا حلقہ وہ تھا جس نے سیاسی مصالح کی بنیاد پر تعلیماتِ اسلامی کو مسخ کر دیا۔ یہ اختلاف اتنا گہرا تھا کہ اُسے اسلام کے خلاف ردِّ عمل ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اس لئے کہ یہ ردِّ عمل عہدِ جاہلیت کو اپنی تمام شقاوت و بربریت، فتنہ و فساد، لہو و لعب، قبائلی عصبیت و عداوت سمیت واپس لے آیا تھا۔ جب واقعۂ کربلا رُونما ہوا تو امام حسینؑ اور اُن کے ساتھی وہ تھے جو اسلامی تعلیمات کے سچّے پیرو اور محافظ تھے اور حسینؑ کے مقابل وہ جماعت تھی جو نہ صرف اہلبیتِ اطہارؑ سے برگشتہ تھی بلکہ اسلامی تعلیمات سے بھی یکسر منحرف ہو گئی تھی۔ اس طرح کربلا کا جہاد حق و باطل کا معرکہ تھا جس میں حق امام حسینؑ کی طرف اور باطل اُن کی مخالف نام نہاد مسلمان جماعت کی طرف تھا:-

کعبہ ادھر تھا جلوہ نما اور اُدھر کنشت — دوزخ کی آگ اُدھر تھی ادھر گلشنِ بہشت
کھیتی ادھر کرم کی اُدھر تھی ستم کی کشت — یاں کارِ نیک ہوتے تھے واں فعل ہائے زشت
شیطاں تھا اُس طرف تو ادھر کردگار تھا
میدان میں مقابلۂ نور و نار تھا

فوج کا عَلَم بجائے خود لکڑی، کپڑے اور دھات کے بنے ہوئے ایک نشان کا مجموعہ ہے لیکن فتح و شکست قوموں کے افتخار و تفوق، شجاعت و جوانمردی کے تصورات اور اقدار سے اُس کا رشتہ قائم ہو جانے کے بعد اُس نے ایک خاص اہمیت حاصل کر لی تھی۔ شعر و ادب صرف کتابوں تک ہی محدود نہیں بلکہ اُن کی جڑیں مادّی حقائق اور نفسیاتِ بشری میں پیوست ہیں۔ عام انسانی ذہن بھی اُنھی

خطوط پر کام کرتا ہے جن پر ایک شاعر کا ذہن کام کرتا ہے۔ فرق صرف ذہنی مراتب اور درجہ کا ہے۔ اسی طرح زبان بھی عام انسان اور شاعر کے اظہار کا مشترکہ وسیلہ ہے۔ زبان دونوں میں مشترک ہے صرف اُس کے استعمال کا اسلوب بدلا ہوا ہوتا ہے۔ عام انسان بھی زبان کا تخلیقی استعمال کرتا ہے اور شاعر بھی کرتا ہے۔ فرق صرف تخئیل کی حدّت، وسعت اور گہرائی اور گیرائی میں پایا جاتا ہے۔ فوج کے عَلَم نے جو اہمیت حاصل کرلی ہے اُس کی تہہ میں بھی وہی انسان کی تخئیل کی کارفرمائی نظر آئے گی جو شاعر کے یہاں ملتی ہے۔ عَلَم محض عَلَم ہے لیکن کسی ملک یا قوم کی نمائندگی کی بنا پر اُس کی حیثیت ایک علامت کی ہوجاتی ہے۔ اب اس عَلَم کی توہین اُس پوری قوم کی توہین ہے، اس عَلَم کا جُھک جانا پوری قوم کے سرنگوں ہوجانے کے مترادف ہے۔ عَلَم کی اہمیت بڑھنے کے ساتھ علمدار کی اہمیت بھی بڑھ گئی اس لئے کہ وہی اُس کا محافظ اور وہی اُس کی حُرمت کا برقرار رکھنے والا ہے۔ اب علمدار محض ایک سپاہی یا محض ایک سپہ سالار نہیں رہا بلکہ پوری قوم کی شجاعت وعزت کا امین اور اُس کی علامت بن گیا۔ اب اگر علمدارِ لشکر میدانِ جنگ سے بھاگتا ہے تو وہ پوری قوم کی ذلت کا سبب بن گیا۔ اور اگر اُس نے اُس کی سربلندی کے لئے جان دے دی تو گویا پوری قوم نے اپنی عزت پر اپنی جان نچھاور کردی۔ اسی لئے ہر قوم مقامِ فخر میں محض اُنہیں علمداروں کو پیش کرتی ہے جو کرار اور غیر فرار ہوں اور جنہوں نے اتنے فتوحات کئے ہوں کہ اُن کا نام ہی فتح کا مماثل بن گیا ہو۔

فوج کے عَلَم اور علمداروں کی یہ وہ اہمیت تھی جسے انیسؔ کا ایسا مزاج دان فطرتِ انسانی نظرانداز نہ کرسکتا تھا۔ چنانچہ انیسؔ نے عَلَم کی اس اہمیت کو محسوس کیا اور اپنے مرثیوں میں جب بھی اور جہاں بھی اس کا تذکرہ کیا تو عَلَم کو اُن تمام تصورات کے پس منظر میں دیکھا جو اُس کے ساتھ جُڑے ہوئے ہیں۔ انیسؔ مذہبی شاعر تھے۔ وہ امام حسینؑ کو اپنا مذہبی رہنما، رسول کا سچّا جانشین اور مقاصدِ الٰہیہ اور تعلیماتِ قرآن کا امین ومبلغ سمجھتے تھے۔ اس لئے کربلا کی جنگ کی اُن کی نگاہ میں ایک انفرادی اہمیت تھی۔ تاریخی اور مادّی نقطۂ نظر سے عام سیاسی جنگ اور جہاد میں کوئی فرق نہیں ہے اس لئے کہ جہاد میں بھی دونوں طرف فوجیں ہوتی ہیں، دونوں طرف علمدار ہوتے ہیں، دونوں طرف عَلَم ہوتے ہیں، دونوں طرف اسلحے ہوتے ہیں اور دونوں طرف کے لوگ قتل بھی کرتے ہیں اور قتل بھی ہوتے ہیں لیکن نقطۂ نظر کے بدلنے سے اشیاء کی ماہیئت میں فرق ہوجاتا ہے۔ ایک جھنڈے اور دوسرے جھنڈے میں کوئی فرق نہیں۔ جیسا ایک فوج کا عَلَم ویسا دوسری فوج کا عَلَم۔ جیسا ایک قوم کا

جھنڈا و یسا دوسری قوم کا علَم ۔ لیکن جب کسی معرکۂ کارزار کو مذہبی، اخلاقی اور انسانی اقدار کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے تو وہی جنگ ایک فریق کے مقصد کے لحاظ سے ''فساد'' اور دوسرے فریق کے لحاظ سے ''جہاد''۔ وہی موت ایک فریق کے لئے ہلاکت اور دوسرے کیلئے شہادت بن جاتی ہے۔ پھر انہیں انسانی، اخلاقی اور رُوحانی معیاروں سے جب ناپا جاتا ہے تو ایک فریق کا جھنڈا محض بانس اور کپڑے کا مجموعہ نہیں رہتا بلکہ باطل، فساد، شر اور حیوانیت کی علامت اور دوسرے فریق کا علَم محض علَم نہیں بلکہ للٰہیت، حقانیت، تقدّس اور انسانیت کا نشان بن جاتا ہے۔

یہ بات لائقِ غور ہے کہ انیسؔ نے دشمن کے جھنڈے کو ناقابلِ توجہ قرار دے کر اُسے اس لائق بھی نہ سمجھا کہ اُس کا ذکر کرتے اور کبھی اُس کے جھنڈوں کا تذکرہ ہے بھی تو اجتماعی طور پر تاکہ دشمن کے نشان کی انفرادی اہمیت باقی نہ رہے اور جب بھی وہ اُن کا تذکرہ کرتے ہیں تو باطل کی اُس تیرگی کی طرف ضرور اشارہ کرتے ہیں جس کی وہ علامت تھے۔ مثلاً:-

نیزے اُٹھا کے جنگ پہ اسوار تل گئے
کالے نشان فوج پہ رُو کے کُھل گئے

ایک دوسری جگہ انیسؔ نے دشمن کے علَم کا تذکرہ کیا ہے لیکن اس تذکرے کے لئے اُنہوں نے اُس وقت کا انتخاب کیا ہے جب فوجِ دشمن میں بھگدڑ مچی ہوئی تھی تاکہ دشمن کے علَم کا بھگوڑوں کے ساتھ ربط قائم کرکے اُسے باطل کے ساتھ جبن و بُزدلی کا نشان بھی بنا دیا جائے۔ وہ موقع وہ تھا جب فوجِ دشمن کی حالت یہ تھی:-

گرتی تھی برقِ تیغ جو ہر پَل اِدھر اُدھر — سمٹے ہوئے تھے ڈھالوں کے بادل اِدھر اُدھر
شبدیز تھا کہ پھر رہی تھی کل اِدھر اُدھر — بھاگڑ تھی قلب فوج میں، ہلچل اِدھر اُدھر
ہر جا تنوں کے ڈھیر سروں سے بلند تھے
بھاگیں کہاں گریز کے کوچے تو بند تھے

تھا الاماں کا شور، پریشاں تھے اہلِ شر — تیغوں کے پیچھے ڈر کے چھپی تھی ہر اک سپر
ماتھے علَم رگڑتے تھے جُھک جُھک کے خاک پر — پرچم نے بال کھولے تھے، فریادیوں نے سر
دانتوں میں خس ہراس سے تھے ہر جوان کے
چادر ہلا رہے تھے پھریرے نشان کے

ملتا نہ تھا صفوں میں علَم کا نشاں کہیں　　چلّے کہیں تھے، شست کہیں تھی، کماں کہیں
نیزے کہیں تھے، ڈانڈ کہیں تھی، سناں کہیں　　جمدھر کہیں، کمند کہیں، برچھیاں کہیں
اک اک سیاہ رُو کا جگر داغ داغ تھا
جنگل تمام ڈھال کے پُھولوں سے باغ تھا

ڈر ڈر کے پیچھے پاؤں سپاہِ لعیں ہٹی　　یہ صف سوئے یسار وہ سوئے یمیں ہٹی
سہمے جبال، نہر کہیں سے کہیں ہٹی　　دہشت سے آسماں ہوا اونچا زمیں ہٹی
بھاگڑ پڑی کہ ایک سے اک آگے بڑھ گیا
دریا لہو کا کشتیٔ گردوں پہ چڑھ گیا

مغفر نہ سر کے پاس نہ خنجر کمر کے پاس　　بیٹے کے پاس باپ، نہ بیٹا پدر کے پاس
قبضہ کے پاس تیغ نہ دستہ تبر کے پاس　　کڑیاں زرہ کے پاس نہ دامن سپر کے پاس
نیزے نہ تھے سناں پہ نہ پرچم نشان پر
پیکاں نہ تیر پر تھا نہ چلّہ کمان پر

اس کے برخلاف انیسؔ نے حسینی علَم کا بار بار تذکرہ کیا ہے اور جہاں بھی اُس کا ذکر ہے اُس کے شایانِ شان ہے۔ انیسؔ نے عباسؑ کے علَم کو کئی سطحوں پر رکھ کر اُس کی اہمیت کی وضاحت کی ہے۔ کبھی اُسے للّٰہیت کا نشان قرار دے کر درسِ معرفت دیا، کبھی شجاعت کی علامت قرار دیا ہے، کبھی اخلاقی نقطۂ نظر سے اُسے خُلقِ عظیم کے نشان کی حیثیت سے اور کبھی خالص جمالیاتی نقطۂ نظر سے اُس کے ظاہری حُسن کی تصویر کشی کی ہے لیکن جمالیاتی حیثیت سے بھی اس کی مُرقع کشی کرنے میں انیسؔ نے اُس کی آب وتاب، چمک دمک اور اس کی جلوہ سامانیوں اور تجلّی پاشیوں کے ساتھ تقدس کے التزام کا ہمیشہ اہتمام کیا ہے۔

سب سے پہلے انیسؔ کے مرثیوں کی روشنی میں ہم عباسؑ کے علَم کا جائزہ لیں گے اور دیکھیں گے کہ علَم کے ایسے محدود موضوع کو انیسؔ کی تخیّل نے کس طرح وسعت دی ہے۔ انیسؔ نے علَم کے اجزا، پنجہ، پھریرا اور چوبِ علَم کو ایک وحدت کی حیثیت سے بھی پیش کیا ہے لیکن موضوع کو وسعت دینے کے لئے اُنہوں نے علَم کے اجزا کا الگ الگ تذکرہ بھی کیا ہے۔ کہیں صرف پنجہ کا ذکر ہے، کہیں محض پھریرے کا۔ جب پھریرے اور پنجہ کا تذکرہ کیا ہے تو اُن کے ساتھ مناسبتِ لفظی اور کبھی

مناسبتِ معنوی کے اعتبار سے اور کبھی تشبیہ و استعارہ سے کام لے کر کلام میں حُسن پیدا کیا ہے۔ اُن کی تخلیقی تخیل نے علَم کے تمام خصوصیات اور اُس کے تمام مرئی اور محسوس پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔ شکل، رنگ، خوشبو، بلندی، سایہ، علَم کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کا اُنہوں نے تذکرہ نہ کیا ہو اور نہ کوئی محسوس (Sensuous) پہلو ایسا ہے جس کی مُناسبت اُنہوں نے کسی نہ کسی مقدّس شے یا مقدّس ہستی کی کسی نہ کسی صفت سے پیدا نہ کی ہو، یا جس کا تعلق اُنہوں نے ذہنی تصورات سے قائم کر کے اُس کو مذہبی اور اخلاقی حیثیت نہ دی ہو۔

حواسِ خمسہ میں سب سے زیادہ اہمیت قوتِ باصرہ کو حاصل ہے اس لئے ہر بڑا شاعر اپنے استعارات میں دو مختلف اشیاء کی یکسانیت ہمیشہ کسی ایسی مشترک صفت میں تلاش کرتا ہے جس کا تعلق مشاہدہ سے ہو۔ پنجہ کی سب سے اہم اور نُمایاں قابلِ مشاہدہ صفت اُس کی آب و تاب اور چمک ہے۔ انیسؔ نے چمک کو نور سے تعبیر کر کے عباسؑ کے علَم کو نورانیت کا نشان (Symbol) بنا دیا۔ قرآن میں ہے ''اللہ زمین و آسمان کا نور ہے'' اور حدیثِ پیغمبرؐ ہے کہ اللہ نے سب سے پہلے چہاردہ معصومین کے نور کو خلق کیا۔ پھر ایک حدیثِ رسولؐ یہ بھی ہے کہ ''میں اور علیؑ ایک نور سے ہیں'' یعنی نور ایک ایسی مشترکہ صفت ہے جو توحید، نبوت اور امامت کو ایک رشتہ میں مربوط کر دیتی ہے۔ حسینؑ اسی نورِ عصمت کے وارث اور امین تھے جو حضرت رسالت مآبؐ سے جناب سیدہؑ کے توسط سے اور حضرت علیؑ سے براہِ راست اُن تک پہنچا تھا۔ چنانچہ انیسؔ کہتے ہیں:-

شمشادِ بوستانِ رسالت حسینؑ ہے　　مفتاحِ بابِ گلشنِ جنّت حسینؑ ہے
ابرِ عطا و آیۂ رحمت حسینؑ ہے　　نقشِ نگینِ مُہرِ نبوّت حسینؑ ہے

ہر جا ظہورِ حق ہے اُنہیں کے ظہور سے
سب خاک سے بنے ہیں یہ خالق کے نور سے

قرآن نے حکم دیا ہے اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم۔ انیسؔ کے عقیدے کی رُو سے حسینؑ اولی الامر تھے۔ اولی الامر کی اطاعت رسول کی اطاعت ہے اور رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ اس لئے جب اولی الامر اہلِ باطل کے مقابلے پر اُٹھ کھڑا ہو تو اُس کی فوج کو خدا کی فوج ہی سے تعبیر کرنا درست ہوگا:-

جاتی ہے کس شکوہ سے رن میں خدا کی فوج　　کمریں وغا پہ باندھے ہے مشکل کشا کی فوج
صف بستہ آگے پیچھے ہے سب پیشوا کی فوج　　جنت کا رُخ کئے ہے شہِ کربلا کی فوج

اس ''فوجِ خدا'' کا نشان پنجہ ہے جس کی شکل ایسی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ لفظ ''اللہ'' لکھا ہوا ہے:-

پنجہ سے خجل پنجۂ خورشید و رُخِ ماہ
اللہ کا لفظ اس سے عیاں ہوتا ہے واللہ

''اللہ'' اور واللہ'' کی مُناسبتِ لفظی اور ہم آہنگی اور ''واللہ'' کا زور بھی لائقِ داد ہے۔
ساری کائنات امام کے تابعِ فرمان ہوتی ہے۔ وہ صرف انسانوں ہی کا حاکم نہیں ہوتا بلکہ وہ جن ومَلک کا بھی امام اور حاکم ہوتا ہے۔ امام کی حاکمیت کے اس تصور کو انیسؔ علَم کے ساتھ مربوط کر دیتے ہیں اور علَم کو امام کے اقتدار کی علامت بنا دیتے ہیں:-

ڈیوڑھی پہ جن و انس و مَلک کا ہجوم ہے
خیمے سے اب علَم کے نکلنے کی دھوم ہے

ایک دوسری جگہ کہتے ہیں:-

اللہ رے یہ اوجِ علم لشکر شاہی
تھا زیرِ نگیں ماہ سے تا مسکن ماہی

فوجِ خدا کے علَم کو مصدرِ انوارِ الٰہی ہونا ہی چاہیئے اسی لئے انیسؔ بار بار انداز بدل بدل کر علَم کی نورانیت کا تذکرہ کرتے ہیں:-

''ہے نور کا عَالَم علَمِ فوجِ خُدا پر''

علَم کی نورانیت کی صفت اتنی اہمیت رکھتی ہے کہ انیسؔ عباسؑ کے علَم کو ''علَمِ نور'' ہی سے تعبیر کر دیتے ہیں۔ وہ علَم اور علمدار کا تقابل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

طوبیٰ ہو تو ایسا، مہِ کامل ہو تو ایسا
ایسے علَمِ نور کا حامل ہو تو ایسا

غازی کی وہ شوکت وہ شکوہِ علمِ نور

کہتی تھی یہ گیتی کہ اناالطُّور اناالطُّور

پھراس نور کی مزید وضاحت کردی:-

''پنجہ جو ہلا پھیل گیا نورِ الٰہی''

قرآن نے حکم دیا ہے لاتفسدوا فی الارض ''دنیا میں فساد نہ پھیلاؤ'' اس لئے حُجّتِ الٰہی کے جہاد کا مقصد شر اور فساد سے دنیا کو پاک کرنا ہی ہوسکتا ہے۔ چنانچہ انیسؔ جہادِ حسینی کے مقصد سے عَلَم کا ربط قائم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

اس طرح جب عَلَم دلبرِ زہرؑا جائے کس سے پھر معرکۂ رزم میں ٹھہرا جائے
سانپ دشمن کی نہ کیوں چھاتی پہ لہرا جائے لہر میں تابہ فلک جس کا پھریرا جائے
رفعِ شر کو عَلَم خیر بشر آیا تھا
سورۂ نصر پئے فتح و ظفر آیا تھا

ایک دوسری جگہ عَلَم کو ''ظلم وستم'' کا مقابل قرار دے کر اُسے عدل وانصاف کے نشان کی حیثیت سے پیش کیا ہے ۔

واں لعینوں نے درِ ظلم و ستم کھول دیا
بڑھ کے عباسؑ نے یاں سبز عَلَم کھول دیا

عباسؑ کا عَلَم اہلِ کیں کے مقابلہ میں دین کا نشان تھا:-

لڑنے کو فوجِ کیں سے بہادر تُلا ہوا
سر پر نشانِ دیں کا پھریرا کُھلا ہوا

عَلَم کی نورانیت اور پنجہ کی چمک کو اُس کی سب سے اہم صفت قرار دینے کے بعد انیسؔ کی تخیّل اُس کا ربط دوسری تمام روشن اور چمکدار چیزوں سے قائم کرتی ہے۔ خورشید سے زیادہ چمک اور کسی شے میں نہیں ہے اس لئے انیسؔ کی نظرِ انتخاب اُس پر پڑتی ہے وہ کہتے ہیں:-

''خورشید ہے یا پنجۂ تابانِ عَلَم ہے''

ایک دوسری جگہ پھر پنجہ کو وہ ''نیّرِ اعظم'' کہتے ہیں۔

یہ شانِ عَلَم اور پھریرے کا وہ عالَم

یہ ابرِ کرم ہے تو وہ ہے نیرِ اعظم

اور پھر:-

پنجہ مثالِ پنجۂ خورشید زرفشاں

ایک بند میں پنجہ کی چمک کو رشکِ خورشید قرار دیتے ہیں۔ پھر اقبال کے چمکنے کی مناسبتِ لفظی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے پنجہ کی چمک کو اقبال کے چمکنے سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کے بعد پنجہ کے لچکنے کی متحرک تصویر اس طرح کھینچتے ہیں کہ بجلی کی چمک سے اُس کی چمک کی مماثلت کا اظہار ہو جائے اور پھر علَم کو "علَمِ نور" سے تعبیر کرتے ہیں۔

دامن سرِ غازی پہ لٹکتا ہے علَم کا خورشید بھی مُنھ رشک سے تکتا ہے علَم کا
ہر گام پہ اقبال چمکتا ہے علَم کا بجلی نہیں پنجہ یہ لچکتا ہے علَم کا
کس جنگ میں ایسے علَمِ نور کُھلے ہیں
پرچم نہ کہو موئے سرِ حُور کھلے ہیں

پنجہ اور خورشید کے تقابل کا ایک پہلو جو مُشاہدہ سے متعلق ہے وہ یہ ہے کہ پنجہ سورج کی روشنی میں اور زیادہ چمک رہا تھا پنجہ میں خورشید کے عکس کو انیسؔ نے پنجے پہ خورشید کے مُنھ رکھ دینے سے تعبیر کر کے پنجہ کے تقدّس کی طرف اشارہ کیا ہے گویا خورشید پنجہ کو بوسہ دے رہا تھا:-

کھولا جو پھریرے کو علمدارِ جری نے لُوٹے گلِ فردوس نسیمِ سحری نے
تاروں کو اُتارا فلکِ نیلوفری نے پرچم جو کُھلا کھول دیئے بال پری نے
عیسیٰ نے پُکارا کہ نثار اُس کے حشم کے
خورشید نے مُنھ رکھ دیا پنجہ پہ علَم کے

پھر اُس کا جمالیاتی پہلو درج ذیل بند میں اُجاگر کیا گیا ہے:-

پنجہ ادھر چمکتا تھا اور آفتاب اُدھر اس کی ضیا تھی خاک پہ ضو اِس کی عرش پر
زر ریزئ علَم پہ ٹھہرتی نہ تھی نظر دولھا کا رُخ تھا سونے کے سہرے میں جلوہ گر
تھے دو طرف جو دو علَم اس ارتفاع کے
اُلجھے ہوئے تھے تار خطوطِ شعاع کے

مگر چونکہ عباسؑ کا علم مصدرِ انوارِ الٰہی ہے اس لئے خورشید سے مثال دینے کے بعد انیسؔ خورشید پر اس کا تفوق ظاہر کرتے ہیں:-

کیوں کر نہ جھکے چشمِ جہاں بین آفتاب　　پنجے سے اُس کے آنکھ ملانے کی کس کو تاب

لہر وہ سبز پھریرے کی وہ پنجہ کی چمک　　شرم سے اَبر میں چھپ جاتا ہے خورشیدِ فلک

تھی اُس کی ضیا آئینۂ مہر سے دو چند

ہم پنجہ ہو پنجہ سے یہ کیا مہر کا مقدور

اس مصرع میں ''ہم پنجہ'' کو ''مقابل'' کے معنوں میں استعمال کر کے مناسبتِ لفظی بھی پیدا کی گئی ہے۔

نکلا وہ شیر خیمے سے باہر عَلَم لئے　　مُجرے کو آئی فتح سپاہِ حشم لئے
جرأت نے بڑھ کے بوسۂ تیغِ دودم لئے　　نصرت نے ہاتھ چومے، ظفر نے قدم لئے
خورشید کا جلال نگاہوں سے گر گیا
اقبال سر کے گرد ہُما بن کے پھر گیا

جب ایک روشن شے کے مقابلے میں اس سے زیادہ روشن شے آجاتی ہے تو اُس کی سفید روشنی زرد نظر آنے لگتی ہے جس طرح شمع کی روشنی سُورج کی روشنی میں زرد ہو جاتی ہے اُسی طرح نورِ خُدا کے مقابلہ میں سورج کا زرد ہو جانا ایک فطری امر ہے:-

کھولا جنابِ حضرتِ عباسؑ نے علَم　　رفعت ہوئی نثار، تصدّق ہوا حشم
اُڑنے لگا ہوا سے پھریرا جو دَم بہ دَم　　دشتِ دغا میں پھیل گئی نکہت ارم
پرچم فزوں تھا حُسن میں گیسوئے حُور سے
خورشید زرد ہوگیا پنجے کے نور سے

اس کے بعد انیسؔ کا ذہن اُن مُناسبات کی طرف جاتا ہے جن سے پنجہ کی چمک اور اُس کے تقدّس کا بیک وقت تصور پیدا ہو سکے۔ چنانچہ اُن کا ذہن یدِ بیضا کی چمک اور اُس کے تقدّس کی طرف جاتا ہے جس کے ساتھ پنجہ کی معنوی مناسبت ہے:-

''پنجہ پہ ہے عالم یدِ بیضا کی ضیاء کا''

پھر درجِ ذیل بیت میں وہ عصائے موسیٰ اور یدِ بیضا دونوں کے ساتھ علَم کی مناسبت کا تذکرہ کرتے ہیں:-

ہے نور کا عالَم علَم فوجِ خدا پر
موسیٰ نے دھرا ہے یدِ بیضا کو عصا پر

یدِ بیضا کے بعد انیسؔ کا ذہن تجلّیِ طور کی طرف جاتا ہے:-

دامن وہ سبز اور وہ پنجے کا اُس کے نور   نکلا ہوا ہے قصرِ زمرد سے روئے حور
فرقِ جنابِ خضر پہ روشن ہے شمعِ طور   بے شبہ وہ امام کے ہے نور کا ظہور
اُس کا علَم ہے یہ جو شہِ مشرقین ہے
گویا حسنؑ کے دوش پہ دستِ حسینؑ ہے

اور پھر درجِ ذیل بند میں علَم کی تصویر فاصلہ سے کھینچی گئی ہے:-

ناگاہ بیابانِ بلا نور سے چمکا   جوں پنجۂ خورشید علَم دُور سے چمکا
عکس اُس کا فزوں حُسنِ رُخِ حور سے چمکا   تھا نور کا شعلہ کہ رُخِ طُور سے چمکا
کرتا تھا اشارہ کہ نہ کیوں نورفشاں ہوں
میں پنجتنِ پاک کے لشکر کا نشاں ہوں

لیکن شعلۂ طُور سے علم کے پنجہ کی تعبیر انیسؔ کو مطمئن نہیں کرتی۔ عباسؑ کا علم اشرف الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ورثہ میں حسینؑ کو ملا تھا اس لئے وہ جس تجلّی کا مظہر تھا اُسے تجلّیِ طور پر تفوق حاصل تھا:-

اللہ رے اوجِ علَمِ فوجِ پیمبرؐ   جنّت کی پھریرے سے ہوا آتی تھی فرفر
تھا سر پہ ہُما سایہ فگن کھولے ہوئے پر   پنجے کی ضیا دیکھ کے خورشید تھا ششدر
تابندہ کوئی شے نہیں زیرِ فلک ایسی
موسیٰ نے تجلّی میں نہ دیکھی چمک ایسی

پھر تقدس اور چمک کی ملی جُلی مناسبت کے لئے انیسؔ کی نظرِ انتخاب قرآن کے سورۂ ''والشمس''

کی آیت پر پڑی چنانچہ خورشید اور شمس کی مناسبتِ لفظی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اور آیت سے تقدّس کی مُناسبت قائم کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:-

''یا سورۂ والشّمس کی آیت ہے یہ رایت''

شاعر کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ وہ مجرد تصورات کو عالمِ محسوسات میں لے آتا ہے تقدّس اور نور کے غیر مرئی صفات کو محسوس کرا دینا انیسؔ کی عظمت کی دلیل ہے۔

اس کے بعد علَم کے تقدّس کی نگاہیں مریم۔ یداللہ، پنجتنِ پاک، حسنین علیہم السلام اور حسینؑ کی طرف جاتی ہیں اور اُن کی شاعرانہ تخئیل ان ذواتِ مقدّسہ اور علَم کے پنجہ میں کوئی نہ کوئی نقطۂ اشتراک یا کوئی نہ کوئی مناسبتِ لفظی تلاش کر لیتی ہے۔ وہ پھریرے اور پنجہ کی مناسبت سے ''پردے'' اور ''پنجۂ مریم'' کا تذکرہ کرتے ہیں:-

''پنجے کو ہے پردے سے نکالے ہوئے مریم''

نیز:

''طوبیٰ کی شاخِ سبز پہ مریم کا ہاتھ ہے''

پھر پنجے کی ہاتھ سے مناسبت اور حضرت علیؑ کے لقب ''یداللہ'' سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے انیسؔ پنجہ کو دستِ خدا سے تعبیر کرتے ہیں:-

دیکھو تو حشم بازوئے شاہِ شہداً کا
سایہ سرِ پُرنور پہ ہے دستِ خدا کا

اس شعر میں حضرت عباسؑ کو ''بازوئے شاہِ شہداً'' کہہ کر ''دستِ خدا'' کے ساتھ ''دست'' اور ''بازو'' کی لفظی مناسبت بھی پیدا کی گئی ہے۔

پنجہ ہاتھ کی شکل کا ہوتا ہے اور ہاتھ میں پانچ اُنگلیاں ہوتی ہیں اس طرح پنجہ میں پانچ کے عدد کی مناسبت پنجتن پاک کے ساتھ ہے۔ اس مُناسبت سے فائدہ اُٹھا کر انیسؔ پنجتنِ پاک کے نور کو علَم کی طرف منتقل کر دیتے ہیں:-

کرتا تھا اشارہ کہ نہ کیوں نورفشاں ہوں
میں پنجتن پاک کے لشکر کا نشاں ہوں

پھر علَم کی حسنین علیہم السلام سے مُناسبات وہ یوں پیدا کرتے ہیں کہ پھریرے کی سبزی کو شہ

زہرِ دعا امام حسنؑ کے رنگ کے مماثل اور سنہرے پنجہ کو خون حسینؑ کا ہم رنگ قرار دے کر اور پھریرے کو دوشِ حسنؑ اور پنجہ کو دست حسینؑ سے تعبیر کرتے ہیں:-

اُس کا علَم ہے یہ جو شہِ مشرقین ہے
گویا حسنؑ کے دوش پہ دستِ حسینؑ ہے

پھر ہاتھ کی مناسبت سے علَم کے پنجہ کو معصومین کے اخلاقی صفات کا مظہر قرار دیا گیا ہے:-

''دستِ کرمِ شاہِ ولایت ہے یہ رایت''

مصروف جو اُمّت کی طرف شاہ کو پایا
ہے بہرِ دعا ہاتھ علَم نے بھی بڑھایا

شکلِ کفِ سائل جو ہے پنجہ یہ سبب ہے
اللہ سے اُمّت کی شفاعت کی طلَب ہے

زر ریز تھا پنجہ تو یہ کہتے تھے خردمند
یہ ہاتھ سخی کا ہے نہ ہووے گا کبھی بند

پنجہ کے بعد انیسؔ پھریرے کے مختلف کیفیات اور خصوصیات کے مُناسبات دوسری حسین ودلکش اور مقدّس اشیاء اور اخلاقی صفات کے ساتھ پیدا کر کے اپنے موضوع میں ایک نیا حُسن ایک نیا بانکپن اور ایک نئی وسعت پیدا کر دیتے ہیں۔ چند مثالیں درجِ ذیل ہیں:-

رحمت کا یہ دریا ہے کہ دامانِ علم ہے
یہ شانِ علَم اور پھریرے کا وہ عالم یہ ابرِکرم ہے تو وہ ہے نیّرِاعظم
پنجے کو ہے پردے سے نکالے ہوئے مریمؑ انگشتِ شہادت سے اشارہ یہ ہے ہر دم
یہ عرش کا رُتبہ ہے نہ افلاک کا رتبہ
ہے سب سے فزوں پنجتنِ پاک کا رتبہ

دکھلاتا تھا سرسبزیٔ افلاک پھریرا

تھا دامنِ مریمؑ کی طرح پاک پھریرا

پرچم فزوں تھا حُسن میں گیسوئے حور سے

پرچم تھا بال کھولے تھی یا حورِ جناں

پرچم تھا کہ بکھرے ہوئے تھے موئے سرِ حور

پرچم نہ کہو موئے سرِ حور کھلے ہیں

پرچم جو کھلا کھول دیئے بال پری نے

پنجہ اور پھریرے کا الگ الگ تذکرہ کرنے کے بعد انیسؔ بہت سے موقعوں پر اس مجموعی تاثر کو پیش کرتے ہیں جو علَم کو دیکھ کر پیدا ہوتا ہے۔ مذہبی اور اخلاقی تصورات سے علَم کا ربط قائم کرنے کے علاوہ وہ علَم کے جمالیاتی تاثر کی تصویر کشی بھی کرتے ہیں:-

سب فوجِ ملائک کی نظر اس سے لڑی تھی
اوڑھے ہوئے اک سبز ردا حور کھڑی تھی

اس میں پنجہ کو "چہرۂ حور" اور پرچم کو "سبز ردا" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

دامن وہ سبز اور وہ پنجے کا اُس کے نور
نکلا ہوا ہے قصرِ زمرّد سے روئے حور

اس شعر میں پھریرے کو "قصرِ زمرد" اور پنجے کو "روئے حور" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان تمام اشعار میں حُسن کے ساتھ تقدّس کا بھی ایک عنصر موجود ہے۔

ایک شعر میں پنجہ کے اردگرد آفتاب کی شعاعوں کو سونے کے سہرے اور علَم کو دولھا کے رُخ سے تعبیر کیا گیا ہے جسے انیسؔ کی حُسن کاری کی ایک نہایت دلکشن مثال کہا جا سکتا ہے:-

زر ریزیٔ علَم پہ ٹھہرتی نہ تھی نظر
دُولھا کا رُخ تھا سونے کے سہرے میں جلوہ گر

عباسؑ کا علَم فوجِ خُدا کا نشان ہے۔ وہ منبع نورِ الٰہی ہے اس لئے کوئی تعجب نہیں اگر انیسؔ کو اُس

کے لہرائے ہوئے سبز پھریرے میں دریائے رحمتِ الٰہی کی جھلک نظر آ گئی ہو:-

رحمت کا یہ دریا ہے کہ دامانِ علَم ہے

حسینؑ ہادیٔ برحق تھے اس لئے اُن کی فوج کے رایت کو اگر ''سروِ چمن آرائے ہدایت'' کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا:-

سروِ چمن آرائے ہدایت ہے یہ رایت

پھر سرو بھی سبز ہوتا ہے، علَم بھی سبز ہے۔ سرو بھی دلکش اور جاذبِ نظر ہوتا ہے اور علَم بھی حسین اور دلکش ہے۔ یہ رایت شاہِ ولایت حضرت علیؑ کے اخلاقِ حسنہ کا مظہر ہے:-

مہرِ فلکِ لُطف و عنایت ہے یہ رایت

دستِ کرم شاہِ ولایت ہے یہ رایت

''ابر'' اور ''خورشید'' کی مناسبت سے ایک جگہ پھریرے کو ابرِ کرم سے تعبیر کیا ہے:-

یہ شانِ علَم اور پھریرے کا وہ عالم

یہ ابرِ کرم ہے تو وہ ہے نیّرِ اعظم

انیسؔ محض پھریرے کا ذکر نہیں کرتے بلکہ اُس کی لہروں کی کیفیت کی مرقع کشی بھی کرتے ہیں اور لہروں کی مناسبت سے کبھی اُسے ''سبزہ'' سے کبھی ''دریا'' سے اور کبھی ''جنّت کی نہر'' سے تعبیر کرتے ہیں بلکہ تقدس کے لحاظ سے اس کو جنّت کی نہروں اور چشمۂ کوثر پر بھی تفوق دے دیتے ہیں:-

لہرا کے سرِ عرش پہ جاتا ہے پھریرا   ساتھ اپنے ہوا خُلد کی لاتا ہے پھریرا

ایسی کوئی جنّت میں رواں نہر نہ ہوگی   سرچشمۂ کوثر میں بھی یہ لہر نہ ہوگی

دریا خجل ہے سبز پھریرے میں ہے وہ لہر

سبزہ بھی اُس کے عشق میں کھائے ہوئے ہے زہر

دامن ہے بادبانِ جہازِ امامِ دہر

موجیں دکھا رہی ہے بہشتِ بریں کی نہر

پھریرے کی لہروں کے بعد انیسؔ پھریرے کی ہوا کا بھی تذکرہ کرتے ہیں اور پھریرے سے ''نکہت'ارم' اور جنت کی سرد ہوا کا رشتہ قائم کرتے ہیں:-

جلوہ فرما ہوئے گھوڑے پہ شہ عرش وقار علمِ فوج کو عباسؑ نے کھولا اک بار

دشت میں نکہتِ فردوسِ بریں آنے لگی عرش تک اُس کے پھریرے کی ہوا جانے لگی

جنت کی پھریرے سے ہوا آتی تھی رن میں
طوبیٰ نے جگہ پائی تھی زہراؑ کے چمن میں

لہرا کے سرِعرش پہ جاتا ہے پھریرا
ساتھ اپنے ہوا خُلد کی لاتا ہے پھریرا

کیا دوشِ مبارک پہ ہے اوجِ علمِ شاہ
جنت کی ہوا اُس کے پھریرے کی ہوا خواہ

اللہ رے اوجِ علَمِ فوجِ پیمبرؐ
جنت کی پھریرے سے ہوا آتی تھی فَرفَر

اُڑنے لگا ہوا سے پھریرا جود مبدم
دشتِ وغا میں پھیل گئی نکہتِ ارم

رفعت بڑھی زمینِ سعادت سرشت کی
ٹھنڈی ہوا پھریرے سے آئی بہشت کی

اس کے بعد پھریرے کی ہوا کی ''دمِ عیسیٰ'' سے مُناسبت قائم کی گئی ہے:-

اعجاز ہے عیسیٰ کا پھریرے کی ہوا میں

عَلَم کے جتنے بھی امکانی پہلو ہو سکتے ہیں اُن میں سے کسی کو بھی انیسؔ نظر انداز نہیں کرتے۔ عَلَم کی بلندی اُس کی عظمت کی طرف دلالت کرتی ہے۔ اس لئے اس کو بھی انیسؔ نے خاصی اہمیت دی ہے۔ انیسؔ عَلَم اور طوبیٰ میں سبز رنگ، بلندی اور تقدس کے مناسبات دیکھتے ہیں اس لئے انداز بدل بدل کر وہ بار بار عَلَم کو طوبیٰ سے تعبیر کرتے ہیں پھر کبھی وہ اس کا ربط ''کرسی'' سے کبھی ''عالم بالا'' سے، کبھی ''عرش'' سے اور کبھی ''پایۂ عرش'' سے قائم کرتے ہیں:-

طوبیٰ ہو تو ایسا مہِ کامل ہو تو ایسا''

حضرت عباسؑ کے بارے میں کہتے ہیں:-

کرسی کے بھی پائے سے سوا پایا ہے رُتبہ
کیا دست بہ دست اُس کو یہ ہاتھ آیا ہے رُتبہ

سب عالمِ بالا بھی ثنا خوانِ عَلَم ہے

یہ عرش کا رُتبہ ہے نہ افلاک کا رُتبہ
ہے سب سے سوا پنجتنِ پاک کا رُتبہ

پنجتنِ پاک سے نسبت رکھنے کی وجہ سے عَلَم بھی عرش و افلاک سے زیادہ بلند مرتبے کا حامل ہے۔

اللہ رے یہ اوجِ عَلَم لشکرِ شاہی
تھا زیرِ نگیں ماہ سے تا مسکنِ ماہی

اگر عَلَم اتنی رفعت کا حامل نہ ہوتا تو ماہ سے ماہی تک ہر شے اُس کے زیرِ اقتدار نہ ہوتی۔ اس شعر میں ''رفعت'' اور ''اقتدار'' میں مناسبت پیدا کی گئی ہے۔

کہیئے پستی اُسے جو اوج ہُما نے دیکھا
وہ سماں پھر نہ کبھی ارض و سما نے دیکھا

طوبیٰ نے جگہ پائی تھی زہراؑ کے چمن میں

کیا اوج تھا نخلِ عَلَم فوجِ خدا کا

فردوس بھی شائق تھا پھریرے کی ہوا کا

عیسیٰ نے پُکارا کہ نثار اُس کے حشم کے

عیسیٰ چرخِ چہارم پر مقیم ہیں اس لئے عیسیٰؑ کا علَم کے حشم کا اعتراف کرنا علَم کی بلندی اور عظمت کی نشاندہی کرتا ہے :-

---

صدقے علَم کے حضرتِ عباسؑ کے نثار
طوبیٰ شکوہ، عرش تجمل، فلک وقار

جُھکتا ہے جس سے عرش یہ پایہ اسی کا ہے

اس مصرع میں ''پایہ'' کا لفظ عظمت، مرتبہ اور رفعت و بلندی کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ عرش کے ''پایہ'' سے علَم کے ''پایہ'' کی مناسبتِ لفظی بھی ہے۔ عرش کا جُھکنا علَم کے تفوق اور تقدس کا اظہار کرتا ہے۔

آفتاب اور پنجہ کا تقابل رفعت کے لحاظ سے درج ذیل شعر میں کیا گیا ہے :-

پنجہ ادھر چمکتا تھا اور آفتاب اُدھر
اس کی ضیا تھی خاک پہ، ضو اُس کی عرش پر

بلندی کے لحاظ سے آفتاب اور پنجہ میں جو نسبت ہے اُس کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ آفتاب کی روشنی خاک پر تھی جب کہ پنجہ کی ضیاء عرشِ الٰہی پر پھیلی ہوئی تھی۔

چُوما نشاں کو بڑھ کے ہر اک خیر خواہ نے
''طوبیٰ لکم'' کہا شہِ عالَم پناہ نے

اس شعر میں ''طوبیٰ لکم'' کی ترکیب کے ساتھ علَم کی بلندی اور باغِ فردوس کے ساتھ اُس کا احترام کرنے والوں کے رشتہ کی طرف جو اشارہ ہے وہ استعارہ سے بھی زیادہ لطیف اور مؤثر ہے۔

علَم کی رفعت سے زمینِ کربلا کو گویا معراج ہوگئی اور وہ بہشتِ بریں کی بلندی تک پہنچ گئی :-

رفعت بڑھی زمینِ سعادت سرشت کی
ٹھنڈی ہوا پھریرے سے آئی بہشت کی

بے مثل جو ہو پھر اُسے کس شے سے دوں مثال
طوبیٰ اُسے کہوں تو وہ ہوجائے خود نہال

انیسؔ کہتے ہیں کہ عَلَم اپنی رفعت، اپنی عظمت اور اپنے تقدّس میں بے مثال ہے اس لئے کسی شے سے اُسے تشبیہ دینا عَلَم کی منزلت کو ظاہر نہیں کرے گا بلکہ اُس سے خود اُس شے کی منزلت بڑھ جائے گی۔ اگر عَلَم کو طوبیٰ کہوں تو اُس سے خود طوبیٰ کی شان میں اضافہ ہوجائے گا اور وہ ''نہال'' ہوجائے گا۔ ''طوبیٰ'' درخت کا نام ہے اور ''نہال'' کے معنی بھی درخت کے ہیں اس لئے ان دونوں الفاظ میں مُناسبت لفظی ہے لیکن اس مقام پر انیسؔ نے ''نہال ہونے'' کو اُردو محاورہ کے لحاظ سے ''فخر و مسرت، سے پھولوں نہ سمانے'' کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

جھک جائے آسماں وہ بزرگی نشاں میں ہے

آسمان کا جُھک جانا، عَلَم کی رفعت وعظمت کے اعتراف کے مُرادف ہے۔

ایک موقع پر شاعرانہ تعلّی کرتے ہوئے جب انیسؔ اپنی منبر نشینی پر فخر کرتے ہیں تو معراج کی بلندی کا ''عَلَمِ صاحب معراج'' سے رابطہ قائم کر کے اپنی بلندی کا نتیجہ اخذ کرتے ہیں:-

بالیدہ ہوں، وہ اوج مجھے آج ملا
ظلِ عَلَمِ صاحبِ معراج ملا

''بالیدگی'' رُوح کا اپنی عظمت کا احساس ہے۔ معراج کے سایہ میں آنے کا نتیجہ ہے۔
عَلَم کی بلندی کے علاوہ انیسؔ نے عَلَم کے ''سایہ'' کو بھی اپنی تخلیقی تخیّل کا موضوع بنایا ہے۔
''ہُما'' ایک افسانوی پرندہ ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ جو شخص اس کے سایہ کے نیچے آجاتا ہے وہ بادشاہ ہوجاتا ہے اس لئے انیسؔ عَلَم کے سایہ کو بار بار ''ظلِ ہُما'' سے تعبیر کرتے ہیں:-

''جو سائے میں اس کے ہے وہ ہے ظلِ ہُما میں''

ہوگا یہ ہُما سایہ فگن اب نہ کسی پر
بس خاتمہ ہے حضرت عباسؑ علی پر

حضرت حمزہ، حضرت جعفر طیار اور حضرت علیؑ کے بعد لشکرِ اسلام کے آخری علمدار حضرت عباسؑ تھے اس لئے انیسؔ کہتے ہیں کہ حضرت عباسؑ کے بعد اب یہ ہُما کسی اور پر سایہ فگن نہ ہوگا۔

تھا سر پہ ہُما سایہ فگن کھولے ہوئے پَر

جُھکتا ہے جس سے عرش یہ پایہ اُسی کا ہے
ظلِ خدا پہ دھوپ میں سایہ اسی کا ہے

اس شعر میں سایہ کی مناسبت سے حضرت امام حسینؑ کو "ظلِ خدا" کہا گیا ہے۔

ایک موقع پر انیسؔ نے سایہ علَم اور ابن سعد کے چترِ زر کا تقابل کر کے ایک رثائی پہلو پیدا کیا ہے۔ وہ روزِ عاشور حضرت امام حسینؑ کی بے سروسامانی، تنہائی اور پریشاں خاطری کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں:-

سر پر لگائے تھا پسرِ سعد چترِ زر تھے دو غلام مروحہ جنباں ادھر اُدھر
تنہا تھا دھوپ میں اسد اللہ کا پسر نے سایۂ علَم تھا نہ عباسِؑ نامور
لگتی تھی کچھ بدن کو ہوا آہِ سرد سے
گیسو اَٹے ہوئے تھے بیاباں کی گرد سے

انیسؔ نے علَم کی خوشبو کو بھی نظر انداز نہیں کیا اور اُس میں بھی اُس کے تقدس کا التزام باقی رکھا:-

دشت میں نکہتِ فردوس بریں آنے لگی
عرش تک اُس کے پھریرے کی ہوا جانے لگی

اُڑنے لگا ہوا سے پھریرا جو دمبدم
دشتِ وغا میں پھیل گئی نکہتِ ارم

انیسؔ نے بعض مقامات پر علَم کی متحرک تصویر پیش کر کے علَم کے منظر کی تصویر کشی کی ہے اور علَم کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے پورے عالمِ فطرت پر اُس کو محیط دکھایا ہے:-

اللہ رے یہ اوجِ علَم لشکرِ شاہی تھا زیرِ نگیں ماہ سے تا مسکنِ ماہی
پنجہ جو ہلا پھیل گیا نورِ الٰہی دامن جو کھلا رنگِ زمیں ہوگیا کاہی

سبزی حسنؑ، سُرخیٔ خون شہِ دیں تھی
سونے کا فلک تھا تو زمرّد کی زمیں تھی

عَلَم کے عکس نے پورے آسمان کو سنہرا اور پھریرے کے رنگ نے زمین کو سبز بنا دیا تھا اس طرح عَلَم کے دامن کی وسعتوں نے زمین و آسمان کو اپنے احاطہ میں لے لیا۔

لہر وہ سبز پھریرے کی وہ پنجے کی چمک شرم سے ابر میں چھپ جاتا تھا خورشیدِ فلک
کہتے تھے صلِ علیٰ عرش پہ اُٹھ اُٹھ کے ملک دنگ تھے سب وہ سماں تھا زسماتا بہ سمک
کہئے پستی اُسے جو اوج ہما نے دیکھا
وہ سماں پھر نہ کبھی ارض و سما نے دیکھا

بعض مرثیوں میں انیسؔ نے ایک واقعہ نظم کیا ہے جس کی حیثیت تاریخی کے بجائے اخلاقی اور جذباتی ہے۔ یہ واقعہ انیسؔ کی شاعرانہ تخئیل کی پیداوار ہے اور اس کا جواز تاریخی حقیقت کے بجائے اُس حقیقت میں تلاش کرنا چاہئے جو انسانی فطرت سے روشناسی ہی سے حاصل ہو سکتی ہے اور جو شاعری ہی سے مخصوص ہے۔ یہ حقیقت وہی ہے جس کو ارسطو نے تاریخی حقیقت پر ترجیح دی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عون و محمد جناب زینبؑ کے کمسن صاحبزادے علمداری کے منصب کے خواہشمند تھے لیکن جب اُنہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا تو جناب زینبؑ نے اُن کی اس معصومانہ خواہش کو سمجھا بجھا کر رد کر دیا۔ اس واقعہ کے بیان کرنے سے انیسؔ کا مقصد عونؑ و محمدؑ کی شجاعت اور بلند حوصلگی ظاہر کرنا تھا اس کے ساتھ جناب زینبؑ کے بلند انسانی اور اخلاقی کردار پر بھی روشنی ڈالنا اُن کا مقصد تھا۔ ماں کی بیٹوں کو نصیحت ایثار، بے نفسی اور شجاعت کے موضوع پر ایک بے مثال موعظہ ہے۔ بچوں کی بلند حوصلگی اور فرماں برداری میں توازن قائم کر کے انیسؔ نے کردار نگاری کے کمال کا مظاہرہ کیا ہے۔ علمداری کے منصب کے دعوے کو۔

اک دوپہر کے واسطے ناحق یہ قیل وقال

کہہ کر جناب زینبؑ پورے معرکۂ کربلا پر تبصرہ کر دیتی ہیں جس سے اس واقعہ کے رثائی عناصر سامعین کے ذہن میں اُبھر آتے ہیں اور یہی ایک مرثیہ نگار شاعر کی حیثیت سے انیسؔ کا مقصود تھا:۔

سب خوش تھے خیمۂ شہِ ذیجاہ میں مگر چیں بر جبیں تھے زینبِؑ ناشاد کے پسر

نے جانبِ علَم تھی نہ ماں کی طرف نظر آنکھوں میں ڈبڈبائے تھے آنسو جھکے تھے سر
اس طرح تھا عرق رُخِ پُر آب تاب پر
جیسے پڑے ہوں قطرۂ شبنم گلاب پر

پھر کر اُدھر سے ماں نے جو بیٹوں پہ کی نظر سمجھیں علَم نہ دینے سے بے دل ہیں یہ قمر
ہٹ کر کیا اشارہ کہ آؤ ذرا ادھر آئے عقب سے شہ کے سعادت نشاں پسر
بولیں کہ اب نہ ہوش نہ مُجھ میں حواس ہیں
قربان جاؤں کیا ہے جو چہرے اُداس ہیں

ہتھیار سج چکے ہیں شہنشاہِ حق شناس تم نے نہ زیبِ جسم کیا فاخرہ لباس
مردوں کو جان دینے میں ہوتا نہیں ہراس دُولھا سے بن کے جاؤ امامِ امم کے پاس
کچھ ملگجے ہیں آؤ یہ کپڑے اُتار دوں
سرمہ لگادوں گیسوئے مشکیں سنوار دوں

شب سے تو صبح تک یہ دعا تھی ہر ایک پَل تیغوں میں پہلے ہم کو کرے سرخرو اجل
اب کیا ہوا یہ کون سے غصّہ کا ہے محل آنکھوں میں اشک، رُخ پہ عرق، ابروؤں پہ بَل
وہ خوش مزاجیاں نہ وہ باتوں کے طور ہیں
اس وقت دیکھتی ہوں کہ تیور ہی اور ہیں

ماں پر یہ آفتیں ہیں، یہ ماموں پہ ظلم و جور پیارو ہمارے حال پہ لازم ہے تم کو غور
نازک مزاجیوں کے کسی دن نہ تھے یہ طور اب مشورے ہیں اور تصور ہیں اور اور
وہ دل نہیں، وہ آنکھ نہیں، وہ نظر نہیں
اوروں کا ذکر کیا تمہیں میری خبر نہیں

اس کا نہیں خیال کہ کیوں کر جئے گی ماں ہوتا ہے آفتوں میں محبت کا امتحاں
تم میری دس برس کی ریاضت ہو میری جاں مُجھ سے سوا ہے کون تمہارا مزاج داں
جس پر یہ برہمی ہے وہ سب جانتی ہوں میں
غصّے کی آنکھ کا ہے کو پہچانتی ہوں میں

پردہ ہے تو سناؤ الگ چل کے دل کا حال دونوں نے عرض کی کہ نہیں کچھ ہمیں ملال

ہاں آج ہم کو بھول گئے شاہِ خوش خصال　　اوروں کی پرورش ہے ہمارا نہیں خیال

کیا ورثہ دارِ جعفرِ طیار ہم نہ تھے

اس عہدۂ جلیل کے حق دار ہم نہ تھے

انگشت رکھ کے دانتوں میں ماں نے کہا کہ ہا　　اب اُس کا ذکر کیا ہے جو ہونا تھا ہو چکا

دیکھو سنیں نہ زوجۂ عباسِ باوفا　　اچھا یہ ہے خوشی کی جگہ یا گِلے کی جا

غصہ نہ اس میں چاہیئے جو امر خیر ہو

واری وہ کون غیر ہیں تم کون غیر ہو

اک دو پہر کے واسطے ناحق یہ قیل و قال　　تا عصر تم نہ ہو گے نہ عباسؑ خوشخصال

اس دن کی دے گئے ہیں خبر شیر ذوالجلال　　مجھ کو نہیں یقیں کہ بچے فاطمہؑ کا لال

پیدا ہوئی ہوں اشک بہانے کے واسطے

رہ جاؤں گی میں قید میں جانے کے واسطے

لو اپنے دُودھ کی تمہیں دیتی ہوں میں قسم　　اب کچھ کہو گے مُنھ سے تو ہوگا مجھے بھی غم

سُنتے تھے تم جو کہتے تھے عباسِ باحشم　　دو جاکے اُن کو تہنیتِ عہدۂ علم

صدقے گئی خلافِ ادب کچھ سخن نہ ہو

میری خوشی یہ ہے کہ جبیں پر شکن نہ ہو

کنبے میں ایک نے بھی اگر سُن لیا یہ حال　　کہتی ہوں صاف میں مجھے ہوگا بہت ملال

ننھے سے ہاتھ جوڑ کے بولے وہ نونہال　　ہم باوفا غلام ہیں کیا تاب، کیا مجال

دیجئے سزا ہمیں جو بَل اَبرو پہ پھر پڑیں

کہئے تو ماموں جان کے قدموں پہ گر پڑیں

زینبؑ بلائیں لے کے یہ بولیں کہ میں نثار　　دونوں ہو تم رشید و سعید و وفا شعار

دے ایسے لال سب کو زمانے میں کردگار　　ذی قدر و ذی شعور و سخن فہم و ذی وقار

لازم خوشی ہے جو جسے عہدہ سپرد ہو

چھوٹوں کے تم بزرگ، بزرگوں کے خورد ہو

بہت سے موقعوں پر انیسؔ علَم کا علمدار سے ربط قائم کر کے علَم اور علمدار کو ایک وحدت کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور علَم کی علمدار سمیت مُرقع کشی کرتے ہیں۔ اُن کا ایک مشہور مرثیہ اسی منظر کشی سے شروع ہوتا ہے:-

جب رَن میں سربلند علیؑ کا علَم ہوا   فوجِ خدا پہ سایۂ ابر کرم ہوا
چرخِ زبر جدی پئے تسلیم خم ہوا   پنجے پہ سات بار تصدق حشم ہوا
دیکھا نہ تھا کبھی جو علَم اس نمود کا
دونوں طرف کی فوج میں غُل تھا دُرود کا

وہ شان اس علَم کی وہ عباسؑ کا جلال   نخلِ زمردی کے تلے تھا علیؑ کا لال
پرچم پہ جان دیتی تھیں پریوں کا تھا یہ حال   غُل تھا کہ دوشِ حور پہ بکھرے ہوئے ہیں بال
ہر لہر آبدار تھی کوثر کی موج سے
طوبیٰ بھی دب گیا تھا پھریرے کے اوج سے

تھا پنجتن کا نور جو پنجہ میں جلوہ گر   اعمیٰ کی پتلیوں میں بھی تھا روشنی کا گھر
ذرّے نثار کرتے تھے اُٹھ اُٹھ کے اپنا زر   تکتے تھے فوق سے تو ملک تحت سے بشر
اللہ ری چمک علَم بوتراب کی
تارِ نظر بنی تھی کرن آفتاب کی

قربانِ احتشامِ علمدارِ نامور   رُخ پر جلالتِ شہِ مرداں تھی سربسر
چہرہ تو آفتاب تھا اور شیر کی نظر   قبضے میں تیغ، بَر میں زرہ، دوش پر سپر
چھایا تھا رعب لشکر ابن زیاد پر
غل تھا چڑھے ہیں شیر الٰہی جہاد پر

غرفوں سے جھانک جھانک کے بولی ہر ایک حور   صَلِّ علیٰ علَم کی چمک ہے کہ برقِ طور
یا رب رہے نگاہِ بد اس کی ضیاء سے دُور   پنجہ ہے یہ کہ ایک جگہ پنجتن کا نور
جلوے ہیں سب محمدؐ و حیدرؑ کی شان کے
قربان اس جواں کے، نثار اس نشان کے

عَلَم کو علمدار کی نسبت سے دیکھنے کے بعد انیسؔ عَلَم کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہیں اور ماضی کے علمداروں سے اس کا رشتہ قائم کر کے علمدار کی اہمیت پر زور دیتے ہیں:-

عالم میں ہوئے چار اولوالعزم علمدار اک حضرتِ حمزہ تھے تو اک جعفر طیّار
بعد اُن کے ہوئے زیبِ علم حیدرؑ کرار عباسؑ اب اس منصبِ والا کا ہے مختار

کرسی کے بھی پائے سے سوا پایا ہے رتبہ
کیا دست بدست اُس کو یہ ہاتھ آیا ہے رتبہ

علمدارِ حسینی کی اہمیت میں اضافہ اس وجہ سے اور ہو جاتا ہے کہ وہ "سقائے حرم" تھے اور بالخصوص سکینہؑ کے لئے پانی لینے گئے تھے اس لئے اُن کا مقصد جنگ نہیں بلکہ پانی لانا تھا۔ اس بندش سے حضرت عباسؑ کا جنگ کرنے کا حوصلہ نکل نہ پایا لیکن وہ ضبطِ نفس کی ایک بلند تر منزل پر فائز ہو گئے۔ عباسؑ کے ایسے شجاع کا اس سے بڑا امتحان اور کوئی نہ ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے حوصلۂ جہاد کو دبا کر ساری توجہ نہر تک پہنچنے اور پھر مشکِ سکینہؑ کو بچانے میں صرف کر دیں۔ یہ ضبطِ نفس اور شجاعت کا ایسا کارنامہ ہے جس میں وہ لشکرِ اسلام کے تمام دوسرے علمداروں سے ممتاز تھے:-

ہاتھ آئی کسے خلق میں اس طرح کی توقیر ہم پنجۂ دستِ احدی بازوئے شبیرؑ
کیا قدرتِ اللہ ہے، اللہ ری تقدیر گر شیرِ خدا مصحفِ ناطق تو یہ تفسیر

بابا کی طرح صاحبِ شمشیر و عَلَم ہیں
حُرمت یہ علاوہ ہے کہ سقائے حرم ہیں

عَلَم فوجِ پیغمبر کا نشان تھا اور عباسؑ حیدرِ کرار کی یادگار۔ اس لئے عَلَم کی علمداری کے منصب کا عباسؑ سے زیادہ کون مستحق ہو سکتا تھا۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ عَلَم سے عباسؑ کی جلالتِ قدر میں اضافہ ہوا یا عباسؑ نے عَلَم کی منزلت میں اضافہ کیا:-

زینت وہ عَلَم کی تو عَلَم اُس کا حشم ہے شوکت میں یہ افضل، نہ بزرگی میں وہ کم ہے
وہ آیۂ رحمت ہے تو یہ ابرِ کرم ہے بے مثل علمدار ہے، نایاب عَلَم ہے

دونوں کا شرف سارے زمانہ پہ عیاں ہے
احمدؐ کا نشاں وہ ہے یہ حیدرؑ کا نشاں ہے

علیؑ نے رسولؐ کے ساتھ ابتدا ًسے انتہا تک جس رفاقت اور وفاداری کا مظاہرہ کیا تھا اُسی کا مظاہرہ عباسؑ نے حسینؑ کے ساتھ کیا اس لئے عباسؑ ہی کی ذات علمداری کے منصب کے لئے سب سے زیادہ موزوں تھی:۔

کون اور کائنات میں ہے دوسرا جواں   قابل اسی کے دوشِ مبارک کے تھا نشاں
بازوئے شاہِ دیں، جسدِ مرتضٰی کی جاں   پیروں کا سرپرست، جوانوں کا قدرداں
باتیں پیمبروں کی خدا کے ولی میں تھیں
سب اس میں جمع ہیں صفتیں جو علیؑ میں تھیں

اُلفت وہی، حیا وہی، مہرو وفا وہی   طاعت وہی، وقار وہی، اتقا وہی
بخشش وہی، کرم وہی، جُود و سخا وہی   جرأت وہی، جلال وہی، دبدبا وہی
گیتی میں اور بھی کوئی ایسا دلیر ہے
خود تھا علیؑ کا قول کہ عباسؑ شیر ہے

بے مثل سب ہیں قبلۂ عالم کے رشتہ دار   لیکن خدا نے اس کو دیا ہے عجب وقار
جیسے نبیؐ کی فوج میں تھے شیرِ کردگار   ویسا ہی بے عدیل ہے یہ شہ کا جاں نثار
سب فوج سے بڑھا ہوا رُتبہ اسی کا تھا
شیرِ خدا کے بعد یہ حصّہ اُسی کا تھا

باہر تو اشتیاقِ علم میں ہے سب سپاہ   خیمے میں باندھتے ہیں کمر شاہِ دیں پناہ
سب خویش و اقربا ہیں مسلّح قریبِ شاہ   ہیں سامنے علَم لئے عباسِؑ عرش جاہ
رتبے کو اوج، نخلِ ترقی مراد پر
گویا علیؑ کھڑے ہیں مہیّا جہاد پر

شیر خدا کا خودِ مبارک ہے زیبِ سر   کلغی، ہمائے اوجِ سعادت کے جس میں پَر
ماتھا ہے یا کہ ابر سے نکلا ہوا قمر   ابرو ہیں ذوالفقارِ یداللہِ نامور
ڈورے جو سُرخ سُرخ ہیں چشمِ سیاہ میں
پھرتی ہیں خوں بھری ہوئی تیغیں نگاہ میں

ایک طرف علَم حضرت عباسؑ اور حضرت علیؑ میں مناسبت قائم کرتا ہے، دوسری طرف یہی علَم عباسؑ اور سکینہؑ میں ربط قائم کرتا ہے۔ آج بھی عباسؑ کے علَم میں بندھی ہوئی چھوٹی سی مشک سکینہؑ کی پیاس کی یاد دلاتی ہے اور پھریرے میں خون کے دھبے عباسؑ کی وفا کی خونچکاں داستان بیان کرتے ہیں:-

ہے جلوہ گر جو حضرتِ عباسؑ کا علَم — شوکت وہی ہے، رُعب وہی اور وہی حشم
مشکِ سکینہؑ دیکھ کے لگتے ہیں تیرِ غم — ہیہات ایسے شیر کے بازو ہوئے قلم
ہر دم رہے نہ کیوں دلِ زہراؑ بھرا ہوا
ہے آج تک لہو سے پھریرا بھرا ہوا

علمدارِ حسینی نے علَم کو اُس وقت تک بچانے کی کوشش کی جب تک ہاتھ رہے لیکن مشکِ سکینہؑ کو اُس وقت بھی بچایا جب دونوں ہاتھ کٹ چکے تھے:-

افشاں ہے سر کے خون کے چھینٹوں سے سب نشاں — عباسؑ کانپ جاتے تھے جھکتا تھا جب نشاں
نام آوروں نے آج مٹایا عجب نشاں — کیوں اے حسینؑ کون اُٹھائے گا اب نشاں
لاش اُن کی پائمال ہوئی زخم پھٹ گئے
جن میں علیؑ کا زور تھا وہ ہاتھ کٹ گئے

شانے پہ جو ظالم نے برابر سے کیا وار — جس ہاتھ میں تھی تیغ قلم ہوگیا اک بار
غصہ میں جو قاتل پہ چلے داب کے رہوار — ہیہات چلی دوسرے قاتل کی بھی تلوار
عباسؑ دلاور کو اسی ہاتھ کا غم تھا
وہ ہاتھ بھی ریتی پہ گرا جس میں علَم تھا

اک چوٹ لگی دل پہ گرا جب علَمِ شاہ — چلّائے یہ کیا قہر ہوا اے مرے اللہ
کیا ہمّت عالی تھی ارادہ تھا عجب واہ — پکڑے ہوئے تھے مشک کو دانتوں میں وہ ذیجاہ
اُس وقت عجب شان تھی اُس تشنہ دہن کی
گویا دہنِ شیر میں گردن تھی ہرن کی

عباسؑ کی علمداری پر سقائی کا پہلو غالب ہے عباسؑ کے علم میں مشکِ سکینہؑ نہیں ہے بلکہ چچا کی گردن میں تشنہ لب بھتیجی کی بانہیں ہیں اس لئے عباسؑ کی رخصت کا مرقع انیسؔ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:-

شہ کہتے تھے سر بھائی کا چھاتی سے لگا کر   مرجائیں گے ہم، داغ نہ دو ہم کو برادر
کہتا ہے علمدار کہ یا سبط پیمبرؐ   حسرت ہے کہ بچوں کے لبِ خشک کروں تر
بھائی کی سعادت جو کرے بھائی کی خدمت
کوثر ہے مرے واسطے سقائی کی خدمت

اک چھوٹی سی لڑکی ہے کہ جینے سے ہے بے آس   ہاتھوں سے نہیں چھوڑتی جو دامنِ عباسؑ
کہتی ہے چچا جان، بجھا دیجئے اب پیاس   اقرار کئے جاؤ کب آؤ گے مرے پاس
گر دیر لگی تم کو تو جینے کی نہیں میں
پھر پانی بھی آئے تو پینے کی نہیں میں

سکینہؑ نے عباسؑ سے اقرار کرالیا تھا کہ پانی لے کر آئیں گے لیکن عباسؑ پانی نہ لا سکے۔ اُنہیں سکینہؑ سے شرمندگی تھی اس لئے اُنہوں نے امام حسینؑ سے وصیت کی تھی کہ میری لاش کو خیمہ میں نہ لے جایئے گا اور حسینؑ عباسؑ کی لاش کے بجائے عباسؑ کا علَم لے کر خیمہ میں آئے۔ یہ موقع ایسا تھا کہ عباسؑ کا علَم ہی عباسؑ کی لاش کی علامت بن گیا:-

یہ سُن کے اُٹھے خاک سے روتے ہوئے سرور   مسند پہ لٹایا علَم اور ڈال دی چادر
بھاوج سے یہ فرمایا کہ اے بیکس و مضطر   مجبور تھا دریا سے میں لاتا اسے کیوں کر
لاشہ نہ اُٹھانا یہ وصیّت تھی جری کی
سمجھو کہ یہی لاش ہے عباس علیؑ کی

اور صرف یہی نہیں کہ جب میدانِ جنگ سے علَم واپس آیا اُسی وقت یہ تأثر ہوا کہ عباسؑ کی لاش خیمہ میں آئی ہے بلکہ عباسؑ کے انجام کا سایہ عباسؑ کی رخصت ہی کے وقت علَم پر پڑ گیا تھا:-

اُجڑا چمن ہر اک گل تازہ نکل گیا
نکلا علَم کہ گھر سے جنازہ نکل گیا

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آخری وقت میں عباسؑ کی ہمت اُس وقت تک پست نہیں ہوئی جب تک کہ پانی کو سکینہؑ تک پہنچا دینے کا تصور بھی باقی رہا لیکن جیسے ہی پانی لے جانے کی اُمید ختم ہوئی عباسؑ کا دل ٹوٹ گیا اور اُن کی زندگی کی توانائیوں نے اُن کا ساتھ چھوڑ دیا:-

گرز ستم سے شق ہوا ناگہ سرِ جناب! تھرائے ہونٹ چُھٹ گئی دانتوں سے مشکِ آب
فرمایا ہائے دیں گے سکینہؑ کو کیا جواب گھوڑے سے تھرتھرا کے گرے مثلِ آفتاب
تڑپے، اُٹھے، کراہ کے خاموش ہوگئے
مُنھ رکھ کے خالی مشک پہ بیہوش ہوگئے

عباسؑ کا سکینہؑ کی خالی مشک پہ منھ رکھ کر بیہوش ہو جانا، پانی کو سکینہؑ تک پہنچانے کی حسرت کی مؤثر مرقع کشی کرتا ہے۔ یہ شاعر کے کمال کا آخری نقطہ ہے کہ وہ غیر مرئی تصورات واحساسات کو احسات کے دائرہ میں کھینچ لائے اور اُن کی ویسی ہی کامیاب تصویر کشی کردے جیسی ایک مصور مادّی اور محسوس اشیاء کی مرقع کشی کرتا ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ انیسؔ نے اپنے شاعرانہ تعبیرات اور تخئیلی مُناسبات سے عباسؑ کے علَم کا رشتہ اُن تمام اشیاء سے قائم کر دیا جن کے کسی نہ کسی پہلو سے علَم کے کسی نہ کسی پہلو کی مناسبت موجود تھی۔ علَم کو واقعۂ کربلا سے تعلق رکھنے والی اہم شخصیتوں میں ربط پیدا کرنے کا وسیلہ بنایا اور علَم سے ربط رکھنے والے جذبات کی ایک باکمال، حساس اور انسانی فطرت کے فیاض شاعر کی طرح نہایت کامیاب اور مؤثر ترجمانی کردی اس طرح علَم انیسؔ کی ذہنی کائنات پر محیط ہوگیا۔ اس میں الوہیت کی تجلّی بھی نظر آتی ہے، وہ اخلاق حسنہ کی علامت بھی ہے اور شجاعت، وفا، محبت، ایثار اور تمام اعلیٰ انسانی جذبات کا سرچشمہ بھی اور اس طرح ایک محدود موضوع کو انیسؔ نے اتنی وسعت دے دی کہ وہ حق کی علامت بن کر دینِ حق کی طرح جامع، وسیع، بسیط اور ہمہ گیر نظر آنے لگا اور اسی کے ساتھ وہ شاعرانہ حُسن اور فن کا ایک بے نظیر اور لازوال شاہ کار بھی بن گیا۔

سلیم احمد

چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

دنیا کی بڑی شاعری تو میں نے پڑھی نہیں، اس لئے اس کے معیار کے بارے میں صرف نقادوں کی سنی سنائی پر قیاس آرائیاں کرنا نہ صرف بدمذاقی ہوگی بلکہ بددیانتی بھی۔ عورت کی طرح شاعری کا پتہ بھی چھونے سے چلتا ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ بعض خوش اعتقاد لوگ براہِ راست تجربے کے بجائے مشاطاؤں اور نقادوں کے کہنے پر ایمان لے آتے ہیں، اس صورت میں میرے لئے یہ فیصلہ کرنا تو بہت مشکل ہے کہ بڑی شاعری کے بازار میں میر انیسؔ کا کیا بھاؤ ہے البتہ ایک بات میں ذاتی تجربے سے جانتا ہوں اور وہ یہ کہ اس زمانے میں جب شبلیؔ کی سفارش بھی کام نہیں آتی اور لوگ میر انیسؔ کو بالکل ہی ازکاررفتہ اور فرسودہ قرار دے چکے ہیں وہ جا بجا میرے دل کی گہرائیوں میں چھوتے ہیں ایسا کیوں ہے؟ اور وہ کیا چیز ہے جسے یہ آدمی اپنی خطابت اور قادرالکلامی سے نہیں، کسی اور طرح حرکت میں لے آتا ہے؟ یہ سوال ہے جو میں اپنے آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔

لیکن اس سے پہلے میں خود اپنی تنبیہہ کے لئے ایک بات کہتا چلوں۔ مجھے اس بات پر غور نہیں کرنا ہے کہ میر انیسؔ نے مرثیے کو رزمیہ بنا کر اچھا کیا یا برا؟ اور اسے رزمیہ بنانے میں مغربی اُصولوں کے مطابق کامیاب ہوئے یا ناکام۔ نہ مجھے اس بحث میں پڑنا ہے کہ میر انیسؔ اپنے مرثیوں میں عرب کا ماحول کیوں نہ پیش کر سکے اور امام حسین علیہ السّلام کو امام حسین لکھنوی کیوں بنا گئے۔ یہ سوال یقیناً اہم ہیں مگر خدا ہمارے مدرس نقادوں کو سلامت رکھے، ان پر بحثیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔

اس تنبیہ بلکہ خود تنبیہی کے بعد لگے ہاتھوں اپنے دو ایک تعصبات بھی بیان کرتا چلوں۔ مثلاً مجھے ایک چڑھ تو اس بات سے ہے کہ یار لوگ عظیم شاعری کے پھڈے میں اردو شاعری کی فہرست میرؔ، غالبؔ، اور اقبالؔ پر ختم کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد اگر اکا دکا نام کا اضافہ ہوتا بھی ہے تو بقول نظیر صدیقی اس کی حیثیت پسند خاص کی ہوتی ہے قبول عام کی نہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں خواہ مخواہ لوگوں کو رعایتی نمبر دلوا کر پاس کروانے کے چکر میں ہوں۔ میرا کہنا صرف یہ ہے کہ ان تین ناموں سے اردو شاعری کے سارے موضوعات، اسالیب اور لب ولہجہ کے سارے انداز تو کیا، اردو شاعری کے سارے رنگوں کی بھی نمائندگی نہیں ہوتی۔ اردو شاعری کی ایک بہت بڑی دنیا ان تین ناموں سے بھی آباد ہے اور ہم حالیؔ کے مقدمہ شعر وشاعری کو تھوڑی دیر کے لئے بھول جائیں تو یہ دنیا بڑی توانا، جاندار اور رنگا رنگ بھی ہے۔ مثلاً اقبالؔ مرد قلندر کی مدح وستائش میں جو کچھ کہتے ہیں اس کا تو کیا کہنا، مگر آتشؔ کی آواز کچھ اور چیز ہے اور جس نے میرؔ کی ''آہ'' کے ساتھ سوداؔ کی ''واہ'' نہ دیکھی اس نے اردو شاعری کیا خاک پڑھی۔ میرا دوسرا تعصب اس فلسفے کے خلاف ہے جو شوکت سبزواری کو پڑھے بغیر سمجھ میں نہیں آتا کہ بدمذاقی کا کتنا بڑا پردہ ہے خدائے قدوس گناہوں کا بہت بڑا معاف کرنے والا ہے مگر بدمذاقی کو بھی معاف کرتا ہے یا نہیں اس کے بارے میں مجھے شک ہے جب تک ممتاز حسین گواہی نہ دیں۔

خیر فلسفے کا ذکر آیا ہے تو میں بھی تھوڑا سا فلسفہ بگھارلوں انسان کی تعریف فلسفے کا ایک اہم موضوع ہے اور کوئی شاعری اس وقت تک عظمت کی حدود میں داخل نہیں ہوسکتی جب تک وہ اس سوال کا جواب نہ دے کہ انسان کیا ہے؟ یہ تو ہوئی ایک بات۔ دوسرا سوال طریقہ کار کا ہے۔ فلسفے کے برعکس شاعری میں یہ جواب عموماً مجرّد تصوّر کی صورت میں نہیں، انسان کی جیتی جاگتی تصویر پیش کر کے دیا جاتا ہے لیکن جہاں کہیں تصورات بھی پیش کئے گئے ہیں وہ بھی شدت سے محسوس کئے ہوئے تصورات ہیں۔ مثلاً اقبالؔ کی شاعری میں۔ بہر حال اردو شاعری میں انسان کی چار بڑی تصویریں ملتی ہیں۔ انسان بحیثیت عاشق کے جس کی ناکامی وجگر کاوی میرؔ کے نشتر بن گئی ہے۔ انسان بحیثیت ''فرد'' کے جس کی آفاق گیر انانیت غالبؔ کے اندیشہ ہائے دور و دراز میں جھلکتی ہے۔ انسان بحیثیت ''تماشائی'' کے جس کی ہوس سیر وتماشا نظیرؔ اکبر آبادی کے بنجاروں کے ساتھ گھومتی نظر آتی

ہے اور انسان بحیثیت ''مردِ عمل'' کے جس کا جوش کردار اقبالؔ کی ضرب کلیم بن گیا ہے لیکن میر انیس نے اردو شاعری کے اس نگار خانے میں ایک بہت اہم تصویر کا اضافہ کیا ہے جو کسی طرح بھی دوسری تصویروں سے کم رتبہ نہیں ہے بلکہ بعض اوقات اتنی پر جلال، پر عظمت اور معجزہ کی حد تک سچی ہے کہ بڑے بڑوں کے پر جلنے لگتے ہیں۔ اقبالؔ نے انسانی عظمت کی جیسی شاعری کی ہے وہ میرے مطالعے میں اردو کی اور دوسروں کی تصدیق سے عالمی ادب کے صفِ اول کی چیز ہے۔ لیکن اقبالؔ کا مردِ کامل، فکر و خیال کی عظیم بلندیوں کو چھونے کے باوجود مجھے کچھ نا آسودہ سا چھوڑتا ہے۔ گو مجھے یہ خیال ہے کہ اقبالؔ کا ایسا کلام تمام تر نعتیہ کلام ہے مگر اب تو ''گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان'' قسم کے مصرعے چھٹ بھیئے صحافیوں اور لیڈروں کے لئے بھی استعمال ہونے لگے ہیں۔ افسوس کہ اقبالؔ کو اس کے مبتذل مداحوں نے ہلاک کر دیا اور ہمارے زمانے کو اس کی بدمذاقی اور بے حسی نے۔ بہر حال اقبالؔ کے انسان سے میں مرعوب بھی ہوتا ہوں اور متاثر بھی، بے اندازہ دماغی قوت کے ساتھ یہ میرے ذہن و عقل کو جھنجوڑ دیتا ہے اور اس کے بعض رخ اور پہلو ایسے ہیں جو میری روح کی رسائیوں سے بھی ماورا معلوم ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود میں اسے گوشت پوست کے انسانوں کی طرح چلتا پھرتا، سوتا جاگتا، محبت اور نفرت کرتا، خوش ہوتا اور دکھ اٹھاتا نہیں دیکھ پاتا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا محرکِ تخلیق ''بڑا خیال ہے'' بڑا تجربہ نہیں۔ اور اگر میرا یہ خیال صحیح ہے کہ یہ نعتیہ کلام ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اقبالؔ حضور ﷺ کی سیرت کے بشری پہلوؤں سے متاثر نہیں ہوئے یا دوسرے لفظوں میں خود اقبالؔ کے اندر گوشت پوست کا انسان کمزور حالت میں تھا۔ غالبؔ کے یہاں تجربے کا عنصر زیادہ ہے کیونکہ غالبؔ کا انسان خود غالبؔ کی انا کا ایک پھیلا ہوا سایہ ہے۔ غالبؔ نے اپنی انانیت سے کیا کام لیا ہے اور اس کو کس طرح حیات و کائنات کی تفتیش کا ذریعہ بنایا ہے میں اپنے ایک مختصر سے مضمون میں جو برادرم مشفق خواجہ کی فرمائش پر رسالہ ''اردو'' کے لئے لکھا گیا تھا بتا چکا ہوں لیکن غالبؔ کا انسان اپنی ذہنیت کے اعتبار سے مجھے پسند نہیں ہے میں اس کی بلند نظری خود آگاہی، شوخی و ظرافت، مجلس آرائی اور محشر خیالی کا قائل و معترف ہونے کے باوجود یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کہیں کہیں اس کی خود رحمی مریضانہ حد تک پہنچ جاتی ہے اور ساتھ ہی کابوس نما انانیت زدگی بھی جو بعض اوقات اسے انسانوں سے اتنی دور لے جاتی ہے کہ وہ جناتوں کی زبان

بولنے لگتا ہے۔ غالبؔ کو شکایت تھی کہ آدمی انسان نہیں بن پاتا۔ مگر عسکری صاحب کو شکایت ہے کہ غالبؔ انسان بھلے کو بن گیا ہو، آدمی کبھی نہیں بنا۔ مجھے بھی اس سے اتفاق ہے سوائے دو ایک غزلوں اور ''ہائے ہائے'' والے بے مثال مرثیے کے۔ البتہ نظیرؔ اپنے ابتذال کے باوجود مجھے پسند ہیں۔ ان کا انسان عوامی مزاج کا اجتماعیت پسند انسان ہے زندگی کے ہر مظہر سے لطف اٹھانے والا میلے ٹھیلوں میں گھومنے والا۔ زندگی کے ہر چھوٹے بڑے، پست و بلند تجربے کو محسوس کرنے والا، انسان کو ہر روپ میں گلے سے لگانے والا اور موت و زیست دونوں کو ایسی آنکھ سے دیکھنے والا جو کبھی کبھی خود بخود ہنسی سے چمک اٹھتی ہے اور خود بخود آنسوؤں سے ڈبڈباتی ہے۔ نظیرؔ تو اردو کا سعدیؔ ہے مگر کاش اس میں پھیلاؤ کے ساتھ شدت اور ارتکاز بھی ہوتا اور ذرا فنی ارتفاع بھی۔ اردو شاعری میں نظم نگاری کی بڑی روایت کی عدم موجودگی نے ایک بڑا آدمی ضائع کر دیا۔

لیکن اردو شاعری میں میری عقیدت کا مرکز میرؔ کا عاشق ہے کہ نامرادانہ زیست کرتا تھا اور اس کے باوجود زندگی کو انتظار کا اور موت کو زندگی کا وقفہ سمجھتا تھا۔ اس عاشق کا محبوب اور کائنات سے کیا رشتہ ہے اس پر تو پھر کبھی اور بات ہوگی لیکن عسکریؔ صاحب نے اسے ہمیں ایک اور رشتہ میں دکھایا ہے۔ یعنی ''دوسروں'' کے ساتھ! وہ دوسرے جو مومنؔ کے یہاں محبوبہ کے اعزا و اقربا ہیں۔ داغؔ کے یہاں کوٹھے والے تماشبین، حالیؔ کے یہاں سرسید کے مخالف، اور مردم گزیدگی کی شکایت کرنے والے غالبؔ کے یہاں کتے۔ میرؔ کے یہاں یہ ''دوسرے'' ہم آپ ہیں یعنی عام آدمی۔ عاشق لطافت ہے تو عام آدمی کثافت مگر میرؔ نے عام آدمی کو کیا سمجھا اور کیا بنا دیا! میرؔ کی شاعری کا نہیں میرؔ کے انسان کا کمال یہ ہے کہ لطافت و کثافت اس طرح گلے مل رہے ہیں کہ دونوں کا تعین باقی نہیں رہا۔ میرؔ کے عاشقؔ کے روپ میں انسان کی یہ تصویر اب تک اردو شاعری کی معراج ہے۔

لیکن میر انیسؔ کی شاعری کا انسان ان سب سے مختلف ہے ابھی میں کچھ دیر کے لئے یہ بھولے جاتا ہوں کہ مرثیوں کا تعلق امام حسین علیہ السلام سے ہے اور اس وجہ سے اس انسان کو میر انیسؔ کی تخلیق نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ یوں تو قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت کی الوہی صفات کا محل ظہور حضور ﷺ کے سوا کون ہو سکتا ہے اور ''سوار اشہب دوراں'' کی پکار امام مہدی علیہ السلام کے علاوہ اور کس کے لئے ہو سکتی ہے۔ تاریخی، مذہبی، اساطیری شخصیتیں جب کبھی شاعری کا موضوع بنتی ہیں

تو وہ شاعر کے تخیل سے اس طرح الگ تھلگ نہیں ہوتیں کہ انہیں اس کی خلاقیت سے بالکل الگ کر کے دیکھا جا سکے ورنہ یوں تو ہومر، ڈانٹے، دالمیک اور فردوسی سب کے سب خالی ہاتھ رہ جائیں گے۔ یہ بات ہمیں بار بار یاد دلانے کی ہے کہ شاعری بالآخر شاعر کے تجربے کے سوا اور کچھ نہیں۔ شاعر کے لئے کوئی معروضی سے معروضی واقعہ یا کردار اس طرح کی معروضیت نہیں رکھتا جس طرح مورّخ یا اخباری رپورٹر کے لئے۔ ایسی معروضیت سے تاریخ پیدا ہوسکتی ہے شاعری نہیں۔ شاعری تو ہر چیز کو داخلیت میں تبدیل کر دیتی ہے اور ہر خارجی واقعے اور کردار پر شاعر کے تجربے کا گہرا رنگ چڑھا دیتی ہے بلکہ بعض اوقات اس طرح ان کی قلبِ ماہیئت کرتی ہے کہ باہر سے وہ کچھ اور ہو کر اندر سے کچھ اور ہو جاتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی مثالیں شیکسپیئر کے ڈراموں میں ملتی ہیں جن کے ہر کردار میں شیکسپیئر زندہ اور سانس لیتا موجود ہے۔ میر انیسؔ کا موضوع امام حسینؓ ضرور ہیں لیکن یہ میر انیسؔ کے امام حسینؓ ہیں ورنہ جوشؔ کے امام حسینؓ کو دیکھئے گستاخی معاف چھوٹے موٹے جواہر لال نہرو معلوم ہوتے ہیں۔ میر انیسؔ نے واقعاتِ کربلا کو تو خیر نظم کیا ہی ہے لیکن ان واقعات میں خود میر انیسؔ کا عقیدہ، تخیل اور تجربہ یک جان ہو کر حل ہو گئے ہیں شاید خود ایک چھوٹی سی کربلا خود میر انیسؔ کے دل میں تھی جس کے بغیر یہ واقعات شاعری نہیں بن سکتے تھے لندھور بن سعدان کی داستان البتہ ہو سکتے تھے۔ اس زاویے سے میر انیسؔ کے امام حسینؓ کو ہم میر انیسؔ سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے۔ مجھے تو بعض نقادوں کے اس اعتراض پر خوشی ہوئی کہ میر انیسؔ نے امام حسینؓ کو روتے دکھایا ہے مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ امام حسینؓ روئے تھے یا نہیں لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ خود میر انیسؔ بہت سے لوگوں کی طرح رونے سے ڈرتے نہیں تھے۔ مثلاً غالبؔ کی طرح!

بہر حال میر انیسؔ کے مرثیوں میں ہم جس انسان سے دوچار ہوتے ہیں وہ غالبؔ اور اقبالؔ کے انسان سے مختلف ہے۔ اقبالؔ کے انسان کو میں نے ابھی مردِ عمل کہا ہے لیکن یہ خیال جتنا قابل قبول معلوم ہوتا ہے اتنا حقیقت کے مطابق نہیں ہے۔ اقبالؔ خود مردِ عمل نہیں تھے۔ مردِ عمل کے مداح تھے۔ اس لئے ان پر عمل کے معنی اس طرح نہ کھل سکے جس طرح گیتا کے ارجن پر کھلے ہیں۔ یہ میں گیتا اور اقبالؔ کی شاعری کا مقابلہ نہیں کر رہا ہوں مگر بعض دور کی چیزوں کو قریب رکھ دینے سے کچھ ایسی باتیں نظر آنے لگتی ہیں جو ویسے نظر نہ آتیں۔ اقبالؔ کی شاعری کے بہت سے مسئلوں کی تفہیم اقبالؔ کی اس نفسیات کو سمجھے بغیر نہیں ہو سکتی کہ وہ خود کو ایک ناکام عملی آدمی سمجھتے تھے اور یوں اپنی عملی

ناکامی کی تلافی خیالی عمل پرستی سے کرتے تھے۔ اقبالؔ کا مردِ عمل اقبالؔ کے خیال کی پیداوار ہے اس ''خیال'' کو انہوں نے شدت سے ''محسوس'' کیا ہے۔ اس میں اپنے جذبات بھی شامل کئے ہیں۔ محبت اور عقیدت کو بھی سمویا ہے۔ مگر یہ اُن کے پورے تجربے کا عکاس نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ ان کے حسّی، جذباتی، نفسیاتی تجربے کی اکائی سے نہیں پیدا ہوا۔ اقبالؔ نے اپنے اس ''خیال'' کی تجسیم حضور ﷺ کی ذات میں دیکھی ہے اور یہ ان کے عشق رسول کا سوتا ہے۔ عشق رسولؐ حالیؔ کو بھی تھا اور محسنؔ کاکوروی کو بھی۔ مگر ان دونوں نے ذاتِ اقدس میں کیا دیکھا اور وہ اقبالؔ سے کتنا مختلف اور کتنا مشابہ ہے، یہ ایک دلچسپ مطالعہ ہے جو نظیر صدیقی کر سکتے ہیں۔ خیر تو اقبالؔ کے ''خیال'' کی عظمت کو تسلیم کرنے کے ساتھ (اور یاد رہے کہ میں لفظوں کی اس بے حرمتی کے دور میں لفظ عظمت کی عصمت کا قائل ہوں) مجھے یہ چھوٹا سا اعتراض بھی ہے کہ اقبالؔ کا انسان ذہن کی پیداوار ہے اس لئے ذہن ہی کو متاثر کرتا ہے۔ پورے وجود میں نہیں اترتا۔ پتہ نہیں میری خوش خیالی ہے یا کیا ہے۔ کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبالؔ اگر اپنے الوہی صفت انسان کو گوشت پوست کا وجود دے سکتا تو شاید میر انیسؔ سے ملتی جلتی ہی کسی قسم کی شاعری پیدا ہوتی۔

لیکن غالبؔ کا انسان، میر انیسؔ سے اس لئے مختلف ہے کہ وہ ایک فردیت پرست فرد ہے اس کا ذکر میں اپنی ایک چھوٹی سی تقریر ''غالبؔ اور نیا آدمی'' میں کر چکا ہوں جو ''نئی نظم اور پورا آدمی'' میں شامل ہے۔ غالبؔ کا یہ فرد زندگی کے تمام رشتوں سے منقطع ہو کر اپنی کائنات اپنی انا سے پیدا کرنا چاہتا ہے۔ وہ نہ صرف اپنی حقیقت خود ہو جانا چاہتا ہے بلکہ ہر حقیقت کو اپنے وجود میں ضم کر لینے کا خواہش مند ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب ہمارے قدیم معاشرے کے تار و پود بکھر رہے تھے اور پرانے رشتے ٹوٹ رہے تھے غالبؔ کے انسان کا ظہور ایک معاشرتی مطالعے کا در کھولتا ہے۔ کیا یہ انسان اس بے گھر، بے در، بے خاندان انسان کی پیش گوئی نہیں ہے جسے ہم کراچی کی سڑکوں پر آوارہ پھرتے دیکھتے ہیں؟ غالبؔ کا انسان درحقیقت ہر رشتے کی نفی ہے۔ وہ خلوت کو انجمن ضرور سمجھتا ہے مگر اس انجمن میں کسی اور کو تو کیا شاید غالبؔ کے محبوب کو بھی داخلے کی اجازت نہیں ہے۔ اس انجمن کے ''حاضرین'' غالبؔ کے ''اصنام خیالی'' کے سوا اور کوئی نہیں اور اس کا صدر نشیں وہ خود ہے۔ غالبؔ کے اس انسان سے میر انیسؔ کا انسان اتنا ہی مختلف ہے جتنے قطب شمالی کے لوگ لکھنؤ سے۔

البتہ نظیؔر اور میرؔ کے انسان ضرور میر انیسؔ کے انسان کے ہمسائے معلوم ہوتے ہیں، شاید اس لئے کہ سب ایک ''روایتی'' معاشرے کے نمائندہ ہیں۔ اقبالؔ نے کہا ہے ۔ موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں، روایتی معاشرے کا فرد یہ نہیں کہہ سکتا۔ اسے کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اقبالؔ تو مچھلی کی طرح اس لئے تڑپے ہیں کہ دریا سے باہر ہیں۔ ورنہ دریا میں تو موج، مچھلی اور دریا سب ایک ہیں۔ مچھلی دریا میں ہو تو دریا میں ہونے کے فوائد بیان نہیں کرتی۔ نظیر صدیقی نے ایک مرتبہ میرے ایک مضمون پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا تھا کہ سلیم احمد فرد پرستوں کے خلاف ہیں۔ انہیں اعتراض اس پر ہوا کہ فرد پرستوں کے خلاف تو ہیں ہی، کمال یہ ہے کہ اجتماعیت پرستوں کے بھی خلاف ہیں۔ میں اس اعتراض کے بارے میں افسوس کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں کہ یہ درست ہے کیونکہ اجتماعیت پرستی، فرد پرستوں کی پریڈ کا نام ہے۔ روایتی معاشرہ نہ فرد پرست معاشرہ تھا نہ اجتماعیت پرست، یہ فطری معاشرہ تھا۔ فطری ان معنوں میں نہیں جن معنوں میں روسوؔ استعمال کرتا ہے بلکہ ان معنوں میں جن میں یونانی استعمال کرتے تھے۔ یقیناً یہ ''معاہدہ عمرانی'' کا معاشرہ نہیں تھا۔ ارسطوؔ کے دیوتا اور جانور دونوں اس معاشرے میں داخل نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ یہ رشتوں کی ہوا میں سانس لیتے انسانوں کا معاشرہ تھا۔ نظیؔر کا انسان اس معاشرے کا ایسا تماشائی ہے جیسے دریا میں کنول، میرؔ کا انسان وہ عاشق ہے جو عشق کی شدید ترین داخلیت میں معاشرے سے ٹوٹ گیا لیکن جس کی بنیادی اور حقیقی انسانیت نے اسے معاشرے سے پھر جوڑ دیا۔ ان دونوں کے مقابلے پر میر انیسؔ کا انسان وہ انسان ہے جو رشتوں کے انفاسِ تازہ سے مہک رہا ہے۔

میر انیسؔ کے انسان کو ہم اردو شاعری میں پہلی بار اس کے خاندانی رشتوں میں دیکھتے ہیں۔ یہ رشتے عملی زندگی میں جو کچھ بھی ہوں لیکن میر انیسؔ کے سوا کسی اور شاعر نے انہیں اتنے احترام، اتنی محبت، اتنے دکھ کے ساتھ نہیں دیکھا کہ وہ تخلیق کا موضوع بنتے۔ جدید تنقید میں سماجی انسان کا بہت شور مچا ہوا ہے مگر اردو میں کسی شاعر نے سماجی انسان پیش کیا ہے تو میر انیسؔ نے، یہاں انسان اپنے بنیادی ماحول میں ہے۔ باپ بیٹے، بھائی بھائی، چچا بھتیجے، ماموں بھانجے، ماں بیٹی، ساس بہو، نند بھاوج، شوہر بیوی، دوست احباب، آقا اور غلام غرض انسانی رشتے کی کون سی شکل ہے جس نے میر انیسؔ کے دل کو متاثر نہیں کیا۔ یہ رشتے تجریدی اور سوچے سمجھے نہیں ہیں۔ میر انیسؔ نے انہیں ذہن

سے پیدا نہیں کیا۔ نہ جذبات سے، یہ تو میر انیسؔ کی روح میں موجود ہیں بلکہ خود اس کے وجود کی جز ہیں۔ خاندان انسانی معاشرے کی بنیاد ہے بلکہ خود انسانیت ہے۔ خاندان کے بغیر ہم صرف وحشی کا تصور کر سکتے ہیں یا ہپّی کا۔ کنفیوشس نے تو خاندان کو اسٹیٹ سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ لیکن خاندان کو جیسا ہندوستان کی روح سمجھتی ہے شاید کوئی اور نہیں سمجھتا۔ برصغیر کی شاعری نے دو خاندان پیدا کئے ہیں ایک تو وہ جو میر انیسؔ کے مرثیوں میں ہے اور دوسرا وہ جو رامائن میں ہے۔ لچھمن سا بھائی! اللہ اکبر، اور حضرت عباسؓ کے بیان میں میر انیسؔ نے کلیجہ نکال کر رکھ دیا۔ شہر بانو سی بیوی زینبؑ سی بہن، قاسمؑ سا بھتیجا، عون ومحمدؑ جیسے بھانجے اور یہ رشتے کس دکھ سکھ کا نام ہیں اسے جیسا میر انیسؔ کے دل نے جانا کون جان سکتا ہے مجھے تو زینبؑ کے آگے اینٹی گنی بھی کچھ اتری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ وہ المیہ چاہے کتنا بھی بڑا ہو مگر بہن ذرا روکھی پھیکی ہی سی معلوم ہوتی ہے۔

لیکن میر انیسؔ کی داد میں صرف میر انیسؔ کو نہیں دوں گا۔ اس میں ان کا ایک اور شریک بھی ہے جس کے بغیر میر انیسؔ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اردو زبان ــــ اردو زبان بنیادی طور پر انسانی رشتوں کی زبان ہے۔ بہت دنوں سے یار لوگ چلّا رہے ہیں کہ اردو فلسفہ اور سائنس کے مسائل کے اظہار پر بھی قدرت رکھتی ہے۔ یقیناً رکھتی ہے اور بڑی خوشی کی بات ہے، اور نہیں رکھتی تو جامعہ کراچی کا شعبۂ تراجم اسے اس قابل بنا دے گا مگر اردو زبان سچ مچ جن چیزوں کے اظہار پر ایسی قدرت رکھتی تھی کہ دنیا کی دوسری زبانیں عش عش کر اٹھیں انہیں تو ہم آپ بھی بھول گئے۔ خدا غالبؔ کا بھلا کرے اس نے اردو کو مالا مال تو کر دیا مگر اس سے اس کی انسانیت چھین لی۔ رہی سہی کسر اس جدید معاشرے نے پوری کر دی جس میں نیاز فتحپوری جیسوں کو ادیب سمجھا جاتا تھا۔ اب تو کوئی آدمی کی طرح بولتا ہی نہیں۔ میں بھی بولتا ہوں تو بعض اوقات شرم آتی ہے کہ میری ماں کیا سوچتی ہوگی۔ اردو زبان ''خاندان'' کی زبان تھی۔ انسانی رشتوں کی شوخیوں اور رنگا رنگیوں، خوشیوں اور دکھوں، قربتوں اور فاصلوں کے اظہار کے جتنے انداز، اسالیب اور لب ولہجے اردو میں ملتے ہیں اس کے بغیر میر انیسؔ شاعری کر ہی نہیں سکتے تھے۔ انسانی رشتوں کی شاعری اردو کو انیسؔ کی دین ہے اور خود انیسؔ شاعری کو اردو کی دین ہے۔ میر انیسؔ کی شاعری میں میر انیسؔ نہیں بولے ہیں خود اردو زبان بولی ہے۔ وہ معاشرہ بولا ہے جس نے اردو زبان پیدا کی ہے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ شاعری کی دیوی اردو زبان

میں اپنی روح بھرے تو وہ کس کی شاعری ہوگی۔ فراقؔ کا خیال ہے کہ میرؔ کی۔ میں میرؔ کے ساتھ میر انیسؔ کا نام بھی لے سکتا ہوں۔

میر انیسؔ پر ایک اعتراض یہ ہے کہ وہ بین کراتے ہیں اور مرثیے کا بیڑہ غرق ہو جاتا ہے۔ اعلیٰ فن کی باتیں تو ڈاکٹر احسن فاروقی جانیں۔ لیکن ذرا کوئی صاحب خود اپنے گھر میں خاندان والوں کو جمع کر کے مرثیہ پڑھ کر دیکھیں۔ پتہ چل جائے گا کہ مرثیہ کے آخر میں بین کیا چیز ہے۔ کلاسوں میں لیکچر جھاڑنے کی تو اور بات ہے مگر میں نے بعض بڑی مہذّب مجلسوں میں بین کا اثر خود دیکھا ہے البتہ یہ صحیح ہے کہ میر انیسؔ جہاں تہاں کبھی صرف ایک شعر میں، کہیں صرف ایک مصرعے میں، کہیں صرف ایک لفظ میں جتنا درد بھر دیتے ہیں وہ پورے بین کو میسر نہیں ہوتا۔ یہ مصرعے، مرثیے میں اچانک اس طرح آتے ہیں جیسے کسی ہنستے بچے کی آنکھ میں آنسو، مگر میر انیسؔ کا فن اس وقت اپنے کمال پر پہنچ جاتا ہے جب وہ صرف لہجے سے تڑپا دیتا ہے مثال کے لئے کبھی حضرت علی اکبرؑ اور عونؑ ومحمدؑ سے جناب زینبؑ کے بعض مکالمے دیکھیے۔ میر انیسؔ کے کمال فن کی بات آئی ہے تو اس پر حرف آخر مولانا شبلیؔ نے لکھ دیا۔ میں نہ صنائع بدائع کے نام جانتا ہوں نہ علم بلاغت کی اصطلاحات کا۔ لیکن کبھی کبھی میر انیسؔ کا ایک لفظ بڑی بڑی داستان سرائیوں پر بھاری معلوم ہوتا ہے۔ بالخصوص ایسے چھوٹے چھوٹے الفاظ جیسے ''کیا''، ''کہاں''۔ آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے۔ شیفتہؔ جیسے سخن فہم نے کیا خوب کہا کہ مرثیہ ختم ہوگیا۔ اب اس ''کیا'' کے بعد کوئی کیا کہے گا۔ اور وہ مصرعہ جس کی یاد دہانی کے لئے جدید اردو ادب قرۃ العین حیدر کا ممنونِ احسان ہے۔ چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے۔ ایک جگہ حضرت حُر کی زبان سے دم مرگ ''کچھ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ''کچھ اڑھا دیجئے مولا! مجھے نیند آتی ہے'' اور ذرا اس نیند کو دیکھئے گا۔ یہ موت ہے اور اسے انیسؔ نے کیا بنا دیا ہے۔

خیر ذکر تھا انسان کی تعریف کا۔ میر انیسؔ کے نزدیک انسان خاندانی رشتوں کا نام ہے۔ لیکن میر انیسؔ جس خاندان کو پیش کرتے ہیں اس میں معنویت کی کئی تہیں ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ میر انیسؔ کا اپنا خاندان ہے اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے شاید مظفر علی سیّد نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ حضرت عباسؑ کے المیے میں میر انیسؔ کے اپنے بھائی کا المیہ بھی شامل ہے۔ میر انیسؔ کے خاندانی

حالات سے مجھے واقفیت نہیں مگر ذاتی تجربے کے بغیر ایسی شاعری ہو ہی نہیں سکتی۔ دوسری سطح پر یہ ہمارا آپ کا خاندان ہے۔ ''دل صاحبِ اولاد سے انصاف طلب ہے'' جیسے مصرعوں کے معنی یہ ہیں کہ باکمال فنکار اپنی تخلیق میں عام لوگوں کے تجربات کو بھی شریک کر رہا ہے۔ بھائی حضرت عباسؑ میں اپنا نمونہ پائیں گے۔ بھتیجے حضرت قاسمؑ میں۔ بھانجے عونؑ و محمدؑ میں، بہنیں اور پھپیاں جناب زینبؑ میں اور انیسؔ اپنے قلم کی بے پناہ جنبشوں سے کیسے کیسے رنگ، سائے اور درد اُبھارتا چلا جاتا ہے۔ تیسری سطح پر یہ خاندان کل انسانی تاریخ پر محیط ہے۔ یہ بھی نوعِ آدم کا خاندان ہے جس کے ٹھیٹھ انسانی تجربات پر انیسؔ کی شاعری میں اس طرح ظاہر ہوئے ہیں جیسے آئینے میں عکس۔ اور چوتھی سطح پر یہ خاندان، خاندانِ رسالت ہے۔ وہ خاندان جو خود آیت الٰہی ہے۔ میر انیسؔ نے مرثیہ کے کردار نہیں لکھے۔ آیات قرآنیہ کی تفسیر لکھی ہے جن کا جامع قرآن ناطق کا نواسہ ہے سب اس کے رشتوں میں بندھے ہیں اور وہ صرف ایک رشتے میں۔ خدا کا رشتہ۔ اب انسان ایک رشتہ ہے اللہ اور عیال اللہ کے درمیان۔ میر انیسؔ اس انسان کی روح کا اردو شاعری میں سب سے بڑا ترجمان ہے۔

میں نے میر انیسؔ کی شاعری پر اس سے پہلے کچھ نہیں لکھا۔ یہ مضمون بھی فرمائشی ہے ایک اتنی سی بات مجھے یہ احساس دلانے کے لئے کافی ہے کہ ہم میر انیسؔ کی شاعری، خود اپنے خاندان اور انسانی رشتوں کو کتنا پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ جدید دنیا ہر رشتے سے کٹے ہوئے ایک تنہا انسان کی دنیا ہے جو دوسروں کو ''جہنم'' سمجھتا ہے اور ان کی طرف اگر کبھی متوجہ بھی ہوتا ہے تو یا تو استحصال کے لئے یا رعب جھاڑنے کے لئے۔ اس دنیا میں تو غالبؔ ہی کی شاعری چل سکتی ہے!۔

ضمیر اختر نقوی

حسینؑ اور نماز میر انیسؔ کی نظر میں

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبعوث برسالت ہونے کا مقصدِ اوّلین خدائے بزرگ و برتر کی توحید والوہیت کی نشرواشاعت ہے اور اس کا بہترین طریقہ صلوٰۃ یعنی نماز ہے۔ انسان اپنے سر و گردن و جسم کو بحالتِ نماز حرکت دے کر اور اپنی پیشانی خاک پر رکھ کر یہ ظاہر کرتا ہے کہ خدائے قدوس وحدہٗ لاشریک لہٗ کا پرستار ہے۔ خداوند عالم نے اپنے مقدس کلام میں تقریباً پچھتر مقامات پر عبادت و نماز بجالانے کا حکم دیا ہے اقامہ صلوٰۃ کی بار بار تاکید آئی ہے۔ ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے واقیموا الصلوٰۃ ولاتکونوا مِن المشرکین ۔نماز کو قائم کرو اور مشرک نہ بنو۔ بالفاظ دیگر نماز مسلم و کافر اور مومن و مشرک کے مابین حدِ فاصل اور مابہ الامتیاز ہے۔ نماز پڑھنے والے پر کافر و مشرک کا اطلاق نہیں ہوسکتا اور بے نماز و مشرک میں بظاہر کوئی فرق نہیں۔ لہٰذا کفر و شرک کی نجاست سے بچنے کا واحد ذریعہ نماز ہے جو اسلام کا طرۂ امتیاز اور ایمان کا زیور ہے اسلام چونکہ قولی مذہب نہیں بلکہ فعلی مذہب ہے لہٰذا بانیٔ اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز کو قائم و برقرار رکھنے میں بے حد سرگرمی وانہماک کا مظاہرہ فرمایا ہے۔ حضور ﷺ نے خدا کی عبادت اس طرح کی ہے کہ آپ ﷺ کے پاؤں متورم ہوگئے اور خدا کو ان الفاظ میں خطاب کرنا پڑا ما انزلنا علیک القرآن لتشقیٰ ۔

اے طبیب وطاہر، اے پاک وپاکیزہ بندے! ہم نے تم پر قرآن اس لئے نازل نہیں کیا کہ تم اقامہ دین اور قامۂ الصلوٰۃ میں اس قدر تکلیف ومحنت برداشت کرو۔ دوسرے مقام پر خدا نے اپنے حبیبِ خاص محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عبادت کی تعریف وتوصیف کرتے ہوئے اپنی خوشنودی اور رضامندی کا تمغہ ان الفاظ میں مرحمت فرمایا ہے ''یا ایھا المزمل قم اللیل الا قلیلا ''۔ یعنی اے کالی کملی اوڑھنے والے محبوب سبحان اللہ کیا پیارا اندازِ تخاطب ہے) تم ساری ساری رات عبادت میں نہ کھڑے رہا کرو۔ کچھ وقت آرام کیلئے بھی رکھ لو۔ المختصر سرکار رسالت ﷺ جس پابندیٔ وقت سے نماز ادا کرتے رہے اور مسلمانوں کو بہ پابندی وقت ادا کرنے کی تاکید فرماتے رہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ حقیقتاً نماز حسنات کی اساس اور اعمال کا خلاصہ ہے۔

جناب رسول خدا ﷺ کے بعد ہم حضرت علیؑ ابن ابی طالب علیہ السّلام کی عبادت اور نماز گزاری کی طرف نگاہ دوڑاتے ہیں تو یہاں استغراق ومحویت کا ایک عالم پاتے ہیں۔ امیرؑ المومنین کے پائے اقدس میں تیر لگتا ہے جس کے نکالنے پر حضورؑ تکلیف اور اذیت محسوس کرتے ہیں لیکن جب آپؑ محرابِ عبادت میں مشغول ہوتے ہیں تو آپؑ پر اس قدر خشوع وخضوع اور فنافی اللہ کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے کہ آپؑ کے پاؤں سے تیر نکال لیا جاتا ہے اور آپؑ ذرّہ برابر بھی اذیت محسوس نہیں کرتے سبطِ اکبر حضرت امام حسن علیہ السّلام جب نماز پڑھنے کے لئے تیار ہوتے تھے تو آپؑ کا رنگ زرد ہوجاتا تھا اور آپؑ کا بند بند کانپنے لگتا تھا اگر کوئی پوچھتا تو آپؑ ارشاد فرماتے تھے کہ ایک عبد ذلیل معبود جلیل کے دربار میں حاضر ہوتا ہے۔ لیکن اقامہ الصلوٰۃ کے سلسلے میں حضرت امام حسین علیہ السّلام اور آپؑ کے رفقاء واصحاب وانصار نے میدان کربلا میں سرگرمی اور انہاک و رجوع قلب اور دلی اشتیاق کا شاندار مظاہرہ کیا ہے اس کی نظیر ومثال ناممکنات میں سے ہے۔ امام حسینؑ کے اصحاب بہترین اطاعت گزار عابد وزاہد اور متقی، راکع، ساجد، عشق الٰہی میں سرشار تھے ایسے نمازی چشم فلک نے نہ آج تک دیکھے نہ آئندہ دیکھنے میں آئیں گے۔ میر انیسؔ نے کیا خوب کہا ہے ؎

دنیا سے اُٹھ گیا وہ قیام اور وہ قعود — ان کے لئے تھی بندگیٔ واجب الوجود
وہ عجز وہ طویل رکوع اور وہ سجود — طاعت میں نیست جانتے تھے اپنی ہست وبود

طاقت نہ چلنے پھرنے کی تھی ہاتھ پاؤں میں
گر گر کے سجدے کر گئے تیغوں کی چھاؤں میں

چاہتا ہوں کہ اقامۃ الصلوٰۃ کے چار مناظر میر انیسؔ کے کلام سے پیش کروں تا کہ اس عظیم شاعر کی فکر و مشاہدے کا اندازہ ہو سکے کہ میر انیسؔ نے کربلا کے ایک ایک منظر کے جزئیات کو پیش کر کے ہم کو عبادت خدا کا شوق دلایا ہے اور ان مقدس بزرگواروں کے اوصاف کی جھلک ہمارے دلوں میں رونما کرنے کی کوشش کی ہے۔

منظر اوّل۔۔۔۔۔۔شب عاشورہ

نویں محرم کو عمر بن سعد کے نام عبیداللہ بن زیاد کا خط پہنچا ہے جس پر صلح کی تمام امیدیں منقطع ہو گئیں اور عمر سعد نے جنگ کی تیاری شروع کر دی اور امام مظلوم پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا عصر کا وقت تھا اور امام خیمہ کے دروازہ پر تلوار کا سہارا لئے گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھے تھے اور کچھ غنودگی بھی طاری تھی کہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز جناب زینب سلام اللہ علیہا کے کان میں آئی۔ آپ بے تابانہ اپنے محبوب بھائی امام حسینؑ کے قریب آئیں اور کہا۔ بھیا! دشمن کے لشکر کی آواز بہت قریب سے آ رہی ہے۔ امام حسینؑ نے تسکین دی اور اس کے بعد امام حسینؑ نے عباس علمدار سپاہ حسینی کو بلا کر فرمایا جاؤ اور ان سے پوچھو کہ اس وقت حملے کا کیا باعث ہے۔۔ جناب عبّاس گئے اور واپس آ کر عرض کی یا مولا یہ لوگ کہتے ہیں کہ ابن زیاد کا حکم آیا ہے کہ یا حسین بیعت کریں یا جنگ کے لئے تیار ہو جائیں۔ حضرتؑ نے فرمایا جاؤ اور ان سے ایک شب کی مہلت طلب کرو عمر سعد نے قدرے پس و پیش کے بعد مہلت دیدی امام مظلوم نے ایک شب کی مہلت اس لئے نہیں مانگی کہ لڑائی کے لئے تیاری کی جائے بلکہ اس لئے کہ دل بھر کر خدا کی عبادت بجا لائیں اور طاعتِ وعبادتِ خدا سے رخصت و وداع ہو لیں یہ تمام شب امام نے اور آپؑ کے اعزہ و اصحاب نے عبادت و طاعتِ خدا میں بسر کی۔ رجوع قلب سے نمازیں پڑھیں تکبیر و تہلیل و تحمید و تقدیس اور تسبیح کی صدائیں اس سنسان جنگل اور لق و دق صحرا میں اس طرح گونج رہی تھیں جس طرح شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی آواز ہوتی ہے۔ ان مجاہدینِ راہِ خدا کو زندگی کی حسرت نہ تھی بلکہ اس بات کی حسرت تھی کہ افسوس اب یہ عبادت نصیب نہ ہوگی۔ محبوب کی یاد وصال محبوب سے زیادہ طرب انگیز اور لذت بخش ہوتی ہے۔ اس نکتہ کو پرستارانِ عشق و محبت ہی سمجھ سکتے ہیں، عارفوں اور عابدوں سے پوچھیئے کہ عبادت میں کیا مزا ملتا ہے میر انیسؔ فرماتے ہیں کہ شبِ عاشور امام حسینؑ نے اپنے اصحاب کو یوں مخاطب کیا:۔

فرمایا بڑا اجر ہے بیداریٔ شب کا
اے تشنہ لبو وقت ہے یہ طاعتِ رب کا

اب عمر بھی آخر ہے نمازیں بھی ہیں آخر　　بے توشہ پہنچتا نہیں منزل پہ مسافر
ہر وقت ہے رب دو جہاں حاضر و ناظر　　اجران کا مضاعف ہے جو ہیں صابر و شاکر
مشکل نہ کسی رنج کو سمجھے نہ بلا کو
بندہ وہی بندہ ہے جو بھولے نہ خدا کو

نام اس کا رہے ورد، سفر ہو کہ حضر ہو　　موجود سمجھ لے اسے جنگل ہو کہ گھر ہو
سجدے ہی کرے دکھ میں کہ راحت میں بسر ہو　　تسبیح میں شب ہو تو نمازوں میں سحر ہو
عشق گل تر ظلم کے خاروں میں نہ بھولے
معشوق کو تلواروں کی دھاروں میں نہ بھولے

شہ نے سخن معرفتِ حق جو سنائے　　اشک آنکھوں میں ہر عاشق صادق کے بھر آئے
کچھ پیاس کا شکوہ بھی زباں پر نہیں لائے　　سجّادے وہیں لا کے دلیروں نے بچھائے
تکبیریں ہوئیں لشکر اللہ و نبیؐ میں
سب محو ہوئے یاد جناب احدی میں

تسبیح کہیں تھی کہیں سجدے کہیں زاری　　تھا صوتِ حسن سے کوئی قرآن کا قاری
کرتا تھا کوئی عرض کہ یا حضرت باری　　اب صبح کو عزت ہے ترے ہاتھ ہماری
حرمت سے شریک شہدا کیجیو! یا رب!
تو حوصلۂ صبر عطا کیجیو! یا رب!

منظر دوم۔۔۔۔نماز صبح

یہ عبادت گزار بندے تمام شب عاشورہ اوراد و وظائف اور دعا و مناجات میں مشغول و منہمک رہے کہ سپیدہ سحر نمودار ہوا اور صبح صادق کا وقت طلوع ہوا۔ نماز صبح پڑھنے کے لئے صفیں تیار ہو گئیں اور امام حسینؑ نے اپنے اصحاب کے ساتھ نماز باجماعت ادا کی۔

میر انیسؔ نے نماز صبح کے منظر کو بہت اہتمام سے نظم کیا ہے اور تقریباً ۵ مرثیوں میں تفصیل کے

ساتھ اس منظر کو پیش کیا گیا ہے۔ میر انیسؔ نے اپنے لئے کہا تھا۔

"اک پھول کا مضموں ہو تو سَو رنگ سے باندھوں"

منظر ایک ہی ہے لیکن میر انیسؔ کا کمالِ فن ہے کہ ہر مقام پر مختلف رنگ سے پیش کیا ہے۔ صبح عاشورہ اذان ہم شکل پیغمبرؐ جناب علی اکبرؑ نے دی:-

جب رات عبادت میں بسر کی شہ دیں نے　سجدوں میں مہم عشق کی سر کی شہ دیں نے
دیکھا جو سپیدی کو سحر کی شہ دیں نے　مڑ کر رُخ اکبرؑ پہ نظر کی شہ دیں نے
فرمایا سحر قتل کی ظاہر ہوئی بیٹا
لو اٹھ کے اذاں دو کہ شب آخر ہوئی بیٹا

سجدوں سے نمازوں سے یہ رفعت کی سحر ہے　رونے کی تذلل کی عبادت کی سحر ہے
پیارے یہ سحر رنج و مصیبت کی سحر ہے　عاشورِ محرّم ہے شہادت کی سحر ہے
لٹنے کا تباہی کا پریشانی کا دِن ہے
اولاد پیمبرؐ کی یہ قربانی کا دِن ہے

یہ کہہ کے بڑھے بہر تیمّم شہ صفدر　جنگل میں اذاں دینے لگا دلبر سرور
وہ صوتِ حسن اور وہ خوش الحانی اکبرؑ　ہر شخص کو یاد آگئی آواز پیمبرؐ
ہر نخل کو اک وجد تھا اس ظلم کے بن میں
تھا بلبل حق گو کہ چہکتا تھا چمن میں

آگے تھے عبا اوڑھے ہوئے شاہِ حجازی　پیچھے تھے صفیں باندھے ہوئے سارے نمازی
ابرار جہاں فخر زماں صفدر و غازی　تھی اُن پہ خدا کو نظرِ بندہ نوازی
دنیا میں یہ رُتبے نہ کبھی ہوں گے کسی کے
معراج میں تھے ساتھ حسینؑ ابن علیؑ کے

امام حسینؑ نے حضرت علیؑ اکبرؑ کو مخاطب کر کے کہا بیٹا تم اذان دو۔ اس کی بھی ایک وجہ تھی جب حضرت علی اکبرؑ میدان قتال میں جانے کے لئے رخصت ہو رہے تھے تو اس وقت امام حسینؑ نے ارشاد فرمایا تھا "اللھم اشهد علی ھولاءِ القوم فقد برز الیھم فتٰی اشبه الناس خَلقاً وخُلقاً ومنطقاً برسولك وكُنّا اذا اشتقنا الیٰ نبیك فنظرنا الیٰ وجهه"

''خداوندا گواہ رہنا اس قوم کے ظلم وستم پر کہ اب ان کی طرف وہ جوان جاتا ہے جو صورت و سیرت رفتار اور گفتار میں تیرے محبوب رسولؐ سے مشابہ ہے جب ہم نانا کی زیارت کے مشتاق ہوتے تو علی اکبرؑ کے چہرے کو دیکھ لیا کرتے تھے۔'' اس ارشاد امامؑ سے معلوم ہوتا ہے کہ علی اکبرؑ کی آواز رسول ﷺ کی آواز سے مشابہ تھی اس لئے امام حسینؑ نے نوجوان فرزند علی اکبرؑ کو اذان کے لئے مامور کیا تا کہ ایک طرف تو اہلِ حرم آخری بار ہم شکل رسول ﷺ کی آواز سن لیں اور دوسری طرف نام نہاد مسلمانوں کو جو آپ کے قتل پر آمادہ اور تیار ہیں۔ رسول یاد آئیں اور اس بات کا احساس ہو جائے کہ رسول ﷺ کی آخری یادگار ہیں۔ جناب علی اکبرؑ کی اذان کا منظر میر انیسؔ نے اس طرح دکھایا ہے کہ پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے منظر وہی ہے رنگ بدلا ہوا ہے۔

ناگاہ چرخ پر خط ابیض ہوا عیاں　　تشریف جا نماز پہ لائے شہ زماں
سجادے بچھ گئے عقب شاہِ انس و جاں　　صوتِ حسن سے اکبرؑ مہرو نے دی اذاں
ہر اک کی چشم آنسوؤں سے ڈبڈبا گئی
گویا صدا رسولؐ کی کانوں میں آ گئی

اذان کا اثر:-

چُپ تھے طیور، جھومتے تھے وجد میں شجر　　تسبیح خواں تھے برگ و گُل و غنچہ و ثمر
محو ثنا کلوخ و بناتات و دشت و در　　پانی سے منھ نکالے تھے دریا کے جانور
اعجاز تھا کہ دلبر شبیرؑ کی صدا
ہر خشک و تر سے آتی تھی تکبیر کی صدا

اذان سُن کر اہلبیت کی کیا حالت ہوئی:-

ناموسِ شاہ روتے تھے خیمے میں زار زار　　چپکی کھڑی تھی صحن میں بانوئے نامدار
زینب بلائیں لے کے یہ کہتی تھی بار بار　　صدقے نمازیوں کے، موذن کے میں نثار
کرتے ہیں یوں ثنا و صفت ذوالجلال کی
لوگو! اذاں سنو مرے یوسف جمال کی

یہ حُسن صوت اور یہ قرأت یہ شد و مد　　حقا کہ افصح الفصحا ہے انھیں کا جد
گویا ہے لحن حضرتِ داؤدِ باخرد　　یا رب رکھ اس صدا کو زمانے میں تا ابد

شبے صدا میں پنکھڑیاں جیسے پھول میں
بلبل چہک رہا ہے ریاض رسول میں

کسی نے دوسرے مصرعہ کی اس قدر بلیغ تشریح میر انیسؔ کے ایک اور مصرع سے استدلال کے ساتھ کی تھی کہ تعریف نہیں کی جاسکتی۔ میر نیسؔ کا مصرع ہے:-

''پانچوں حواس آپ یہاں بے حواس ہیں''

مندرجہ بالا مصرعے کی روشنی میں اب یہ مصرع ملاحظہ ہو۔

''شبے صدا میں پنکھڑیاں جیسے پھول میں''

انہوں نے کہا تھا کہ آواز کے اتار چڑھاؤ یا امواج صوت کو ظاہر کرنے کے لئے قوسوں کی اشکال سے مدد لی جاتی ہے جسے میر انیسؔ نے پھول کی پنکھڑیوں سے تشبیہہ دی ہے اب اس تشبیہہ میں لطف یہ ہے کہ اس آواز سے پانچوں حواس لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ آواز پھول کی پنکھڑی ہے اسے سونگھیئے تو اس میں خوشبو ہے، دیکھئے تو رنگ ہے چھوئیے تو نرمی اور ملائمت ہے سنیئے تو کان میں رس گھل جائے اور چکھیئے تو مٹھاس موجود۔ یہ تو اتفاقاً ایک تذکرہ آ گیا گفتگو امام حسینؑ کی نماز صبح کی ہے امام حسینؑ اور اصحاب محرم کی ۷ تاریخ سے پیاسے تھے وضو کرنے کے لئے پانی نہیں تھا۔

تیمّم:-

پانی نہ تھا وضو جو کریں وہ فلک جناب   پر تھی رخوں پہ خاک تیمم سے طرفہ آب
باریک ابر میں نظر آتے تھے آفتاب   ہوتے ہیں خاکسار غلام ابوتراب
مہتاب سے رخوں کی صفا اور ہوگئی
مٹی سے آئنوں پہ جلا اور ہوگئی

اقامت:-

صف میں ہوا جو نعرۂ قدقامت الصلوٰۃ   قائم ہوئی نماز اٹھے شاہ کائنات
وہ نور کی صفیں وہ مصلّی ملک صفات   قدموں سے جن کے ملتی تھی آنکھیں رہ نجات
جلوہ تھا تابہ عرش معلا حسینؑ کا
مصحف کی لوح تھی کہ مصلا حسینؑ کا

نماز جماعت:-

قرآن کھلا ہوا کہ جماعت کی تھی نماز　　بسم اللہ جیسے آگے ہو یوں تھے شہ حجاز
سطریں تھیں یا صفیں عقب شاہ سرفراز　　کرتی تھی خود نماز بھی ان کی ادا پہ ناز
صدقے سحر بیاض پہ بین السطور کی
سب آیتیں تھیں مصحف ناطق کے نور کی

باہم مکبّروں کی صدائیں وہ دلپسند　　کرّوبیانِ عرش تھے سب جن سے بہرہ مند
ایماں کا نور چہروں پہ تھا چاند سے دو چند　　خوف خدا سے کانپتے تھے سب کے بند بند
خم گردنیں تھیں سب کی خضوع و خشوع میں
سجدوں میں چاند تھے مہ نو تھے رکوع میں

دعائے قنوت:-

ہاتھ ان کے جب قنوت میں اٹھے سوئے خدا　　خود ہوگئے فلک پہ اجابت کے باب وا
تھرائے آسمان بلا عرش کبریا　　شہپر تھے دونوں ہاتھ پئے طائر دعا
وہ خاکسار محو تضرع تھے فرش پر
روح القدس کی طرح دعائیں تھیں عرش پر

تیمم، اذان، اقامت، نیت، تخشع، تضرع، قیام، قعود، رکوع، سجود، قنوت، تشہد، سلام، درود، دعائیں، تسبیح، غرض تمام ارکانِ نماز کو میر انیس نے شاعری کا جزو بنا دیا۔ یہ بات اُردو کے کسی شاعر کے یہاں نہیں ہے۔

منظر سوم۔۔۔۔نماز ظہر

زوال آفتاب ہو رہا ہے۔ امام حسینؑ معہ اپنے اصحاب جانثار کے عروس شہادت سے ہمکنار ہونے کے لئے آمادہ ہیں آپؑ کے صحابی ابوثمامہ صیداوی رضی اللہ تعالیٰ علیہم آگے بڑھتے ہیں اور امام حسینؑ سے عرض کرتے ہیں۔ مولا! زوال آفتاب ہوگیا ہے اور نماز ظہر کا وقت ہے، میں اس بات کا مشتاق و متمنی ہوں کہ نماز ظہر آپؑ کے اقتداء میں باجماعت پڑھ کر خدا کے حضور میں پہنچوں۔ امام حسینؑ نے آسمان کی طرف نگاہ کی اور فرمایا بے شک نماز کا اوّل وقت ہے ذکــــــــرت الصلوة جعلك الله من المصلين.

اے ابوثمامہ۔ اس وقت جو تم نے نماز یاد دلائی ہے خدا تمہیں نماز گزاروں میں محشور فرمائے اس کے بعد امام حسینؑ نے فرمایا کہ جاؤ دشمن سے نماز کی مہلت مانگو لیکن دشمن نے نماز کی مہلت نہ دی اور

جنگ جاری رکھنے کا حکم دیا۔امامؑ کے دو صحابی آگے بڑھ کر عرض کرتے ہیں یا مولا آپ نماز پڑھایئے ہم آپ کی حفاظت کریں گے چنانچہ صحابۂ کرام نے نماز کی صف باندھی امامؑ نے نماز شروع کی اور دو صحابی سینہ سپر ہو کر کھڑے ہوگئے امام حسینؑ نماز پڑھتے رہے جو تیر آ رہا تھا وہ جاں نثار صحابی اپنے سینوں پر لیتے رہے ادھر نماز ختم ہوگئی ادھر ایک صحابی امام کی اور نماز کی حفاظت کرتا ہوا درجۂ شہادت پر فائز ہوگیا۔ اگرچہ یہ صحابی شریک نماز باجماعت نہ تھے چونکہ انہوں نے نماز اور نمازیوں کی حفاظت کی لہٰذا یہ بھی نماز گزاروں میں محشور ہوں گے۔ اللہ اللہ کس شان کے یہ نمازی تھے کہ تیروں کی بوچھار میں نماز حق ادا فرمائی۔ میر انیسؔ نے اس پورے واقعہ کو ایک مرثیے میں نظم کیا اور نمازِ شبِ عاشور، نمازِ صبحِ عاشور کی طرح نماز ظہر کو بھی تفصیل کے ساتھ پیش کیا۔

آیا زوال رن میں جو مہر منیر پر — غم کا فلک گرا شہِ گردوں سریر پر
نرغہ تھا شامیوں کا جہاں کے امیر پر — پڑتی تھی تیغ تیغ پہ اور تیر تیر پر
مرنے لگے رفیق شہِ کم سپاہ کے
دن ۱ بین ۲ تارے رہ گئے ہمراہ ماہ کے

واں ہل رہی تھی نالۂ شہنا سے سب زمیں — فکرِ نماز ظہر میں تھے یاں امامِ دیں
تھے منحرف جو قبلۂ ایماں سے وہ لعیں — غل اقتلو الحسینؑ کا کرتے تھے اہل کیں
دشمن تھی سب سپاہ شہِ سرفراز کی
ملتی نہ تھی امام کو مہلت نماز کی

بڑھ کر ابو ثمامہ نے اس دم کیا خطاب — اے ظالمو نہ خانۂ دیں کو کرو خراب
ہے کون سی خطا کہ جو ہو مانعِ ثواب — شہ کو نماز پڑھنے کی مہلت دو اب شتاب
مارو نہ تیر ربِّ دو عالم کے واسطے
تیغوں کو کرلو میان میں اک دم کے واسطے

تیوری چڑھا کے ابنِ انس نے یہ تب کہا — کیسی نماز کہتے ہیں کیا شاہِ کربلا
مانیں گے ہم کبھی نہ یہ باتیں دمِ دغا — کچھ ہو مگر بچے گا نہ فرزندِ مرتضیٰ
پوچھو کہ بندگی سے انہیں کیا حصول ہے
اس وقت کی نماز بھلا کب قبول ہے

تھرا گئے یہ سُن کے شہِ عرش بارگاہ روکر عجیب یاس سے گردوں پہ کی نگاہ
حق سے دعا یہ کی کہ الٰہی تو ہے گواہ ایذا ترے حسینؑ کو دیتے ہیں روسیاہ
ناحق ستاتے ہیں دلِ زہراؑ کے چین کو
ملتی نہیں نماز کی مہلت حسینؑ کو

مولا کی اس فغاں سے ہلا آسمانِ پیر بولے یہ دست بستہ زُہیر فلک سریر
حضرت پڑھیں نماز ستاتے ہیں گو شریر روکوں گا اپنے تن پہ میں زخمِ سنان و تیر
ٹوکے، یہ کیا مجال کسی پر غرور کی
تیغوں میں اب غلام سپر ہے حضور کی

اُس باوفا کا جب یہ سخن آپ نے سنا فرمایا اے زہیرِ خوش انجام مرحبا
اس امر خیر کی تجھے اللہ دے جزا تجھ کو لکھے نماز گزاروں میں کبریا
جنّت سے فاطمہ ترے لاشے پہ آئیں گی
حوریں تجھے شراب طہورا پلائیں گی

یہ کہہ کے شاہ محوِ عبادت ہوئے ادھر وہ دونوں شیر سامنے آکر بنے سپر
جب تک نماز پڑھتے رہے شاہ بحروبر سرکے نہ ان کے پاؤں خوشا دل زہے جگر
کچھ پہلے زخم کھائے تھے کچھ تیر پھر پڑے
شہ پڑھ چکے نماز تو وہ شیر گر پڑے

پہنچے ریاضِ خلد میں جس دم وہ تشنہ کام پھر تو ملی نہ عصر تلک مہلت کلام
ہونے لگا قلم چمنِ سرورِ انام قاسمؑ رہے نہ حضرتِ عباسؑ نیک نام
سب کارواں گیا شہ دلگیر رہ گئے
نالاں جرس کی طرح سے شبیرؑ رہ گئے

منظر چہارم۔۔۔۔نماز عصر

امام حسین! کے تمام اصحاب باوفا نصرت کرتے ہوئے باری باری شہید ہوکر اعلیٰ علیین میں جا پہنچے۔ آپ کے بھائی۔ بیٹے۔ بھتیجے اور بھانجے بھی جو وجاہت وشجاعت اور تقویٰ وطہارت میں

یگانۂ روزگار تھے درجۂ شہادت پر فائز ہو گئے۔ اب وہ وقت آ گیا کہ میدان میں امام حسینؑ یکہ وتنہا رہ گئے تمام جسم تلواروں، نیزوں اور بھالوں کے زخموں سے شگافتہ تھا اور نیزوں سے تمام بدن زخمی ہو رہا تھا۔ امامؑ نے اس عالم تنہائی میں جانب آسماں نگاہ اٹھائی ہنگام عصر تھا۔ تلوار نیام میں رکھ لی۔ میر انیسؔ نے اس واقعہ کو نظم کرتے ہوئے بڑے دردناک انداز میں اشعار کہے ہیں۔

فاقے میں دیر تک جو لڑے شاہ تشنہ کام — غرقِ عرق تھے کانپ رہا تھا بدن تمام
ہاتھوں سے چھوڑ دی تھی جو راہوار کی لگام — آنکھیں تھیں بند ہانپتا تھا اسپِ تیزگام
غش میں سوارِ دوشِ نبیؐ کا یہ حال تھا
بے تھامے خود فرس سے اترنا محال تھا

دیکھا جو یہ کہ بھاگ گئے رن سے حیلہ ساز — تلوار رکھ کے میان میں بولے شہ حجاز
مہلت ہے اے حسینؑ پڑھو عصر کی نماز — یہ آخری ہے بندگئ ربِ بے نیاز
فکرِ نجاتِ امتِ خیر البشر کرو
سوکھی زباں کو ذکرِ الٰہی سے تر کرو

ناگاہ سوئے لاشِ پسر جا پڑی نظر — چلائے دل کو تھام کے سلطانِ بحروبر
اکبرؑ اٹھو کہ گھوڑے سے گرتا ہے اب پدر — سوتے ہو تم دھرے ہوئے رخسارہ خاک پر
بھولے پدر کو نیند میں قربان آپ کے
آؤ نماز عصر پڑھو ساتھ باپ کے

چمنستان فاطمہؑ کا مرقع بکھر چکا۔ حسینؑ تنہا رہ گئے۔ تین دن کی پیاس، زخمی بند اور عصر کی نماز کا وقت امام عصر اپنے آپ سے مخاطب ہیں:۔

ہے عصر کا ہنگام مناسب ہے اترنا — اس خاک پہ ہے شکر کا سجدہ ہمیں کرنا
گو مرحلۂ صعب ہے دنیا سے گزرنا — سجدے میں کٹے سر کہ سعادت ہے یہ مرنا
طاعت میں خدا کی نہیں صرفہ تن و سر کا
ذی حق ہیں ہمیں اس کے کہ ورثہ ہے پدر کا
وعدے کو لڑکپن کے وفا کرتا ہے شبیرؑ — سجدہ تہِ شمشیر ادا کرتا ہے شبیرؑ

تھا عصر کا ہنگام کہ حضرت کو غش آیا
سجدے میں سنبھل کر سرِ انور کو جھکایا

سجدے کو سرپاک جھکا طاعت حق میں
خورشیدِ زمیں ڈوب گیا خوں کی شفق میں

بیٹھے جو سوئے قبلہ دو زانو شہ بے پر
جھکتے تھے کبھی غش میں اٹھاتے تھے کبھی سر

تھے ذکر خدا میں کہ لگا تیر دہن پر　　یاقوت بنے ڈوب کے خوں میں لبِ اطہر
تھرا کے جھکے سجدۂ حق میں شہ ابرار　　خوش ہو کے پکارا عمر سعد جفا کار
آخر ہے بس اب کام امام ازلی کا
سر کاٹ لو سب مل کے حسینؑ ابن علیؑ کا

بے سر نماز میں پسر فاطمہؑ ہوا
سجدہ نہ ہوچکا تھا کہ بس خاتمہ ہوا

سیّد افضال حسین نقوی (فضلؔ فتح پوری)

مرثیہ اور انیسؔ

انسان کو غم سے ایک مناسبت ہے۔ شاید انسانی وجود ورثۂ غم رحمِ مادر سے لے کر آتا ہے۔ اس کے جینتی نشو ونما میں ماں کا جذباتی ہیجان اور جسمانی اذیت بطورِ غذا جو شامل رہتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انسان اس دنیا میں زندگی کا آغاز رونے ہی سے کرتا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ اس کی تمام زندگی غم واندوہ سے عبارت رہتی ہے اور وہ اپنے دکھ، مصائب اور اذیتوں کا عزادار بن جاتا ہے۔

انسان عہدِ عتیق سے ہی اپنے صدمات پر کڑھتا اور غم مناتا آیا ہے۔ آدم وحوا کو جب وقتی مفارقت ہوئی تو دونوں نے آٹھ آٹھ آنسو بہائے اور وصل کی دعائیں مانگیں۔ زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ہجر اور موت پر نئے نئے انداز سے غم منائے جاتے رہے۔ گریہ وبکا اور سینہ کوبی کے ایسے موقعوں پر عام مظاہرے ہوتے تھے۔ غم واندوہ کے اندمال کی بھی صورت بکائیہ کلمات کے ادا کرنے میں مضمر تھی۔ یہ کلمات جو کہ ابتدائی دور میں نوحہ وشیون تک محدود تھے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑی بڑی زبانوں میں مرثیوں کی شکل اختیار کر گئے۔

غم منانا دراصل انسانی افتادِ طبع کا ایک جزو ہے اور مرثیہ اس کیفیت کی عکاسی کا نام ہے۔ ہر صدمہ جو انسان برداشت کرتا ہے نتیجتاً ایک تاثر چھوڑتا ہے۔ جتنا صدمے کی اہمیت کا زور ہوتا ہے اس کا تاثر اتنا ہی شدید تر ہوتا ہے۔ انسانی حیات کا اتلاف جو اثر پذیری کے اعتبار سے نہایت اہم ہے اس طرزِ شاعری کی داغ بیل کا موجب بنا۔

زمانہ قدیم سے جبکہ انسان ابھی اپنا مافی الضمیر ادا کرنا نہ سیکھ پایا تھا کسی متوفی کا غم منانا ایک عام بات تھی۔ ٹوٹے پھوٹے جملے جو غم واندوہ میں ڈوبے ہوئے تھے انسانی زبان سے بے ساختہ نکل

جاتے تھے۔ یہی انسانی نفسیات دراصل مرثیہ نگاری کی صنف کو جنم دینے میں ممد و معاون ثابت ہوئی۔ دنیا کا ہر ادب اس طرزِ شاعری کا حامل ہے۔ یہ دراصل عقیدت مندی اور نیاز مندی کے اظہار کا ایک طریقہ ہے جس کے ذریعہ انسان اپنے ساتھیوں کے بچھڑ جانے پر ان کی یاد تازہ کرتا ہے۔

اس طرزِ شاعری کی آفاقیت اس بات کی دلالت کرتی ہے کہ انسانی قلوب جذباتی ہیجان اور انسانی اتلاف پر یکساں طور پر اثر قبول کرتے ہیں اور ان کی دھڑکنوں میں نمایاں یکسانیت ہوتی ہے۔

تہذیب انسانی ابتدائی دور سے چاہے وہ مصر کی ہو یا بابل و نینوا کی یا چین کے ازمنۂ قدیم کی مرثیوں کا وجود ہر ایک میں قدرِ مشترک ہے۔

ایسس (ISIS): کا مرثیہ جو اس نے اپنے بھائی اور شوہر اوسائرس (OSIRIS) کے غم میں کہا تھا اس طرزِ شاعری کی قدامت کی اچھی دلیل ہے۔ یہ مرثیہ تقریباً چار ہزار سال قبلِ مسیح کہا گیا ہے۔

سر جیمس جان فریزر (Sir James John Fraser) اپنی کتاب گولڈن باؤ (Golden Bough) میں رقم طراز ہیں:۔

''مقامی روایات کے بموجب جس کی پلوٹرچ بھی تائید کرتا ہے جب ایسس کو اپنے شوہر اوسائرس کی لاش ملی تو وہ اپنی بہن نیفاطیس (NEphtys) کے ساتھ لاش کے برابر بیٹھ گئی اور نوحہ وشیون کرنے لگی۔ یہ بین بعد کے زمانے کے لئے متوفّی کے لئے ایک عام نوحہ کی حیثیت اختیار کر گیا۔''

اس نوحے میں، جسے دراصل مرثیہ کہنا چاہئے، ایک بیوی اپنے شوہر کی اچانک موت پر بین کرتی ہے۔ تاثر یہ ہے کہ گویا وہ روٹھ گیا ہے۔ وہ اس کے سج دھج کی تعریف کرتی ہے، اسے ہر طرح سے مناتی ہے، اپنے پیار کا واسطہ دیتی ہے اس بات کا اعادہ کرتی ہے کہ اس کا سرتاج اس کے علاوہ کسی دوسرے سے محبت نہیں کرتا۔ وہ اس کی بہن بھی تو ہے، پھر وہ اس سے کیوں کر دور رہ سکتا ہے۔ دیوتا اس کے گواہ ہیں وہ اپنے ماں جائے اور شوہر کو یونیفر یا برکتوں والا کہتی ہے اور بلک بلک کر روتی ہے۔

یہ مرثیہ ایسے جوانِ رعنا کے لیے کہا گیا تھا جسے عین عالمِ شباب میں موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ ہمیں اڈونس (Adonis) کے لیے کہے گئے نوحوں کی یاد تازہ کراتا ہے۔ یونیفر (Unnefer) یا

برکتوں والے کا لقب جو اوسائرس کو تفویض کیا گیا ہے روایاتی اعتبار سے بھی صحیح ہے۔ یہ بیک وقت خطاب بھی ہے اور بحیثیت بادشاہ کے نام بھی۔

انسائیکلو پیڈیا بری ٹینکا کے بموجب ایلجی (Elegy) یا مرثیہ اس مختصر نظم کو کہتے ہیں جس میں نوحہ اور تاسف کا بیان ہو یا تو کسی محبوب کی موت پر لکھی گئی ہو یا کسی مقتدر اور مقدس شخص کے سانحۂ ارتحال پر کہی گئی ہو جس میں درد وفا جیسے انسانی جذبات کی ٹیسیں موجود ہوں۔

یونانی مرثیہ: یونانی لفظ Eyeyela کی مشکوک حیثیت ہے۔ اس کے عام طور پر المیہ گیت یا جنازے کی نظم کے معنی لیے جاتے ہیں لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ متوفی کے لیے تاسف کا عنصر بھی اس لفظ کے اصلی معنی میں موجود ہو۔

یونان کے ابتدائی مرثیے جو کہ ہم تک پہنچے ہیں، دراصل ایسی نظمیں نہیں ہیں جنھیں جنازے پر کہی ہوئی نظمیں کہا جا سکے۔ تاہم یہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے قدیم Eyeyela میں ایسے الفاظ استعمال کیے گئے ہوں جو موسیقی کے ساتھ تدفین کے موقع پر گائے جاتے ہوں۔

البتہ جب ہم اس یونانی ادب پر نظر ڈالتے ہیں جسے بقائے دوام حاصل ہے تو اس میں ہم مرثیوں کو بھی پاتے ہیں۔ لیکن انہیں ہم موت کے لیے مخصوص ومعنون نہیں پاتے بلکہ انھیں جنگ اور محبت کے لیے مخصوص پاتے ہیں۔ یوفی سوس (EPHE SUS) کا کالینوس (CALLINUS) جو کہ ساتویں صدی قبلِ مسیح میں پروان چڑھا، دراصل یونان کا انتہائی قدیم مرثیہ نگار ہے تاہم اس کے متعلق بہت کم مواد حاصل ہو سکا ہے۔ اس مرثیہ نگار کے کچھ ہی عرصہ بعد ٹائی رٹ سوس (Tyrtseus) اپنے مشہور مرثیے اسپارٹا میں نظم کہہ رہا تھا۔ یہ دونوں لکھنے والے جہاں تک ہم جانتے ہیں خصوصیت کے ساتھ جنگجو اور مُحبِ وطن تھے۔ ان کے برخلاف محبت کے جذبے کو جس نے مہمیز کیا تھا وہ میم نرموس (Mimnermus) تھا۔

میرد کے رہنے والے تھیو جنیس (Theognis) کے ادب پاروں میں یونانی مرثیہ کی خصوصیتیں پوری تابانی کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہیں۔ یہاں ڈوریں Dorian کی جنگجویانہ روح کا ظہار اپنے تمام وکمال پر ہے مزید برآں جنگ، مردانہ محبت سے مربوط ہے۔

یہ دیکھنے میں عجیب معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ قدیم میں موت پر ماتمی دوہوں کو جو تھیا کری ٹس

(Theocritus) بائن (Bion) اور ماسچوس (Moschus) نے کہے ہیں ہمارے لیے مرثیہ کی ایک قسم کی تو ایک حیثیت رکھ سکتے ہیں بھرپور مرثیے کی نہیں بلکہ ایک حد تک انھیں مرثیہ کہنا بھی چاہیے۔ یہ دراصل نہایت مختصر پُراثر نظمیں ہیں۔

لاطینی مرثیہ: گالوس (Gallus) جس کے فن پارے بدقسمتی سے امتدادِ زمانہ کے نذر ہو گئے دراصل ایسا شاعر تھا جس نے عاشقانہ طرز کے مرثیے (Eroti Elegies) نظم کیے جو لاطینی میں نہایت ہی قدیم مرثیے کہے جاتے ہیں۔ پراپرٹیس (Propertuis) کے سنھتیا (Cynthia) نے چھ رکن کے وزن کا شعر اور پانچ رکن کے وزن کا شعر کے یکے بعد دیگرے عمدہ اور بلیغ استعمال سے اس ترکیب کو لاطینی مرثیہ کی معتدبہ بحروں میں شامل کر دیا۔

تائی بُوبُوس (Tibulus) کا نام ہمیشہ پراپرٹیس کے نام کے ساتھ لیا جاتا ہے کیونکہ دونوں ہم عصر تھے مانا کہ دونوں کے انداز بیان میں بڑا تضاد ہے۔ آخیر میں اُووڈ (Ovid) نے مرثیے لکھے جو کہ مضمون کے اعتبار سے مختلف النوع ہیں البتہ ساخت کے اعتبار سے ایک جیسے ہیں۔

انگریزی مرثیہ: سولھویں صدی کے اوائل سے انگریزی میں مرثیہ کے لفظ کا استعمال ہوا۔ چنانچہ جبھی سے یہ لفظ یا تو جنازے کے گیت کے معنی دیتا ہے یا نوحہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اسپنسر (Spenser) ۱۵۹۱ء کی (Daphnaida) صحیح معنوں میں طرزِ جدید کا مرثیہ کہلانے کی مستحق ہے۔ جانسن (Johnson) کی مرثیہ کی تعریف کہ یہ ایک مختصر نظم ہے جس میں گریز کی گنجائش نہیں دراصل ایک نامکمل اور بغیر سوچی سمجھی تعریف ہے۔ ۱۷۵۵ء تک کے عرصہ میں انگریزی ادب نے کچھ نمایاں مرثیے پیش کیے جن میں ملٹن (Milton) کی (Lycidas) اس صنف کی بھرپور ترجمان ہے۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں انگریزی ادب میں نہایت ہی مشہور مرثیے لکھے گئے جن میں شیلے (Shellay) کا (Adonais) جو کہ کیٹس کا مرثیہ ہے اور میتھو آرنلڈ (Methew Arnold) کا (Thyrisis) جو کہ کلائیو کا مرثیہ ہے۔

انگریزی ادب کا نہایت ہی گراں قدر مرثیہ گرے (Gray) کا ہے جو کہ ایک دیہات کے قبرستان پر لکھا گیا ہے۔ تاہم یہ مرثیہ ایک خاص انداز کا حامل ہے کیونکہ یہ کسی خاص شخص کی یاد میں نہیں لکھا گیا۔

جیمس ہمنڈ (James Hammand) ۱۷۱۶ء۔۴۲ء کو ایسے مرثیے نظم کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی جن میں محبت کا عنصر غالب ہے اور اسی شاعر نے انگریزی عاشقانہ طرز کے مرثیوں کو رواج دیا جیسا کہ لاطینی میں اووڈ (Ovid) اور ٹائی بولوس نے کیا تھا۔

فرانسیسی مرثیہ: درج بالا تجربہ کا انگریزی ادب میں تو کوئی اثر نہ ہوا۔ البتہ فرانس نے اسے خوش آمدید کہا۔ چنانچہ پارنی (Parney) ۱۸۱۴ء۔۱۷۵۳ء چینی ڈول (Chinedolle) ۱۸۳۳۔۱۷۶۹ء اور میلی وائے (Mille Voye) ۱۸۱۶ء۔۱۷۸۲ء نے اپنے (Ematory Works) میں اس طرز کو جگہ دی۔

لامرین (Lamarine) کو مرثیہ نگاروں کی فہرست میں ضرور شامل کرنا چاہیے کیونکہ اس کا مرثیہ ''Le Lae'' فرانسیسی ادب میں وہی مقام رکھتا ہے جو انگریزی ادب میں Country Churchyard کو حاصل ہے۔

پرتگالی مرثیہ: پرتگال میں مرثیہ کی صنف کو فروغ ہوا اور اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اس کی افزائش میں کامونیز (Camoens) کے مساعی شامل ہیں۔

اطالوی مرثیہ: اطالوی زبان میں چیابریرا (Chiabrera) اور فلی کاسیا (Filicacia) کو نمایاں مرثیہ نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ان کی شہرت قومی سطح کی ہے۔

جرمن مرثیہ: جرمن ادب میں مرثیہ کا تصور بحیثیت بند نظم کے مفقود ہے۔ گوئٹے (Goethe) کے مشہور رومی مرثیے ساخت اور مضمون کے اعتبار سے اووڈ (Ovid) کا اتباع ہیں، لیکن ان میں وہ سوز و گداز نہیں۔

انگریزی میں مرثیہ کا لفظ بارہا غلط طور پر استعمال ہوا ہے، یہ یاد رکھنا چاہیے مرثیہ ایسی نظم ہے جو غمگین، فکر انگیز اور مختصر ہوتی ہے (یہ تصور یورپی زبانوں کے مرثیوں کے متعلق ہے) جس میں لفظوں سے کھیلا نہیں جاتا، چنانچہ ٹینیسن (Tennyson) کی (In Memorium) اتنی طوالت کے اعتبار سے علیحدہ کی جاسکتی ہے اور اسے مرثیوں کا مجموعہ کہنا بجا ہوگا۔ ورڈز ورتھ (Words Worth) کی (Lucy) دراصل تابوت کا نوحہ ہے جس میں نہایت مختصر طور پر

شدید جذبات کا اظہار ہوا ہے اور جسے مشکل ہی سے مرثیہ کا رتبہ دیا جا سکتا ہے۔

عبرانی اور سنسکرت زبانوں میں بھی مرثیہ کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ غرض مرثیہ ایک ایسی آفاقی اور عالمگیر صنفِ شاعری ہے جسے ہر زبان نے اپنایا ہے اور حتی الوسع عروج دینے کی کوشش کی ہے۔

عربی اور فارسی مرثیہ: چونکہ موجودہ مقالہ انیسؔ سے متعلق ہے اس لیے ظاہر ہے کہ اردو مرثیہ ہی اس کا حاصلِ مضمون ہے۔ اردو مرثیہ کو صحیح طور پر سمجھنے اور بحیثیت صنفِ شاعری اس کا مقام متعین کرنے کے لیے ہمیں اس کی جڑیں عربی اور فارسی شاعری میں تلاش کرنی پڑیں گی۔ چنانچہ ضرورت اس امر کی ہے کہ مرثیہ کی ایک مختصر تاریخ پیش کی جائے جس میں یہ بتلایا جائے کہ عربی مرثیہ سے لے کر موجودہ اردو مرثیہ تک اس صنف نے کون کون سی ارتقائی منزلیں طے کی ہیں۔

عربی شاعری کی ابتداء مرثیہ سے ہوئی ہے۔ عربی میں کافی مراثی لکھے گئے ہیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب شاعری ذاتی منفعت کا وسیلہ بن گئی تو مرثیہ کی اہمیت گھٹنے لگی اور اس کی جگہ قصیدے نے لے لی جس میں ظاہر ہے زندہ اور ذی حیات اشخاص کی مدح کی جاتی تھی۔
اس سلسلہ میں حنا، یتیم بن نویرہ، فرزدق اور دعبل وغیرہ عربی شعرا کے نام نمایاں طور پر لیے جا سکتے ہیں۔

یہی حشر فارسی شاعری کا ہوا جس کی بنیادی تکلّف اور تصنّع پر رکھی گئی تھی اور مبالغہ اور تعریف جس کی جان تھی۔ نتیجہ ظاہر ہے قصیدہ گوئی نے مرثیہ نگاری کو پسِ پشت ڈال دیا۔ تاہم فارسی شعرا کی ایک اچھی خاصی تعداد مثلاً محتشم کاشی، طالب، آملی، غزالی اور ظہوری وغیرہ نے مرثیے تصنف کیے لیکن پرانی ڈگر سے آگے نہ بڑھ سکے۔

اس سے قبل فردوسی اور فرخی نے مرثیے تصنیف کیے۔ فردوسی نے شاہ نامہ میں جہاں سہراب کی ماں نے اپنے چہیتے بیٹے کا بین کیا ہے اور فرخی جس نے محمود غزنوی کا مرثیہ لکھا ہے، فارسی مرثیہ نگاری میں اضافہ ہے لیکن ان میں کوئی بھی مرثیہ دورِ جدید کے مرثیوں سے لگا نہیں کھاتا اور تقابلی جائزے کی حد تک بیکار ہے۔

اردو مرثیہ کی ابتدا: جس طرح اردو شاعری کا منبع و مخرج دکن ہے، بالکل اسی طرح اردو مرثیہ کی ابتدا بھی اسی سرزمین سے ہوئی ہے۔ دراصل شاہانِ گولکنڈہ اور بیجاپور نہ صرف مرثیہ نگاروں کے مربی تھے بلکہ خود اس صنفِ شاعری میں طبع آزمائی کرتے تھے اور اس طرزِ شاعری کے موجد کہلائے

جا سکتے ہیں۔

دکن کے مرثیہ نگاروں میں وجہی، کاظم، شاہی، نوری اور ہاشمی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے مرثیے دستیاب ہو گئے ہیں اور موجود ہیں۔

بارہویں صدی ہجری میں جب کہ اورنگ زیب عالمگیر کا عہدِ حکومت تھا ہندوستان میں مرثیہ نگاری کا عام رواج تھا۔ محمد شاہ کے عہد میں فضلی کے علاوہ تین بھائی، مسکین، حزین اور غمگین مرثیہ نگاروں کی فہرست میں شامل تھے۔ نواب درگاہ قلی نے ان کے اردو مرثیوں کو بہت سراہا ہے۔

یہاں پر یہ بتلانا بے جا نہ ہوگا کہ فارسی اور عربی مراثی کے برخلاف اردو کے مرثیے خاص طور پر شہادتِ کربلا سے متعلق ہیں۔

دبستانِ دہلی کے فروغ نے بہت سے مرثیہ نگار پیدا کیے ہیں لیکن دکن کی شاعری کا اثر غالب رہا اور اس کا اعادہ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

میر تقی میر نے اپنے ''نکات الشعراء'' اور میر حسن نے اپنے ''تذکرہ'' میں جن شعراء کے نام گنوائے ہیں۔ ان میں میر امانی، میر آلِ علی، درخشاں، سکندر، صبر، قدیر، گمان، ندیم وغیرہ شامل ہیں۔ میرؔ اور سوداؔ نے بھی مرثیے کہے ہیں لیکن اس صنف میں خاطر خواہ اضافہ نہیں کر سکے۔ میر ضاحک اور میر حسن کے مرثیے بھی کوئی انفرادیت نہیں رکھتے بجز اس کے کہ یہ دونوں بزرگوار میر انیس کے اجداد ہیں۔

لکھنؤ میں مرثیہ کا فروغ: لکھنؤ شروع ہی سے شیعی ثقافت کا مرکز رہا ہے۔ نوابینِ اودھ جن کا یہ مرکزِ حکومت تھا شیعی مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس مسلک کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ شیعت میں واقعۂ کربلا پر اظہارِ غم ارکانِ مذہب میں شامل ہے۔ لکھنؤ میں محرم کے ۱۰ دن جس اہتمام، عقیدت اور احترام سے منائے جاتے ہیں اظہر من الشمس ہیں البتہ نوابینِ نواس اودھ کے عہد میں محرّم منانے کی کچھ اور ہی شان تھی۔

شاہانِ اودھ نے وسیع و عریض امام باڑے بنوائے تھے جن میں مومنین مجلس برپا کرتے تھے اور اپنے شہید امام کے فضائل و مناقب بیان کرتے تھے اور ان کی شہادت اور غریب الوطنی پر نالہ و بکا کرتے تھے۔

تباہی۔ یہ سب چیزیں حسینؑ کو راستے سے نہیں ہٹا سکیں۔

آپ کا چھوٹا سا لشکر تین روز سے بے آب وغذا ہے۔ لیکن کوئی بھی ذرا سا متوحش نہیں بجائے اضمحلال کے ان کے دل نئے عزم سے معمور ہو جاتے ہیں اور ان کا جذبۂ ایثار دوگونہ بڑھ جاتا ہے۔

ایک حق آگاہ صفِ دشمن سے نکل کر امام کے لشکر میں آ جاتا ہے۔ اس مردِ مجاہد کا نام حُر ہے۔ اس کی مسابقت اللحق میں کوئی دنیوی منفعت شامل نہیں۔ ظاہر ہے حسین مظلوم کی نصرت میں دینوی طور پر گھاٹا ہی گھاٹا ہے لیکن وہ حسینؑ کے مقصد کی عظمت کو پہچانتا ہے اور حسینؑ پر اپنی جان فدا کر دیتا ہے۔

کوئی بھی شاعری جو ان خیالاتِ عالیہ کی ترجمان ہو اسے اعلیٰ درجہ کی اخلاقی شاعری نہ کہنا دراصل شاعری کی توہین ہے۔

انیس کا منصۂ شہود پر نمود: میر انیس محلّہ گلاب باڑی فیض آباد میں ۱۲۱۶ ہجری یا ۱۲۱۷ ہجری میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والدِ ماجد نے آپ کی پرورش کی۔ آپ جب لکھنؤ تشریف لائے تو آپ کے صاحبزادے نفیس پیدا ہو چکے تھے۔ آپ کے چھوٹے بھائی انس آپ کے ساتھ تھے۔ شروع شروع آپ نے فیض آباد سے تعلق رکھا لیکن جب پورا خاندان لکھنؤ منتقل ہو گیا تو آپ لکھنؤ ہی کے ہو رہے اور فیض آباد سے قطعِ تعلق کر لیا۔

آپ کا خاندان شاعروں کا خاندان ہے۔ آپ کے خاندان میں یکے بعد دیگرے پانچ بڑے شاعر پیدا ہوئے۔ آپ کے والد، دادا، پردادا سبھی شاعر ہیں۔ ظاہر ہے آپ نے وہ سب ہنر گھر ہی پر سیکھے جو شاعری کے لیے ضروری ہیں۔ اس کے علاوہ ایسے معروف خاندان کے فرد کے لیے ازبس ضروری تھا کہ کسبِ علم ضرور کرے۔ انیس عالم تھے یا نہیں الگ بیکار سی بات ہے البتہ یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ آپ نے وہ تبحر علمی ضرور حاصل کیا ہوگا جو کسی بڑے عالم کی بضاعتِ علمی سے کم مایہ نہ ہو۔ یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ آپ کو عربی اور فارسی شاعری کی اصل روح سے نہ صرف کما حقہ واقفیت تھی بلکہ آپ اس کے پس منظر سے پوری طرح آگاہ تھے۔ آپ کا اردو شاعری سے تعلقِ خاطر اور اس کی صحیح سوجھ بوجھ اظہر من الشمس ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے آپ نے ماں کی گود ہی سے غیر ارادی طور پر لوازماتِ شعری کو شیرِ مادر کی طرح پیا ہوگا۔ اس میدان میں آپ کی کوئی ہمسری

یہ مجلسیں لکھنؤ کے گوشہ گوشہ میں ہوتی تھیں جس میں بڑے چھوٹے، غریب امیر، مرد و عورت، بچے بوڑھے سبھی شرکت کرتے تھے اور اپنے جوشِ ایمانی اور عقیدت و مودتِ اہلِ بیتؑ کا مظاہرہ کرتے تھے اور ان مجلسوں کی رونق کے لیے حسبِ استطاعت دل کھول کر خرچ کرتے تھے۔

عزائی رسوم کی ادائیگی اپنی پوری شدت اور عقیدت سے ہوتی تھی۔ عزائی رسوم کے اظہار کے لیے سب سے مؤثر آلہ کار مرثیہ تھا جسے یا تو تحت اللفظ میں منبر پر پڑھا جاتا تھا یا پھر سوز خوانی کے طور پر تعزیے کے قرب پڑھا جاتا تھا۔ مجلس کی ابتداء بھی سوز خوانی اور مرثیہ خوانی سے کی جاتی تھی جس میں لے کا درد و سوز ادائیگی کی جان تھی۔

غمِ حسین اس جوش و خروش کے ساتھ منانا عام دستور کی حیثیت رکھتا تھا اور کٹر سے کٹر نقاد کو بھی یہ جرأت نہ تھی کہ کوئی حرف اُٹھا سکے۔

ہر شیعہ کا یہ عقیدہ ہے کہ اگر اس نے سید الشہداء اور ان کے یار و انصار کے غم میں ایک مصرعہ بھی موزوں کرلیا تو اس کی مغفرت کے لیے کافی ہوگا۔ نوابینِ اودھ اپنے شعرا کی ہمت افزائی فرماتے تھے اور الطاف و عنایات کی بارشیں کرتے تھے۔ چنانچہ مرثیہ نگاری مذہبی ضرورت کے علاوہ دنیاوی اعتبار سے بھی منفعت بخش ثابت ہوئی تھی اور اس طرح حکامانِ وقت کی نظرِ کرم حاصل ہوجاتی تھی۔ حکوت کی ہمت افزائی، مذہبی عقیدے کی یکسوئی، مخصوص جغرافیائی حالات و نیز ثقافتی وحدت اس طرزِ شاعری کے فروغ میں مددگار ثابت ہوئی اور نتیجہ کے طور پر یہ صنف شاعری آسمانِ ترقی پر پہنچ گئی۔

اردو مرثیہ کا ارتقاء: سوداؔ وہ پہلے شاعر تھے جنھوں نے مرثیہ میں چومصرعہ کے بجائے مسدس کا رواج دیا۔ سوداؔ سے پہلے چار مصرعوں کے بند مرثیہ کے لیے مخصوص تھے۔ اس تبدیلی نے بڑے دوررس نتائج مرتب کیے۔ مسدس کے استعمال نے خیالات کے اظہار کو آسان تر اور فطرت سے قریب تر کردیا جو چومصرعہ میں قوافی کی پابندیوں کی وجہ سے پوری طرح نبھ نہ سکتا تھا۔ سوداؔ کے کلیات میں بانوے (۹۲) مرثیے موجود ہیں جن میں چند ایک ان کے شاگرد مہربان کے تصنیف کردہ ہیں۔

ادبی بلندیوں سے قطعِ نظر موجود مرثیہ کے موجد میر ضمیرؔ ہیں جنھوں نے نہ صرف مرثیہ میں نئے اختراعات کیے بلکہ اپنی جودتِ طبع سے بالکل نئی شکل دے دی۔ نئے مضامین نظم کیے اور نئے اسلوب سے صنف کو مالا مال کیا۔ ان اختراعات میں رزمیہ کی ابتداء، سراپا کی ایجاد، گھوڑے، تلوار

اور اسلحۂ جنگ کی تعریف اور واقعہ نگاری کی بنیاد شامل ہیں۔ اظہار میں سادگی پیدا کی اور اس طرح مرثیہ کو ایک مضبوط بنیاد دے دی جس پر ایک عالی شان عمارت کھڑی کی جاسکتی تھی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں انیسؔ اور ان کے خاندان نے مرثیہ کی صنف کو نہ صرف مکمل کیا بلکہ بامِ عروج پر پہنچادیا۔ میر امانیؔ، میر ضاحکؔ اور میر حسنؔ نے مرثیے لکھے۔ میر حسنؔ، میر انیسؔ کے دادا تھے۔ میر حسنؔ میر ضاحکؔ کے فرزند تھے۔ میر ضاحکؔ کے والد کا نام میر امانیؔ تھا۔ میر حسنؔ کے چار بیٹے تھے جن میں تین شاعر تھے۔ ان کے نام خلیق، خلق اور محسن۔ میر حسن کے ہر فرزند نے مرثیہ کی ترویج و ترقی میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ میر خلیق جو میر انیسؔ کے والد تھے اپنے بھائیوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔

میر خلیق کا سب سے بڑا کارنامہ مرثیہ نگاری کے میدان میں زبان کی صحت اور صفائی، روزمرّہ کا صحیح استعمال اور تشبیہہ و استعارہ کا برمحل اور حسین تصرف ہے۔ اس کے علاوہ میر خلیق کے مرثیوں میں درد و غم کی چاشنی ہے۔ میر خلیق میر ضمیر سے انہیں چیزوں کی باعث ممیز نظر آتے ہیں۔

مرثیہ میں مسدس کی ایجاد نے فنی نقطۂ نگاہ سے بڑے دور رس نتائج مرتب کیے۔ میر خلیق اور میر ضمیر سے قبل مرثیہ چو مصرع نظم کیا جاتا تھا۔ مقصد صرف رونا رلانا تھا۔ اس نئی ایجاد کی بدولت اب مرثیہ اس قابل ہوگیا کہ اس پر فنی تنقید اس انداز سے کی جائے جس انداز کی غزل، قصیدہ اور مثنوی پر کی جاتی تھی۔ اس ایجاد کی بدولت مرثیہ کے جسد میں ایک نئی روح پھونک دی گئی۔

جس طرح دنیا کی ہر بیانیہ شاعری کے لیے ساخت کے اعتبار سے ایسی نظم کی قسم درکار ہے جس میں کسی واقعہ کے بیان میں رکاوٹ نہ پیدا ہو بلکہ حتی الوسع اس کے ابلاغ میں مدد ملے بالکل اسی طرح اردو میں مرثیہ کے بیانیہ پہلو کو مسدس کے استعمال سے بھرپور تقویت ملی ہے۔

مرثیہ کے مضامین: اردو مرثیہ دیگر زبانوں کے مرثیہ کے مقابلے میں بہت سے اعتبار سے مختلف ہے۔ اردو مرثیہ میں ذاتی صدمہ پر رنج و غم کا اظہار نہیں کیا جاتا بلکہ اس سے کچھ سوا تاثر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ سید الشہداء حضرت امام حسینؑ اور ان کے یاور و انصار کی شہادت عظمیٰ کے جاں سوز واقعہ کو ضبطِ نظم کرتا ہے۔

کون حسینؑ جو امام عصر ہے، محبت خدا ہے، نیابتِ الٰہی کا سزاوار ہے، محافظِ مذہب ہے، معصوم ہے اور

تمام ممکنہ انسانی صفات سے متصف ہے۔ ظاہر ہے اس کا بیان صرف ایک شخص کی انفرادی تعلق خاطر یا جذبۂ محبت وعقیدت کا بیان نہیں بلکہ ایک پوری قوم یا پورے مسلک کے اندازِ فکر کی ترجمانی کرتا ہے چنانچہ اس میں اگر کہیں عام انداز کے مطابق کچھ غلو نظر آتا ہے تو وہ دراصل غلو کے حدود میں نہیں آتا کیونکہ نہ صرف شاعر بلکہ وہ جس مسلک وعقیدہ کی ترجمانی کر رہا ہے اس شہیدِ اعظم کو اسی درجہ فائز سمجھتے ہیں۔

مرثیہ کے مضامین اس قدر ارفع اور اعلیٰ ہیں اور اس حد تک اخلاقِ عالیہ اور پندونصائح سے مملو ہیں کہ وہ اس بات کے متقاضی ہیں کہ اردو مرثیہ کو دنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ اخلاقی شاعری قرار دیا جائے تو کم ہے اس اعتبار سے اردو مرثیہ فارسی اور عربی مراثی سے کہیں اعلیٰ ہے اور گوئے سبقت لے جاتا ہے۔

وہ مضامین کس قدر نہ اعلیٰ وارفع ہوں گے جن میں یہ دکھلایا جائے کہ رحمتہ اللعالمین کا نواسہ جسے امت کو منزلت اور تقدس کے رشتے سے سب سے اعلیٰ سمجھنا چاہیے تھا اس بھری دنیا میں اپنے آپ کو یک وتنہا محسوس کرتا ہے۔ سارا زمانہ اس کے خون کا پیاسا ہے۔

وہ اپنے چھوٹے سے لشکر کے ہمراہ جس میں عورتوں اور بچوں کے علاوہ بہتر نفوس ہیں، کربلا کے میدان میں پوری طرح محصور ہے۔ وہ اس مقام پر اہلِ کوفہ کے پیہم اصرار پر پہنچا ہے۔ جس میں اس سے کہا گیا ہے کہ امتِ مسلمہ کو یزید جیسے فاسق وفاجر کی خلافت سے نجات دلائی جائے۔

وہ مدینے سے ایک لمبی مسافت طے کر کے نینوا پہنچا ہے۔ اس کڑے سفر میں اس کے ساتھ اس کے بیوی، بچے اعزا اور رفقاء ہیں۔ اس نے سفر کے دوران موسم کے شدائد کا خوب ہی سامنا کیا ہے۔ تپتا ہوا ریگستان جہاں میلوں تک روئیدگی کا نام نہیں، جہاں پانی کا دور دور تک پتہ نہیں۔ اس نے تمام صعوبتیں بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کی ہیں۔ ان تمام تکالیف کے برداشت کرنے کا مقصد صرف ایک ہے کہ امتِ محمدیہ کو ایک ظالم اور فاسق کی حکومت سے نجات دلائی جائے۔

وہ اپنے اعزاء اور رفقاء کو یکے بعد دیگرے شہید ہوتے دیکھتا ہے۔ وہ ہر مجاہد کی بالیں پر پہنچتا ہے اس کی دلجوئی کرتا ہے، اس کے گزر جانے کے بعد لاش کو گنجِ شہیداں میں لاتا ہے۔ سارے مجاہدوں کی شہادت کے بعد وہ خود بھی میدانِ جنگ میں بہ نفسِ نفیس آتا ہے اور ایسی بے مثال جنگ کرتا ہے۔ جس کی نظیر رہتی دنیا تک نہیں مل سکتی۔ لاتعداد زخم کھاتا ہے اور جان جانِ آفریں کے سپرد کرتا ہے۔ ظالم شمر اس کے سر کو تن سے جدا کرتا ہے اور نوک نیزہ پر بلند کرتا ہے۔

ہر عزیز اور ساتھی یہی جانتا ہے کہ حسینؑ پر فدا ہونے پر سبقت کرے اور اعلائے کلمۃ الحق میں حسینؑ مظلوم کا ساتھ دے۔ ایک پر ایک ٹوٹا پڑتا ہے کہ جلد سے جلد یہ فریضہ ادا کرے۔ ان حق آگاہوں اور حق شناسوں کے بدن تیروں اور تلواروں سے زخمی ہوتے ہیں۔ ان کے اعضاء ان کے اجسام سے جدا کیے جاتے ہیں، ان کے سینے تیروں سے چھلنی کر دیئے جاتے ہیں، ان کے لاشے پامالِ سمِ اسپاں کر دیے جاتے ہیں مگر ان تمام مصائب کے باوجود ان کے پائے استقامت کو جنبش نہیں ہوتی۔ وہ عزم وارادے کے پہاڑ بنے رہتے ہیں۔

سفری صعوبتوں کے پیشِ نظر امام حسینؑ اپنی بیمار بچی صغریٰ کو مدینے میں چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے قدرت کو یہی منظور تھا کہ باپ اپنی بیٹی سے جدا ہو جائے۔ حسینؑ تقدیر کے اس فیصلے کو منظور کرتے ہیں اور اپنی چہیتی بیٹی کو مدینے میں چھوڑ جاتے ہیں۔

عباسؑ علمدار جو سالارِ لشکرِ حسینی ہیں میدان جانے کی اجازت مانگتے ہیں تاکہ اپنی پیاری بھتیجی سکینہ کی پیاس بجھا سکیں۔ خیام اہل بیتؑ میں تین روز سے پانی بند ہے۔ بچے العطش العطش کر رہے ہیں۔ امام حسینؑ پورے کنبے کی ڈھارس عباسؑ کو بڑی مشکل سے اجازت دیتے ہیں۔ عباسؑ فوجِ اشقیا میں درآتے ہیں۔ گھمسان کا رن پڑتا ہے۔ فوجیں بھاگتی ہیں اور عباس نہرِ فرات میں اپنا گھوڑا ڈال دیتے ہیں۔ بالی سکینہ کی سوکھی مشک میں پانی بھرتے ہیں۔ گھوڑے کی لگام ڈھیلی چھوڑ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے اسپ وفادار پانی پی لے، خود چلّو میں پانی لیتے ہیں اور بھتیجی کی پیاس یاد کر کے فرات میں پانی ڈال دیتے ہیں۔ گھوڑا مالک کی حالت دیکھ کر پانی سے گردن اٹھا لیتا ہے اور ایک بوند پانی نہیں پیتا۔ عباسؑ پانی لے کر خیام حسینی کی طرف بڑھتے ہیں۔ فوج اشقیا چاروں طرف سے یلغار کرتی ہے مجاہد پر تیروں اور تلواروں کی بارش کرتی ہے۔ کسی شقی کی تلوار سے شیر کا ایک بازو کٹ جاتا ہے عباسؑ دوسرے بازو سے مشکیزہ اور علم لے لیتے ہیں۔ اثنائے راہ میں دوسرا بازو بھی کٹ جاتا ہے عباس مشکیزہ کو اپنے دانتوں میں دبا لیتے ہیں کوئی شقی کمین گاہ سے سر پر گرز کا وار کرتا ہے اور ایک تیر مشکیزہ میں پیوست ہو جاتا ہے۔ پانی کے ساتھ ساتھ عباس کا خون بہتا ہے جیسے دونوں کا باہم تعلق ہو۔

افرادِ خاندان کی گرفتاری اور رسوائی حسینؑ مظلوم کے پیشِ نظر ہے۔ حسینؑ کے قبضہ واختیار سے باہر ہے کہ اپنی چھوٹی بچی کی پیاس بجھا سکیں۔ آپ کا ششماہہ آپ کے ہاتھوں پر فدا ہو جاتا ہے لیکن حسینؑ کے عزم میں سر مو انحراف نہیں ہوتا۔ بچوں کا رونا، عورتوں کے بین، اپنے خاندان کی ممکنہ

تباہی۔ یہ سب چیزیں حسینؑ کو راستے سے نہیں ہٹا سکیں۔

آپ کا چھوٹا سا لشکر تین روز سے بے آب و غذا ہے۔ لیکن کوئی بھی ذرا سا متوحش نہیں بجائے اضمحلال کے ان کے دل نئے عزم سے معمور ہو جاتے ہیں اور ان کا جذبۂ ایثار دو گونہ بڑھ جاتا ہے۔

ایک حق آگاہ صفِ دشمن سے نکل کر امام کے لشکر میں آ جاتا ہے۔ اس مردِ مجاہد کا نام حُر ہے۔ اس کی مسابقت اللحق میں کوئی دنیوی منفعت شامل نہیں۔ ظاہر ہے حسین مظلوم کی نصرت میں دنیوی طور پر گھاٹا ہی گھاٹا ہے لیکن وہ حسینؑ کے مقصد کی عظمت کو پہچانتا ہے اور حسینؑ پر اپنی جان فدا کر دیتا ہے۔

کوئی بھی شاعری جو ان خیالاتِ عالیہ کی ترجمان ہو اسے اعلیٰ درجہ کی اخلاقی شاعری نہ کہنا دراصل شاعری کی توہین ہے۔

انیس کا منصّۂ شہود پر نمود: میر انیس محلہ گلاب باڑی فیض آباد میں ۱۲۱۶ ہجری یا ۱۲۱۷ ہجری میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والدِ ماجد نے آپ کی پرورش کی۔ آپ جب لکھنؤ تشریف لائے تو آپ کے صاحبزادے نفیس پیدا ہو چکے تھے۔ آپ کے چھوٹے بھائی انس آپ کے ساتھ تھے۔ شروع شروع آپ نے فیض آباد سے تعلق رکھا لیکن جب پورا خاندان لکھنؤ منتقل ہو گیا تو آپ لکھنؤ ہی کے ہو رہے اور فیض آباد سے قطعِ تعلق کر لیا۔

آپ کا خاندان شاعروں کا خاندان ہے۔ آپ کے خاندان میں یکے بعد دیگرے پانچ بڑے شاعر پیدا ہوئے۔ آپ کے والد، دادا، پردادا سبھی شاعر ہیں۔ ظاہر ہے آپ نے وہ سب ہنر گھر ہی پر سیکھے جو شاعری کے لیے ضروری ہیں۔ اس کے علاوہ ایسے معروف خاندان کے فرد کے لیے ازبس ضروری تھا کہ کسبِ علم ضرور کرے۔ انیسؔ عالم تھے یا نہیں الگ بیکار سی بات ہے البتہ یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ آپ نے وہ تبحر علمی ضرور حاصل کیا ہوگا جو کسی بڑے عالم کی بضاعتِ علمی سے کم مایہ نہ ہو۔ یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ آپ کو عربی اور فارسی شاعری کی اصل روح سے نہ صرف کما حقہ واقفیت تھی بلکہ آپ اس کے پس منظر سے پوری طرح آگاہ تھے۔ آپ کا اردو شاعری سے تعلقِ خاطر اور اس کی صحیح سوجھ بوجھ اظہر من الشّمس ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے آپ نے ماں کی گود ہی سے غیر ارادی طور پر لوازماتِ شعری کو شیرِ مادر کی طرح پیا ہوگا۔ اس میدان میں آپ کی کوئی ہمسری

نہیں کر سکتا۔

آپ کا ذہن رسا جو مقصود کو احاطۂ فکر میں لانے، اسے متشکل کرنے، خود محسوس کرنے اور دوسروں کو محسوس کرانے میں ید طولیٰ رکھتا ہے یقیناً سونے پر سہاگہ والی بات ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے انیسؔ کے قوائے حسنہ نہایت بیدار تھے۔ دیکھنے، سننے، سونگھنے اور چکھنے کی قوتیں نہ صرف بیدار تھیں بلکہ تمام و کمال تک پہنچی ہوئی تھیں۔ آپ کا حسنِ تناسب پر دلدادہ ہونا آپ کا شہسواری اور تیغ زنی پر عبور رکھنا آپ کے تکمیلِ فن کے لیے فال نیک تھا۔

میر انیسؔ ایک فطری شاعر ہیں اور آپ نے یہ وصف اپنے اجداد سے ورثے میں لیا ہے۔ آپ اپنے خاندان پر جتنا فخر کریں کم ہے۔ میر انیس نے بچپن ہی سے شعر موزوں کرنے شروع کر دیئے تھے۔ آپ کی شہرت آپ کے والد کی حیات میں دور دور تک پہنچ گئی تھی۔ چنانچہ جب میر خلیق اور میر ضمیر نے میدانِ مرثیہ نگاری چھوڑا تو میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ نے اس فن کے احیاء کا بیڑا اٹھایا اور اسے بامِ کمال تک پہنچا دیا۔

کہا جاتا ہے کہ میر انیسؔ نے کوئی دو ڈھائی لاکھ شعر کہے ہیں آپ نے لاتعداد مرثیے، سلام، قطعات اور رباعیاں تصنیف کیں۔ آپ کا پورا کلام اب تک نہیں چھپ سکا۔ البتہ جو چھپ چکا ہے وہ پانچ جلدوں میں موجود ہے۔

انیسؔ کا زبان پر احسان: انیسؔ کا اردو زبان پر احسان ہے۔ زبان کی ترقی، صحت، سلاست اور نکھار دینے میں انیسؔ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ آپ نے زبان کو نیا طرزِ ادا دیا۔ محاورات اور روزمرّہ کا صحیح استعمال سکھایا، تشبیہہ و استعارات کی شگفتگی دکھائی اور زبان کو نئے محاورات اور نئی بندشوں سے آراستہ کیا۔

انیسؔ کی زبان دلی اور لکھنؤ دونوں جگہ مستند سمجھی جاتی ہے۔ آپ کا خاندان صحت زبان کا امین سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات انیسؔ نے الفاظ و محاورات کا ایسا استعمال کیا ہے جو اس وقت لکھنؤ میں مروج نہ تھا۔ چنانچہ ایسے موقعوں پر آپ نے کہا ہے کہ صاحبو یہ میرے گھر کی زبان ہے اہل لکھنؤ ایسے انداز میں نہیں بولتے۔ کہا جاتا ہے کہ فیض آباد میں ایک دفتر تھا جس میں وہ روزمرّے اور محاورے جو بہو بیگم کے گھر میں بولے جاتے تھے قلم بند کر لیے جاتے تھے۔ اس دفتر کے محافظ میر حسن

اوران کے بیٹے میر خلیق تھے۔ ظاہر ہے انیسؔ سے بہتر کون زبان کی صحت وصفائی کا دعویدار ہوسکتا ہے۔

انیسؔ کا فن: مرثیہ مختلف عناصر کا مجموعہ ہے۔ اس میں چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، جنگ (رزمیہ کی جملہ صفات کے ساتھ) شہادت اور بین وغیرہ جیسے عناصر شامل ہیں۔ انیسؔ کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے مرثیہ کے ہر جزو کو پوری پوری تاب وتواں بخشی ہے لیکن انیسؔ کا کمال ان جملہ عناصرِ مرثیہ ہی کے پیش کرنے پر موقوف نہیں بلکہ دراصل ان میں جوہرِ شعری سمونے میں ہے۔ چنانچہ جس چیز کا وہ تذکرہ کرتے ہیں اس کی ہو بہو تصویر آنکھوں کے سامنے کھینچ دیتے ہیں۔ یہ شاعری کا اعجاز ہے کہ کسی شے کی منہ بولتی تصویر کھینچ دی جائے جو مصور کے موئے قلم کی دسترس سے بھی باہر ہو۔ انیسؔ کے اس جوہر کی طرف ہم ذرا تفصیلاً بحث کریں گے اور اس ضمن میں انیسؔ کی مختلف خصوصیتوں کو فرداً فرداً پیش کریں گے۔

مناظرِ فطرت کی عکاسی: انیسؔ کو مناظرِ فطرت کی عکاسی پر پورا پورا عبور ہے۔ مناظرِ فطرت کا بیان مرثیے کے حدود سے باہر نہیں تاہم اس قسم کے بیانات کو بخوبی مرثیے سے علیحدہ کیا جاسکتا ہے۔ ان بیانات میں فطرت کی بھرپور عکاسی ملتی ہے اور مرثیہ سے علیحدہ علیحدہ نکال کر بھی یہ اپنے مضمون اور بیان کی لطافت نہیں کھوتے۔ مرثیہ میں مختلف قسم کے مضامین بیان کئے گئے ہیں اور مختلف قسم کی بصری تصویریں کھینچی گئی ہیں۔ پورا مرثیہ ان مختلف النوع تصاویر کا ایک مرقع نظر آتا ہے۔ یہ مختلف تصاویر گو ایک دوسرے سے الگ الگ نظر آتی ہیں لیکن اصل مرثیہ کی روح اور نفسِ مضمون سے الگ نہیں بلکہ اس پوری وحدت کا ایک جزو ہوتی ہیں۔ مثلاً صبح کی تازگی، شام کا سانولا سلونا حسن، چاندنی، رات کا پُر کیف منظر، شبِ تار کی ہولناکی، چمن زاروں میں پھولوں کی بہتات، حدِ نظر تک سبزے سے ڈھکا فرش، تمازتِ آفتاب، گرمی کی شدت وغیرہ جیسے مناظر جو ایک دوسرے سے الگ ہونے کے باوجود مرثیہ کی وحدت کے الگ الگ جزو ہیں۔ چند ایک اقتباس اس بات کی بخوبی نشاندہی کریں گے کہ انیسؔ کو مناظرِ فطرت کی عکاسی میں کس قدر ملکہ ہے۔

صبح کی تعریف میں فرماتے ہیں۔

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زارِ صبح　　گلزار شب خزاں ہوا آئی بہارِ صبح

کرنے لگا فلک زرِ انجم نثارِ صبح　　سرگرم ذکرِ حق ہوئے طاعت گزارِ صبح
تھا چرخِ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہو جیسے پھول چمن میں گلاب کا

وہ پھولنا شفق کا وہ ضیائے لاجورد　　مخمل سی وہ گیا وہ گلِ سبز و سرخ و زرد
رکھتی تھی پھونک کر قدم اپنا ہوائے سرد　　یہ خوف تھا کہ دامنِ گل پر پڑے نہ گرد
دھوتا تھا دل کے داغ چمن لالہ زار کا
سردی جگر کو دیتا تھا سبزہ کچھار کا

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور　　دیکھے تو غش کرے ارنی گوئے اوجِ طور
پیدا گلوں سے قدرتِ اللہ کا ظہور　　وہ جا بجا درختوں پر تسبیح خواں طیور
گلشن خجل تھے وادیِ مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار　　پھولوں پہ جا بجا وہ گہر ہائے آب دار
اٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار　　بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار
خواہاں تھے زیب گلشن زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے

جہاں گرمی کی شدت اور تمازت و طپش کا بیان کرتے ہیں انیسؔ کے الفاظ لو دینے لگتے ہیں۔

وہ لو، وہ آفتاب کی شدت وہ تاب و تب　　کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثالِ شب
خود نہرِ علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب　　خیمے تھے جو حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب
اُڑتی تھی خاک خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

شیر اُٹھتے تھے نہ دھوپ کے مارے کچھار سے　　آہو نہ منہ نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدّر غبار سے　　گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے
گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھُن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

جذبات کی عکاسی: خارجی اشیاء کی تصویر کشی سے کہیں زیادہ مشکل چیز انسانی جذبات مثلاً درد والم، خوشی ومسرت، غم وغصہ، الفت ورقابت، بیم ورجا اور انہیں جیسے جذبات کی عکاسی ہے۔ لیکن انیسؔ کا کمال یہ ہے کہ ان جذبات کی وہ منہ بولتی تصویریں کھینچی ہیں کہ باید وشاید۔ میر انیسؔ کے مرثیوں سے انہیں جذبات کی ترجمانی کے لیے کچھ اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔ اختصار ملحوظِ خاطر رکھنے کے سبب صرف چند ایک اقتباسات پر قناعت کی جاتی ہے۔

بیٹی کی جدائی: مدینے سے رخصت کے وقت شاید قسمت کو یہی منظور تھا کہ امام حسینؑ اپنی بیٹی صغریٰ کو سفر میں نہ شامل کر سکیں اور مدینے ہی میں چھوڑ دیں۔ واقعہ یہ تھا کہ بی بی صغریٰ سخت علیل ہو گئی تھیں اور سفر کرنے کے قابل نہ تھیں۔ ایسے موقع پر امام حسینؑ کو اپنی اس بیٹی کو چار و ناچار مدینہ میں چھوڑنا پڑا۔ اس واقعہ کو بھی مرثیہ نگاروں نے اپنے مرثیہ کی زینت بنایا ہے۔ ظاہر ہے کہ باب شہادت حسینؑ کی پہلی سرخی یہی واقعہ ہے۔ کسی المیہ کو مزید پُر الم بنانے کے لیے اس واقعہ کی ابتداء کچھ کم درد انگیز نہیں چنانچہ میر انیسؔ نے بھی اس واقعہ کو نظم کیا ہے اور حق تو یہ ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔ چند ایک اقتباسات ملاحظہ ہوں جس میں جذبات کی عکاسی دیدنی ہے فرماتے ہیں:

کہہ کے یہ سخن بیٹھ گئے سیّد خوش خُو — اور سورۂ الحمد پڑھا تھام کے بازو
بیمار نے پائی گلِ زہرا کی جو خوشبو — آنکھوں کو تو کھولا پہ ٹپکنے لگے آنسو
ماں سے کہا مجھ میں جو حواس آئے ہیں اماں
کیا میرے مسیحا میرے پاس آئے ہیں اماں

شبیرؑ کا منہ تکنے لگی بانوئے مغموم — صغراؔ کے لیے رونے لگیں زینبؑ وکلثومؑ
بیٹی سے یہ فرمانے لگے سیّدِ مظلوم — پردہ رہا کیا اب تمہیں سب ہو گیا معلوم
تم چھٹتی ہو اس واسطے سب روتے ہیں صغراؔ
ہم آج سے آوارہ وطن ہوتے ہیں صغراؔ

لُو چلتی ہے خاک اُڑتی ہے گرمی کے ہیں ایام — جنگل میں نہ راحت نہ کہیں راہ میں آرام
بستی میں کہیں صبح تو جنگل میں کہیں شام — دریا کہیں حائل کہیں پانی کا نہیں نام
صحت میں گوارا ہے جو تکلیف گزر جائے

اس طرح کا بیمار نہ مرتا ہو تو مرجائے

وہ بات نہ ہوگی کہ جو بے چین ہو مادر — ہر صبح میں پی لوں گی دوا آپ بنا کر
دن بھر مری گودی میں رہیں گے علی اصغرؑ — لونڈی ہوں سکینہ کی نہ سمجھو مجھے دختر
میں یہ نہیں کہتی کہ عماری میں بٹھادو
بابا مجھے فضہ کی سواری میں بٹھادو

شہ بولے کہ واقف ہے مرے حال سے اللہ — میں کہہ نہیں سکتا مجھے درپیش ہے جو راہ
کھل جائے گا یہ راز بھی گر تم نہیں آگاہ — ایسا بھی کوئی ہے جسے بیٹی سے نہیں چاہ
ناچار یہ فرقت کا الم سہتا ہوں صغراؑ
ہے مصلحتِ حق یہی جو کہتا ہوں صغراؑ

درجِ ذیل بند جذبات نگاری کی معراج ہے۔ بی بی صغراؑ اپنے ششماہے بھائی علی اصغرؑ کو مخاطب کر کے تنبیہہ کے انداز میں کہتی ہیں کہ کوئی میری درخواست پر غور نہیں کرتا۔ ایک تم ہو سو تمہیں بات کرنی نہیں آتی۔ اب بتلاؤ کسے اپنی بپتا سناؤں۔

بند ملاحظہ ہو:

تم جاتے ہو ساتھ اور بہن جا نہیں سکتی — تپ ہے تمہیں چھاتی سے بھی لپٹا نہیں سکتی
جو دل میں ہے لب پر وہ سخن لا نہیں سکتی — رکھ لوں تمہیں اماں کو بھی سمجھا نہیں سکتی
بے کس ہوں مرا کوئی مددگار نہیں ہے
تم ہو سو تمہیں طاقتِ گفتار نہیں ہے

بیٹے کی جدائی: حضرت علی اکبرؑ میدانِ وغا کی اجازت کے لیے حاضر ہوتے ہیں، ایسے موقع پر میر انیسؔ بیٹے سے جدائی کا ایک دل دوز منظر پیش کرتے ہیں۔ بند ملاحظہ ہو:

مومنو مرنے کو ہم شکل نبی جاتا ہے — دولتِ بانوئے بے کس پہ زوال آتا ہے
کیا الم ہے کہ جگر سینے میں تھراتا ہے — داغ بیٹے کا فلک باپ کو دکھلاتا ہے
ماں تڑپتی ہے شہِ جن و بشر روتے ہیں
کس جواں بیٹے سے ماں باپ جدا ہوتے ہیں

ایسے نازک موقع پر حضرت علی اکبرؑ کی والدہ اجازت دینے میں کچھ تامّل کرتی ہیں، وجہ ظاہر ہے اب تک جو کوئی بھی میدان میں گیا ہے اس کی لاش واپس آئی ہے۔ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے حضرت علی اکبرؑ نہایت مؤثر انداز میں اپنی عرض پیش کرتے ہیں۔ کس قدر مناسبِ حال ہیں یہ کلمات کس قدر درد ہے ان لفظوں میں مُلاحظہ ہو:

سب نے قرباں کیے زہرا کے پسر پر فرزند　　کٹ گئے تیغوں سے کس کس کے جگر کے پیوند
میں نے چاہا تھا کہ ہو آپ کا بھی نام بلند　　پر تعجب ہے کہ آئی نہ مری عرض پسند
آپ کہتی ہیں نہ جاؤ تو نہ جائیں گے ہم
اپنے ہم چشموں میں پھر منہ نہ دکھائیں گے ہم

حضرت علی اکبرؑ کی ماں موقع کی نزاکت، مقصد کی عظمت، شہادت مقدر ہونے اور امامِ مظلوم کی غریب الوطنی اور تنہائی دیکھ کر اجازت دے دیتی ہیں۔ ایسے موقع پر انیسؔ جس قادر الکلامی سے جذبات و احساسات کی ترجمانی اور عکاسی کرتے ہیں وہ دیدنی ہے۔ فرماتے ہیں:

سن کے ماں سے یہ سخن قدموں پہ فرزند گرا　　عرض کی آپ سے روٹھوں مرا مقدور ہے کیا
ماں نے چھاتی سے لگا کر کہا صدقے بیٹا　　جاؤ رخصت بھی کیا دودھ بھی تم کو بخشا
غم نہ کھانا کہ یہ ماں رو رو کے مر جائے گی
ساتھ دو باپ کا ماں کی بھی گزر جائے گی

درج ذیل بند حضرت علی اکبرؑ کے وداع کا منظر ہے۔ یہ جذباتی شاعری کا شاہکار ہے۔ مزید کچھ لکھنا سورج کو چراغ دکھانے والی بات ہے۔ بند ہے۔

در پہ موجود سواری کو جو تھا اسپ عُقاب　　جوڑ کر ہاتھ کہا شاہ سے با چشمِ پُر آب
فدوی اسوار ہو لے جائیں جو تشریف جناب　　بولے شبہ تم بڑھو گھوڑے پہ میں تھاموں گا رکاب
باپ نے پاؤں کو گر ہاتھ لگایا تو کیا
کاندھے پر چڑھتے تھے گھوڑے پر چڑھایا تو کیا

امام حسینؑ کی آخری رخصت: حضرت امام حسینؑ آخری رخصت کو خیامِ اہلِ بیت میں تشریف لاتے ہیں۔ بیوی، بہنیں اور بیٹیاں گھیرے ہوئے ہیں۔ منظر نہایت دل دوز ہے، انیسؔ نے

جس انداز سے اس منظر کی عکاسی کی ہے وہ یقیناً قابلِ دید بھی ہے اور قابل ستائش بھی فرماتے ہیں:۔

پیارے نہ تھے حسین علیہ السلام کے　　لائی حرم سرا میں بہن ہاتھ تھام کے
تھرا رہے تھے پاؤں شہِ تشنہ کام کے　　سردوش پر تھا زینب عالی مقام کے
فرماتے تھے بہن علی اکبر گزر گئے
ہم ایسے سخت جاں تھے کہ اب تک نہ مر گئے

آخری رخصت سے پہلے امام حسینؑ خیامِ اہل بیت میں تشریف لاتے ہیں۔ زخمی، نڈھال، بے آس، بے سہارا، سارے عزیز مر چکے، سب رفیق بچھڑ چکے۔ کون ہے جو حسینؑ کی آواز پر لبیک کہے، کون ہے جو حسینؑ کا ساتھ دے۔ دشمنوں کی یلغار ہے اور حسینؑ یکہ وتنہا۔ ایسے موقع پر اہلِ بیت میں کیا کہرام بپا ہوگا۔ عورتوں اور بچوں کا کیا حال ہوگا۔ صرف شاعر کا ذہن ہی اس موقع کی تصویر کھینچ سکتا ہے۔ چند ایک اقتباسات ملاحظہ ہوں جن میں جذبات واحساسات اپنے بند توڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

سر بارِ دوش ہے ہمیں رخصت کرو بہن　　اب عنقریب خیمۂ عصمت ہیں تیغ زن
مردے پڑے ہوئے ہیں عزیزوں کے بے کفن　　پامال ہو نہ لاشۂ فرزندِ صف شکن
محجوب ہم ہیں قاسمِ بے پر کی روح سے
شرمندگی نہ ہو علی اکبرؑ کی روح سے

یہ سن کے بیبیوں کے جگر پر چھری چلی　　زینب زمیں پر گر کے پکاری کہ یا علیؑ
سرخفی جہاں کے ہیں سب آپ پر جلی　　جاتا ہے سرکشوں میں یہ کونین کا ولی
بے کس کو آسرا ہے پسر کا نہ بھائی کا
آقا یہی تو وقت ہے مشکل کشائی کا

صدقے گئی پسر کے بچانے میں کد کرو　　فرزندِ فاطمہؑ کی بلاؤں کو رد کرو
دریا کو چھین لو حق زہراؑ سند کرو　　یا شیرِ حق مقامِ مدد ہے مدد کرو
پانی پہ جنگ آگ لگی ہے یہ دہر میں
حصہ پسر کا کیا نہیں مادر کے مہر میں

حضرت امام حسینؑ کو اپنی چھوٹی بچی سکینہ سے بڑی محبت تھی۔ بچی کو اس وقت تک نہ نیند آتی تھی

جب تک کہ باپ اپنی چھاتی پر نہ سلالے۔ ایسی چہیتی بچی کو حضرت امام حسینؑ رخصت کے وقت سمجھاتے ہیں اور دلاسہ دیتے ہیں۔ شاید یہ مبالغہ نہ ہو کہ جذبات کی اس سے بہتر عکاسی کسی بھی شاعری میں ممکن ہو سکے۔ یہ خیال رہے کہ ایک مجبور باپ اپنی چہیتی بچی کو جس کی عمر بڑی تھوڑی ہے میدانِ جنگ میں جانے سے پہلے سمجھا رہا ہے اور میدانِ جنگ بھی ایسا، جہاں سے زندہ سلامت کوئی واپس نہیں آتا۔ بند کا زور ملاحظہ ہو۔ بغیر چشمِ نم پڑھا نہیں جا سکتا۔

ضد کرکے روئیو نہ ہمیں چاہتی ہو گر　　جانا ہے دور شب کو جو آنا نہ ہو اِدھر
سو رہیو ماں کی چھاتی پہ غربت میں رکھ کے سر　　پہلے پہل ہے آج شبِ فرقتِ پدر
راحت کے دن گزر گئے یہ فصل اور ہے
اب یوں بسر کرو جو یتیموں کا طور ہے

شہر بانو جو امام حسینؑ کی زوجہ ہیں اور ایران کے بادشاہ یزدگرد کی بیٹی ہیں۔ آخری رخصت کے وقت ان لفظوں میں عرض کرتی ہیں۔ بند ہے:

مشہور ہوں کنیزِ امامِ فلک مقام　　میں وہ ہوں جو کہ قید میں آئی تھی یا امام
گر قید ہوگئی تو کہیں گے یہ خاص و عام　　پاس آپ کے ہے بابا کا اے قبلۂ انام
بندی چلی ہے شام کو آلِ رسولؐ کی
دیکھو یہی بہو ہے علیؓ و بتولؓ کی

درج بالا بندوں میں جو زور، جو سلاست، جو حسن اور جو قدرتِ بیان ہے وہ اس بات کے متقاضی ہے کہ انیسؔ کی قادر الکلامی کو جس قدر سراہا جائے کم ہے۔ اس کے علاوہ جذبات و احساسات کی جتنی لطیف سے لطیف تہیں ہو سکتی ہیں انیسؔ کے موئے قلم نے انہیں پوری طرح اجاگر کیا ہے۔ یہ انیسؔ کی شاعرانہ قدرت کا کمال ہے۔

باوفا بھائی کے آخری لمحات: حضرت امام حسینؑ نے جب اپنے بھائی اور علمدارِ لشکر حضرت عباسؑ کی صدائے استغاثہ سنی تو اپنے بیٹے حضرت علی اکبرؑ کی معیت میں فوجِ اشقیا کی طرف دوڑے۔ یہ اضطراری کیفیت جس میں باوفا بھائی کی ساری محبت سموئی ہوئی ہے بیان سے باہر ہے۔ امام حسینؑ بیٹے کے سہارے مضطرب و حیراں اور افتاں و خیزاں بھائی کے لاشے پر پہنچتے

ہیں جو دم توڑ رہا ہے۔ بند ملاحظہ ہو۔

القصہ لائے باپ کو اکبر ترائی میں　　زخمی ملا وہ شیرِ دلاور ترائی میں
پائی جو بوئے خونِ برادر ترائی میں　　لاشے کے پاس گر پڑے سرور ترائی میں
گزری تھی عمر ہاتھ جسے جوڑتے ہوئے
دیکھا اسی کو خاک پہ دم توڑتے ہوئے

حضرت امام حسینؑ اپنے دلاور اور باوفا بھائی کے لاشے پر بین کرتے ہیں۔ اس منظر کو انیسؔ یوں ادا کرتے ہیں۔ لفظوں کا اتھاہ درد ملاحظہ ہو:۔

ٹھہرو عنانِ توسنِ عمرِ رواں نہ لو　　ساتھی تھکا ہوا ہے رہِ کارواں نہ لو
کروٹ کراہ کر مرے آرام جاں نہ لو　　لگتی ہے چوٹ دل پہ مرے ہچکیاں نہ لو
مر جاؤں گا میں ساتھ اگر چھوٹ جائے گا
بھائی مرا تو رشتۂ جاں ٹوٹ جائے گا

حضرت عباسؑ کے آخری لمحات میر انیسؔ کے الفاظ میں ملاحظہ ہوں:

یہ کہہ کے چپ ہوئے تھے کہ اٹھا جگر میں درد　　رخسار سرخ سرخ جو تھے ہوگئے وہ زرد
لیں کروٹیں تو بھر گئی زخموں میں رن کی گرد　　منہ رکھ کے شہ کے پاؤں پہ کھینچی اک آہِ سرد
دنیا سے انتقالِ علمدار ہوگیا
سردارِ فوج بے کس و بے یار ہوگیا

حضرت علی اکبر کے آخری لمحات: حضرت امام حسینؑ اپنے بیٹے کی پکار پر میدانِ جنگ کی طرف دوڑتے ہیں۔ تمام عالم آنکھوں کے سامنے اندھیر ہے۔ بیٹے کا لاشہ کہیں نظر نہیں آتا۔ میر انیسؔ اسی دردناک منظر کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہ بند امام حسینؑ کے اضطراری کیفیت کی منہ بولتی تصویر ہے۔ انیسؔ نے جو درد اس میں سمویا ہے وہ بیان سے باہر ہے بند ملاحظہ ہو:

جنگل سے بے حواس پھرے نہر پر گئے　　واں بھی جو وہ گہر نہ ملا سوئے مر گئے
دوڑے کسی طرف تو کسی جا ٹھہر گئے　　تھالے ملے لہو کے برابر جدھر گئے
ٹپکا ہوا زمیں پہ جگر کا لہو ملا

لیلیٰ کہیں نہ وہ پسرِ ماہ رُو ملا

دم توڑتے ہوئے بیٹے کی تصویر انیس کی زبانی ملاحظہ کریں:

دیکھی عجیب حالتِ فرزندِ نوجواں پیکاں گلے میں ہونٹوں پہ نکلی ہوئی زباں
تن پر جراحتِ تبر و خنجر و سناں گردن تھی کج پھری ہوئی آنکھوں کی پتلیاں
ٹاپوں سے مرکبوں کے جراحت پھٹے ہوئے
چہرہ سفید خاک میں گیسو اَٹے ہوئے

اس ذیل میں چند ایک بند اور ملاحظہ ہوں۔ حضرت علی اکبرؑ کے دمِ واپسیں کا جو منظر انیس نے کھینچا ہے درد آشنا دل ہی خوب اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس میں کتنا زور ہے۔

غش میں جونہی سنا علی اکبر نے ماں کا نام کس یاس کی نگاہ سے دیکھا سوئے خیام
سوکھی زباں دکھا کے یہ بولا وہ تشنہ کام شدت یہ پیاس کی ہے کہ دشوار ہے کلام
اب اور کوئی دم کا پسر میہمان ہے
امداد یا حسینؑ کہ پانی میں جان ہے

فرمایا شہ نے اے علی اکبرؑ میں کیا کروں پانی نہیں ہے مجھ کو میسر میں کیا کروں
گھیرے ہیں نہر کو یہ ستمگر میں کیا کروں کچھ بس نہیں مرا مرے دلبر میں کیا کروں
اعدا نہ دیں گے بوند اگر لاکھ کد کریں
بیٹا تمہاری ساقیِ کوثر مدد کریں

میر انیس حضرت علی اکبرؑ کے دم توڑنے کا منظر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:

حضرت یہ کہتے تھے کہ چلا خلق سے پسر اتنی زباں ہلی کہ خدا حافظ اے پدر
ہچکی جو آئی تھام لیا ہاتھ سے جگر انگڑائی لے کے رکھ دیا شہ کے قدم پہ سر
آباد گھر لٹا شہِ والا کے سامنے
بیٹے کا دم نکل گیا بابا کے سامنے

انیس کی مصورانہ قدرت: انیس نے لفظوں کی مدد سے ایسی منہ بولتی تصویریں کھینچی ہیں جو شاید ایک مصور کا قلم بھی اس بانکپن سے نہ کھینچ سکے۔ ترائی کے علاقے میں جہاں زمین اونچی نیچی

ہوتی ہے ایک چابکدست سوار کی شہسواری کا اس سے بہتر اور کیا منظر ہوسکتا ہے ملاحظہ ہو:۔

برچھیوں اڑتا تھا دب دب کے فرس رانوں سے
آنکھ لڑ جاتی تھی دریا کے نگہبانوں سے

قاعدہ ہے کہ جب بچہ سہم جاتا ہے تو اپنے بڑوں سے لپٹ جاتا ہے یہ بچوں کی نفسیات ہے، چنانچہ حضرت علی اصغرؑ کے دمِ واپسیں کا منظر اس سے زیادہ فطری اور حسبِ حال کیا ہوسکتا ہے۔ جیسا درج ذیل ہے یہ خیال رہے کہ مصورانہ بانکپن شعر کے بند توڑ رہا ہے۔

دکھائی شکل اجل نے تو ڈر گئے اصغرؑ
لپٹ کے باپ کی چھاتی سے مر گئے اصغرؑ

حضرت امام حسین اپنے ششماہے بچے کا لاشہ لے کر خیمۂ اہلِ بیتؑ میں داخل ہوتے ہیں۔ بچے کی ماں، بچے کی خیریت پوچھتی ہے۔ حسینؑ سے کچھ جواب نہیں بن پڑتا۔ اس دلدوز منظر کی انیسؔ کے لفظوں میں عکاسی ملاحظہ فرمایئے۔

یہ شرم کیسی ہے للہ بولئے صاحب
مرے پسر کا ذرا منہ تو کھولئے صاحب

حسینؑ مظلوم کیا جواب دیتے، بچے کا لاشہ ہاتھوں پر ہے۔ ماں بچے کا منہ عبا کا دامن ہٹا کر دیکھتی ہے اور منہ پیٹ لیتی ہے۔

اس منظر کی تصویر جس میں درد والم کی رنگ آمیزی پورے شباب پر ہے ملاحظہ ہو۔

منہ اپنا بانو نے پیٹا تو کٹ گئے شبیرؑ
لٹا کے خاک پہ اصغرؑ کو ہٹ گئے شبیرؑ

ہنگامِ عصر ہے، سب یار وانصار مر چکے، سارے عزیز و دلبند جان جانِ آفریں کے سپرد کر چکے، حسین یکا و تنہا ہیں، زخموں سے چور اور نڈھال ہیں ایسے موقعہ پر کوئی حسینؑ مظلوم کا تعارف چاہتا ہے۔ بھلا حسینؑ اس سے بہتر اپنا تعارف ایسے موقع پر کیا کرا سکتے تھے۔ یاد رہے کہ درج ذیل بیت کی مصورانہ خوبی اپنی جگہ مسلّم اور بیت کا حزن دیدنی ہے۔

یہ تو نہ کہہ سکے شہ مشرقین ہوں
مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسینؑ ہوں

رزمیہ شاعری: میر انیسؔ سے قبل اردو زبان رزمیہ شاعری سے عاری تھی۔ میر ضمیر کی مساعی اس ضمن میں نہ ہونے کے برابر ہیں، انیسؔ نے رزمیہ شاعری اردو زبان میں اپنی پوری تابنا کی کے ساتھ شامل کی۔

رزمیہ شاعری کا ایک خاص انداز ہے۔ اس کے الفاظ، اس کا طرزِ ادا، اس کے بیان کی گرمی، غرض اس کا ہر عنصر عام شعری قوام سے مختلف ہوتا ہے۔ انیسؔ نے ان تمام عناصرِ شعری کو اردو رزمیہ میں نہ صرف تمام وکمال تک پہنچایا بلکہ سچ پوچھیے تو اسے فارسی اور عربی شاعری سے بلند تر کر دیا۔

میدانِ جنگ میں مبارز طلبی، مخالف کا جواب، حملہ آوروں کی یورش، دو حریفوں کی جنگ، آلاتِ حرب، جنگ کا ساز وسامان غرض میدانِ جنگ کی جزئیات کا بیان اس انداز سے کیا جائے کہ جنگ کا ہو بہو نقشہ کھنچ جائے، انیسؔ اس فن میں طاق نظر آتے ہیں۔ میدانِ جنگ کی وہ بصری تصویریں کھینچتے ہیں کہ الفاظ لو دینے لگتے ہیں۔ قاری کے سامنے تمام منظر اتنی شدت، ہولنا کی، جوش، حرارت اور اولوالعزمی کے ساتھ سامنے آ جاتا ہے۔ میر انیسؔ نے سیکڑوں انداز سے تلوار اور گھوڑے کی تعریف کی ہے لیکن ہر بیان اپنے اندر ایک نیا بانکپن رکھتا ہے۔ میر انیسؔ کے رزمیہ کا یہی کمال ہے۔

بہت سے اقتباسات ایسے پیش کیے جا سکتے ہیں۔ جن میں بخوبی دکھلایا جا سکتا ہے کہ میر انیسؔ کس شان سے فوجوں کا جمع ہونا، دو حریفوں کی جنگ، ان کی مبارز طلبی، طرفین کا جواب، فنِ حرب کے باریک باریک جزئیات کا بیان قالبِ شعر میں اس طرح ڈھالتے ہیں کہ ان کی رزمیہ شاعری میں جنگ کی صحیح روح پوری طرح جاری وساری نظر آتی ہے۔ اس رزمیہ میں وہ زور ہے کہ اسے دنیا کی بڑی سے بڑی رزمیہ شاعری کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اختصار کے پیشِ نظر صرف دو دو بند رزمیہ کے ہر عنصر کو اجاگر کرنے کے لیے پیش کیے جاتے ہیں۔ انیسؔ نے ہر جنگ میں گھوڑے اور تلوار کی نئے نئے ڈھنگ سے تعریف کی ہے۔ اختصار کے پیشِ نظر مثال کے لیے صرف دو دو بند اس ذیل میں پیش کئے جائیں گے۔

ہنگامۂ جنگ: میر انیس نے ہنگامۂ جنگ کی جب کہ دو فوجیں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی ہوں بڑی منہ بولتی تصویریں کھینچی ہیں اس قبیل کے چند ایک بند ملاحظہ ہوں۔

کانپے طبق زمیں کے ہلا چرخِ لاجورد　　مانندِ کہربا ہوا مٹی کا رنگ زرد
اٹھ کر زمیں سے بیٹھ گئی زلزلے میں گرد　　تیغوں کی آنچ دیکھ کے بھاگی ہوائے سرد
گرمی سے رن کی ہوش اڑے وحش و طیر کے
شیر اس طرف اُتر گئے دریا کو پیر کے

گھوڑوں سے گونجتا تھا وہ سب وادیٔ نبرد　　گردوں میں مثل شیشۂ ساعت بھری تھی گرد
تھا چرخِ چارمیں پہ رُخِ آفتاب زرد　　ڈر تھا گرے زمیں پہ نہ مینائے لاجورد
گرمی ہجومِ فوج سے دو چند ہوگئی
خاک اس قدر اڑی کے ہوا بند ہوگئی

یورش کا زور: حسینی سپاہ کی یورش نے مخالف فوج میں ایک تلاطم برپا کردیا ہے۔ صفیں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوگئی ہیں، پسپائی کا وہ عالم ہے کہ سپاہی دوسرے کی طرف مڑکرنہیں دیکھتا۔ اس بھگدڑ میں فرات کے پانی میں وہ ہلچل ہے کہ دریائی جانور تہہ میں بیٹھ گئے ہیں۔ میر انیسؔ اس منظر کی یوں عکاسی فرماتے ہیں۔

تھا فوجِ قاہرہ میں تلاطم کے الحذر　　تھیں فوج کی طرح سب ادھر کی صفیں اُدھر
چکر میں تھی سپاہ کہ گردش میں تھا بھنور　　پانی میں تھے نہنگ ابھرتے نہ تھے مگر
فوجیں فقط نہ بھاگی تھیں منہ موڑ موڑ کے
دریا بھی ہٹ گیا تھا کنارے کو چھوڑ کے

رجز: بھرپور جنگ سے قبل عرب کا دستور تھا کہ فوج سے ایک بہادر نکلتا اور مخالف فوج سے مبارز طلبی کرتا۔ اس مبارز طلبی کو عربی اصطلاح میں رجز کہتے ہیں۔ رجز میں ایک بہادر دوسرے کو جنگ کے لیے للکارتا ہے۔ اپنا نام ونسب بتاتا ہے، اپنی تلوار کی کاٹ باڑہ کا ذکر کرتا ہے، اپنی اور اپنے خاندان کی اصابتِ نسبی اور بہادری کے ترانے گاتا ہے اور اس طرح اپنا سکّہ فوجِ مخالف پر جماتا ہے۔ میر انیسؔ نے سیکڑوں رجز نظم کیے ہیں جو کہ فرد کی مناسبت سے اپنے زور اور آہنگ میں مختلف ہیں چنانچہ وہ رجز جو حضرت امام حسینؑ کی زبانِ اقدس سے نکلتا ہے اس کا انداز اور اس کے تیور ملاحظہ ہوں۔ بند حسب ذیل ہے۔

میں ہوں سردارِ شبابِ چمنِ خلد بریں　　　میں ہوں انگشترِ پیغمبرِ خاتم کا نگیں
میں ہوں خالق کی قسم دوشِ محمدؐ کا مکیں　　　مجھ سے روشن ہے جہاں مجھ سے منور ہے زمیں

ابھی نظروں سے نہاں نور جو میرا ہوجائے
محفلِ عالمِ امکاں میں اندھیرا ہوجائے

حضرت امام حسینؑ جو نیابتِ الٰہی کے سزوار ہیں ان کی مبارزطلبی کی شان کا کیا کہنا اور جب ذاتی افتخار پر اُتر آئیں تو کیا کچھ نہیں کہہ سکتے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ بند ملاحظہ ہو:

دنیا ہو اک طرف تو لڑائی کو سر کروں
آئے غضب خدا کا ادھر رخ جدھر کروں
ے جبرئیل کار قضا و قدر کروں
انگاک اشارہ سے شق القمر کروں
طاقت اگر دکھاؤں رسالتمآب کی
رکھ دوں زمین پہ صبر کے ڈھال آفتاب کی

فن حرب کا مظاہر

میر انیس کو فن حرب میں کافی دستگاہ حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے آپکی بیان کردہ دست بدست جنگیں شمشیر زنی اور تیر انگنی کے طریقے، نیزوں اور بھالوں کا استعمال، ہر چیز نہایت ناپ تول کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ درج ذیل بند میں میر انیس آلات حرب کے مختلف استعمالات پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک جنگی منظر کو بے کم وکاست طور پر پیش کرتے ہیں۔

بھالا سنبھالا دشمنِ ایماں نے مل کے ہاتھ　　　نیزے کے چار پانچ نکالے سنبھل کے ہاتھ
پہلے ہی بک چکا تھا ستمگر اجل کے ہاتھ　　　بڑھتا نہ تھا جو پاؤں تو رکھتا تھا مل کے ہاتھ

کم تھے نہ یہ بھی زور میں گروہ زیاد تھا
نیزے کے بند بند کا توڑ ان کو یاد تھا

گھوڑے کی تیزی: میر انیسؔ نے گھوڑے کی تیزی، سبک روی، حسن، چال ڈھال، آؤ جاؤ کے لاتعداد نقشے کھینچے ہیں۔ ہر نقشہ اپنے اندر ایک عجیب بانکپن رکھتا ہے۔ اس سلسلہ میں دو بند ملاحظہ ہوں۔ مشتے از خروارے والی بات ہے۔

سمٹا، جما، اڑا اِدھر آیا اُدھر گیا چمکا، پھرا، جمال دکھایا، ٹھہر گیا
نیزوں سے اُڑ کے برچھیوں میں بے خطر گیا برہم کیا صفوں کو پرے سے گزر گیا
گھوڑوں کا تن بھی ٹاپ سے اس کے فگار تھا
ضربت تھی نعل کی کہ سروہی کا وار تھا

پھرتا تھا کیا صفوں میں فرس جھوم جھوم کے سرعت بلائیں لیتی تھی منہ چوم چوم کے
پامال تھے پرے سپہ شام و روم کے غُل تھا کہ غول ہیں پسرِ سعدِ شوم کے
رخش ایسا روم ورَے میں نہیں شام میں نہیں
یہ شوخیاں تو ابلقِ ایام میں نہیں

تلوار کی تعریف: جس طرح میر انیسؔ نے گھوڑے کی صدہا انداز سے تعریف کی ہے بالکل اسی طرح تلوار کی کاٹ باڑھ، برش اور تیزی کی خوب خوب تصویریں کھینچی ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

چمکی، گری ، اٹھی اِدھر آئی اُدھر گئی خالی کیے پرے تو صفیں خوں میں بھر گئی
کاٹے کبھی قدم کبھی بالائے سر گئی ندی غضب کی تھی کہ چڑھی اور اتر گئی
غل تھا یہ کیا ہے آج جو قہرِ صمد نہیں
ایسا تو رودِ نیل میں بھی جزر و مد نہیں

کیا کیا چمک دکھاتی تھی سر کاٹ کاٹ کے تنتی تھی بس تنوں سے زمیں پاٹ پاٹ کے
پانی وہ خود پئے ہوئے تھی گھاٹ گھاٹ کے دم اور بڑھ گیا تھا لہو چاٹ چاٹ کے
کیا جانیے ملا تھا مزہ کیا زبان کو
کھا جاتی تھی ہما کی طرح استخوان کو

اسپنسر سے تقابل: جیسا عرض کیا جا چکا ہے انیسؔ محسوسات سے بھرپور دماغ رکھتے ہیں اور اس بات کی قدرت رکھتے ہیں کہ ہر قسم کے محسوسات کو احاطۂ ادراک میں لاسکیں۔

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی تعریف کے مستحق ہیں کہ انھوں نے انیسؔ کے اس جوہر کو بجا طور پر سراہا ہے۔اس موقع پر انھیں نکات کا دوبارہ بیان ظاہر ہے ایک غیر ضروری سی بات ہوگی۔

انیسؔ بیانیہ شاعری کے بادشاہ ہیں اور دنیا کے بڑے سے بڑے بیانیہ شاعر سے کسی طرح پیچھے نہیں۔انگریزی شاعری میں اسپنسر آپ کا صحیح معنوں میں مدِ مقابل ہوسکتا ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے اس معاملہ میں سولہویں صدی کا انگلینڈ انیسویں صدی کے لکھنؤ میں دوبارہ جنم لے لیتا ہے۔

قبل اس کے کہ کوئی تقابل کیا جائے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اڈمنڈ اسپنسر کی شخصیت اور شاعری کے متعلق کچھ روشنی ڈال دی جائے۔

بقول ایک نقاد کے اسپنسر اُن شعرا انگلینڈ کا قافلہ سالار ہے جو سولہویں صدی میں پیدا ہوئے اور جن پر انگریزی شاعری کو بجا طور پر ناز ہونا چاہیے۔شیکسپیرؔ انگلینڈ کے منصۂ شہود پر (Faery Queene) اور ہوکر کی Ecebsiasticol Polity کے مطبوع ہونے کے فوراً بعد ظاہر ہوا۔یہ زمانہ ۱۵۹۷ء کے فوراً بعد کا ہے۔اس وقت انگلینڈ ہر قسم کی ترقیاتی تابناکی سے منور تھا۔اسپنسر دراصل ماضی کو مستقبل سے مربوط کرنے کے فرائض انجام دیتا ہے۔

اسپنسر کی شاعری میں ایک قاری کہانی کے رواں بیان سے مبہوت ہوجاتا ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتا ہے وہ ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ہر قسم کے منظر نظروں کے سامنے پھر جاتے ہیں۔ہر قسم کے کردار پوری طرح اجاگر نظر آتے ہیں۔(Faery Queene) کی پوری نظم عمدہ منظر کشی، بہتر کردار نگاری اور حسین شخصی، واقعاتی اور بصری مرقعوں سے بھرپور ہے۔اس میں اعلیٰ شعری فکر اور حقیقت بیانی کا بہترین سنجوگ ملتا ہے۔

اسپنسر کو انگریزی ادب میں شاعروں کا شاعر کہنا بالکل حق بجانب ہے۔

درج بالا بیان کی روشنی میں اب یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انیسؔ اور اسپنسر کا موازنہ کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ حسنِ شعریت کا کہاں تک دونوں فنکاروں نے بول بالا کیا ہے۔

صبح کی منظر کشی دونوں صاحبِ فن شاعروں نے اپنے اپنے طور پر کی ہے۔مناسب معلوم ہوتا ہے کہ موازنہ صبح کی منظر کشی سے کیا جائے۔ایک قاری جسے شاعری کی تفہیم کا اچھا مذاق ہے دونوں شاعروں کی الگ الگ بندش سے صحیح طور پر لطف اندوز ہوسکتا ہے۔

اسپنسر کی نظم (Faery Queene) کی کتابِ اول کے کینٹو دوئم کے ایک بند کے چند

مصرعے ملاحظہ ہوں۔

Now when the rosy - fingered morning faire,
Weary of Aged Tithones saffron bed,
Had spread her purple robe through dewy air,
And the high hills Titan discovered.

درج بالا مصرعوں کا اردو نثر میں ترجمہ کرنا حسنِ شعریت کو مجروح کرنے والی بات ہے۔ البتہ اسی منظر کو اب انیس کی زبان سے سنئے اور زورِ بیان، حسنِ بندش اور منظر کشی کی داد دیجئے۔

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زارِ صبح — گلزارِ شب خزاں ہوا آئی بہارِ صبح
کرنے لگا فلک زرِ انجم نثارِ صبح — سرگرمِ ذکرِ حق ہوئے طاعت گزارِ صبح
تھا چرخِ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہو جیسے پھول چمن میں گلاب کا

دونوں شاعر اپنے اپنے فن کے امام ہیں۔ مگر اس موقع پر انھیں کچھ نمایاں نقاش نظر آتے ہیں جو اپنی تصویر اجاگر کرنے میں کچھ زیادہ شوخ رنگوں کا استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ چار مصرعوں سے بیک گراؤنڈ کے بعد جو آخری بیت میں رنگ آمیزی کی گئی ہے وہ نسبتاً دیدنی ہے اور مصورانہ بوقلمونی کا شاہکار ہے۔

اگر اس موقع پر دونوں شاعروں کے ایک ایک اور صبح کے منظر پیش کر دیئے جائیں تو شاید طوالت کا موجب نہ ہوں۔ (Faery Queene) کے کتاب اول کینٹو پنجم سے ایک اور بند کے چند مصرعے ملاحظہ ہوں۔

At last the golden oriental gate
Of greatest heaven gan to open faire.
And Phoebus fresh as bridegroome to his mate,
Came dancing for the shaking his deawie heir.
And hurls his glistring beams through gloony air.

میر انیسؔ اسی منظر کو درج ذیل لفظوں میں ادا کرتے ہیں۔

خورشید نے جو رُخ سے اٹھائی نقابِ شب — در کھل گیا سحر کا ہوا بند بابِ شب
انجم کی فرد فرد سے لے کر حسابِ شب — دفتر کشائے صبح نے الٹی کتابِ شب
گردوں پہ رنگِ چہرۂ مہتاب فق ہوا

سلطانِ غرب و شرق کا نظم و نسق ہوا

اس میں شک نہیں کہ ان دونوں رشحات کو ایک دوسرے پر ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ دونوں شعراء کے مختلف شاعرانہ ورثے، بیک گراؤنڈ اور حسنِ شعریت دونوں میں جاری وساری ہے۔ یہ قاری کے اپنے ذاتی حسنِ نظر پر مبنی ہے کہ وہ بہتر اور کمتر کا فیصلہ دے البتہ ایک بات بغیر کہے ہوئے بھی نہیں رہی جاسکتی کہ شاید انیسؔ اپنے بیان میں زیادہ کامل نظر آتے ہیں جبکہ وہ منظر کو ہو بہو منعکس کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

کسی ایسے معرکے کی لفظی تصویر جس میں دو حریف نبرد آزما ہوں اور فنِ سپہ گری کا مظاہرہ کررہے ہوں یقیناً کسی شاعر کے لئے کسی حد تک مشکل کام ہے۔ صرف وہی شاعر اس فرض سے عہدہ برا ہوسکتا ہے جو اپنے اندر واقعی شاعرانہ جوہر رکھتا ہو۔ انیسؔ اور اسپنسر دونوں نے ایسے معرکوں کی لفظی تصاویر کھینچی ہیں۔ ایک سیدھا سادھا موازنہ اور تقابل اس بات کی پوری نشاندہی کرے گا کہ دونوں نامور فنکاروں میں کہاں تک یہ بے پایاں جوہر موجود ہے اور ان کا فن اس کا کس حد تک مظاہرہ کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں اسپنسر کی نظم (Faery Queene) کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

And full of hrath, that, with his sharp head speare.
Through vainly crossed shield he quile did puerces.
And had his staggering steed not shronke for feare.
Through shield & Bodie eke he should him heare.
Yet, so great was the prissance his push,
That from his saddle quite he did him beare:
He tumbling radely down to ground did rush,
And from his gored wound a well of blood did gush.

کم و بیش اسی قسم کا منظر میر انیسؔ کے لفظوں میں ملاحظہ ہو۔ یہ یاد رہے کہ اسپنسر کا بند آٹھ مصرعوں کا ہے اور انیسؔ کا صرف چھ مصرعوں کا ہے بہرصورت بند ملاحظہ ہو:

گھوڑا اُڑا کے ہاتھ کو اکبرؔ نے دی تکاں ڈوبی گرہ میں تیرۂ ظالم کی جب سناں
دستِ شقی سے چھوٹ گئی ڈانڈ ناگہاں اللہ دے زور اُٹھ گیا گھوڑے سے پہلواں

نیزے کے ساتھ شور اٹھا اس گروہ سے
لو اژدہے کو لے گیا سیمرغ کوہ سے

اب یہ قاری کی اپنی صوابدید پر منحصر ہے وہ اندازہ کرے کہ کس بند میں زیادہ شاعرانہ خوبیاں

مضمر ہیں۔ البتہ ایک چیز نہایت نمایاں ہے وہ یہ کہ انیس نے روایت اور حقیقت کا ایک لطیف امتزاج کیا ہے جس سے تصویر زیادہ جاذب نظر ہوگئی ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح ایک مصور اپنی تصویر میں دل کشی پیدا کرنے کے لیے خطوط کچھ زیادہ تیکھے اور طویل کر دیتا ہے۔

اسپنسر اور انیس دونوں نے ہنگامہ دار و گیر کی عمدہ تصویریں کھینچی ہیں۔ دونوں بے پناہ فن کار ہیں۔ اس ذیل میں اسپنسر اور انیس کے ایک ایک اقتباس ملاحظہ ہوں۔ اسپنسر اپنی نظم (Faery Queene) میں اس قسم کا منظر درج ذیل لفظوں میں ادا کرتا ہے۔

A Thrilling trompet sounded frome one hye,
And unto batill had themselves addresse.
Their shining shields about their wrest they tie.
And burning blades about their heads and blesse.
The instrument of wrath & heaviness:
With greedy force each after did assayle.
And strike so frercely, that do inpresse
Deep dinted furrows in the battered mayle.
The yron walles toward their blows are weak & frenile.

انیس اسی قسم کا منظر عرب کی جنگی روایت کی روشنی میں یوں کھینچتے ہیں:۔

نقارۂ وغا پہ لگی چوٹ یک بیک — اٹھا غریوِ کوس کہ ہلنے لگا فلک
شہپور کی صدا سے ہراساں ہوئے مَلَک — قرنا پھنکی کہ گونج اٹھا دشت دور تک
شورِ دہل سے حشر تھا افلاک کے تلے
مُردے بھی ڈر سے چونک پڑے خاک کے تلے

ان دونوں اقتباسات پر تنقید کرنا عبث ہے۔ دونوں بیانات اپنے اپنے طور پر مکمل اور بھرپور ہیں۔ اگر اسپنسر سامانِ حرب کے بیان میں زیادہ مخصوص رنگ لیے ہوئے ہے تو انیس کا بیان زیادہ عمومیت کا حامل ہے اور اس طرح انیس اپنی تصویر میں زیادہ دلفریب رنگ بھرتے ہیں۔ دونوں ہی اپنی جگہ پر خوب ہیں اور کسی کو کسی پر فوقیت دینا بیکار ہے۔

انیس بیانیہ شاعری میں ید طولیٰ رکھتے ہیں جیسا اسپنسر کی شاعری سے موازنہ وتقابل میں کسی حد تک اندازہ ہوگیا ہوگا گو کہ انیس کی پوری شاعری بیانیہ شاعری کا بہترین نمونہ ہے۔ تاہم اس کے اندر اور بہت سے عناصر شامل ہیں مثلاً مدح، مبالغہ، کردار نگاری، مکالمے اور بَین انیس کی بیانیہ

شاعری کے دیگر عناصر میں جہاں تک کہ انیسؔ کی بیانیہ شاعری کے کمال کا تعلق ہے انیسؔ کا مشہور مرثیہ جس کا مطلع ہے۔

ہوتے ہیں بہت رنج مسافر کو سفر میں

اس نوع کی شاعری کا بہترین مظہر ہے۔

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی ستائش کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس مرثیہ کی فنی اور ادبی خوبیوں پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں اس قسم کی تنقید اردو زبان میں ایک اضافہ ہے اور اس بات کی متقاضی ہے کہ انہیں خطوط پر ایک بھرپور تحقیقی اور علمی کام کیا جائے جس کی اولیت کا سہرا ڈاکٹر احسن فاروقی کے سر ہے۔

میر انیسؔ اور میرزا دبیر: میر انیسؔ پر کوئی بھی مضمون اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ مرزا دبیر کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ مرثیہ نگاری کے میدان میں میر انیسؔ اور مرزا دبیر ایسے رؤسائے وقت ہیں جن سے کوئی بھی مرثیہ نگار گوئے سبقت نہیں لے جا سکتا۔ تاہم مرزا دبیر کے شاعرانہ زور، تجرِ علمی اور فکرِ رسا کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ مرزا دبیر موروثی شاعر نہ تھے اور میر انیسؔ کی وہ خوبیاں جو انھیں ورثے میں ملی تھیں، یقیناً نہ رکھتے تھے۔ انیسؔ کے خاندان میں یکے بعد دیگر سے پانچ نامور شاعر پیدا ہوئے۔ انیسؔ نے ماں کی گود ہی سے اردو شاعری کا رس شیرِ مادر کی طرح پیا تھا اور اردو شاعری کی صحیح روح اپنے اندر رچائی تھی۔ اس کے علاوہ انیسؔ کے اجداد اردو مرثیہ کے بانی بھی تھے۔ مرزا دبیر ان خوبیوں سے متصف نہ تھے اور ظاہر ہے ان پر انھیں اختیار بھی نہ تھا۔ یہ صفات کسبی نہ تھیں بلکہ یہ میر انیسؔ کو وراثتاً ملی تھیں لیکن یاد رہے کہ یہ صفات معمولی نہیں تھیں۔ چنانچہ ان صفات کی کمی کا مرزا دبیر کی شاعری پر بہت بُرا اثر پڑا ہے۔ اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم مرزا دبیر کی منزلت کو گھٹا نہیں سکتے۔

مرزا دبیر نے اردو مرثیہ نگاری کے لیے بہت بڑا کام سرانجام دیا ہے جو اُن حالات اور اس مقدرت کے ساتھ جس کے وہ حامل تھے دوسرا کوئی نہ انجام دے سکتا تھا۔ مرزا دبیر بہت بڑے شاعر اور نہایت اعلیٰ فن کار ہیں۔ اگر مرزا دبیر نہ ہوتے تو شاید اردو مرثیہ ان بلندیوں کو نہ پہنچ پاتا جس پر آج وہ پہنچا ہے۔ یہ دونوں شاعروں کے شایانِ شان نہیں کہ ایک دوسرے کا موازنہ اس نیت سے کیا

جائے کہ ایک کی فوقیت جتا کر دوسرے کے کیڑے نکالے جائیں۔ مرزا دبیر کی وسیع القلبی اور صحیح منزلت کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ انھوں نے میر انیسؔ کی موت پر کس کھلے دل سے میر انیسؔ کے شاعرانہ جوہر کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

طورِ سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیسؔ

مرثیہ خالص اردو کی تخلیق ہے: مرثیہ اپنے موجودہ انداز میں خالص اردو زبان کی پیداوار ہے اور کوئی بھی زبان اس انداز اور اس طرز کے مرثیہ کے موجد ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتی۔ دیگر اصنافِ شاعری مثلاً غزل، مثنوی، واسوخت وغیرہ عربی اور فارسی زبانوں سے مستعار لی گئی ہیں اور ان اصناف پر مقامی رنگوں کے باوجود ان کا اپنا چہرہ صاف اور واضح نظر آتا ہے۔ اردو مرثیہ کی حد تک یہ چیز نہیں کہی جاسکتی۔ عربی اور فارسی مرثیوں سے اسے مطلق کوئی علاقہ نہیں۔ یہ دراصل اردو زبان کی اپنی پیداوار ہے اور اس میں کسی کی کوئی شرکت نہیں۔ یہ اردو شاعری میں اضافہ ہے۔ اردو ادب کے کسی بھی طالبِ علم کو جب بھی اس امر کی جستجو اور تحقیق ہوگی کہ اردو زبان کی اپنی صنفِ شاعری کون ہے جو صرف اسی کی تخلیق ہو اور جس پر کسی دوسری زبان کی شرکت کا حق نہ پہنچتا ہو تو صرف صنفِ مرثیہ ہے۔ اردو مرثیہ کا مطالعہ انیسؔ کے رشحاتِ قلم کے بحرِ بے کراں میں غواصی پر مجبور کرے گا۔ یہیں بات ختم نہیں ہوتی بلکہ اردو زبان کے ہر ہونے والے شاعر کو انیسؔ کے کانِ جواہر سے اپنی استعداد بھر جھولی بھرنی پڑے گی۔ انیس کا مطالعہ ہر مستقبل کے شاعر کو شاعرانہ استعداد اور زبان و بیان کی نوک پلک درست کرنے میں مدد دے گا۔ میر انیسؔ کو اپنی اس خوبی کا اچھی طرح احساس تھا۔ چنانچہ بجا طور پر فرماتے ہیں:۔

نہریں رواں ہیں فیضِ شہِ مشرقین کی — پیاسو پیو سبیل ہے نذرِ حسینؑ کی
لگا رہا ہوں مضامینِ نو کا پھر انبار — خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

انیس اور ان کے نقاد: انیسؔ کی وفات کے بعد لگ بھگ ایک سو سال کے عرصہ میں کوئی ایسا بڑا نقاد اور ادیب نہیں گزرا جس نے میر انیسؔ پر کچھ نہ کچھ نہ لکھا ہو۔ ان میں چاہے محمد حسین آزاد ہوں یا الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی ہوں یا امداد امام اثر، رام بابو سکسینہ ہوں یا ڈاکٹر احسن فاروقی ہر ایک نے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ میر انیسؔ کے اندر وہ غیر معمولی جوہرِ شاعری ہے جو انھیں صفِ

اوّل کے بہترین اردو شاعروں میں ممتاز جگہ دیتا ہے تاہم چند ایک کی نگاہ میں انیسؔ اردو ادب کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔

چونکہ انیسؔ نے ایسا مضمون اپنی شاعری کے لیے منتخب کیا تھا جو مسلمانوں کے ایک خاص فرقے سے متعلق تھا۔ میر انیسؔ کے مرتبے کے تعین میں بسا اوقات انصاف سے کام نہیں لیا گیا۔ یہ انیسؔ کے قسمت کی ستم ظریفی ہے کہ وہ کچھ ناقدین کی نگاہ میں فنِ شاعری کی منتہا اور معراج پر فائض ہیں، وہیں عبدالغفور نساخ جیسے ناقدِ فن ان کی شاعری میں کیڑے نکالتے ہیں اور ان کے کلام کو ناہموار اور زبان کی غلطیوں سے پاک بھی نہیں سمجھتے۔

حالیؔ، شبلیؔ اور سکسینہ جیسے بہت کم ہیں جنھوں نے میانہ روی اختیار کی ہو اور کم سے کم شدت پسندی کا اظہار کیا ہو۔ یہی معاملہ ڈاکٹر احسن فاروقی کے ساتھ ہوا جو ''مرثیہ نگاری اور انیسؔ'' کے **مصنف ہیں**۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ وہ اس تصور کو باطل ٹھہرائیں **جس کے** خواجہ الطاف حسین حالیؔ نمائندے ہیں کہ میر انیسؔ کا کلام بہترین اخلاقی شاعری کا مظہر ہے۔ ڈاکٹر فاروقی کی نگاہ میں اردو مرثیہ کسی بھی صورت اخلاقی شاعری نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ طرزِ شاعری خوف و تعجب کے جذبے کو ابھارتی ہے۔

صاحبِ ''مرثیہ نگاری اور انیسؔ'' کی نگاہ میں مرثیہ کے اندر ڈرامائی عناصر اور کردار نگاری کا فقدان ہے۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ ڈاکٹر صاحب انگریزی ادب کا بے پناہ درک رکھتے ہیں اور ملٹن اور شیکسپیئر سے اس حد تک متاثر یا مرعوب ہیں کہ وہ کسی ایشیائی شاعر کو ان کی گردِ پا تک پہنچنے کے قابل نہیں سمجھتے۔ ملٹن کی (Paradise Lost) اور (Paradise Regained) مرثیہ کے قاری کی فراست اور فہم سے بالا ہیں۔

فاضل نقاد کی نگاہ میں ''نعرۂ حیدری'' والی تنقید شیعوں کے لیے مخصوص ہے جن کا مذہب محض ایک الیوژن ہے میں نہیں کہہ سکتا کہ فاضل محقق کو اس قسم کے کلمات ادا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ڈاکٹر فاروقی کے تبحرِ علمی پر یہ بات چغلی کھاتی ہے کہ وہ ایسے کلمات معرضِ تحریر میں لائیں جنھیں وہ با آسانی حذف کر سکتے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاضل نقاد نہایت مخمصہ میں گرفتار ہیں۔ انھیں شیعت سے نفرت ہے، وہ شیعی رسومات پسند نہیں کرتے۔ ان کے ذہن پر یہ چیز مسلط ہے کہ شیعیت ایک الیوژن ہے۔ لیکن

اس کے باوجود ان کی نگاہ میں اردو شاعری میں اگر اپنا کوئی مخصوص سرمایہ ہے جس پر غیروں کی کوئی چھاپ نہیں تو وہ صرف مرثیہ ہے۔ یہ صورت ڈاکٹر احسن فاروقی کے منصبِ تنقید کے لیے کچھ گومگو کی سی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو کوئی بھی اس صنفِ شاعری کے اخلاقی پہلو کو اُجاگر کرتا ہے وہ اس کی شدت سے نفی کرتے ہیں۔ اب اس تصور کے اجاگر کرنے میں چاہے شبلیؔ ہوں یا حالیؔ یا کوئی اور۔

حق یہ ہے کہ مرثیہ میں ڈرامائی عناصر، کردار نگاری اور اخلاقی اقدار کی سربلندی کا اسی قدر اثر و نفوذ ہے جس قدر ایک بیانیہ شاعری اور ہماری مشرقی روایات اس کے متحمل ہوسکتی تھیں۔ ڈاکٹر فاروقی کا یہ فکری عدم توازن ان کی محولا بالا تصنیف میں پوری طرح جاری وساری ہے۔ کتاب کا پہلا حصہ توقف سے پہلے تک سخت متقمانہ اور کیڑے نکالنے والی تنقید کہا جاسکتا ہے البتہ کتاب کا باقی حصہ اس کی عین ضد ہے۔

جہاں تک مرثیہ کی اخلاقی حیثیت کا تعلق ہے اس سے کسی کو بھی انکار ہی نہیں ہوسکتا جو شخص بھی مرثیہ لکھے گا اسے مضمون کی عظمت اور تقدس کا خیال رکھنا پڑے گا۔ دیگر اصنافِ شاعری مثلاً غزل و مثنوی وغیرہ میں شاعر جس قدر چاہے بلند اور پست ہوسکتا ہے لیکن مرثیے کے لیے سنجیدگی اور بردباری شرطِ اول ہے۔

بہادری، جرأت، اولوالعزمی، عالی ظرفی اور شرافتِ نفسی کا جو سبق امام حسینؑ اور ان کے اعزا اور رفقاء کی قربانی سے ملتا ہے وہ قاری کے جذباتِ عالیہ ابھارنے میں یقیناً ممد و معاون ثابت ہوسکتا ہے، اس کا تاثر کبھی منفی نہیں ہوسکتا۔

جنگ و جدل کی من وعن تصویریں، دو حریفوں کی جدال کا نقشہ، مبارز طلبی کا زور، رجز کی گرمی، بے دینوں کی موت، کمزوروں کی دادرسی، وعدے کا پاس، عزتِ نفس اور اسی قسم کے مضامین جو رزمیہ شاعری کی جان ہیں اردو شاعری میں ایک بے نظیر اضافہ ہیں۔

اردو مرثیہ رزمیہ شاعری کا بہترین نمونہ ہے یہ بات ڈاکٹر احسن فاروقی کو قابلِ قبول نہیں کیونکہ یہ دورِ انحطاط کی پیداوار ہے۔ جب قوم تن آسانی اور غلامی سے سمجھوتہ کرچکی تھی۔ ایسے موقع پر کسی ایسی سوسائٹی کے شاعر یعنی میر انیسؔ کا رزمیہ بیان حقیقت سے بعید ہے اور تقریباً منہ چڑانے والی بات ہے۔ میرا خیال ہے ڈاکٹر صاحب کی رائے پر مزید رائے زنی کرنا بے کار ہے کیونکہ یہ کوئی بدھا اصول نہیں، کوئی پتھر کی لکیر نہیں کہ دورِ انحطاط کا شاعر رزمیہ لکھ ہی نہیں سکتا۔ یہ صرف ڈاکٹر صاحب کا

سوءِظن ہے اور کچھ نہیں اور یہ خود موصوف کے اندازِ فکر کی نفی بھی کرتا ہے جہاں وہ میر انیسؔ کے بیانیہ شاعری کی خوبیاں گنواتے ہیں۔

انیس کی سوسالہ برسی: انیسؔ اردو کے صفِ اوّل کے بہترین شاعروں میں سے ایک ہیں اور اگر انھیں اردو کا بہترین شاعر کہا جائے تو شاید مبالغہ نہ ہو۔ غالبؔ کی سوسالہ برسی نہ صرف ہندوستان و پاکستان بلکہ پوری دنیا میں منائی گئی۔ یہ تعجب کُن اتفاق ہے کہ اردو ادب کے دو بہترین شاعر کم و بیش ایک ہی عہد میں پیدا ہوئے۔ انیسؔ، غالبؔ سے چند ایک سال چھوٹے تھے۔ انیسؔ کی عظمت فن کے خود غالبؔ مداح ہیں انیسؔ کی سوسالہ برسی ۱۹۷۴ء ہوئی کیونکہ انیسؔ کا سن وفات ۱۸۷۴ء ہے۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ انیس کی بھی برسی اُسی شان سے منائی جائے کیونکہ انیسؔ بھی دنیا کے بہترین شاعروں میں سے ایک ہیں قطعِ نظر اس کے کہ انیسؔ ایک خاص مسلک کے فرد تھے اور ایک خاص واقعہ کی عکاسی کرتے ہیں لیکن اس سے ہٹ کر بھی جہاں تک حسنِ شعری خصوصاً منظر نگاری، جذبات نگاری، رزمیہ حزن اور بین کا تعلق ہے، انیسؔ کی شاعرانہ قدرت بے کراں ہے اور وہ اپنے اور غیر سبھوں کے لیے پُرکشش ہے انیسؔ اپنے فن کی وساطت سے آفاقی ہیں۔ انیسؔ کو بغیر اس تخصیص کے کہ کوئی اردو بولنے والے علاقہ سے تعلق رکھتا ہے یا نہیں انیسؔ کے فن کو پوری طرح سمجھ سکتا ہے اور حظ حاصل کرسکتا ہے۔

انیسؔ کا اثر: جہاں تک اردو ادب میں انیسؔ کے اثر و نفوذ کا تعلق ہے اس کے بے نہایت پن کا الفاظ احاطہ نہیں کرسکتے۔ انیسؔ کے بعد ہر شاعر انیسؔ کے کلام سے خوشہ چینی کرتا نظر آتا ہے۔ یہ کہنا کچھ غیر ضروری سا معلوم ہوتا ہے کہ انیسؔ کے بعد اردو میں جتنی بھی بڑی بڑی نظمیں لکھی گئی ہیں ان سب پر انیس کے فن اور بیان کی چھاپ ہے۔ بسا اوقات شعرائے مابعد انیسؔ نے مسدس کو اپنی نظم کا (Media) بنایا ہے۔

حالی کی مشہور مسدس ''مدوجزرِ اسلام'' انیسؔ کے طرز پر لکھی گئی۔ سرور جہاں آبادی نے مسدس ہی کو اپنی شاعری کا آلۂ کار بنایا۔

اگر کوئی اس سلسلہ میں تھوڑی سی تحقیق سے کام لے تو اسے معلوم ہوگا کہ آزادؔ، حالؔی، چکبستؔ اور سرورؔ کی دلچسپ اور زوردار نظمیں سب انیسؔ کے مرثیہ کی رہینِ منت ہیں۔ اقبالؔ کا شکوہ جواب شکوہ

انیسؔ ہی کے طرز پر لکھا گیا ہے۔ غالبؔ جیسا مسلّم الثبوت شاعر کہتا ہے کہ اردو زبان نے انیسؔ اور دبیرؔ سے بہتر مرثیہ گو نہیں پیدا کیے اور جس میں انیسؔ کا مرتبہ نہایت بلند ہے۔ کون اس امر سے انکار کرسکتا ہے کہ انیسؔ کے بعد نظموں میں جو صفائی، سلاست، بندش کی چستی، مضمون کی بلندی، تشبیہ و استعارے کا بانکپن، الفاظ کی نشست اور حسنِ بیان ہے سب انیسؔ کے مرثیوں کا طفیل ہے۔

مولانا حالیؔ نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اگر انیسؔ چوتھی صدی ہجری میں ایران میں پیدا ہوتے اور اسی سوسائٹی میں پروان چڑھتے جس میں فردوسی پلا بڑھا تھا تو وہ ہرگز فردوسی سے پیچھے نہ رہتے۔ بالکل اسی طرح اگر فردوسی لکھنوی سوسائٹی میں جس میں انیسؔ پلے بڑھے تھے پیدا ہوتا تو ہرگز انیسؔ سے آگے نہ بڑھ سکتا۔

ڈاکٹر احسن فاروسی انیسؔ کے حضور میں نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہوئے بجا کہتے ہیں کہ انیس شاعروں کا شاعر ہے اور جسے شاعری سیکھنی ہے اسے انیسؔ کے در کی جبہ سائی کرنی پڑے گی۔

انیسؔ ایک بے پناہ فن کار ہیں جو کسی زبان میں شاذ و نادر ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اگر انگریزی ادب اسپنسر، شیکسپیئر اور ملٹن پر ناز کرسکتا ہے، اگر فارسی ادب فردوسی، سعدی اور حافظ کے لیے رطب اللسان ہوسکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اردو ادب میرؔ، انیسؔ اور غالب کے حضور حسنِ عقیدت کے پھول نہ نچھاور کرے۔ جس طرح اسپنسر اور فردوسی اپنے اپنے ادب میں ایک مخصوص مقام کے حامل ہیں اسی طرح انیسؔ بھی ایک مشاق فنکار اور فطری شاعر ہونے کی حیثیت سے اس کے اہل ہیں کہ اردو ان پر جس قدر ناز کرے وہ کم ہے بلکہ یہ کہنا مبالغہ سے خالی نہ ہوگا کہ وقت کے ساتھ ساتھ انیسؔ کا مقام بلند سے بلندتر ہوتا جائے گا۔

ضمیر اختر نقوی

اصحابِ حسینؑ
کلامِ میر انیسؔ کے آئینے میں

اصحابِ حسینؑ میں سے ہر ایک اپنی منفرد حیثیت بھی رکھتا ہے اور گلدستۂ شہادت میں شامل ہو کر اس کے مجموعی جلال و جمال میں اضافہ بھی کرتا ہے۔ ان اصحاب باوفا میں امام حسینؑ آفتاب کی مانند تھے اس لئے اصحاب حسینؑ کو حسینؑ سے الگ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا۔ اسی آفتاب نے انہیں منوّر کیا تھا، اسی سرچشمۂ فیض نے انہیں توانائی بخشی تھی اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ واقعی اس بچی ہوئی مٹی سے بنائے گئے تھے جس سے حسینؑ کا پیکرِ عظمت تیار ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی رفتار و گفتار میں عزائم اور عقائد میں مقاصد اور خیالات میں خواہش مرگ اور حیات میں کردارِ حسینیؑ کی جھلک ملتی ہے اور نہ صرف واقعۂ کربلا بلکہ حسینؑ کے مقصدِ حیات کا ایک جزو بن جاتے ہیں۔ ایسی عظیم الشان شخصیت کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کی طاقت اِنہیں میں تھی موت پر یقین کے باوجود شکوہ کا ایک لفظ زبان پر لائے بغیر اس طرح ثابت قدم رہنا انہیں کا کام تھا۔ وہ امام حسینؑ کے لئے باعث فخر تھے۔ اسی وجہ سے تو امام حسینؑ نے اپنی زبان سے ان کی تعریف و توصیف کی۔ یہ ان کی عظمت کے لئے اتنی بڑی سند ہے کہ اس کے بعد کسی اور کے کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی ان کے

کرداروں کا حسین ترین پہلو جو کسی طرح فراموش نہیں کیا جا سکتا ان کی وہ انفرادیت ہے جو اتنے بڑے واقعے کے ہنگاموں میں اور عظیم المرتبت اعزائے حسینی کی قربانیوں کے باوجود ماند نہیں پڑی۔ اس کا سمجھنا اور پرکھنا ہی ان کے مقام عظمت کو پہچاننا ہے۔

ان معمارانِ حقانیت اور محافظان نور امامت میں صحابۂ رسول ﷺ بھی تھے اور حافظان قرآن بھی، زاہدان شب زندہ دار بھی تھے اور شجاعان آزمودہ کار بھی، قبیلوں کے رئیس بھی تھے اور اپنے عہد کے فصیح بھی، انہیں میں وہ بہادروں کے بہادر حبیب ابن مظاہر بھی تھے اور وہ مجاہدوں کے مجاہد بریر ہمدانی بھی تھے اور انہیں میں اکثر وہ بھی تھے جو کڑی چوکیوں اور پہروں سے بچ بچا کر اور اپنی جانوں پر کھیل کر گویا ہفت خواں طے کر کے حسینؑ کی نصرت کو آئے اور اپنی شجاعت اور صداقت کا نقش جما کر ملک بقا کو سدھار گئے۔

ایک عام اعتراض واقعۂ کربلا پر یہ کیا جاتا ہے کہ یہ دو خاندانوں کی جنگ تھی اور امام حسینؑ مقابلے کے لئے اپنے خاندان کو لائے تھے۔ لیکن اصحاب حسینؑ نے اس نظریئے کو ہر عہد میں باطل قرار دے دیا۔ ان اصحاب کی شرکت واقعۂ کربلا کی نوعیت کو برقرار رکھنے کے لئے نہایت ضروری تھی اگر حضرت امام حسینؑ صرف اپنے خاندان کے لوگوں کو لے کر کربلا کی سرزمین پر آ گئے ہوتے تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ یہ ایک خاندانی یا گھریلو جنگ تھی۔ لیکن امام حسینؑ کے اصحاب میں تقریباً عرب کے ہر قبیلے اور مختلف مقامات کے ممتاز افراد موجود تھے۔

اکثر مورخین کے بیان کے مطابق لشکر حسینؑ تمیں۳۰ سواروں اور چالیس۴۰ پیادوں پر مشتمل تھا اور فوج مخالف کی تعداد کم سے کم تمیں ہزار بتائی جاتی ہے زیادہ سے زیادہ چھ لاکھ اور نو لاکھ بتائی جاتی ہے۔ مگر حسینی ناموں کی تفصیلات اور بعض دوسرے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ فوج حسینی کی تعداد سو۱۰۰ اور دو سو۲۰۰ کے درمیان تھی ان میں سے تقریباً بانوے انصار کے تھوڑے بہت حالات کتب میں ملتے ہیں۔ چند اہم ترین نام یہ ہیں۔ حضرت مسلم ابن عوسجہ، حضرت حبیب ابن مظاہر، حضرت بریر ہمدانی، حضرت ہلال ابن نافع، حضرت زہیر قین، حضرت ابوثمامہ صیداوی، حضرت عابس شاکری، حضرت عبداللہ بن عمیر کلبی، حضرت سعید ابن عبداللہ، حضرت جون غلام ابوذر غفاری، حضرت شوذب غلام عابس، حضرت وہب ابن عبداللہ، حضرت حر ابن یزید ریاحی۔ یہ وہ اصحاب حسینی ہیں جن کے نام بار بار آتے ہیں۔ ان کے متعلق کسی قدر تفصیلات بھی موجود ہیں۔

صاحب الامرؑ امام زماں علیہ السّلام نے زیارت ناحیہ میں ان اصحاب کو ذیل کے الفاظ میں مخاطب فرمایا ہے:-

''تم پر سلام اے بہترین مددگار، سلام تم پر تمہارے صبر وتحمل کے عوض، دیکھو آخرت کا گھر کیا اچھا گھر ہے۔ خدا تم کو کاشانۂ ابرار میں جگہ دے، میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا نے تمہارے سامنے سے پردہ اٹھادیا اور جنّت میں تمہارے لئے فرش بچھادیا اور عطا وانعام کو تمہارے لئے بڑھا دیا۔ تم نے حق میں تاخیر نہیں کی اور تم حلم سے آگے بڑھ گئے اور حلم دار بقا میں تمہارے دوست ہیں''۔

اصحاب حسینؑ کے اس مختصر تعارف اور عظمت کے بیان کے بعد آیئے اس بات کا جائزہ لیں کہ اُردو اَدب میں اگر میر انیسؔ کا وجود نہ ہوتا تو ہماری یہ عظیم زبان ان عظیم اخلاقی نمونوں سے خالی ہوتی۔ یہ میر انیسؔ کا احسان ہے کہ انہوں نے امام حسینؑ کے سیرت وکردار کے بیان کے ساتھ اصحاب حسینؑ کے سیرت وکردار کے ہر پہلو کو عوام کے ذہنوں میں محفوظ کر دیا۔ میر انیسؔ کے مختلف مرثیوں سے ہم ایسا انتخاب پیش کر رہے ہیں جس میں صرف اصحاب حسینؑ کی کردار نگاری اور ان کی عظمت وبزرگی کا بیان ہے۔

امام حسینؑ کے اصحاب کی خصوصیت کو زمانہ بھول نہیں سکتا وہ ان کا بھوک اور پیاس میں جنگ کرنا، موت کا یقین کئے ہوئے میدان میں آنا، مرنے کی رات عبادت میں گزارنا، خشک لبوں پر فاتحانہ تبسم، ایک دوسرے پر سبقت، مرتے دم تک سردار لشکر کے احترام کی فرمائش، ''اوصیك بهذ الامام'' کا نعرہ، باوجود شدائد امام سے کوئی شکایت نہ کرنا، علیؑ کے فرزند کو بچانے کی انتھک کوششیں، حمایت اہل حرم میں جانے دینا، حالت نزع میں مولا کی گود پاکر ان کا مسکرانا، عاشور کی خاموش رات میں ان کا تلوار لے کر ٹہلنا، اشجع عرب کے گرد ان کا جھرمٹ، بنت علی کی فرمائش پر تلوار قبضے سے نکال کر درخیمہ پر پھینک دینا، ایمان کی قوت سے کام لے کر عاشور کی جنگ سر کرنا، ان کارناموں اور خصوصیاتِ اصحابِ حسینؑ کو کلام انیسؔ کے آئینے میں ملاحظہ کیجئے۔

ظاہر میں گرچہ تھے رفقاء شاہ کے قلیل　　پیش خدا مگر وہ حقیقت میں تھے جلیل
جرأت میں بے نظیر شجاعت میں بے عدیل　　سرگرم جان دینے پہ سب صورت خلیل
فاقوں میں صبر وشکر سے دل ان کے سیر تھے
جاں باز تھے جری تھے مجاہد تھے شیر تھے

سر پر عمامے چاند سی پیشانیوں پہ نور — حاضر گلا کٹانے کو سب شاہ کے حضور
لب برگِ گل سے سوکھے ہوئے پیاس کا وفور — یکتا ہر اک مگر نہ تکبر نہ کچھ غرور
پیرو امام کے تھے نہ کیوں خوش طریق ہوں
آقا حسینؑ سا ہو تو ایسے رفیق ہوں

ہر دم فروتنی کا لبوں پر کلام تھا — شکر خدا سے ان کی زبانوں کو کام تھا
ایک ایک دل سے عاشق شاہ انام تھا — آنکھوں میں نشۂ مئے حُبِ امام تھا
ہر حال میں وہ لوگ رضا جوئے شاہ تھے
رخ ان کے مثل قبلہ نما سوئے شاہ تھے

ذی جاہ و ذی جلالت و ذی فہم و ذی شعور — شائق ریاض خلد کے مشتاق وصل حور
ہر شخص نشۂ مئے حب علیؑ میں چور — ذکر دعائے نور سے پیشانیوں پہ نور
ذرہ نہ مہر و ماہ میں اور ان میں فرق تھا
اک اک جوان حُسن کے دریا میں غرق تھا

حضرت امام حسینؑ کو جیسے اصحاب مِلے اس سلسلے میں خود امامؑ نے فرمایا ہے کہ ایسے اصحاب نہ میرے نانا رسولؐ خدا کو مِلے، نہ میرے بابا علی مرتضیٰؑ کو مِلے اور نہ میرے بھائی حَسن مجتبیٰؑ کو مِلے۔ حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ حسینؑ کے اصحاب قیامت کے دن تمام شہیدوں کے سردار ہوں گے اور انہیں تمام شہدا پر فضیلت ہے۔ ادھر لشکر یزیدی کی کثرت کا جوش تھا تو ادھر بھی مختصر سپاہ حسینیؑ کا ایک ایک سپاہی اپنے آقا پر جان دینے کو تیار تھا۔ میر انیسؔ کے ایک مرثیے سے اصحاب حسینیؑ کا سراپا ملاحظہ کیجئے:۔

تھے جمع ادھر بھی در مولا پہ موالی — ماتھوں پہ نشاں سجدے کے چہروں پہ بحالی
دل صبر سے معمور شکم کینے سے خالی — کیا علم تھا، کیا زہد تھا کیا ہمت عالی
ہوتے تھے فدا نام پہ فرزند نبیؐ کے
وہ عاشق صادق تھے حسینؑ ابن علیؑ کے

باندھے ہوئے عمامے سروں پہ وہ خوش اطوار
تھے شاہ کے قدموں پہ فدا ہونے کو تیار
نورانی عباؤں کے تلے جنگ کے ہتھیار
رخ غیرت خورشید جبیں مطلع انوار
فولاد کے سینے تھے تو شیروں کے جگر تھے
خود تیغ تھے اور سبط پیمبرؑ کے سپر تھے

وہ عابد و زاہد تھے وہ تھے عارف کامل
منھ قبلۂ ایماں کی طرف سوئے خدا دل
تسبیح زباں سارے امامت کے فضائل
قرآن بھی تیغیں بھی گلوں میں تھیں حمائل
حق ان کا طرفدار تھا وہ جانب حق تھے
سب مصحفِ ناطق کے صحیفے کے ورق تھے

قلب ان کے تھے آئینہ ایماں کی طرح پاک
دل نور کے تن نور کے اور نور کی پوشاک
خوش باطن و آگاہ دل و صاحب ادراک
خاک پسر فاطمہؑ میں ان کی ملی خاک
روشن ہے کہ فرزند نبیؐ نور خدا ہے
یہ خاک انہیں غازیوں کی خاک شفا ہے

قانع تھے، مجاہد تھے، شجاع ازلی تھے
ہشیار تھے اور مست مئے حب علیؑ تھے
پروانۂ شمعِ حرمِ لم یزلی تھے
حقا کے ولی تھے، وہ ولی تھے، وہ ولی تھے
پیدا نہ کئے مالک تقدیر نے ویسے
دیکھے نہ جواں پھر فلک پیر نے ویسے

جس جا پہ گرے سبط پیمبر کا پسینہ
خوں اپنا گرا دیں یہ وہاں گر ہو قرینہ
تیغ آئے جو سر پر تو سپر کردیں یہ سینہ
آتش میں گریں حکم جو دیں شاہ مدینہ
تنہا شہ مظلوم کا مدفن نہیں چھوڑا
مرکر بھی تو شبیرؑ کا دامن نہیں چھوڑا

ایسے نہ محمدؐ کو ملے یار موافق
واں ایک موافق تھا تو تھے بیس منافق
یکتا یہ شجاعت میں وفاداری میں صادق
ایسے کسی معشوق نے پائے نہیں عاشق
تھے زہد میں سلمان و ابوذر کے برابر
اور زور میں تھے مالک اشترؓ کے برابر

کہتا تھا کوئی سبط پیمبر کے تصدق عباسؑ کے صدقے علی اکبرؑ کے تصدق
سو جاں سے میں لخت دل شبرؑ کے تصدق بے شیر ہے دو روز سے اصغرؑ کے تصدق
صابر انہیں کہتے ہیں یہ خاصان خدا ہیں
معصوم کے معصوم بھی راضی بہ رضا ہیں

کہتا تھا کوئی وقت پھر ایسا نہ ملے گا یہ فوج، یہ میدان یہ دریا نہ ملے گا
ڈھونڈو گے جو دنیا میں تو کیا کیا نہ ملے گا پر فاطمہؑ کے لال سا آقا نہ ملے گا
کیا غم ہے اگر پانی سے ناکام رہیں گے
گر آج مرے حشر تلک نام رہیں گے

کہتا تھا کوئی دیکھو ذرا آنکھ اُٹھا کر وہ گلشن جنّت ہے وہ ہے چشمۂ کوثر
وہ حوریں ہیں ہاتھوں میں لئے پانی کا ساغر وہ ہیں حسنؑ سبز قبا اور وہ پیمبرؐ
زہرا ہیں یہ سر کھولے جو کوثر کے درے ہیں
حیدرؑ ہیں وہ جو ہاتھ کلیجے پہ دھرے ہیں

صبح عاشور، آغازِ جنگ اور اصحاب کی قربانیاں

فوجِ شام میں جنگی باجوں کا شور ہوا اور فوج یزید نے تیروں سے جنگ کا آغاز کیا۔ میر انیسؔ نے اس منظر کو نہایت پر اثر انداز سے پیش کیا ہے:-

ناگاہ فوج شام میں بجنے لگا دہل تیغیں کھنچیں چمکنے لگے برچھیوں کے پھل
کڑکیں کمانیں آنے لگے ناوکِ اجل شیروں کے تیوروں پر پڑے اس طرف بھی بل
تن تن کے ہونٹ چاب کے تھرا کے رہ گئے
تیروں کے زخم شاہ کو دکھلا کے رہ گئے

بولے یہ رنگ دیکھ کے شبیر خوش نہاد ہاں اے مجاہدو، رہ حق میں کرو جہاد
جوں غنچہ کھل گئے وہ جواں ہو کے شاد شاد سرخی لبوں پہ آگئی پایا گل مراد
بڑھ بڑھ کے پیدلوں نے سواروں سے جنگ کی
ایک ایک تشنہ لب نے ہزاروں سے جنگ کی

جس غول پہ جھپٹ کے گئے صورت اسد　　بھاگے وہ لوگ چھوڑ کے دشت ستم کی حد
لاکھوں میں ان کا وار کوئی کر سکا نہ رد　　نعرہ ہر ایک ضرب میں تھا یا علیؑ مدد
دو کرتے تھے وہ مجمع قوم جھول میں
گھوڑوں کو عرض میں تو سواروں کو طول میں

کس کس دلاوری سے وہ خاصان رب لڑے　　اس شان سے کبھی نہ عجم نے عرب لڑے
دریا کی سمت رخ نہ کیا تشنہ لب لڑے　　پیاسے تھے تین روز کے لیکن عجب لڑے
بے دست ہوگئے تو یہ جوہر دکھا گئے
لوہے کو مثل شیر درندہ چبا گئے

الحق تھے شیر بیشۂ ہیجا وہ صف شکن　　مرنے کی یہ خوشی تھی کہ خنداں تھے زخم تن
کھا کھا کے تیر کہتے تھے وہ غیرت چمن　　قربان بندہ پروریٔ سرور زمن
غازی ستم گروں سے وغا کر کے مرگئے
حق نمک جو تھا وہ ادا کر کے مرگئے

حر و بریرو وہب و عمیر فلک مقام　　وہ مسلم ابن عوسجۂ عرش احتشام
سعد و زہیرقین و حبیب خجستہ کام　　وہ شیر جس کا بو عمر نہشلی تھا نام
جس غول پر جھپٹ کے یہ آئے وہ ہٹ گیا
ایک ایک مرتے مرتے پروں کو الٹ گیا

حر دلاور کا جہاد

میر انیسؔ نے حضرت حر کی سیرت و کردار جنگ و شہادت پر مستقل مرثیے لکھے ہیں اس موضوع کے لئے الگ مضمون درکار ہے۔ یہاں صرف ایک بند دیکھئے جس میں انہوں نے حضرت حر ان کے بھائی اور فرزند کی شہادت ایک ہی بند میں نظم کی ہے:-

پہلے حر غازی نے صفیں کی تہ و بالا　　پھر بھائی گیا رن میں ہلاتا ہوا بھالا
فرزند نے رہوار کو چمکا کے نکالا　　تینوں جو ہوئے قتل تو روئے شہ والا
کہرام تھا مہماں کے لئے اہل حرم میں
رونے کو بتولؑ آئی تھیں میدان ستم میں

حضرت مسلم ابن عوسجہؓ کا جہاد

میر انیسؔ نے حضرت مسلم ابن عوسجہؓ کے کارنامے متعدد مرثیوں میں نظم کئے ہیں یہاں صرف ایک بند مثال میں پیش کیا جاتا ہے:-

میدان میں مسلم پسر عوسجہ آیا　　تلوار جو کھینچی تو ہزاروں کو بھگایا
جس دم وہ گرا شہ نے بڑا رنج اٹھایا　　چھاتی سے کئی مرتبہ زخمی کو لگایا
لاشے سے گلے مل کے جدا ہوتے تھے شبیرؑ
عورات میں غل ہوتا تھا جب روتے تھے شبیرؑ

حضرت حبیبؓ ابن مظاہر کا جہاد

میر انیسؔ نے ایک مکمل مرثیہ حبیب ابن مظاہر کے حالات پر مشتمل کہا ہے جس میں ان کے بچپن کے حالات بھی نظم کئے ہیں دو مرثیوں میں سے چند بند دیکھئے:-

وہ ابن مظاہر کہ حبیبوں میں جو تھے فرد　　دنیا میں کسے ملتے ہیں اس طرح کے ہمدرد
اعدا کے لئے تیغ ہلالی، دم ناورد　　پیری میں اولوالعزم بڑھاپے میں جواں مرد
سب چھوٹے مگر دامنِ حضرت نہیں چھوڑا
مرنے پہ بھی اب تک درِ دولت نہیں چھوڑا

یکتا وہ حبیبوں میں حبیب ابن مظاہر　　یکساں صفت مہر مبیں باطن و ظاہر
عصیاں سے بری طیّب و پاکیزہ و طاہر　　جاں باز، جہاں دیدہ، فن جنگ کے ماہر
سر ہلتا تھا پیری سے قدِ راست میں خم تھا
اس پر بھی کچھ آگے ہی جوانوں سے قدم تھا

انداز جوانوں کا بھی پیرانہ سری بھی　　پروانۂ جاں بار بھی، شمع سحری بھی
ابرار بھی دیندار بھی عصیاں سے بری بھی　　زاہد بھی، مجاہد بھی، نمازی بھی، جری بھی
طفلی سے یہ فوج شہ نامی میں رہے تھے
ترسٹھ برس آقا کی غلامی میں رہے تھے

نماز ظہر کے وقت اصحاب کا ایثار

میر انیسؔ نے ایک مرثیے میں نماز اور ابوثمامہ وزہیر کے ایثار کو اس طرح پیش کیا ہے۔

آیا زوال رن میں جو مہر منیر پر   غم کا فلک گرا شہ گردوں سریر پر
نرغہ تھا شامیوں کا جہاں کے امیر پر   پڑتی تھی تیغ تیغ پہ اور تیر تیر پر
مرنے لگے رفیق شہ کم سپاہ کے
دس بیس تارے رہ گئے ہمراہ ماہ کے

واں ہل رہی تھی نالۂ شہنا سے سب زمیں   فکر نماز ظہر میں تھے یاں امام دیں
تھے منحرف جو قبلہ ایماں سے وہ لعیں   غل اقتلو الحسینؑ کا کرتے تھے اہل کیں
دشمن تھی سب سپاہ ، شہ سرفراز کی
ملتی نہ تھی امام کو مہلت نماز کی

بڑھ کر ابو ثمامہ نے اس دم کیا خطاب   اے ظالمو نہ خانۂ دیں کو کرو خراب
ہے کون سی خطا کہ جو ہو مانعِ ثواب   شہ کو نماز پڑھنے کی مہلت دو اب شتاب
مارو نہ تیر ربِ دو عالم کے واسطے
تیغوں کو کرلو میان میں ایک دم کے واسطے

تیوری چڑھا کر ابن انس نے یہ تب کہا   کیسی نماز کہتے ہیں کیا شاہ کربلا
مانیں گے ہم کبھی نہ یہ باتیں دم وغا   کچھ ہو مگر بچے گا نہ فرزند مرتضیٰ
پوچھو کہ بندگی سے انہیں کیا حصول ہے
اس وقت کی نماز بھلا کب قبول ہے

تھرا گئے یہ سن کے شہ عرش بارگاہ   رو کر عجیب یاس سے گردوں پہ کی نگاہ
حق سے دعا یہ کی کہ الٰہی تو ہے گواہ   ایذا ترے حسینؑ کو دیتے ہیں روسیاہ
ناحق ستاتے ہیں دل زہراؑ کے چین کو
ملتی نہیں نماز کی مہلت حسینؑ کو

مولا کی اس فغاں سے ہلا آسمان پیر بولے یہ دست بستہ زہیر فلک سریر
حضرت پڑھیں نماز ستاتے ہیں گو شریر روکوں گا اپنے تن پہ میں زخم سنان و تیر
ٹوکے یہ کیا مجال کسی پر غرور کی
تیغوں میں اب غلام سپر ہے حضور کی

اس باوفا کا جب یہ سخن آپ نے سنا فرمایا اے زہیرِ خوش انجام مرحبا
اس امر خیر کی تجھے اللہ دے جزا تجھ کو لکھے نماز گزاروں میں کبریا
جنت سے فاطمہؑ ترے لاشے پہ آئیں گی
حوریں تجھے شراب طہورا پلائیں گی

یہ کہہ کے شاہ محو عبادت ہوئے ادھر وہ دونوں شیر سامنے آ کر بنے سپر
جب تک نماز پڑھتے رہے شاہ بحر و بر سرکے نہ ان کے پاؤں، خوشا دل زہے جگر
کچھ زخم پہلے کھائے تھے کچھ تیر پھر پڑے
شہ پڑھ چکے نماز تو وہ شیر گر پڑے

میر انیسؔ نے ایک ہی بند میں کئی اصحاب کی شہادت کا ذکر ایک ساتھ کیا ہے اس طرح کا ایک بند شروع مضمون میں درج کیا گیا ہے دوسرا بند ملاحظہ ہو:-

ضرغامہ، وہبؔ و انسؔ و مالک دیندار حجاجؔ و زبیرؔ و جبلہ، عامرؔ و عمار
عمرانؔ و شبیبؔ و عمر و عابسؔ ابرار قربانِ حسینؑ ابن علیؑ ہو گئے اکبار
جس سمت یہ جاں باز تھے خالی وہ پڑا تھا
دو روز تلک دشت ستم خوں سے بھرا تھا

آخر میں مختلف مرثیوں سے اصحاب باوفا کی مدحت کے بند درج کئے جاتے ہیں۔ جہاں میر انیسؔ نے حُسن وکمال سے ادبی، شاعرانہ وتاریخی نکات نظم کئے ہیں۔

اصحاب حسینؑ کے لئے جناب فاطمہ زہراؑ اب تک اشکبار ہیں

کیا فوج حسینؑ کے جوانان حسینؑ تھے کیا زاہد و ابرار تھے کیا صاحب دیں تھے
آگاہ دل و اہل وفا اہل یقیں تھے غنچہ دہن و مہر لقا ماہ جبیں تھے
ایک ایک کے مرقد پہ فدا ہوتی ہے زہراؑ
عاشور سے بس آج تلک روتی ہے زہراؑ

ہر صحابی چاہتا تھا کہ ہم پہلے حضرت امام حسینؑ پر نثار ہو جائیں

دنیا کے نہ خواہاں تھے نہ تھی خواہش اجلال　　تھے دو بہت فقیروں کے نہ تھی حب زر و مال
نے یاد وطن تھی نہ انہیں الفت اطفال　　شبیرؑ کے عاشق تھے زہے بخت خوشا حال
مذکور یہ تھا جی سے گزر جائیں گے پہلے
اس بات پہ مرتے تھے کہ مرجائیں گے پہلے

ان کے سینے معرفت الٰہی سے لبریز تھے

مست مئے عرفان تھے وہ سب عاقل وذی ہوش　　تھی غیر خدا سب کی انہیں یاد فراموش
دنیا سے بری بار علائق سے سبکدوش　　دل یاد الٰہی میں جو یوں دیکھو تو خاموش
ہر دم سر تسلیم تھا خم راہ خدا میں
بڑھتے چلے جاتے تھے قدم راہ خدا میں

ہمت سے توانا پہ ریاضت سے بدن زار　　مرنے پہ کمر باندھے شہادت کے طلبگار
غربت، المِ فاقہ کشی، زردئ رخسار　　سُوکھے ہوئے ہونٹوں پہ عیاں پیاس کے آثار
تسبیح خدائے دو جہاں ورد زباں تھی
بیداری شب نرگسی آنکھوں سے عیاں تھی

عالم امکان میں ایسے وفادار نہ پہلے تھے اور نہ اب پیدا ہوں گے

مقبول خدا صاحبِ دیں زاہد و ابرار　　ایسے نہ پیمبرؐ کو ملے یاور و انصار
برسوں جو رہے چرخ میں یہ گنبد دوار　　پیدا نہ ہوں اس طرح کے اصحاب وفادار
حق ہم سے غلامی کے ادا ہو نہیں سکتے
کٹوائے سر ان لوگوں نے ہم رو نہیں سکتے

کیا کیا نہ اذیت تھی پہ تھے صابر و شاکر　　مولا کی محبت تھی ہر اک بات میں ظاہر
سر دینے کو موجود فدا ہونے کو حاضر　　اس بھوک میں ثابت قدم اس پیاس میں صابر
کھائے تبر و تیر یہ غم خواری کا حق تھا
وہ کر گئے غازی جو وفاداری کا حق تھا

اصحاب حسینؑ کے ایسے عابد و زاہد، جانباز و سرافراز، صابر و شاکر، جرار، وفادار تاریخِ اسلام میں دوسرے نہیں۔

کیا جوانان خوش اطوار تھے سبحان اللہ　　کیا رفیقان وفادار تھے سبحان اللہ
صفدر و غازی و جرار تھے سبحان اللہ　　زاہد و عابد و ابرار تھے سبحان اللہ
زن و فرزند سے فرقت ہوئی مسکن چھوڑا
مگر احمد کے نواسے کا نہ دامن چھوڑا

اللہ اللہ عجب فوج عجب غازی تھے　　عجب اسوار تھے بے مثل تازی تھے
لائق مدح و سزاوار سرافرازی تھے　　گو بہت کم تھے پر آمادۂ جانبازی تھے
پیاس ایسی تھی کہ آ آ گئی جاں ہونٹوں پر
صابر ایسے تھے کہ پھیری نہ زباں ہونٹوں پر

وہ تخشع وہ تضرع وہ قیام اور وہ قعود　　وہ تذلل وہ دعائیں وہ رکوع اور وہ سجود
یادِ حق دل میں تو سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ درود　　یہ دعا خالق اکبر سے کہ اے رب ودود
یوں لٹیں ہم کہ نہ آل اور نہ اولاد رہے
مگر احمدؐ کے نواسے کا گھر آباد رہے

موم فولاد ہو آوازوں میں وہ سوز و گداز　　اپنے معبود سے سجدوں میں عجب راز و نیاز
سر تو سجادوں پہ تھے عرش معلی پہ نماز　　شیر دل منتخب دہر وحید و ممتاز
چاند شرمندہ ہو چہرے متجلی ایسے
نہ امام ایسا ہوا پھر نہ مصلی ایسے

اصحاب باوفا کو اس پر ناز تھا بعد شہادت رسولؐ خدا ہم کو سینے سے لگائیں گے۔

افضل ہے عبادت سے مددگاری شبیرؑ　　خود دوڑو، کماں داروں کی جانب صفت تیر
بجلی سے گرو، واں کوئی چمکائے جو شمشیر　　کس شخص کے یاور ہو ہے عزت و توقیر
چھاتی سے ہمیں آج لگا دیں گے محمدؐ
رونے کیلئے لاشوں پہ آدیں گے محمدؐ

اصحاب باوفا کا دم زانوئے شبیر پر نکلا

مارے گئے لڑ بھڑ کے جو وہ مومن کامل　　جا جا کے اٹھا لائے انہیں سرور عادل
کس طرح بشر سے ہوں بیاں ان کے فضائل　　رتبے ہیں ملک ہو نہ سکے جن کے مقابل
رونے کو نہ مادر تھی نہ ہمشیر سرہانے
تھا وقت اجل زانوئے شبیرؑ سرہانے

اصحاب باوفا امام حسینؑ سے پہلے جنّت میں پہنچے

اللہ نے دل ان کے وفا سے بنائے تھے　　اور جسم پاک خاک شفا سے بنائے تھے
سینے خمیر صدق و صفا سے بنائے تھے　　دست کرم سخا و عطا سے بنائے تھے
اور لکھ دیا تھا روز ازل سرنوشت میں
پہنچیں گے یہ حسینؑ سے پہلے بہشت میں

وہ عاشق صادق تھے وہ تھے مومن کامل　　دی تھی انھیں خالق نے تمیز حق و باطل
کیا ہوش تھا، کیا فہم تھی کیا عقل تھی کیا دل　　کیا حسن سے طے کر گئے وہ عشق کی منزل
محرابِ عبادت خمِ شمشیر کو سمجھے
جادہ وہ مسافر دمِ شمشیر کو سمجھے

کلمہ کوئی پڑھتا تھا کوئی کہتا تھا تکبیر　　قاری کوئی قرآں کا کوئی ماہرِ تفسیر
تھی پیش نظر گلشنِ فردوس کی تعمیر　　تھا شوق کہ اب حوروں سے ہوویں گے بغلگیر
نے پیاس کا صدمہ تھا نہ جانوں کی پڑی تھی
ایک ایک کی کوثر کی طرف آنکھ لڑی تھی

مست مئے عرفاں تھے وہ سب عاقل و ذی ہوش　　تھی غیر خدا سب کی انھیں یاد فراموش
دنیا سے بری بار علائق سے سبکدوش　　دل یاد الٰہی میں، جو یوں دیکھو تو خاموش
ہر دم سر تسلیم تھا خم راہ خدا میں
بڑھتے چلے جاتے تھے قدم راہ خدا میں

وہ صوتِ حسن اور وہ اثردار دعائیں — وہ چاند سے رخ اور وہ نورانی عبائیں
وہ ان کی عباؤں کے تلے تنگ قبائیں — وہ دوش پہ شملے وہ عمامے وہ ردائیں

نے حور میں یہ حسن نہ انساں نہ پری میں
گویا ملک اترے تھے لباسِ بشری میں

مرقوم ہیں قرآن میں رتبے شہدا کے — بے جاں ہوئے پردیس میں کیا رنج اٹھا کے
وہ چاہنے والے تھے امام دوسرا کے — طالب تھا خدا ان کا وہ طالب تھے خدا کے

دنیا میں یہ تحصیلِ سعادت کا صلا تھا
آقا بھی انھیں سبط پیمبرؐ سا ملا تھا

اللہ ری شان واہ رے لشکر زہے حشم — مشتاق ان دلیروں کا تھا کوثر و ارم
کیا ان کے میں ثباتِ قدم کو کروں رقم — سر کٹ گئے مگر نہ ہٹے گھاٹ سے قدم

پروانۂ سراج نبیؐ وہ سعید تھے
زاہد تھے، متقی تھے، جری تھے شہید تھے

سائے میں تھے علم کے شجاعانِ ارجمند — روشن تھے آفتاب سے چہرے ہزار چند
مانندِ برق کوندتے تھے زیر راں سمند — ہر دم نقیبِ فوج کی تھی یہ صدا بلند

ہے سامنے بہشت دلیرو بڑھے چلو
تلواریں تولتے ہوئے شیرو بڑھے چلو

جب غازیانِ فوج خدا نام کر گئے — لاکھوں سے تشنہ کام لڑے کام کر گئے
امت کی مغفرت کا سرانجام کر گئے — فیض اپنا مثلِ ابر کرم عام کر گئے

پڑھتے ہیں سب درود جو ذکر ان کے ہوتے ہیں
ایسے بشر وہ تھے کہ ملک جن کو روتے ہیں

دیندار و سرفروش و شجاع و خوش اعتقاد — ہاتھوں میں تیغیں اور دلوں میں خدا کی یاد
زخموں کو نخل قد پہ وہ سمجھے گل مراد — مردانگی یہ پیاس میں فاقوں میں یہ جہاد

تیغوں سے بند کون سا ان کا کٹا نہ تھا
پر معرکے سے پاؤں کسی کا ہٹا نہ تھا

رستم اٹھا نہ سکتا تھا سر ان کے سامنے　　شیروں کے کانپتے تھے جگر ان کے سامنے
پھیکی تھی روشنیٔ قمر ان کے سامنے　　اڑتا تھا رنگِ روئے سحر ان کے سامنے
بخشا تھا نور حق نے ہر اک خوش صفات کو
ہوتا تھا دن جو گھر سے نکلتے تھے رات کو

پیشانیوں پہ جلوہ نما اخترِ سجود　　دیکھیں جو ان کا نور تو قدسی پڑھیں درود
رخ سے عیاں جلال و جوانمردی و نمود　　شیدائے آل شیفتۂ واجب الوجود
جینے کی شاہ دیں کو دعا دے کے مر گئے
ایماں کے آئینہ کو جلا دے کے مرگئے

تاثیر کر گئی تھی انھیں صحبتِ امام　　تھا نزع میں بھی خشک لبوں پر خدا کا نام
لبریز تھے محبتِ حیدرؑ سے دل کے جام　　ذی قدر ، ذی شعور [illegible] خجستہ کام
لشکر جو اُن پہ ٹوٹ پڑے شام و روم کے
تلواریں کھائیں جسموں پہ کیا جھوم جھوم کے

لاکھوں میں انتخاب ہزاروں میں لاجواب　　تھا خشک و تر پہ جن کا کرم صورتِ سحاب
وہ نور وہ جلال وہ صورت وہ آب و تاب　　زہراؑ کے گھر کے چاند زمانے کے آفتاب
بس یک بیک جہاں میں اندھیرا سا چھا گیا
دن بھی ڈھلا نہ تھا کہ زوال ان پہ آ گیا

حق کے ولی مصاحب سردار انس و جن　　کوئی جواں ، کوئی متوسّط ، کوئی مُسن
فاقوں میں باحواس لڑائی میں مطمئن　　کہتے تھے روزِ قتل ہمیں عید کا ہے دن
مانگو دعا کہ آج یہ مرنا سعید ہو
قربان ہوں حسینؑ پہ رن میں تو عید ہو

نکلے حرم سرا سے شہِ آسماں شکوہ　　پرنور ہوگئے رُخ روشن سے دشت و کوہ
ہاتھوں پہ سر دھرے تھے جوانانِ حق پژوہ　　حقا کہ بادشاہ عجب تھا عجب گروہ
ایذا تھی عشقِ شاہ میں چین ان کے واسطے
بہرِ حسینؑ وہ تھے حسینؑ ان کے واسطے

دیندار سرفروش وفادار اہل درد سرمہ ہے چشم حور کا جن کے قدم کی گرد
لب پیاس سے کبود تو فاقوں سے رنگ زرد دم میں مگر صفوں کو الٹ دیں دمِ نبرد
رستم نظر ملا نہ سکے ان کی چشم سے
مرجائے ڈر سے شیر کو دیکھیں جو خشم سے

ہر بات میں خشوع و خضوع و فروتنی محتاج پر حسینؑ کی دولت سے دل غنی
قبضے میں جوں کماں ہنرِ ناوک افگنی جنگ آزما ہزبرِ وغا تیغ کے دھنی
گر آسماں گرے تو زمیں پر کھڑے رہیں
ٹل جائے کوہ پر قدم ان کے گڑے رہیں

تھا ولولہ جہاد کا مشتاقِ جنگ تھے کمریں کسی کھنچے ہوئے گھوڑوں کے تنگ تھے
رانوں میں بے قرار کمیت و سرنگ تھے تھے بحر میں نہنگ تو بر میں پلنگ تھے
گھوڑے اڑا کے تیغ سے بجلی کو پے کریں
پانی تو کیا ہے آگ کے دریا کو طے کریں

آئے سجادۂ طاعت پہ امام دو جہاں اس طرف طبل بجے یاں ہوئی لشکر میں اذاں
وہ مصلّی کہ زباں جن کی حدیث وقرآں وہ نمازی کہ جو ایماں کے تنِ پاک کی جاں
زاہد ایسے تھے کہ ممتاز تھے ابراروں میں
عابد ایسے تھے کہ سجدے کئے تلواروں میں

عرشِ اعظم کو ہلاتی تھیں دعائیں ان کی وجد کرتے تھے ملک سن کے صدائیں ان کی
وہ عمامے وہ قبائیں وہ عبائیں ان کی حوریں لیتی تھیں بصد شوق بلائیں ان کی
ذکر خالق میں لب ان کے جو ہلے جاتے تھے
غنچے فردوس کے شادی سے کھلے جاتے تھے

زہد میں حضرت سلمانؓ کے برابر تھا کوئی دولتِ فقر و قناعت میں اباذرؓ تھا کوئی
صدق گفتاری میں عمار کا ہمسر تھا کوئی حمزہؑ عصر کوئی مالکؓ اشتر تھا کوئی
ہوں گے ایسے ہی محمدؐ کے جو شیدا ہوں گے
پھر جہاد ایسا نہ ہوگا نہ وہ پیدا ہوں گے

گو مصیبت میں تلاطم میں تباہی میں رہے　　سر کٹے پاؤں مگر راہِ الٰہی میں رہے
یوں سرافراز وہ سب لشکر شاہی میں رہے　　جس طرح تیغ دودم دستِ سپاہی میں رہے
اس مصیبت میں نہ پایا کبھی شا کی اُن کو
آبرو ساقیٔ کوثر نے عطا کی ان کو

اللہ رے وفائے رفقائے شہ ذی جاہ　　کرتے تھے سفر چوم کے پائے شہ ذی جاہ
سر دیتے تھے ہنس ہنس کے برائے شہ ذی جاہ　　دل سینوں میں لبریز وِلائے شہ ذی جاہ
دنیا کی نہ جانب ہیں نہ دریا کی طرف ہیں
مرتے ہوئے آنکھیں شہ والا کی طرف ہیں

مرنے پہ کسے تھا کمر ایک ایک سے پہلے　　کر دیتا تھا سینہ سپر ایک ایک سے پہلے
دیتا تھا بصد شوق سر ایک ایک سے پہلے　　کرتا تھا دلِ شہ میں گھر ایک ایک سے پہلے
دشوار انھیں زیست کی ایک ایک گھڑی تھی
کوثر سے نظر خلد سے جان ان کی لڑی تھی

ایماں شہ والا کی ولا جانتے تھے وہ　　مرجانے کو تو عین وفا جانتے تھے وہ
جینے کو ہوس دم کو ہوا جانتے تھے وہ　　فاقوں کے بیاں کو بھی گلا جانتے تھے وہ
کچھ فرق اطاعت میں وہ ناکام نہ لائے
پانی کا زبانوں پہ کبھی نام نہ لائے

پہنچے جو وہ مردانِ وغا دشتِ وغا میں　　تھا غلغلۂ صلِّ علیٰ ارض و سما میں
سرگرم تھے سب الفتِ شاہ شہدا میں　　ثابت تھے دلیروں کے قدم راہِ خدا میں
کہتے تھے کہ آقا کی یہ تائید کا دن ہے
کٹوایئے ہنس ہنس کے گلے عید کا دن ہے

یہ روز مبارک ہے سعادت ہے یہ مرنا　　سجدے میں سرِ تیغ سر اس جنگ میں دھرنا
ہاں غازیو، اس کثرت اعدا سے نہ ڈرنا　　ہر زخم پہ دم الفتِ شبیرؑ کا بھرنا
گھوڑوں کی عنانوں کو عنانوں سے ملا دو
تیغوں سے گلے سینے سنانوں سے ملا دو

معلوم نہ ہوگا یہ کئی روز کا فاقا　　جب تیغوں کے پھل کھائیں تو حاصل ہوا فاقا
اولاد سے مطلب ہے نہ گھر سے ہے علاقا　　دنیا میں کہاں پائیں گے شبیرؑ سا آقا
پایا ہے یہ کس نے جو ہمیں پایا ملے گا
قبروں کو بھی شبیرؑ کا ہمسایا ملے گا

کیا فوج تھی کیا لوگ تھے اللہ رے ارادے　　اس پر بھی بہترؑ تھے سوار اور پیادے
ایک ایک جب آقا کے لئے جان لڑا دے　　کیوں کر نہ بھلا فاطمہؑ ان سب کو دعا دے
سردار مجاہد ہو تو انصار ہوں ایسے
آقا جو ہو ایسا تو مددگار ہوں ایسے

ہتھیار چمکتے ہوئے اور برق سے تازی　　دیں دار خوش اطوار وفادار نمازی
مکّی و قریشی و حسینی و حجازی　　زور آور و لشکر شکن و صفدر و غازی
جب آنکھ ملا دیں تو دلیروں کو بھگا دیں
قبضے پہ رکھیں ہاتھ تو شیروں کو بھگا دیں

حاضر درِ حضور پہ وہ خاصگانِ رب　　ایک ایک جن میں فخرِ عجم زینتِ عرب
غربت زدہ، گرسنہ و مظلوم و تشنہ لب　　سن کر سحر کا شور اٹھے بستروں سے سب
کہتے تھے ہائے جا کے کدھر جستجو کریں
پانی نہیں کہ قبلۂ عالم وضو کریں

نکلے حرم سے کر کے تیمم امام پاک　　سجادے سب نے لا کے بچھائے بروئے خاک
اکبرؑ نے دی اذاں جو بہ آواز دردناک　　آنسو بھر آئے ہوگئے دل غم سے چاک چاک
آگے سبھوں کے شاہ حجازی کھڑے ہوئے
پیچھے صفیں جما کے نمازی کھڑے ہوئے

آراستہ صفیں تھیں کہ قرآں کھلا ہوا　　بسم اللہ آگے جیسے ہو یوں تھا وہ مقتدا
اور مقتدی تھے سب عقب شاہ کربلا　　مصحف کی جس طرح سے ہوں سطریں جدا جدا
جیسا امام ویسی ہی ابرار فوج تھی
ہر صف خدا کے نور کے دریا کی موج تھی

سیدھے کبھی الف کی طرح تھے وہ خوشخصال　　جھک جاتے تھی رکوع میں گاہے بشکلِ دال
خم ہوگئے سجود میں گہہ صورت ہلال　　پیشانیوں سے صاف عیاں نور ذوالجلال
حق سے دعا قنوت میں کوثر کے جام کی
طاعت خدا کی تھی تو اطاعت امام کی

وہ چاند سے سفید عمامے رخوں پہ نور　　دیکھے سے جن کے سیر کبھی ہو نہ چشمِ حور
دیندار و حق پرست و دل آگاہ و باشعور　　کمریں کسے جہاد پہ، راحت دلوں سے دور
لب پر درود اشکوں سے آنکھیں بھری ہوئیں
تلواریں سجدہ گاہوں کے آگے دھری ہوئیں

حُبِ حسینؑ دل میں زبانوں پہ ذکرِ حق　　نے فکر کچھ عیال کی نے مرگ کا قلق
دیندار ایسے پھر نہ ہوئے زیرِ نہ طبق　　حقا کہ سب صحیفۂ ایماں کے تھے ورق
کس آفتِ عظیم میں ثابت قدم رہے
آقا کا دم بھرا کئے جب تک کہ دم رہے

اللہ رے جوانانِ حُسینی کے ارادے　　ساونت نہ ہوں کیوں جنھیں توفیق خدا دے
کُل تیس تو اسوار تھے چالیس پیادے　　ایک ایک پر ایسا تھا کہ لاکھوں کو بھگا دے
جنت ہی شہیدوں کی شہادت کا صلا تھا
ہفتم سے دہم تک انہیں پانی نہ ملا تھا

کچھ پیاس کا شکوہ تھا نہ فاقوں کی شکایت　　ایک ایک تھا پروانۂ مصباحِ ہدایت
تھی دل میں ولائے پسرِ شاہِ ولایت　　لب پر ☆فَسَيَكْفِيكَهُمُ الله کی آیت
ہرچند یہ سامانِ وغا ان کی طرف تھا
حضرت کے یہ تھے ساتھ خدا ان کی طرف تھا

پڑھ پڑھ کے نمازیں شب عاشور گزاری　　خشکیدہ زبانوں پہ رہا شکر ہی جاری
ہر دم ہی یہ نعرہ تھا کہ یا ایزدِ باری　　ہے فکر کہ عزت ہے ترے ہاتھ ہماری
خوشنود رہے فاطمہؑ وہ کام کریں ہم
پہلے ترے محبوب کے پیارے سے مریں ہم

☆نوٹ:- فَسَيَكْفِيكَهُمُ الله، فَ سَ يَكفي كَ هُمُ الله وَهُوَ السَّميعُ العَليمُ (البقرۃ آیت ۱۳۷)
ترجمہ:- تمہیں خدا کافی ہے اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

واں ظلم پہ باندھے تھا کمر لشکرِ کفار — تھوڑے سے جواں یاں کے بھی تھے مرنے پہ تیار
ذی قدر، جواں مرد، خوش اطوار، وفادار — خاصانِ خدا، متقی و زاہد و ابرار
آغوشِ محمدؐ کا مکیں اُن کی طرف تھا
دنیا تو ادھر جمع تھی دیں اُن کی طرف تھا

تھا فتح کے سورے کا مفسّر کوئی ذی جاہ — پڑھتا تھا کوئی آیۂ نصرت طرفِ شاہ
کہتا تھا کوئی ہنس کے توکّلت علی اللہ — بولا کوئی اب جلد کٹی جاتی ہے یہ راہ
گو رحم نہ یہ لشکرِ نااہل کرے گا
اس پیاس کی سختی کو خدا سہل کرے گا

تھا سورۂ کوثر کسی پیاسے کی زباں پر — مائل تھا کوئی سیرِ گلستانِ جہاں پر
صدقے کوئی ہوتا تھا امامِ دو جہاں پر — لڑکے بھی کھڑے تھے کئی کھیلے ہوئے جاں پر
تسبیحِ امامت کو عجب دانے ملے تھے
یا فاطمہؑ کی شمع کو پروانے ملے تھے

عاشق شہ والا کے، مطیعِ اسداللہ — سر دینے کو سب ہادیٔ کونین کے ہمراہ
مستغنی وحق بین وحق آئین وحق آگاہ — دنیا کو وہ دیندار سمجھتے تھے گزرگاہ
فاقوں میں توکّل تھا جنابِ اَحدی پر
پڑتی تھی نظر اُن کی نعیمِ ابدی پر

خشکیدہ زبانوں پہ سخن شکر کا جاری — معشوقِ امام دو جہاں عاشقِ باری
کوئی تو محدّث کوئی حافظ کوئی قاری — ہم رتبۂ سلمان و اباذرِ غفاری
سمجھے ہوئے تھے تلخ وہ لذّاتِ جہاں کو
تھا چاشنیٔ فقر سے کام اُن کی زباں کو

گو فاقوں سے تحلیل تھے وہ صاحبِ توقیر — موقوف نہ ہوتے تھے مگر نعرۂ تکبیر
دانائے جہاں سیف زباں صاحبِ شمشیر — طینت میں وفاداروں کے تھی الفتِ شبیر
دل تیروں سے زخمی ہوئے چھد چھد گئے سینے

سر رشتۂ تسبیح کو توڑا نہ کسی نے

اک ایک مئے وحدتِ اللہ سے سرمست ثابت قدم و صفدر و جانباز و زبردست
سرکائیں نہ سینوں کو جو سو تیر ہوں پیوست سمجھا کئے دنیا کی بلندی کو سدا پست
نے گھر کا نہ اولاد کا نے مال کا غم تھا
غم تھا تو فقط فاطمہؑ کے لال کا غم تھا

کس شوق سے تلواروں کے پھل بھوک میں کھائے پانی کا مگر نام زبانوں پہ نہ لائے
آقا کی محبتؑ میں وطن چھوڑ کے آئے ایسے بھی نمک خوار کسی نے نہیں پائے
زرہیں تن پُرنور میں شیروں کے لڑی تھیں
آنکھیں سپہ شام کی تیغوں سے لڑی تھی

پہلو میں کوئی اور کوئی پیش شہ خوش خو کوئی سپر حفظ ، کوئی جوشن بازو
رُخ چاند سے روشن تو بدن پھولوں سے خوشبو رخساروں پہ سنبل سے لٹکتے ہوئے گیسو
تیروں سے نہ تلواروں سے منہ پھرتا تھا اُن کا
حضرت کے پسینے پہ لہو گرتا تھا اُن کا

کیا شانِ حبیب ابن مظاہر کا لکھوں حال وہ پیاس کا صدمہ وہ ضعیفی وہ سن و سال
کیا رتبۂ اعلیٰ تھا زہے حشمت و اقبال فرماتا تھا بھائی جسے خود فاطمہؑ کا لال
جو عشق تھا سلمان و ابوذر کو نبیؐ سے
ان کو وہی الفت تھی حسینؑ ابن علیؑ سے

انداز جوانوں کا بھی پیرانہ سری بھی پروانۂ جاں باز بھی شمعِ سحری بھی
ابرار بھی دیں دار بھی عصیاں سے بری بھی زاہد بھی مجاہد بھی نمازی بھی جری بھی
طفلی سے یہ فوج شہ نامی میں رہے تھے
تریسٹھ ۶۳ برس آقا کی غلامی میں رہے تھے

تھا وہ قدمِ گشتہ شجاعت سے نہ خالی مرنے کو چلے کیا کہ چلی تیغ ہلالی
پسپا تھی وہ صف جس پہ نظر شیر نے ڈالی نعرہ تھا یہ ہر دم کہ نثارِ شہ عالی
صدقے ہوئے یوں لختِ دلِ ختم رسلؐ پر

بلبل کبھی جس طرح فدا ہوتی ہے گل پر

اصحاب باوفا کی عظمت وشکوہ کے بیان میں میر انیسؔ کے بہت سے بہترین اشعار مثالوں میں نہیں دیئے گئے۔ یہ موضوع طویل ترین مقالے کا موضوع ہے مرثیوں کے علاوہ رباعیات اور سلاموں میں بھی اصحاب باوفا کا ذکر میر انیسؔ نے کیا ہے آخر میں ایک سلام سے تین شعر پیش کیے جاتے ہیں۔

کیا کیا لڑے ہیں رن میں بہتّر جدا جدا — مجرائی شہ پہ صدقے کیے سر جدا جدا

رن میں ہر اک نے ابن شہ ذوالفقار کو — دکھلائے اپنی تیغ کے جوہر جدا جدا

ہوتے جوان کے سامنے ستّر دو تن شہید — ماتم سبھوں کا کرتے پیمبرؐ جدا جدا

پروفیسر ڈاکٹر محمد حسن (دہلی)

مراثیٔ انیسؔ میں آویزش کی نوعیت

انیسؔ کے مرثیوں کا مطالعہ کئی زاویوں سے کیا جاسکتا ہے۔ پہلی بات جو انہیں دوسری اصناف شعر سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ مراثی غزل کے اشعار کی طرح محض لکھے ہوئے الفاظ نہیں ہیں بلکہ منبر پر پڑھے جانے والے الفاظ ہیں۔ ان کا حُسن اور آہنگ مرثیہ خوانی سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ایک ایسے عوامی آرٹ کی روایت کا حصہ ہیں جو محض کتابی نہیں الفاظ کا دروبست، مسدّس کے مصرعوں کی ترتیب اور مناظر کی تصویر کشی، مجلس کے آداب اور انداز کو سامنے رکھ کر ہوئی ہے اور مجلس کے ادارے کو نظر انداز کر کے مراثی میں انتخابِ الفاظ اور ترتیبِ واقعات کو سمجھنا دشوار ہے۔

مجلس کے طرز کا دوسرا عوامی ادارہ اگر اس دَور میں کوئی تھا تو وہ داستان گوئی کا تھا۔ مشاعروں کا شمار اس زمرے میں نہیں کیا جاسکتا کہ اس وقت تک مشاعرے میں ترنّم نے جگہ نہ پائی تھی اور اس کے دروازے آج کی طرح عوام کے لئے نہیں کھلے تھے۔ داستانیں البتہ سڑکوں کے موڑ پر اور محلّے کے نکڑ پر کہی جاتی تھیں اور مجمع دم بخود داستان گو کے اشارۂ ابرو کا منتظر بیٹھا رہتا تھا۔ داستان گو داستان کے بیان میں جان بوجھ کر ایسے الفاظ برتتا تھا جن کو 'بتایا' جاسکے اور چشم و ابرو کی ہلکی سی جنبش یا ہاتھ کے اشارے سے ادا کر کے بیان کے تاثر کو زیادہ موٴثر بنایا جاسکے۔ داستان گو محض ایسے الفاظ کا انتخاب نہیں کرتا جو حرکت اور عمل کا تصور پیدا کرتے ہوں اور واقعات کا نقشہ آنکھوں کے سامنے لے آتے ہوں بلکہ داستان گو واقعات کی ترتیب اس نہج پر قائم کرتا ہے کہ سننے والے برابر داستان کے اگلے حصے کے لئے بے قرار رہیں اور وہ سننے والوں پر جب چاہے جس قسم کا تاثر پیدا کر سکے۔

اسی لئے وہ مختلف انسانی جذبات کے مرقعے ترتیب کے ساتھ سجاتا ہے۔ مثلاً اگر قصہ دردناک ہے تو اسے نہایت پاکیزہ اور شفاف منظر سے شروع کرے گا کہ جب تاریکی چھانے لگے تو اندھیرے کا احساس اور شدید ہو جائے اور مختلف جذبات کا مرقع اس انداز سے مرتب ہو جائے کہ فن کار سننے والوں کے تزکیہ باطن سے اُن کی شخصیت میں اندرونی آہنگ پیدا کر سکے۔

انیسؔ کا فیض آباد اور انیسؔ کا لکھنؤ قصہ گوئی کے مراکز تھے۔ فیض آباد میں میر حسنؔ نے عروج پایا اور لکھنؤ میں ''رانی کیتکی'' والے انشا اور ''اندر سبھا'' والے امانتؔ نے۔ دونوں کے ہاں قصے پن کا عنصر غالب تھا اور قصہ بھی ایسا جس میں حیرت واستعجاب ہی نہیں تھا، انسانی زندگی کی لذت کوشی اور درد آشنائی دونوں شامل تھیں۔ انیسؔ کے قصے طبعزاد نہیں تھے۔ شاید میر حسنؔ، انشا اور امانتؔ نے بھی قصے کہیں نہ کہیں سے مستعار لئے ہوں، لیکن انیسؔ کا ماخذ واضح تھا اور اس ماخذ پر مذہب اور روایت دونوں کی مہرِ توثیق ثبت تھی۔ اس کا فائدہ بھی تھا اور نقصان بھی۔ فائدہ یہ کہ سامعین کو قصہ پہلے ہی سے معلوم تھا اور اشخاصِ قصہ سے ان کی ہمدردی مرثیہ شروع ہونے کے قبل ہی سے تھی۔ لہٰذا نہ قصے کی جزئیات پر روشنی ڈالنے کی ضرورت تھی نہ اشخاصِ قصہ سے ہمدردی پیدا کرنے کے لئے کردار نگاری پر بہت زیادہ وقت صرف کرنا لازم تھا۔ نقصان یہ تھا کہ فن کار کے تخیل کو قصے اور کردار میں ردّ و بدل کرنے کا مجاز نہ تھا جس کی وجہ سے اس کی جولاں گاہ خاصی محدود ہو گئی تھی اور اس پر سخت فنّی قیود عائد ہو گئی تھیں۔

صحیح ہے کہ انیسؔ نے تاریخ نظم نہیں کی۔ وہ بنیادی طور پر مذہبی مورّخ نہیں، شاعر اور مرثیہ گو تھے۔ انہوں نے واقعۂ کربلا کو اپنے مُلک اور اپنی تہذیب کا رنگ و آہنگ دے دیا۔ واقعۂ کربلا کا جغرافیہ عرب اور عراق کا نہیں، فیض آباد اور نواحِ لکھنو کا ہے جہاں عرب کے ریگستانوں کی جگہ اس زمانے میں جنگلات تھے جن کی کچھار سے ڈکارتا ہوا ضیغم نکل سکتا تھا۔ یہاں قاسم نوشاہ لکھنؤ کے امیرزادوں کی رسموں کے ساتھ دولہا بنتے ہیں، رت جگے ہوتے ہیں اور منّتیں مرادیں مانی جاتی ہیں، بچوں کے گلے میں ہنسلیاں ڈالی جاتی ہیں اور دُلہن کے ہاتھوں میں مہندی رچتی ہے اس تمام تہذیبی تصرف کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ انیسؔ واقعاتِ کربلا اور اشخاصِ واقعات کے کرداروں میں کسی قسم کی بڑی تبدیلی یا تحریف کرنے کے نہ مجاز تھے، نہ اس کی ہمت کر سکتے تھے اس لئے واقعہ کی تشکیل اور کرداروں کی نوعیت سے انیسؔ کا محاکمہ کرنا یا اس سے نتیجے نکالنا یا مطابقت پیدا کرنا مغالطے کا

باعث ہوسکتا ہے۔ انیسؔ کے مرثیوں میں قصہ گوئی کے اعلیٰ عناصر پائے جاتے ہیں۔ انیسؔ بہت اچھے داستان گو بھی ہیں، اس سج دھج سے قصہ بیان کرتے ہیں کہ سُننے والوں کا دل موہ لیتے ہیں۔ جہاں چاہتے ہیں اور جتنی دیر چاہتے ہیں داستان کو روک دیتے ہیں اور سامعین کی پوری دلچسپی کسی ایک مرحلے یا نقطے پر قائم رکھ سکتے ہیں، لیکن اپنی پوری قادرالکلامی کے باوجود وہ قصے اور کرداروں کے نظام میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کرتے، یہ پابندی ان کی فنی آزادی پر لازمی رُکاوٹ کی حیثیت رکھتی ہے اور انیسؔ کے مرثیوں کا محاکمہ کرتے وقت اُن کی اِس مجبوری کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

انیسؔ کے مرثیے ایک مخصوص تکنیک اور دروبست کے آئینہ دار ہیں۔ انیسؔ کے لئے داستان بیان کر پانا ہی معجزے سے کم نہیں۔ پھر ایسی داستان جس پر تاریخ کی مہر ثبت ہو اور مذہبی روایت نے اسے پاکیزہ اور مقدّس بنادیا ہو۔ اسی لئے اپنے متعدد مراثی کو انیسؔ اعجازِ سخن عطا ہونے کی دُعا سے شروع کرتے ہیں جس میں یونانی ڈراموں کے کورس یا سنسکرت ڈراموں کی 'وندنا' کا سا انداز ہے۔ یہ گویا سامعین میں حالتِ انتظار اور احساسِ تقدّس اور جذبۂ احترام پیدا کرتا ہے۔ سننے والے پر یہ ذہنی کیفیت طاری ہونے لگتی ہے جیسے وہ کسی بڑے شاہکار کو سننے والا ہو۔ اس کیفیت سے انیسؔ آہستہ آہستہ برسرِ مطلب آتے ہیں۔

یہاں انیسؔ کے مراثی میں گریز کے مضامین سے بحث کرنا مقصود نہیں، لیکن انیسؔ کے مختلف مراثی کے ابتدائی حصے اُن کی مخصوص تکنیک اور مرثیوں کی بناوٹ پر ضرور روشنی ڈالتے ہیں۔ انیسؔ ہر مرثیے کی مجموعی فضا کے اعتبار سے چہرہ چنتے ہیں۔ اگر انجام بہت ہی دردناک ہے تو آغاز بہت ہی کھلا ڈُلا اور معصومانہ ہوگا۔ صبح کے مناظر کی تصویر کشی، اوس کے قطرے، شبنم سے بھرے ہوئے گلاب کے پیالے، قمری کی آوازیں، سبزے کا لہلہانا اور ہَوا کی مستی یہ سب گویا پیش منظر کی سفّا کی اور تاریکی کا پیش خیمہ ہیں۔ فطرت کے اس قدر معصومانہ شفاف اور سجل عکس کے بعد انسان اُبھرتا ہے۔ ایک طرف وہ انسان جو گویا فطرت کے اسی بھولے پن کا ایک حصہ ہے روشن، پاکیزہ اور بے رِیا اور دوسری طرف ایسے انسان جو گویا اس پس منظر کی نفی کرتے نظر آتے ہیں، سفّاک، تیرہ دل اور ظالم۔

پھر فطرت کے ہم مزاج، ان روشن دل، پاکیزہ وش، بے ریا انسانوں کے انسانی رشتے اُبھرتے ہیں۔ ان کا چھوٹا سا قافلہ، چھوٹا سا خاندان، بھائی، بچّے، بیوی، بہن، دوست، بھانجے، بھتیجے ان سب کے درمیان انسانی رشتوں کا وہ لطیف اور شائستہ سلسلہ ہے جو گویا تہذیب انسانی کی اعلیٰ ترین

قدروں کا عکس معلوم ہوتا ہے۔ یہ سب لوگ نیکی کا مجسمہ ہیں۔ ایثار اور قربانی کا نمونہ ہیں۔ اخلاق و کرم کے پیکر ہیں۔ یہی نہیں حُسنِ سیرت کے علاوہ حُسنِ صورت اور خوش نمائی میں بھی بے نظیر ہیں۔ مردانہ حُسن کی جو بے محابا تصویریں انیسؔ نے کھینچی ہیں وہ اُردو شاعری میں کمیاب ہیں۔ پھر ان نیک خُو انسانوں کو خدا کی بارگاہ میں بھی وہ منزلت حاصل ہے کہ ان کے ایک اشارے سے قضا و قدر کا فیصلہ بدل سکتا ہے اور نظامِ فطرت تہہ و بالا ہوسکتا ہے۔ یہ مقرب بارگاہ بندے واقعات کا رُخ موڑ سکتے ہیں۔ پھر وہ جری اور بہادر بھی ایسے ہیں کہ ان میں ہر ایک غنیم کی پوری فوج کے لئے کافی ہے۔ رن پڑتا ہے تو ایک ایک جری ہزاروں غنیموں کا منہ پھیر دیتا ہے۔

(۲)

ایسے برگزیدہ، جری اور نیک نفس بندے جن کی دل موہ لینے والی تصویریں انیسؔ کے مرثیوں میں جا بجا بکھری ہوئی ہیں، ان المیوں کے ہیرو ہیں۔ المیہ ٹکراؤ سے وجود میں آتا ہے اور ٹکراؤ یا تو کمزور انسان اور طاقت ور مشیت کے درمیان ہوسکتا ہے جو اکثر یونانی المیہ کی بنیاد ہے یا پھر خود ہیرو کی شخصیت کے بکھراؤ سے پیدا ہوتا ہے۔ المیہ کا ہیرو خود کسی ایسی اندرونی کمزوری یا افتراق کا شکار ہو جاتا ہے جو اس کی مرتب اور منضبط شخصیت کو پارہ پارہ کر ڈالتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ انیسؔ کے مرثیوں میں المیہ کرداروں کی کشمکش کی نوعیت کیا ہے۔ یقیناً ان میں کوئی اندرونی خلش موجود نہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ ایک لمحہ کے لئے بھی حضرت امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کے ایمان متزلزل ہوئے ہوں یا اُنہیں دنیا کے موہ یا جان کے لالچ نے صحیح راستے سے بھٹکا دیا ہو۔ ان کا راستہ صاف اور سیدھا، ان کا عزم ہمالیہ کی طرح مضبوط اور ان کی شخصیت مرّتب اور مربوط ہے۔ یہ بھی نہیں کہ ظالم مشیت ان کے ساتھ کھیل کھیل رہی ہو یا قضا و قدر کا نظام ان کا دشمن ہے۔

بی بی زینبؑ نے کوفہ کے بازار میں خطبہ دیا تو انہوں نے کوفہ کے روتے ہوئے ہجوم سے یہی سوال کیا تھا، یہاں تو سب میری ہمدردی میں رو رہے ہیں۔ آخر کس نے ہمیں تباہ و برباد کیا؟ یہ سوال انیسؔ کے مرثیوں میں بھی اُبھرتا ہے۔ یزید، شمر یا ابنِ زیاد کا نام لیا جا سکتا ہے لیکن حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کو برباد کرنے کے لئے یہ لوگ بہت چھوٹے معلوم ہوتے ہیں۔ امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کے نام کا سکّہ تو قضا و قدر پر بھی چلتا تھا، خدا کی خدائی ان کے تابعِ فرمان تھی، ان کی نیکی اور برگزیدگی کی دھوم تھی، ان کے ہونٹوں سے نکلی ہوئی ایک دعا حالات کا رُخ موڑ سکتی تھی۔ پھر ایسا

کیوں ہوا کہ یزید، شمر اور اس کے ساتھی نیکی اور برگزیدگی کے خلاف فتح یاب ہو گئے اور نظامِ قضا و قدر اس جنگ و جدل کو دُور سے دیکھتا رہا۔

اخلاقی عظمت، روحانی برگزیدگی اور حُسنِ سیرت کی تمام صفات سے قطع نظر، صرف ان نیک نفس اشخاص کی شکل و شمائل پر نظر کیجئے:-

آنکھیں وہ نرگسی، جنہیں دیکھے سے ہو سرور روشن میانِ کعبہ ہیں یہ دو چراغِ طور
یا صاف دو ستاروں کا ہے ایک جا ظہور کوثر سے یا بھرے ہوئے ہیں ساغر بلور

حق بیں ہیں، حق پرست ہیں، یزداں پرست ہیں
ہشیار کیوں نہ ہوں، مئے عرفاں سے مست ہیں

رخسارۂ روشن، گُلِ خورشید پہ ور ہے اس جا گُلِ تر بھی عرقِ شرم میں تر ہے
یہ ریشِ مُطہر نہیں، ہالے میں قمر ہے یہ صاف ہویدا ہے، یہ شب ہے، یہ سحر ہے

پہلو میں شبِ قدر کو، یاں بدر لئے ہے
اور بدر کو ہالے ہیں شبِ قدر لئے ہے

حُسنِ انسانی کے ایسے خوبصورت، پاک سرشت اور نیک کردار پیکر تو اس لائق نہ تھے کہ صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا دیئے جائیں اور وہ بھی اس طرح کہ ان پر ڈھائے گئے ظلم و ستم مدتوں گریہ و ماتم کا سبب بنے رہیں اگر یہ قربانی ایسے نیک اور برگزیدہ بندوں کو دینی پڑی تو یقیناً اس کا سبب مشیت ہی ہوگی۔ اسے محض فطرت کی چیرہ دستی پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔

فطرت نے آخر ان سے قربانی کیوں طلب کی۔ اس کا ایک جواب تو یہ ممکن ہے کہ حضرت عیسیٰ کی طرح ہر دَور میں برگزیدہ ترین افراد کو جرم حیات کی سزا پورے عالمِ انسان کی طرف سے بھگتنا پڑتی ہے اور یہ سزا گویا فرضِ کفایہ کے طور پر ان کے حصّہ میں آتی ہے۔ خیر کے پنپنے کے لئے شر لازمی طور پر یہ قربانی لیتا آیا ہے۔ دوسرا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ کائنات آفریں کو من موہنی مورتیں بنانے، انہیں بڑے پیار سے سجانے اور پھر انہیں بے دردی اور سفا کی سے مٹانے ہی میں مزا آتا ہے۔ تخلیق کا یہ آئینہ خانہ اس کے لئے محض ایک کھیل ہے اور یہ کھیل من مانے اصولوں کا پابند ہے۔ لیکن اس کی ایک ادبی توجیہ یہ بھی ممکن ہے کہ راستی کا رشتہ ہمیشہ دار و رسن سے جُڑا رہتا ہے اور سچ تختی کی آگ سے گزر کر ہی کندن بنتا ہے۔

یہ استفہامیہ انیسؔ کا نہیں انیسؔ کے پورے تمدّن کا استفہامیہ بن کر اُبھرتا ہے۔ فیض آباد سے دارالسلطنت لکھنؤ منتقل ہوا، آصف الدولہ کا زمانہ بیتا اور سعادت علی خاں کے دَور کے بعد لکھنؤ کا زوال شروع ہوا۔ ایک طرف لکھنؤ نے نئے تمدن کی شائستگی کو نقطۂ عروج تک پہنچایا۔ دہلی نے ایک ملی جُلی تہذیب کو جس نفاست اور لطافت کے درجہ تک پہنچا دیا تھا لکھنؤ نے اِسے آگے بڑھایا۔ دوسری طرف سیاسی طور پر اودھ کی حکومت مکمل طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجوں پر منحصر اور محتاج ہوگئی۔ کمپنی نے اودھ کے حکمرانوں کی درخواست کے باوجود فوجوں کی تعداد کم کرنے سے انکار کر دیا اور بن بلائی فوجوں کی تنخواہ کا بار اودھ پر اس قدر زیادہ ہوگیا کہ شاہی خزانہ خالی ہونے لگا۔ بیگمات اودھ پر ظلم و تعدّی کر کے ان سے رقم وصول کرنے یا فیض آباد کو لُوٹنے کے واقعات اسی بنا پر پیش آئے اور آخر میں غازی الدین حیدر سے لے کر واجد علی شاہ تک سبھی فرماں روا اپنے کو اس درجہ مجبور پانے لگے کہ جان بوجھ کر لہو و لعب میں پناہ لینے کے سوا ان کے سامنے کوئی چارہ نہ رہا۔

(۳)

انیسؔ کے دَور کے سامنے یہ سوال بار بار آیا ہوگا کہ آخر ایک ایسی تہذیب جس نے صدیوں کے بعد شائستگی کا نکھار پایا ہے اور اس تہذیب کی لطافت و نفاست کو جنم دینے والے سماج کو زمانہ کیوں حرفِ غلط کی طرح مٹانے پر تُلا ہوا ہے۔ تہذیب کے اس اعلیٰ منصب تک پہنچنے والا معاشرہ آخر کیوں اپنے کو اس قدر بے بس اور مجبور پا رہا ہے۔ اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کی ابتدا میں دہلی اور لکھنؤ میں فروغ پانے والے معاشروں کو اکثر انحطاطی اور زوال پذیر کہا گیا ہے۔ (راقم الحروف نے بھی اپنی کتاب ''دہلی میں اردو شاعری کا فکری اور تہذیبی پس منظر'' میں اسی خیال کا اظہار کیا ہے) اکثر اس کا اعلان کیا گیا ہے کہ اس دَور کی تہذیب کے پاس ایسی مثبت قدریں باقی نہیں رہ گئی تھیں جو ارتقا پذیر سماج کے سوالوں کا جواب دے سکیں اور نیا حوصلہ یا آدرش پیش کر سکیں۔ لیکن اس کو کیا کہیئے کہ تہذیب کے تقریباً سبھی شعبوں میں جو ترقی اس دَور میں ہوئی ہے اس کی نظیر اس کے قبل کی ایک صدی میں موجود نہیں۔ دہلی میں نہ صرف قابلِ ذکر اور اہم مکاتیب کا جال بچھا ہوا تھا بلکہ اہم مفکّر، انشا پرداز، شاعر غرض ہر فن کے ماہرین اسی زمانے میں اُبھرے۔ لکھنؤ کا بھی یہی حال تھا۔ غازی الدین حیدر کے زمانے میں طباعت کا کام شروع ہوا۔ سائنس اور علم ہیئت پر کتابیں چھپنے لگیں، تاریخ کی اہم کتابیں لکھی گئیں، اسی زمانے میں لکھنؤ کی یادگار عمارتیں تعمیر

ہوئیں جو فنِ تعمیر کے نقطۂ نظر سے ملک گیر اہمیت رکھتی ہیں۔ موسیقی اور رقص میں نئے طرز اُبھرے۔ تفضل حسین علامہ جیسے لوگ پیدا ہوئے۔ نشست و برخاست سے لے کر معاشرت اور علمِ مجلسی تک ہر فن کے آئین و آداب مرتب ہوئے۔ زبان کی تراش خراش لفظوں کے دروبست، شاعری اور نثر کے رموز و ضوابط پر توجہ ہوئی۔ جہاں تہذیب اور معاشرہ اس قدر شائستگی تک پہنچے ہیں، اُس سماج کو محض زوال پذیر اور انحطاطی نہیں کہا جا سکتا۔

انحطاط اور زوال کی بنیادیں اقتصادی نظام پر قائم ہوتی ہیں۔ تفصیل کا موقع نہیں لیکن یہاں یہ اشارہ کیا جا سکتا ہے کہ اس دَور کا ہندوستان نئے اقتصادی اور تجارتی اُفق چاہتا تھا۔ پیداوار اس منزل تک پہنچی تھی کہ اس کی کھپت کے لئے نئے بازار اور ان بازاروں تک پہنچنے کے لئے نئی سہولتیں اور نیا انتظامی ڈھانچہ درکار تھا۔ عین اسی وقت ایسٹ انڈیا کمپنی سیاسی اُفق پر طلوع ہوئی اور شروع میں یہاں کے مقامی تاجروں حتیٰ کہ سیاسی سربراہوں سے تعاون حاصل کر کے اس نے برآمد کا سارا نظام سنبھال لیا اور بعد کو بلا شرکتِ غیرے اس پورے کاروبار کی اجارہ دار بن بیٹھی۔ نتیجے کے طور پر ہمارا سابقہ ایک ایسے توانا اور تندرست نظام سے پڑتا ہے جو وسعت اور پھیلاؤ کا طلبگار ہے اور چونکہ وسعت اور پھیلاؤ کے سارے راستے ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضے میں ہیں لہٰذا آکسیجن کی اس کمی کی بنا پر ہمارا نظام ہاتھ پاؤں پٹک رہا ہے۔ اودھ کے علاقوں میں تجارت کے جتنے زبردست مراکز تھے ان کا ہلکا سا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کمپنی کے لاتعداد افسروں اور ملازموں نے ان علاقوں میں ذاتی کاروبار شروع کر رکھا تھا۔ فیض آباد جامدانی کا مرکز تھا۔ کپڑے اور نیل کی تجارت کی اجارہ داری کمپنی کے ملازمین کو حاصل تھیں۔ خود گل کرسٹ نے نیل کا کاروبار کیا او بہت نفع کمایا لیکن اس قسم کے تمام کاروبار سے حاصل شدہ دولت ان علاقوں میں واپس نہیں آئی بلکہ کمپنی کی لُوٹ میں شامل ہو کر ملک سے باہر چلی گئی۔ اس مالی زبوں حالی کا اثر اس دَور کے پورے مزاج پر پڑا اور پورا سماج تشنج میں گرفتار ہو گیا۔

فوجیوں کو تنخواہ نہیں ملتی۔ نظم و نسق پر مقامی حکمرانوں کو قابو نہیں ہے۔ روزگار اور تجارت کے نئے مواقع حاصل نہیں ہیں۔ بے اطمینانی کی کیفیت طاری ہے۔ معاشرے کے سامنے آگے بڑھنے کا کوئی منصوبہ ہے نہ ارمان۔ اس حالت میں عیش و نشاط کے مشغلے راہِ فرار کا درجہ رکھتے ہیں یا اپنی مجبوری کے اعتراف کا جب کسی پر بس نہ چلے تو اپنے گریبان پر ہی ہاتھ پڑتا ہے۔

(۴)

انیسؔ اس صورتِ حال کے محض تماشائی نہ تھے، خود اس میں شریک تھے۔ اُن کی ہمدردیاں اُس طبقہ کے ساتھ تھیں جس نے اس تہذیب کو بنایا اور سنوارا تھا۔ اس لئے اس تہذیب کے آئینہ خانے کا ہر عکس اُنھیں عزیز تھا۔ یہاں اس تہذیب کی خامیوں سے بحث ہے نہ اس طبقہ کی کمزوریوں سے۔ دونوں کی فہرست طولانی ہے لیکن اتنی بات یقینی ہے کہ انیسؔ اپنے مرثیوں میں جس آویزش سے دوچار نظر آتے ہیں ان کا براہِ راست تعلق ان کے دَور کی آویزش سے ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے۔ قدرت ایسے نقشِ حسین حرفِ غلط کی طرح مٹانے پر کیوں تلی ہوئی ہے؟ متوازی صورت حال انہیں واقعۂ کربلا میں ملتی ہے۔ انیسؔ پورے واقعہ کو اپنا تہذیبی پیکر بخش دیتے ہیں اور اپنے دَور کے استفہامیہ کو مذہبی تاریخ کے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں اس لحاظ سے فرات اور دشت کربلا کو فیض آباد اور لکھنؤ کے نواح کے انداز میں بیان کرنا یا عرب کرداروں کے مزاج، پوشاک، گفتگو، رسم و رواج اور تہذیبی سیاق کو لکھنؤ کے اس طبقے کے رنگ و آہنگ عطا کرنا کچھ تعجب خیز نہیں۔ کیونکہ لکھنوی تہذیب کا امانت دار یہی طبقہ اس نہج کے بحران کا شکار تھا وہ اپنے کو علم، اخلاق، شائستگی کا پیکر جانتا تھا اور پھر بھی کڑی جھیل رہا تھا اور سختی اور زبوں حالی میں گرفتار تھا۔

یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ اُردو مرثیے کے آہنگ میں عصری زبوں حالی کا ماتم اس سے قبل بھی ہوتا آیا ہے۔ دکنی ادب کے سبھی مورّخ معترف ہیں کہ گولکنڈہ پر اورنگ زیب کے تسلّط کے بعد دکن کی غلامی اور ابوالحسن تاناشاہ بادشاہ کی معزولی کا ماتم مرثیے کے پیرائے میں ہوا اور اس دور کے مرثیہ نگاروں نے واقعۂ کربلا اور اشخاصِ کربلا کے پردے میں گولکنڈہ کی تباہی اور اس کے فرماں روا کی معزولی کا بھی ماتم کیا جو اچھائیوں کے باوجود ظلم و ستم کا نشانہ بنے۔ یہی صورتِ حال انیسؔ کے زمانے میں بھی تھی اور نیکی کی زبوں حالی کا جو استفہامیہ انیسؔ کے دَور کے سماج کو درپیش تھا وہی ان کے مراثی کی بنیادی کشمکش کی صورت میں ظاہر ہوا۔ یہاں مشیت کی چیرہ دستی کی فریاد نہیں ہے بلکہ مشیتِ الٰہی کے برگزیدہ بندے ہوتے ہوئے گویا مشیت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینے اور سخت ترین عذابوں کو جھیلنے پر رضامند ہو جانے کی صورت ہے۔ یہی سپردگی، نیکی اور برگزیدگی ہے اور اس سے مفر نہیں۔

(۵)

انیسؔ کا تخئیل میدان تخلیق کا رِہ نورد ہے۔ تخئیل کی دنیا میں مادّی زندگی کی بہت سی محرومیاں اپنا بدل پالیتی ہیں اور جن کوتاہیوں کا کوئی علاج زندگی میں ممکن نہیں ہوتا، تخئیل کی دنیا میں ان کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ شاید اس کی سب سے اچھی مثال عبدالحلیم شررؔ کے اسلامی ناول ہیں جو اس دَور میں لکھے گئے جب ہندوستان پر یورپی راج تھا اور ان ناولوں کا موضوع وہ صلیبی جنگیں ہیں جن میں عیسائیوں پر مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی ہے۔ گویا مادّی زندگی کی غلامی کا بدلہ تخلیقی تخئیل نے صلیبی جنگوں کی فتح کی یاد دلا کر لے لیا۔ انیسؔ کے مراثی بھی تخئیل کی اس تسکین سے خالی نہیں۔ انیسؔ کا زمانہ وہ تھا جب جنگ کے میدان ایسٹ انڈیا کمپنی کی فتوحات کے نعروں سے گونج رہے تھے۔ ہندوستانی ریاستیں پسپا ہو رہی تھیں۔ ان کی فوجیں ذلیل اور شکست خوردہ تھیں۔ جرأت اور حوصلہ مندی کے جذبے مفقود تھے۔ عسکری مزاج قوم سے جاتا رہا تھا۔ انیسؔ نے اسی دَور میں مرثیہ کو رزمیہ آہنگ سے معمور کیا۔ شاید اسی دَور میں یہ رزمیہ آہنگ مادّی زندگی کی ساری محرومیوں اور ساری شکست خوردگی اور احساسِ تذلیل کا جواب بن سکتا تھا۔

اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو انیسؔ کے مراثی اس دور کے (Testament of Faith) کے طور پر سامنے آتے ہیں اور یہاں Faith محض ایک مذہبی عقیدہ نہیں ہے بلکہ اس دَور کا منشورِ حیات ہے جو اپنے لئے زندگی کا جواز اس استدلال سے تلاش کرتا ہے کہ نیکی اور برگزیدگی کو جرمِ زندگی میں انتہائی قربانی دینی ہوتی ہے اور جرمِ بے گناہی کچھ ایسا ہے جس کے لئے مشیت کی سفاکی اور بے رحمی لازمی نہیں، جس میں پُر اسرار مصلحتوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے انیسؔ کے مراثی کی بنیادی آویزش محض فنّی سطح ہی پر نہیں اس دَور کی پوری تہذیبی سطح پر اُبھر رہی تھی۔ انیسؔ کے مراثی اس دَور کے اہم ادبی دستاویز ہی نہیں ہیں بلکہ نئے تقاضوں کی للکار پر اس دَور کے فکری اور جذباتی رَدِّعمل اور ان کا ایک مربوط اور معنی خیز اظہار ہیں۔ یہ کشمکش اس دَور کی ہوتے ہوئے بھی محض اس دَور تک محدود نہیں تھی۔ اس کا تعلق انسانی وجود کے ایسے مسائل سے ہے جن سے ابتدا سے آج تک انسانی سماج دوچار رہا ہے یہی وجہ ہے کہ اس للکار اور اس رَدِّعمل دونوں کی معنویت اور کشش آج بھی اسی طرح قائم ہے اور جب تک یہ قائم ہیں اس وقت تک انیسؔ کے کلام کا جادو بھی قائم رہے گا۔

میر انیسؔ اور چیونٹی

۱۸۸۰ء میں جرمنی نے یہ قانون بنایا تھا کہ جو شخص چیونٹیوں کو مارے یا اُن کی گذر بسر میں مخل ہو تو وہ ایک ماہ کی سزا یا نتو۱ مارکس کے جرمانہ کا مستوجب ہوگا۔ کیوں کہ یہ پودوں اور درختوں کے موذی اور مہلک کیڑوں کے مار ڈالنے میں بے حد کامیاب ثابت ہوئی ہیں۔

کیا یہ بات میر انیسؔ کو معلوم تھی.....؟

کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی
چلے جو راہ تو چیونٹی کو بھی بچا کے چلے

پروفیسر ڈاکٹر شارب ردولوی (لکھنؤ)

اُردو تنقید پر انیسؔ کا اثر

دُنیا کی تقریباً ہر زبان میں شعرا نے ایسے اشعار اور نظمیں لکھی ہیں جو نہ صرف یہ کہ ان کے تنقیدی شعور کی نشان دہی کرتی ہیں بلکہ آنے والے زمانوں میں اسی شعور پر شعر و ادب کی تنقید کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ یہ بحث یہاں پر بہت مفید نہیں ہوگی کہ تنقید یا تنقیدی شعور پہلے پیدا ہوا یا شاعری پہلے وجود میں آئی لیکن تاریخی شواہد سے اس کا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ تنقید نے فنّی صورت شاعری کے وجود میں آنے کے بہت عرصے بعد اختیار کی گو کہ انتخابِ الفاظ، اوزان و بحور، اندازِ بیان اور ایک خیال کو دوسرے خیال پر فوقیت دینے میں شعرا کا تنقیدی شعور ضرور شامل تھا، تنقید کے ابتدائی خدوخال بھی قدیم شعرا کے کلام ہی میں نظر آتے ہیں اور وہی خدوخال وقت اور زمانے کی تبدیلی کے ساتھ رفتہ رفتہ فنّی صورت اختیار کرتے گئے۔ چنانچہ تنقید کا پہلا اشارہ بھی ایک نظم ہی میں ملتا ہے۔ ہومرؔ نے الیڈ میں اکلیز کی ڈھال پر ہی فسٹس کے بنائے ہوئے سونے کے نقوش کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''اور ہل کے پیچھے زمین سیاہ ہوتی گئی اور ہل چلی ہوئی زمین لگتی تھی حالانکہ کام سونے کا تھا اور یہ اس کی صناعی کا معجزہ تھا''۔

یا دوسرا اشارہ شاعری سے متعلق، اس کی دوسری تصنیف اوڈیسی کے آٹھویں حصے میں ملتا ہے۔

''اس مقدس مطرب ڈیموڈوکس کو بلاؤ کیونکہ خدا نے اُسے جیسی گانے کی صلاحیت دی ہے کسی اور کو

نہیں دی۔ اس لئے جیسے اُس کا جی چاہے اُس طرح گا کر وہ انسانوں کو خوش کرے''۔

اسی طرح دنیا کی مختلف زبانوں کے شعرا نے کسی نہ کسی انداز میں فنِ سُر، تخلیقی عمل اور محاسنِ شاعری کی طرف اپنی تخلیقات میں تنقیدی اشارے کئے ہیں۔ بعض شعرا نے پوری پوری نظمیں فنِ شاعری کے بارے میں لکھی ہیں۔ مثلاً ابن رشیق نے تخلیقِ شعر، اُس کی خصوصیات اور شاعر کے فرائض کے بارے میں ایک نظم لکھی ہے جس کے ایک شعر میں وہ کہتا ہے ''یعنی جب نظم پوری کر چکو تو اپنے اشعار کی خود تنقید و تصحیح کرو اگر چہ وہ واضح اور صاف ہوں''۔

اسی طرح شعرا نے تخیل، مبالغہ، ربطِ الفاظ، سلاست و فصاحت، بلاغت، تشبیہ کی اہمیت اور ضرورت، رعایتِ لفظی اور صنائع کے بارے میں اپنے اشعار میں اشارے کئے ہیں۔ اُردو شعرا کے یہاں اس طرح کے واضح اشارے یا مبتدی شعرا کے لئے تنبیہ کے اشعار بکثرت مل جاتے ہیں۔ مُلا وجہی نے قطب مشتری میں لکھا ہے۔

جو بے ربط بولے تو بتیاں پچیس　　بھلا ہے جو یک بیت بولے سلیس

اگر خام ہے شعر کا تجھ کوں چھند　　چنے لفظ لیا ہور معنی بلند

وجہی کے علاوہ قلی قطب شاہ، غواصی، ولی، سراج، آبرو، سودا، میر، ناسخ، آتش، انیس اور دوسرے شعرا کے یہاں بھی اشعار میں ایسی باتیں کہی گئی ہیں جو اس عہد کے تنقیدی شعور اور رجحانات کی نشان دہی کرتی ہیں۔ چونکہ اس عہد میں تنقید کی فنی شکل وصورت متعین نہیں تھی اور یہ اشارے تنقید کی زبان کے بجائے شاعری کی زبان میں تھے اس لئے انہیں تنقید میں شمار نہیں کیا گیا۔ لیکن بعد کے ادوار میں جب تنقید کے اصولوں اور فنِ شعر پر باقاعدہ غور وخوض کیا گیا تو یہی اشارے اُن اصولوں کی ترتیب میں معاون ہوئے۔

افلاطون نے جب شاعری کو اپنی ریاست سے خارج کیا یا ارسطو نے فنِ تنقید پر اہم ترین کتاب بوطیقا کی تدوین کی تو ان کے سامنے شعر، المیہ، رزمیہ یا ڈرامے کی پرکھ کے لئے پہلے سے بنے ہوئے اصول نہیں تھے جن پر وہ حکما اپنے نظریات کی بنیاد رکھ سکتے۔ یہ اصول اس عہد کے شعرا اور ڈراما نگاروں کی تخلیقات سے ہی اخذ کئے گئے تھے۔ ایسی صورت میں محاسن و معائب کے پرکھنے کے اصول اُن شعرا کی تخلیقات میں ملنے والے تنقیدی اشاروں اور اچھے شعر و ڈرامے کی خصوصیات کے بارے میں اُن کے خیالات سے ہی سب سے پہلے متعین کئے گئے۔ ایک اچھا شاعر اچھا تنقیدی

شعور بھی رکھتا ہے۔ کسی شاعر کا تنقیدی شعور جتنا بلند ہوگا اُس کی شاعری میں اتنی ہی گہرائی اور وسعت ہوگی۔ اس لئے کہ خیال کی ترتیب، الفاظ کے انتخاب، مشاہدے کی باریکی، تجربے کی شدّت، جذبے کا جوش، تخیّل کی جولانی اور اُن سب میں ایک توازن کا برقرار رکھنا شاعر کے بلند تنقیدی شعور کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر عہد کے تنقیدی مزاج اور شعور کو بنانے اور تنقیدی اصولوں کو مرتب کرنے میں اگر ایک طرف اس عہد کا علم، فلسفہ، جمالیات اور فکری تصوّرات مددگار ہوتے ہیں تو دوسری طرف اس عہد کے شعرأ کا کلام اثر انداز ہوتا ہے۔ ادب کی تاریخ میں بہت سے ایسے شعرا ملیں گے جنہوں نے اپنی جودتِ طبع، فکر کی بلندی اور تخلیقی بصیرت سے شاعری کے موضوع اور ہیئت میں اہم اضافے کئے ہیں۔ یہ شعرأ اپنے عہد کے نقاد نہیں تھے لیکن انہوں نے شاعری کے موضوع اور ہیئت کے بارے میں اپنے کلام میں اشارے ضرور کئے ہیں جن پر بعد کے ناظرین نے اس صنفِ شاعری کے پرکھنے کے اصول متعین کئے اس لئے تنقید کو ایسے شعراء کے اثر سے خارج نہیں قرار دیا جاسکتا۔

میر انیسؔ اُردو کے عظیم شاعروں میں ہیں۔ اُنہیں نہ صرف یہ کہ شعر گوئی پر مہارت، زبان پر قدرت اور خیال کے اظہار پر مکمل گرفت حاصل تھی بلکہ انہوں نے اُردو کی ایک صنفِ شاعری مرثیہ کو معراج کمال تک پہنچا دیا۔ مرثیہ جو انیسؔ سے کچھ پہلے تک ایک غیر اہم صنف تھا اور جس میں شعر گوئی کا مقصد صرف حصولِ ثواب تھا، انیسؔ کے خونِ جگر سے ادب کی ایک ایسی جامع صنف بن گیا جس نے اُردو کو نہ صرف مقامی زبانوں کے ادب میں ممتاز جگہ دی بلکہ دنیا کی دوسری اہم زبانوں کے ادب سے آنکھیں ملانے کے قابل بنایا۔ ایک تخلیقی فن کار کی حیثیت سے اگر ایک طرف وہ صفِ اوّل کے شاعر ہیں تو دوسری طرف اُن کے تنقیدی شعور اور محاسنِ شاعری کے بارے میں اُن کے نظریات نے اُردو شاعری کے عام معیار کو بلند کیا۔ انیسؔ کی شاعری کا موضوع یوں تو واقعہ کربلا اور شہادتِ امام حسین ہے لیکن اپنے موضوع کے اس محدود احاطے میں بھی انہوں نے فکر و فن، جذبات نگاری، واقعہ نگاری، محاکات اور دوسرے محاسنِ شعری کو اس طرح سمو دیا ہے کہ اُن کے ایک ایک مصرع میں جذبات و احساسات کی ایک دنیا آباد نظر آتی ہے۔ انیسؔ نے جہاں مختلف طرح کے جذبات، نفسیاتی و ڈرامائی کیفیتوں کو نظم کیا ہے وہیں اُن کے کلام میں ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں

جن سے شاعری اور بالخصوص مرثیہ کے محاسن پر روشنی پڑتی ہے۔اس سلسلے میں اُن کے وہ اشعار کافی اہمیت رکھتے ہیں جن میں اُنہوں نے زبان و بیان، فصاحت و بلاغت، روزمّرہ محاورہ اور صنعتوں کے استعمال کے بارے میں اپنے نظریات کو پیش کیا ہے۔ان کی رائیں تنقید کہی جاسکتی ہوں یا نہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بعد کے ناقدین نے مرثیہ کی پرکھ کے سلسلے میں انیسؔ کی ان رایوں سے استفادہ کیا اور مرثیہ کا ایک عام معیار متعین کرنے میں ان سے مدد لی۔میر انیسؔ صنعتوں کے استعمال اور رعایتِ لفظی کے بہت قائل نہیں تھے لیکن اس عہد میں یہی باتیں سب سے زیادہ مقبول تھیں اور ایسے ہی اشعار پسند کئے جاتے تھے جن میں صنعتوں اور رعایتِ لفظی سے کام لیا گیا ہو۔اس پسند کے پیچھے اس زمانے کے سماجی حالات اور اس عہد کی شکست و ریخت کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔اودھ کی تہذیب انگریزوں کی آمد کے بعد ایک ایسی منزل پر پہنچ چکی تھی جہاں جدوجہد کی توانائی اور زندگی کی حقیقتوں کا سامنا کرنے کی قوت کم ہوتی جارہی تھی۔اس لئے زندگی ہو یا شاعری سب میں خارجی لوازمات اور ظاہری آرائش کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ کی شاعری میں لفظی کاریگری اور آرائش کا اہتمام زیادہ نظر آتا ہے۔شاعری میں صنعتیں اور رعایتِ لفظی بھی ایسا ہی زیور ہیں جو وقتی مسرت یا فردوسِ گوش کی تعمیر سے زیادہ نہیں ہیں۔اس لئے میر انیسؔ بھی اپنے عہد کے پسندیدہ رجحان کو قطعاً نظر انداز نہیں کرسکتے تھے۔پھر بھی اُنہوں نے ان باتوں پر زور دیا جو اچھی شاعری کی تخلیق کے لئے ضروری تھیں۔انہوں نے روزمّرہ اور سلاست و فصاحت کو شاعری کی روح سمجھا اور ایسی دوراز کار صنعتوں سے پرہیز کیا جو سامعین کی سمجھ ہی میں نہ آئیں وہ کہتے ہیں۔

روزمّرہ شرفا کا ہو سلاست ہو وہی   لب و لہجہ وہی سارا ہو متانت ہو وہی
سامعیں جلد سمجھ لیں جسے صنعت ہو وہی   یعنی موقع ہو جہاں جس کا عبارت ہو وہی

لفظ بھی چست ہوں مضمون بھی عالی ہوئے
مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہوئے

میر انیسؔ نے اس ایک بند میں مرثیہ کی پرکھ کے لئے ایک معیار پیش کردیا ہے۔مرثیے کی زبان کیسی ہونی چاہیئے۔اس کا فنّی حُسن کن باتوں میں ہے اور اس کا مقصد کیا ہے۔مرثیے پر تنقید کرتے وقت ایک عام نقّاد کے سامنے یہی باتیں ہوتی ہیں۔انیسؔ نے خود اس سلسلے میں ایک زاویۂ نگاہ پیش

کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنے مرثیوں کے مطالعے کے لئے نقاد یا ایک اچھے قاری کو پیمانہ دیا ہے تاکہ اس کسوٹی پر مرثیوں کو پرکھا جاسکے۔ یعنی روزمرہ سلاست اور متانت زبان کے لئے، جلد سمجھ میں آجانے والی صنعت، موقع کے مطابق عبارت اور مضمون اور چست الفاظ مرثیے کے فنّی حُسن کے سلسلے میں اور مرثیہ میں درد کی باتیں اس کے مقصد کے لئے۔ اس طرح ایک بند میں مرثیے کے معیار و اقدار کے تعین سے متعلق میر انیسؔ نے ایک ایسا پیمانہ پیش کردیا ہے جو آج بھی پُرانا اور 'وقت گزارا' نہیں قرار دیا جاسکتا۔ مرثیے کا عام مقصد رونا اور رونے کا موقع فراہم کرنا ہے اس لئے اس میں درد کی باتوں کا ہونا ضروری ہے، یہاں اس مصرعے ''مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہوئے'' پر نگاہ رکھنا ضروری ہے۔ انیسؔ کی نگاہ میں مرثیے کے روایتی معنی نہیں ہیں ورنہ وہ لکھ سکتے تھے کہ مرثیہ صرف رونے اور رُلانے کے لئے ہونا چاہیئے۔ ان کی نگاہ میں درد کی باتوں کی اہمیت تو ہے لیکن صرف وہی اس کا مقصد نہیں ہے یہ مرثیے کی تاریخ کا ایک اہم موڑ ہے۔ انیسؔ کی نگاہ میں اس کی فنّی عظمت مذہبی عقیدت سے کم نہیں ہے اس لئے اُنہوں نے دونوں میں ایک توازن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور رونے اور گریہ و بکا کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ انیسؔ نے ایک اور بند میں لوازماتِ مرثیہ اور عناصرِ مرثیہ کا ذکر کرتے ہوئے مرثیے کے رثائی جز کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ بند بھی اُن کے اُس مرثیے کا بہت اہم بند ہے جس نے مرثیے کی تنقید کے لئے اصول اور معیار پیش کئے ہیں۔

بزم کا رنگ جُدا، رزم کا میداں ہے جُدا   یہ چمن اور ہے زخموں کا گلستاں ہے جُدا
فہمِ کامل ہو تو ہر نامے کا عنواں ہے جُدا   مختصر پڑھ کے رُلا دینے کا ساماں ہے جُدا

دبدبہ بھی ہو، مصائب بھی ہوں توصیف بھی ہو
دل بھی محظوظ ہوں، رقّت بھی ہو، تعریف بھی ہو

یہاں بھی انیسؔ مرثیے کا وہ معیار پیش کررہے ہیں جو قدیم اور روایتی مرثیے سے بالکل مختلف ہے۔ مرثیے میں انیسؔ سے پہلے رزم و بزم کا کوئی واضح تصور نہیں تھا۔ خلیقؔ و ضمیرؔ سے پہلے تو مرثیے میں ان عناصر کا ملنا ہی مشکل ہے۔ ان سے پہلے مرثیہ صرف مصائب امام حسینؑ اور حالات و روایات واقعاتِ کربلا کے بیان کرنے کا نام تھا لیکن انیسؔ نے اسے رزم نامۂ کربلا کی شکل دی اور

رثائی حصہ کو مختصر پڑھ کر رُلا دینے تک محدود رکھا۔ صنفِ مرثیہ کے لئے انیسؔ کا یہ قدم بڑا انقلاب انگیز تھا جس نے مرثیے کی پوری تعریف ہی بدل دی۔ وہ مرثیے میں بزم کی ایسی تصویر چاہتے ہیں کہ شمعِ تصویر پر اُڑ اُڑ کر پتنگ گرنے لگیں اور رزم ایسی کہ خون برستا ہوا نظر آنے لگے:-

قلزمِ فکر سے کھینچوں جو کسی بزم کا رنگ　　شمعِ تصویر پہ گرنے لگیں آ آ کے پتنگ

صاف حیرت زدہ مانیؔ ہو تو بہزادؔ ہو دنگ　　خوں برستا نظر آئے جو دکھاؤں صفِ جنگ

رزم ایسی ہو کہ دل سب کے پھڑک جائیں ابھی
بجلیاں تیغوں کی آنکھوں میں چمک جائیں ابھی

یہ صرف شاعرانہ تعلّی نہیں بلکہ انیسؔ نے مرثیے کے لئے اس کی اہمیت پھر اس رزم و بزم کے مخصوص انداز میں پیش کئے جانے پر زور دیا ہے کہ اگر بزم کی ایسی تصویر نہ ہوئی جو واقعی حقیقت سے اتنی قریب ہو کہ بزم معلوم ہونے لگے یا رزم ایسی نہ ہو کہ صاف میدان جنگ کا نقشہ اور کارزار کی گرمی نگاہوں میں پھر جائے تو بیکار ہے۔ اس طرح میر انیسؔ نے مرثیے کے دو اہم عناصر رزم و بزم کی ضرورت اور ان کی حقیقی تصویر کشی پر زور دیا۔ اُن کی نگاہ میں مرثیہ صرف سامانِ گریہ و بکا نہیں بلکہ رزم و بزم کے ساتھ بہت سے عنوانات کا مخزن ہے جس میں ہر نامے کا عنوان جدا ہے۔ اسی لئے وہ اس میں دبدبہ، مصائب، توصیف، حظ، رقّت، اور تعریف ہے ہر بات پر زور دیتے ہیں۔ میر انیسؔ کے یہ بند فنِ مرثیہ گوئی کی پرکھ کے لئے کسی بوطیقا سے کم نہیں، جنہوں نے آنے والے ناقدوں کے لئے تنقید کے ایسے اصول فراہم کئے جن پر مرثیے کی تنقید کی عمارت تعمیر کی گئی۔

میر انیسؔ کے کلام میں فصاحت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ شبلیؔ سے لے کر آج تک ہر نقاد نے اُن کے کلام کی فصاحت پر زور دیا ہے۔ خود میر انیسؔ نے بار بار اپنے کلام میں فصاحت کی اہمیت کو ظاہر کیا ہے اور اُس پر فخر کیا ہے۔ کہیں لکھا ہے:-

مقبول ہے کلامِ فصاحت نشاں مرا

یا

یہ دوات و خامہ ہے ملکِ فصاحت کا نشاں

کبھی کہتے ہیں۔

یہ فصاحت، یہ بلاغت، یہ سلاست، یہ کمال معجزہ گر اسے کہیئے نہ تو ہے سحرِ حلال

نمکِ خوانِ تکلّم ہے فصاحت میری ناطقے بند ہیں سُن سُن کے بلاغت میری

اور کبھی طبع فصاحت نواز کی فلک پیمائی پر اس لئے باگیں کھینچ لیتے ہیں کہ مدح اہلِ بیت مقامِ ادب ہے اور یہاں تعلّی سوئے ادب۔ ان اشعار میں انیسؔ نے اپنے کلام کی فصاحت کی تعریف ضرور کی ہے لیکن اس سے شاعری میں فصاحت کی اہمیت کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ شبلیؔ نے فصاحت کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بعض الفاظ کریہہ و ثقیل اور بعض فصیح ہوتے ہیں۔ شستہ، سبک اور شیریں الفاظ فصیح ہوتے ہیں اور یہی الفاظ شاعری میں دلکشی و دل آویزی پیدا کرتے ہیں لیکن اسے اُنھوں نے مفرد الفاظ کی فصاحت سے تعبیر کیا ہے جس کا شمار فصاحت کی اعلیٰ مثال میں نہیں ہوتا ہے۔ کلام کی فصاحت کی بنیاد شبلیؔ کے الفاظ میں یہ ہے کہ

''صرف لفظ کا فصیح ہونا کافی نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ جن الفاظ کے ساتھ وہ ترکیب میں آئیں ان کی ساخت، ہیئت، نشست، ہلکی اور گرانی کے ساتھ اس کو خاص تناسب اور توازن ہو ورنہ فصاحت قائم نہ رہے گی''۔

کلام کی فصاحت، الفاظ اور تراکیب کا مجموعی آہنگ، تناسب اور تاثر ہے۔ میر انیسؔ نے اپنے کلام کے ذریعے فصاحت کے اسی معیار کو پیش کیا ہے اور اچھی شاعری کی پرکھ کے لئے ایک اہم اصول پیش کیا ہے، اُن کا خیال ہے کہ دو متضاد چیزوں میں بھی حُسن ہوتا ہے۔ شاعر کا یہ فرض ہے کہ وہ اس موقع کو تلاش کرے جہاں عیب بھی حُسن بن جاتا ہے اور یہ بات بغیر فصاحت کو سمجھے ہوئے ممکن نہیں ہے جو فصاحت کی اہمیت کو جانتا ہے اُسے معلوم ہے کہ ہر بات کا ایک موقع اور ہر نکتے کا ایک مقام ہے۔ اگر کوئی اس موقع اور مقام کی شناخت نہیں رکھتا تو اس کے یہاں فصاحت کی تلاش بے سود ہوگی۔ اسے بڑے خوبصورت انداز میں میر انیسؔ نے ایک بند میں نظم کیا ہے۔

ہے کجی عیب مگر حُسن ہے ابرو کے لئے سرمہ زیبا ہے فقط نرگسِ جادو کے لئے
تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لئے زیب ہے خالِ سیہ چہرۂ گلرو کے لئے

داند آنکس کہ فصاحت بہ کلامے دارد
ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

میر انیسؔ نے رزم و بزم، سلاست وفصاحت، روزمرہ محاورے کے علاوہ بھی مرثیے اوراس کی زبان کے بعض اصول متعین کئے ہیں جو صرف مرثیہ ہی نہیں بلکہ کسی بھی صنف میں اعلیٰ شاعری کے لئے ضروری ہیں۔ میر انیسؔ سے پہلے اُردو شاعری میں بڑے شاعر تو ہوئے لیکن کسی نے شاعری یا کسی خاص صنفِ ادب کے لئے اس باقاعدگی کے ساتھ تنقیدی اصول نہیں پیش کئے۔ میر انیسؔ کی ایک بہت بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ انہوں نے خود زبان اور شاعری کے لئے ایسے تنقیدی اصول فراہم کئے جن کی اہمیت سے انکار کرنا ممکن نہیں ہے۔ مرثیہ آج بھی عام طور پر فنّی اعتبار سے انہیں اصولوں کو سامنے رکھ کر پرکھا جاتا ہے جو میر انیسؔ نے اُردو تنقید کو دیئے ہیں۔

میر انیسؔ کے خیال میں شاعر کو صاحبِ علم، خوش فکر، خوش لہجہ اور پاکیزہ خصال ہونا چاہئے۔ اس کے ذہن میں جودت اور موزونی ہونی چاہیئے۔ اس کے علاوہ نثر بے سجع نہ ہو، نظم موزوں ہو، اس میں سکتا یا ناموزونی نہ ہو، جو بات کہی جائے وہ سنجیدہ اور واضح ہو، اس میں اغراق نہ ہو، کلام سہلِ ممتنع ہو، اس میں نبات کی سی حلاوت ہو، الفاظ غنچوں کی طرح نازک اور مصرعے پھولوں کی ڈالیوں کی طرح شاداب ہوں، سخن میں رنگینی اور لطافت ہو، نظم دُرِّ شہوار کی لڑیوں کی طرح ہو اور لفظ مغلق نہ ہوں، گنجلک نہ ہوں، تعقید نہ ہو۔

میر انیسؔ کو خصوصیت کے ساتھ ان باتوں کی وضاحت کرنی پڑی اور مرثیے کے لئے تنقیدی پیمانے اور اصول بنانے پڑے۔ اس لئے کہ انہوں نے ایسی صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی تھی جس کی اس وقت تک کوئی ادبی حیثیت واہمیت نہیں تھی اور جو صرف ایک مذہبی صنف سمجھی جاتی تھی، جسے نہ صرف ناقدین نے نظر انداز کر رکھا تھا بلکہ عام صاحبِ نظر و صاحبِ علم حضرات بھی اس سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے کہ وہ ثواب اور بخشش کا ذریعہ ہے۔ انیسؔ نے اس کے لئے تنقیدی پیمانے پیش کر کے بالواسطہ شعروادب کے ناقدین کو مرثیے کی ادبی اہمیت کے بارے میں غور کرنے کی طرف مائل کیا۔

میر انیسؔ کا اثر اُردو تنقید پر ایک اور شکل میں بھی نظر آتا ہے جو میری نگاہ میں ان تنقیدی اشاروں کے مقابلے میں زیادہ اہم ہے اور وہ ان کے کلام کی ہمہ جہتی اوران کی تخلیقی بصیرت ہے۔ اُردو کے کسی شاعر کے کلام نے تنقید میں اتنے اہم اضافے نہیں کئے جتنے میر انیسؔ کے کلام نے کئے ہیں۔

تنقید کے پیمانے فن کار کی تخلیق ہی سے بنتے ہیں۔ اگر فنکار کی تخلیق میں کوئی اہم بات نہیں ہے تو نقاد اپنا فرض ادا ہی نہیں کر سکتا، فلسفہ، نفسیات اور سماجی علوم، فنی تخلیقات کو سمجھنے اور اس کی قدروں کے تعیّن میں معاون تو ہو سکتے ہیں لیکن اس کی بنیاد نہیں بن سکتے۔ بنیادی اہمیت تخلیق کی ہی ہوتی ہے اور اس کی پرکھ کے پیمانے سی کی روشنی میں وضع کیے جاتے ہیں۔

انیسؔ سے پہلے اُردو میں بیانیہ شاعری مثنوی کی شکل میں موجود تھی اور جذبات نگاری و واقعہ نگاری کی بنیاد پڑ چکی تھی جس کی کامیاب مثال میر حسنؔ کی مثنوی ''سحرالبیان'' سامنے تھی۔ لیکن انیسؔ نے زبان اور شاعری کو اتنی وسعت دی اور اظہار و بیان کے اتنے نئے گوشے تلاش کیے جس کی مثال کسی دوسری جگہ ملنی مشکل ہے۔ انیسؔ نے بیانیہ شاعری کی زبان کو سلاست و فصاحت کا ایسا بلند معیار دیا اور اسے ایسے درجۂ کمال تک پہنچا دیا کہ جو اس معیار کو اپنے کلام میں نہ برت سکا وہ کم تر درجے کا شاعر سمجھا گیا۔ یہ انیسؔ کے کلام کی گہرائی اور وسعت ہی تھی جس کے لئے اُردو تنقید کو نئے زاویے اور نئے معیار (Standards) تلاش کرنے پڑے۔ اس لئے کہ تنقید کے پرانے پیمانے اور صرف شاعری کے جمالیاتی اصول انیسؔ کے کلام کی قدروں کے متعین کرنے کے لئے کافی نہیں تھے۔ انیسؔ کے یہاں بیانیہ شاعری نے جو رُخ اور جو نئے زاویے پائے اور جس طرح اس میں انسانی نفسیات، رزم، بزم، ڈرامائی عناصر، جذبات نگاری کی جزئیات، کردار نگاری، مناظر قدرت، اخلاقی تعلیم، تہذیبی و سماجی قدریں سمٹ آئیں ان سے پہلے اُردو شاعری میں یہ چیزیں کہیں یکجا نہیں ہوئی تھیں اسی لئے اُردو تنقید میں ان کے مطالعے کے اصول بھی نہیں تھے۔ انیسؔ نے اپنی شاعری کے ذریعے اس طرح اُردو تنقید کو بھی وسعت دی۔

اُردو شاعری میں انیسؔ سے پہلے نہ تو رزمیہ کا کوئی تصور تھا اور نہ المیہ اور ڈرامائی عناصر کا۔ میر انیسؔ نے پہلی بار مرثیے میں ان چیزوں کو جگہ دی اور ایک طرف اگر اس میں جنگ و جدل اور حرب و ضرب کی جامع تصویر پیش کی تو دوسری طرف ترتیبِ واقعات، مکالمہ، کردار نگاری، کشمکش، تصادم اور وحدتِ زمان و مکاں کا اہتمام کر کے اُسے ڈرامے سے قریب تر کر دیا۔ اسی طرح نیچرل شاعری بھی اردو میں نہ ہونے کے برابر تھی۔ میر انیسؔ نے صبح کا سماں، رات کا منظر، گرمی کی شدّت، لُو کا چلنا، نسیم سحری کی اٹکھیلیاں، پھولوں کا کھلنا، سبزے پر شبنم کے گرنے کی کیفیت اور ان سے متعلق تمام

جزئیات کو بیان کر کے اُردو تنقید میں مطالعے کے نئے گوشوں کا اضافہ کیا۔

کردار نگاری خود ایک فن ہے جس کی ڈرامے، ناول اور افسانے میں بڑی اہمیت ہے۔ اُردو میں اس وقت تک نہ ڈرامے کا تصور تھا اور نہ ناول یا افسانے کا۔ داستانوں میں جو کردار ہوتے تھے ان کا فن یا کردار نگاری کے اصولوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ کردار عام طور پر مثالی اور مافوق الفطرت کردار ہوتے تھے جو کہ واقعہ میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے شامل کر دیئے جاتے تھے۔ میر انیسؔ جس واقعے کو پیش کر رہے تھے اس سے متعلق کردار بھی مثالی تھے اور شاعر و سامع کی مذہبی عقیدت ان سے وابستہ تھی۔ لیکن میر انیسؔ نے ان کرداروں کو بھی بڑی حد تک ارضی کردار بنا کر پیش کیا۔ اس طرح انہوں نے اُردو میں کردار نگاری کی بنیاد ڈالی۔

اُردو میں واقعہ نگاری اور جذبات نگاری تھی لیکن انیسؔ نے اس کی جو سطح اور معیار پیش کیا اس نے اردو شاعری کو جذبات نگاری اور واقعہ نگاری کے کمال تک پہنچا دیا۔ جذبات نگاری صرف غم، خوشی اور غصہ کو پیش کر دینا ہی نہیں ہے۔ انیسؔ نے انسانی نفسیات کی باریکیوں کو سامنے رکھ کر ماں بیٹے، شوہر بیوی، بھائی بہن، دوست قرابت دار سب کے جذبات کی ایسی تصویر پیش کی ہے کہ کسی دوسری ترقی یافتہ زبان میں بھی ایسی تصویر مشکل ہی سے نظر آئے گی۔ انسانی نفسیات پر انیسؔ کی نگاہ اتنی گہری تھی کہ جذبات نگاری کے وقت وہ عمروں کے فرق کو بھی پیشِ نظر رکھتے تھے۔ ایک بچے کی تکلیف، پیاس یا خوشی کا اظہار کس طرح ہوگا، ایک عورت یا ایک نوجوان کسی واقعہ کے رَدِّعمل کے طور پر کس طرح کا برتاؤ کرے گا، ایک بزرگ آقا اور رہنما کا رَدِّعمل کیا ہوگا، اس سلسلے میں معمولی سے معمولی جزئیات بھی ان سے نظر انداز نہیں ہوئی ہیں۔ اس طرح جذبات نگاری کے ذریعہ انیسؔ نے مرثیہ کے مطالعے کے سلسلے میں انسانی نفسیات کو پیشِ نظر رکھنے کی راہ دکھائی۔

واقعہ نگاری کے سلسلے میں انیسؔ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ صرف واقعہ کے راوی نہیں ہیں بلکہ اس واقعے کا ایک حصہ یا اس کا ایک کردار ہیں۔ ان کی واقعہ نگاری کا یہ کمال ہے کہ ان کے یہاں واقعۂ کربلا کا ہر عمل ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جو کچھ بیان کرتے ہیں، اس کی مکمل تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے اور اس کا سننے والا صرف الفاظ کو سننے کے بجائے واقعہ کو ہوتا ہوا دیکھتا ہے۔ اس کے لئے انیسؔ نے حرکت Action والے الفاظ سے فائدہ اٹھایا۔ اس لئے

کہ ان کے ذریعہ وہ واقعہ کی کامیاب تصویر بھی بنا سکتے تھے اور ڈرامائی کیفیت بھی پیدا کر سکتے تھے۔ انیسؔ کے کلام کو اگر غور سے دیکھا جائے تو محسوس ہوگا کہ اُردو شاعری میں حرکت Action رکھنے والے الفاظ کا سب سے زیادہ استعمال میر انیسؔ نے کیا ہے۔ ان کے مراثی میں ۹۵ فیصدی سے زیادہ بند ایسے ملیں گے جن میں حرکت رکھنے والے الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔

انیسؔ کے مرثیوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ان میں اُردو کے تمام اصنافِ سخن کی خصوصیات شامل ہوگئی ہیں۔ ان میں غزل کی شوخی، رنگینی اور نزاکت بھی ہے، قصیدے کی شان وشکوہ، بلند آہنگی اور دبدبہ بھی، مثنوی کی نرمی، واقعات کا ربط اور جذبات نگاری بھی اور مرثیے کی دردناکی، رزم وبزم اور ڈرامائیت بھی۔ اس لئے انیسؔ کے کلام کی قدروں کے تعین کے سلسلے میں وہ پیمانے ناکافی تھے جو ان کے عہد تک اُردو تنقید میں مستعمل تھے۔ اس طرح انیسؔ نے اُردو تنقید کو اپنے کلام کے ذریعہ بہت سے نئے پیمانے اور اصول دیئے۔ آج اُردو کے شعری ادب کے مطالعے کے سلسلے میں جو اصول ناقدین کے سامنے رہتے ہیں اُن میں سے بہت سے صرف انیسؔ کے کلام کی دین ہیں۔ اگر اس نگاہ سے انیسؔ کے ناقدوں کا مطالعہ کیا جائے تو اُن کے یہاں بہت سی نئی باتیں ایسی نظر آئیں گی جو تنقید میں پہلے نہیں تھیں۔ اور شاید وہ باتیں جو انیسؔ کے کلام کی وجہ سے اُردو تنقید میں آئی ہیں کم کردی جائیں تو اُردو تنقید کے سرمائے میں بہت بڑی کمی ہو جائے گی۔

میر انیس:

مرثیہ گوئی کا صلہ

کم ہے عوض اس کا جو کوئی کوہِ طلا دے
آقا تجھے اس مرثیہ گوئی کا صلا دے

افسردہ نہ ہو غنچۂ اُمید کھلے گا
کھل جائیں گی آنکھیں وہ صلہ تجھ کو ملے گا

عزّت مری اللہ کو منظورِ نظر ہے
شبیرؑ کے مدّاح کا فردوس میں گھر ہے

رکھ اس پہ نظر تنگ نہ ہو کثرتِ غم سے
مطلب ترے بر لائے گا وہ اپنے کرم سے

ڈاکٹر سہیل بخاری

میر انیسؔ کے مسدّس کی ٹیپ

میر انیسؔ اردو کے بہت بڑے شاعر تھے جنھوں نے ادب کی ایک صنف مرثیے کو اپنا کر اُسے کمالاتِ شاعری کے سہارے ان آسمانوں تک پہنچا دیا جہاں تک نہ ان سے پہلے کوئی شاعر پہنچا سکا تھا اور نہ ان کے بعد سے اب تک کوئی پہنچا سکا ہے اسی لیے اردو ادب کے پارکھ یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ میر انیسؔ پر مرثیہ گوئی کا خاتمہ ہو گیا اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان کا یہ کہنا بالکل ٹھیک ہے۔ اردو نظم میں میر انیسؔ سے پہلے مرثیہ مربع بھی ہوتا تھا اور مسدس بھی یعنی اس میں چار چار مصرعوں کے بند بھی ہوتے تھے اور چھ چھ مصرعوں کے بند بھی پر میر انیسؔ نے اپنی مرثیہ گوئی کے لئے خالی مسدس کو لے لیا اور پھر عمر بھر اسی میں مرثیہ کہتے رہے۔ اس کا قاعدہ یہ ہے کہ اس کے پہلے دو شعر یا چار مصرعے ایک ہی قافیے میں کہے جاتے ہیں اور آخری شعر جسے ٹیپ کہتے ہیں ان سے آزاد اور الگ ردیف قافیہ رکھتا ہے۔ مسدس یوں تو اردو شاعری کی دوسری اصناف جیسے شہر آشوب، واسوخت، وغیرہ میں بھی کام آتا تھا پر اس کے عروج کو میر انیسؔ کا انتظار تھا کہ بھاگوان مٹی کو ہاتھ لگا دے تو سونا بن جائے۔

غزل کا ہر شعر ایک آزاد اکائی ہوتا ہے اور اس کے لیے یہ بات اچھی سمجھی جاتی ہے کہ دوسرا مصرعہ پہلے مصرعے سے بڑھا ہوا ہوتا کہ پڑھنے سننے والے پر تاثر کا بھرپور وار ہو سکے اس لیے غزل کہنے والے عام طور پر شعر کا دوسرا مصرعہ پہلے اور پہلا مصرعہ بعد میں کہتے ہیں۔ مشاعروں کے لیے مصرعہ طرح دینے کی ریت کے ساتھ ساتھ گرہ لگانے کی مشق بھی اسی خیال سے کی جاتی ہے۔ مسدس میں بند کی وہی حیثیت ہوتی ہے جو غزل میں شعر کی اور ٹیپ بند میں وہی درجہ رکھتی ہے جو غزل کے شعر کے دوسرے مصرعے کا ہوتا ہے کہ وہ پہلے چار مصرعوں پر بھاری ہو پھر خود ٹیپ کے شعر

میں بھی دوسرا مصرعہ جسے ٹیپ کا مصرع کہا جاتا ہے پہلے مصرعے سے بڑھا ہوا ہونا چاہیے۔ مسدس کے فنی تقاضے اسی طرح پورے ہوتے ہیں اور اس کی قدر و قیمت اسی سے جانچی جاتی ہے۔ اردو میں آج تک جتنے مسدس کہے گئے ہیں ان کو اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو میر انیسؔ کا پلڑا سب سے بھاری نظر آئے گا۔ سچی بات یہ ہے کہ انھوں نے مسدس کی زمین کو آسمانوں کی جس بلندی سے ملا دیا ہے اس کو دیکھنے میں سروں سے ٹوپیاں گر جاتی ہیں۔ کہنے کو تو حالیؔ نے بھی مسدس کہا ہے جس کی اردو ادب میں بڑی دھوم ہے، یہ بھی ایک مقصدی نظم ہے جو قومی امنگوں کو سامنے رکھ کر لکھی گئی۔ حالیؔ نے اس سے سرسید کی فرمائش بھی پوری کر دی اور ہو سکتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں میں جگار بھی پیدا کر دی ہو پر مذہبی عقیدت اور قومی جذبے کو الگ کر کے فن کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو مسدس حالیؔ کا شکوہ کرتا نظر آتا ہے۔

یہ ۱۹۴۳ء کی بات ہے کہ جوشؔ ملیح آبادی نے اپنا مسدس جوان کی کتاب ''آیات ونغمات'' میں ''حسینؑ اور انقلاب'' کے نام سے چھپ چکا ہے پہلی بار لکھنؤ میں چھوٹی رانی صاحب کے امام باڑے میں پڑھا تھا۔ یوں تو یہ پوری کی پوری نظم بجی سنوری ہوئی ہے پر میں خصوصیت کے ساتھ اس کا ایک بند اور اس کے پڑھتے وقت کا سماں آج تک نہیں بھول سکا کیوں کہ ان دونوں کا ایک دوسرے سے بہت گہرا لگاؤ ہے۔ وہ بند یہ ہے۔

جو کاروانِ عزم کا رہبر تھا وہ حسینؑ — خود اپنے خون کا جو شناور تھا وہ حسینؑ
اِک دینِ تازہ کا جو پیمبر تھا وہ حسینؑ — جو کربلا کا داورِ محشر تھا وہ حسینؑ
جس کی نظر پہ شیوۂ حق کا مدار تھا
جو روحِ انقلاب کا پروردگار تھا

اس بند کا ہر مصرع دوسرے مصرعے سے بڑھا ہوا ہے کیوں کہ پہلے مصرعے میں حسینؑ کو رہبر، دوسرے میں شناور، تیسرے میں پیمبر یہاں تک کہ چوتھے مصرعے میں داورِ محشر تک کہہ دیا گیا۔ اب اس کے بعد اس سے بڑا اور کوئی منصب نہیں رہ گیا تھا جو حضرت امام حسینؑ کو پیش کیا جاتا۔ مجلس میں بیٹھے ہوئے لوگ دنگ تھے۔ ان کی نیچے کی سانس نیچے اور اوپر کی اوپر تھی۔ اس حالت میں وہ کبھی جوشؔ کی طرف دیکھتے تھے اور کبھی آپس میں ایک دوسرے کی طرف کہ داورِ محشر سے آگے شاعر کے

لیے ٹیپ میں کہنے کو رہ گیا گیا۔ شوق اور اچنبھے کی اسی ملی جلی حالت میں بند کا پانچواں مصرع بھی سن لیا گیا پر جیسے ہی جوشؔ نے چھٹا مصرع اپنی خاص گرجدار آواز میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھا تو بے ساختہ داد کے ڈونگرے برسنے لگے اور حاضرین بے چین ہو کر سرو قد کھڑے ہو ہو گئے کہ واہ رے استاد۔ واہ رے استاد۔ انیسؔ کے لکھنؤ سے زیادہ مسدس کی یہ ریت اور خوبی کون جان سکتا ہے کہ اس بند کا چھٹا مصرع معنی کے اعتبار سے چوتھے مصرعے کے برابر سہی زبان و بیان میں اس سے بہت آگے نکل گیا ہے۔

مسدس کے اس فن کو سامنے رکھ کر میر انیسؔ کے مرثیے دیکھے جائیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ جہاں انھوں نے مرثیہ گوئی میں شعر کی ساری لطافتیں اور خوبیاں سمودی ہیں وہاں بند کی ٹیپ کو نکھارنے اور سجانے کا بھی بھرپور اہتمام کیا ہے اور اسے ایسا چمکایا ہے کہ مرثیہ آئینہ بن گیا۔ اس میں وہ چیزیں بھی ملتی ہیں جو انیسؔ نے بند کے دو شعروں یا چار مصرعوں میں برتی ہیں اور کچھ ایسے گن بھی بھر دیئے ہیں جو ان میں نہیں ملتے یا ملتے بھی ہیں تو کہیں کہیں۔ اس طرح میر انیسؔ نے ٹیپ کو پہلے دو شعروں سے بڑھانے میں جو محنت کی ہے اس کا ایک ہلکا سا اندازہ اگلی سطروں سے لگایا جا سکتا ہے۔

مسدس کے پہلے چار مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ ان میں کبھی ردیف آتی ہے اور کبھی نہیں بھی آتی یعنی پہلے دوسروں کا ایک قافیہ ہونا تو ضروری ہے ہاں ردیف ضروری نہیں ہے۔ ہر ٹیپ میں قافیے کے ساتھ ساتھ ردیف کا ہونا بھی لازمی ہے میر انیسؔ کے پورے کلام میں کوئی ایک ٹیپ بھی ایسی نہیں ملتی جس میں قافیہ اور ردیف دونوں نہ باندھے گئے ہوں۔ یہ وہ پہلی خصوصیت ہے جو ٹیپ کو بند کے پہلے دو شعروں سے الگ کرتی ہے۔ یوں تو قافیہ بھی شعروں میں راگنی کی لہر پیدا کرتا ہے پر ردیف کے ساتھ اس کا رس اور بڑھ جاتا ہے اور ٹیپ بہت اٹھ جاتی ہے۔ یہ بات ٹیپ کے ان شعروں سے بھی کھل جائے گی جو آگے چل کر مثالوں میں لکھے جائیں گے اس لیے یہاں اس کی مثالیں چھوڑے دیتا ہوں۔

میر انیسؔ کے شعروں میں فارسی کی ترکیبیں اور بندشیں تو بہت ہیں پر یہ بند کے پہلے شعروں میں ہی پائی جاتی ہیں ٹیپ میں ترکیبیں بہت کم دیکھنے میں آتی ہیں اور جہاں کہیں ملتی بھی ہیں وہاں اتنی کھنچ کر بندھی ہیں کہ سوچ کے دھارے کا بہاؤ قائم رہتا ہے۔ بندش کی کھچاوٹ کی کچھ مثالیں دیکھئے جن میں ٹیپ رواں دواں اور بنی سنوری نظر آ رہی ہے۔

بلبل کی طرح روتے ہیں فریاد و فغاں سے
کچھ بس نہیں چلتا چمن آرائے جہاں سے

مثلِ خورشید بدن ضعف سے تھرّاتا ہے
نیّرِ برجِ امامت پہ زوال آتا ہے

کچھ دن جو میرے پاس رہے مستعار تھے
یہ لال سب امانتِ پروردگار تھے

بھاگی ہے وہ جس فوج پہ وار اپنے چلے ہیں
ہم بیشۂ ضرغامِ الٰہی کے پلے ہیں

ٹیپ میں رس اور اثر پیدا کرنے کا کام انیسؔ نے مکالموں، روزمرّوں، محاوروں، مقولوں اور کہاوتوں سے بھی لیا ہے۔ میں پہلے وہ مثالیں لکھتا ہوں جن میں بول چال نے ٹیپ کو اٹھا دیا ہے ان میں قافیے کا لطف بھی لیتے چلیے۔

ڈر سے کسی روباہ نے ضیغم کو نہ روکا
تلوار اُٹھا کر کہا کیوں ہم کو نہ روکا

ہاں سوئے ابنِ شہنشاہِ عرب جاتا ہوں
لے ستمگر جو نہ جاتا تھا تو اب جاتا ہوں

دیکھیں تو ہاں! پرے کو جمائے کھڑے رہو
روکو تو برچھیوں سے ہم آئے کھڑے رہو

تم کہتے تھے ہم نہر پہ جانے نہیں دیتے
لو آؤ تو اب ہم تمہیں آنے نہیں دیتے

سبقت کسی پہ ہم نہیں کرتے لڑائی میں
بس کہہ دیا کہ پاؤں نہ رکھنا ترائی میں

تم سب کی کیا بساط ہے دامن کی گرد ہو
ہاں اب ہمیں ہٹاؤ تو جانیں کہ مرد ہو

کچھ دھیان میں لاتے نہیں لشکر کو کسی کے
ہم اور نہیں کوئی نواسے ہیں علیؑ کے

دیکھیں تو ہم اس تیغِ شرر دم کو تو روکو
دریا کو تو روکا ہے بھلا ہم کو تو روکو

نعرہ کیا کہ او سگِ ناپاک دُور ہو
یہ کیا سخن ہیں منہ میں ترے خاک دور ہو

اس کے ساتھ ساتھ ذرا بیگماتی بول چال کے نمونے بھی دیکھیے اور اندازہ لگائیے کہ اس سے ٹیپ کہاں سے کہاں جا پہنچی ہے۔

غبطہ نہ اس میں چاہیے جو امرِ خیر ہو
داری وہ کون غیر ہیں تم کون غیر ہو

بے میری اجازت جو یہ مرنے کو چلے ہیں
پوچھے تو کوئی کس کی مُرادوں کے پلے ہیں

بانوئے نیک نام کی کھیتی ہری رہے
صندل سے مانگ بچوں سے گودی بھری رہے

روزمرّے اور روزمرّے کے ساتھ ساتھ انیسؔ نے، کیا ہو، کہیں کا نہ رہوں گا، ہو تو ایسا، اللہ کی پناہ۔ ہیں تو یہ ہیں۔ ہوں تو ان کا۔ قدرت خدا کی ہے۔ ایسے ہوں، جیسے، فقروں سے بھی ٹیپ

سنوارنے کا کام لیا ہے۔ کچھ مثالیں یہ ہیں۔

بڑھ بڑھ کے پیدلوں نے سواروں سے جنگ کی — ایک ایک تشنہ لب نے ہزاروں سے جنگ کی
پیدل تو اس قطار کے تھے کس قطار میں — دو دو سوار کٹ گئے ایک ایک وار میں
انجامِ کار سب کے لئے مرگ و گور ہے — بی بی خدا سے کیا کسی بندے کا زور ہے
صفدر ہے، شیر دل ہے، بہادر ہے، نیک ہے — بے مثل سیکڑوں میں، ہزاروں میں ایک ہے
گوشہ ہمیں ملے نہ فضا ہو نہ سیر ہو — اب تو یہی پڑی ہے کہ جانوں کی خیر ہو
یوں تیروں کی بوچھار کسی تن پہ نہ ہوئے — جو شاہ پہ گزری کسی دشمن پہ نہ ہوئے
سر بھی کٹے اگر تو نہ پیچھے قدم ہٹیں — کعبہ اگر ہٹا ہو تو شاہِ اُمم ہٹیں
چپکے چلے گئے ہیں زباں تک ہلی نہیں — ہم کیا پیمبروں کو تو مہلت ملی نہیں
ہیں چھوٹے چھوٹے سن پہ قیامت دلیر ہیں — کیوں کر نہ ہوں کہ شیرِ الٰہی کے شیر ہیں
صدقے کئے فرزند پھوپھی سوگ نشیں ہے — سمجھیں تو مراحق ہے نہ سمجھیں تو نہیں ہے
فرقہ یہ پیادوں کا ہے آفت نہ بپا ہو — دنگا ابھی لشکر میں جو ہو جائے تو کیا ہو
ناشاد بہن آپ کی غربت پہ فدا ہو — بچہ کوئی گر تو نس کے مر جائے تو کیا ہو
حضرت کی جدائی کا نہ میں داغ سہوں گا — صدقے نہ ہوا اگر تو کہیں کا نہ رہوں گا
طوبیٰ ہو تو ایسا مہِ کامل ہو تو ایسا — ایسے علمِ نور کا حامل ہو تو ایسا
دونوں میں صاف حیدر و جعفر کے طور ہیں — اللہ کی پناہ یہ تیور ہی اور ہیں
اللہ و محمدؐ کے جو پیارے ہیں تو یہ ہیں — بالائے زمیں عرش کے تارے ہیں تو یہ ہیں
رستم ہوں تو ان کا ہوں جو صفدر ہوں تو ان کا — بندہ ہوں تو ان کا جو برادر ہوں تو ان کا
سرعت ہے ابر کی تو لطافت ہوا کی ہے — اتنے ہنر فرس میں یہ قدرت خدا کی ہے
لاکھ دو لاکھ پہ بھاری ہوں تو چار ایسے ہوں — گھوڑے چالاک ہوں ایسے تو سوار ایسے ہوں

محاورہ اسم اور فعل کے اس مرکب کو کہتے ہیں جس میں فعل مجازی معنی دیتا ہے اور حقیقت سے مجاز زیادہ پُر لطف ہوتا ہے۔ اس سے انیس نے ٹیپ میں جان ڈالنے کے لئے بہت سے محاورے بھی باندھے ہیں۔ محاوروں سے سجنے والی کچھ ٹیپوں کی مثالیں یہ ہیں۔

زخم سینوں کے گریباں کی طرح پھٹتے تھے
چال کیا تھی کہ ہزاروں کے گلے کٹتے تھے

سمجھا ہے کیا امامِ عراق و حجاز کو
گدّی سے کھینچ لوں گا زبانِ دراز کو

اِن جنگلوں میں بادیہ پیما تھا دین کا
گز بن گیا تھا راہِ خدا کی زمین کا

بھولے ہوئے ہیں اس پہ کہ ہم خاکسار ہیں
شاید ہوا کے گھوڑے پہ ظالم سوار ہیں

فخر اس زمیں کا جس پہ شہَ انس وجن پھرے
دیکھو خدا کی شان کہ جنگل کے دن پھرے

رفعت کا اس کی فرش سے غُل عرش تک گیا
لو آج خاک کا بھی ستارا چمک گیا

کاٹے ہوئے نشاں تھے زمیں پر پڑے ہوئے
ہر جا تھے ضربِ تیغ کے جھنڈے گڑے ہوئے

خورشید کی ضیا تھی سموں کے نشان پر
نخوت سے تھا زمیںؔ کا دماغ آسمان پر

جب ایسا بھائی ظلم کی تیغوں میں آڑ ہو
پھر کس طرح نہ بھائی کی چھاتی پہاڑ ہو

لہرائی جب اتر گیا پانی بڑھا ہوا
نیزوں تھا ذوالفقار کا پانی چڑھا ہوا

نیزوں کو ہر سوار ادھر تولنے لگا
گونجے ادھر بھی شیر کہ رن بولنے لگا

ننھی سی قبر کھود کے اصغرؔ کو گاڑ کے
شبیرؔ اُٹھ کھڑے ہوئے دامن کو جھاڑ کے

کہیں کہیں انیسؔ نے ٹیپ میں کوئی مقولہ نظم کر کے بھی رس اور رنگ بکھیرنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں کچھ مقولے تو ایسے ہیں جو پہلے ہی سے چلے آ رہے تھے پر کچھ ایسے بھی ہیں جو ایک بار انیس کی زبان سے نکلنے کے بعد لوگوں کی زبانوں پر چڑھ گئے اور اب وہ بے تکان روزانہ بول چال میں ادا کئے جاتے ہیں ان دونوں قسموں کی مثالیں دیکھئے

ہے درد و الم شامِ غریباں نہیں گزری
دنیا میں کسی کی کبھی یکساں نہیں گزری

قاروں کا خزانہ ہو تو عزت نہیں ملتی
دولت سے کمینے کو شرافت نہیں ملتی

محتاجی سے کم رتبہ عالی نہیں ہوتا
عزت وہ خزانہ ہے کہ خالی نہیں ہوتا

فرزند کا غم ماں کے کلیجے کو چھری ہے
صدقے گئی یہ آتما کی آنچ بری ہے

گرلا علاج ہے تو کلیجے کا داغ ہے
بدتر وہ قبر سے ہے جو گھر بے چراغ ہے

جو زندہ ہے وہ موت کی تکلیف سہے گا
جب احمدِ مرسل نہ رہے کون رہے گا

ہاں مالِ غیر کفو میں تصرف نہ چاہیئے
آپس میں دوستوں کو تکلف نہ چاہیئے

ہم کب گئے جہاں سے نبیؐ و علیؑ کے ساتھ
دنیا میں کون مرتا ہے بی بی کسی کے ساتھ

مارو اسے کچھ اس کے نہ ہونے کا غم نہیں — دشمن کا ہو جو دوست وہ دشمن سے کم نہیں

یہ داغ یہ اندوہ و الم سب کے لئے ہیں — ماں باپ زمانے میں سدا کس کے جئے ہیں

آئے ہیں ڈھونڈتے ہوئے اس ارض پاک کو — سچ ہے کہ خاک کھینچتی ہے اپنی خاک کو

ہو نوجواں مزاج میں غصہ ہے آپ کے — بیٹا وہ ہے قدم بہ قدم ہو جو باپ کے

بے وجہ خیر خواہوں سے منہ موڑتے نہیں — ساتھی برا بھی ہو تو اسے چھوڑتے نہیں

انسان کھو کے وقت کو پاتا نہیں کبھی — جو دم گزر گیا وہ پھر آتا نہیں کبھی

لاکھ مردود جو بہکائیں تو کیا ہوتا ہے — بگڑی بن جاتی ہے جب فضل خدا ہوتا ہے

انیسؔ نے ٹیپ میں کہاوتیں بہت کم باندھی ہیں پھر بھی انہوں نے دو چار جگہ ان سے ٹیپ سجانے کا کام ضرور لیا ہے۔ ان کی کچھ مثالیں یہ ہیں۔

چتلے ہیں جتنے سانپ وہ ڈستے نہیں کبھی — گرجے ہیں جو بہت وہ برستے نہیں کبھی

ہاتھ اپنا چلے گا تو جگہ پا کے چلے گا — ٹھوکر وہی کھائے گا جو گھبرا کے چلے گا

کم مایہ کمال اپنا جتا دیتا ہے اکثر — جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے اکثر

بھاگا طنابیں کٹتے ہی کیا حیلہ ساز ہے — سچ ہے حرام زادے کی رسّی دراز ہے

رستے کی وہ سختی وہ سفر رنج و بلا کا — سچ کہتے ہیں سودا ہے کڑا راہِ خدا کا

ٹیپ کی زبان کہیں نثر کے قریب ہوتی ہے اور کہیں بالکل نثر ہی بن جاتی ہے اور پھر جب اس میں ایک بول بھی بھرتی کا نہیں ہوتا تو اس کے پڑھتے وقت ایک خوشگوار سی کیفیت کا احساس ہوتا ہے، کچھ مثالیں دیکھئے۔

بڑھ بڑھ کے پیدلوں نے سواروں سے جنگ کی — ایک ایک تشنہ لب نے ہزاروں سے جنگ کی

اشراف کا بناؤ رئیسوں کی شان ہے — شاہوں کی آبرو ہے سپاہی کی جان ہے

فوجوں میں یوں کسی نے بھی گھوڑے اڑائے ہیں — دیکھو تو ہم کہاں سے کہاں لڑ کے آئے ہیں

عشق گل تر ظلم کے خاروں میں نہ بھولے — معشوق کی تلواروں کی دھاروں میں نہ بھولے

شمشیر اجل فوج کے بھالوں سے رکی ہے — گرتی ہوئی بجلی کبھی ڈھالوں سے رکی ہے

شادی نہیں رہتی ہے سدا غم نہیں ہوتا — دنیا کا کبھی ایک سا عالم نہیں ہوتا

گردش نہ رہی ہے سدا دَور رہا ہے — دنیا کا ہمیشہ یہی طور رہا ہے

اک گل پہ یہاں ہزار طرح کی بہار ہے　　چہرہ نہ کہیئے قدرتِ پروردگار ہے
گردوں پہ نہ ٹھہرے گی زمیں سے نہ رکے گی　　تم کیا ہو پرِ روحِ امیں سے نہ رکے گی

ہر نخل غیرتِ شجرِ طور ہوگیا　　صحرا خدا کے نور سے معمور ہوگیا
یہ احمد مختار کے پیاروں کا مکاں ہے　　یہ عرش معلّٰی کے ستاروں کا مکاں ہے
زندوں کو بھی مردوں میں قلم بند کیا تھا　　اک تیغ نے دو لاکھ کا دم بند کیا تھا
گھوڑے اڑا کے تیغ سے بجلی کو پے کریں　　پانی تو کیا ہے آگ کے دریا کو طے کریں
ساونت ہیں نور نظر شاہ نجف ہیں　　یہ جس کے طرفدار ہیں بس اس کی طرف ہیں
سب نشۂ غرورِ جوانی اتر گیا　　شمشیر تھی کہ حلق سے پانی اُتر گیا
آنکھوں کے سامنے سے سواری نکل گئی　　گویا چمن سے بادِ بہاری نکل گئی

کبھی کبھی انیسؔ دو فاعلوں کیلئے ایک ہی فعل لاتے ہیں تو مصرع خوب کس جانے سے رواں دواں ہو جاتا ہے جیسے

فرما کے الوداع ہر اک سوگوار سے　　خیمے سے نکلے شاہ پیمبر مزار سے
ڈر کر جو چھپے تھے وہ ستم گر نکل آئے　　خیمے سے حرم قبر سے حیدر نکل آئے

اور کبھی ایک ہی فعل دوبارہ آتا ہے تو ایک جگہ حقیقی اور دوسری جگہ مجازی معنی دے کر لطف پیدا کر دیتا ہے جیسے

گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں　　اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں
تھا کون جو ایماں تہہ صمصام نہ لایا　　اس شخص کا سر لائے جو اسلام نہ لایا
غل تھا فلک نے دفترِ عصمت الٹ دیا　　فضہ نے پردۂ درِ دولت اُلٹ دیا
سب ہیں وحیدِ عصر یہ غل چار سو اُٹھے　　دنیا سے جو شہید اٹھے سرخ رُو اٹھے

میر انیسؔ اکثر بہت سی چیزوں کے نام ایک جگہ جمع کر دیتے ہیں جس سے ٹیپ میں ندی کا سا بہاؤ آ جاتا ہے یہی وہ جگہ ہے جہاں انیسؔ سننے والے کو اتنا مبہوت کر دیتے ہیں کہ وہ زبان پر ان کی قدرت کا لوہا ماننے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے اس کی تھوڑی سی مثالیں دیتا ہوں۔

دوزخ کے زبانوں سے بھی آنچ اس کی بری تھی　　برچھی تھی، کٹاری تھی، سروہی تھی، چھری تھی

شعلہ تھی، شرارہ تھی، قیامت تھی، بلا تھی
شمشیر تھی یا برق تھی یا قہر خدا تھی

فاقوں میں صبر و شکر سے دل ان کے سیر تھے
جانباز تھے، جری تھے، مجاہد تھے، شیر تھے

خالق نے غضب بھی تجھے بخشا ہے کرم بھی
دوزخ بھی ترا، خلد بھی، کوثر بھی، ارم بھی

جو تھم گیا وہ تیرِ اجل کا نشانہ تھا
ترکش تھا نے کماں تھی نہ بازو نہ شانہ تھا

گھوڑے ہیں بظاہر یہ خدا جانے یہ کیا ہیں
طاؤس ہیں، بجلی ہیں، چھلاوا ہیں، ہوا ہیں

کھانے کا ہے خیال نہ پانی کی فکر ہے
سجدے ہیں اور دعائیں ہیں اور حق کا ذکر ہے

کیا اس کا ساتھ جس کی اطاعت گناہ ہو
حاکم ہو یا رئیس ہو یا بادشاہ ہو

اک روز نہ جاں ہے نہ یہ ملبوسِ بدن ہے
گھر قبر ہے تن خاک ہے پوشاک کفن ہے

ہاتھ منہ کٹ گئے سر اڑ گئے جی چھوٹ گئے
مورچے ہوگئے پامال پرے ٹوٹ گئے

کلام میں جوش یا زور اونچے مضامین سے بھی پیدا ہوتا ہے اور شاعر کی شخصیت اور اس کی عقیدت اور خلوص سے بھی آتا ہے۔ میر انیسؔ نے اونچے مضمونوں سے بھی ٹیپ میں زور پیدا کیا ہے اور ممدوح (حضرت امام حسینؑ) سے ان کی بے پناہ عقیدت نے بھی ان کے کلام میں جوش بھر دیا ہے مثلاً ان کی ایک ٹیپ دیکھیے۔

طاقت اگر دکھاؤں رسالت مآبؐ کی
رکھ دوں زمیں پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی

انیسؔ نے اس ٹیپ میں جو کچھ حضرت امام حسینؑ کی زبان سے کہلوایا ہے وہ پہلی نظر میں تو مبالغہ سا معلوم ہوتا ہے پر حضور سرورِ کائناتؐ اور ان کے نواسےؑ سے انیسؔ کی عقیدت اس بات کو بہت معمولی سمجھتی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جلیل القدر نانا کی طاقت دکھانے کا دعویٰ حسینؑ کو ہی سجتا تھا پھر انیسؔ کے عقیدے سے وہ تین دن کی بھوک پیاس میں بھی سورج کو چیر ڈالنے کی طاقت رکھتے تھے۔ اس ٹیپ میں آفتاب کو گولائی میں ڈھال کہا ہے تو ٹکیا یا قرص کی جگہ ڈھال کا بول اس لیے بھی جچتا ہے کہ یہ بات ڈھالوں کے جنگل یعنی لڑائی کے میدان میں کہی گئی ہے۔ پھر ڈھال کا چیر ڈالنا بھی کوئی ایسی ویسی طاقت کا کام نہیں ہے پر اس بات میں سب سے مزے دار وہ اشارہ ہے جو رسولِ اکرمؐ کے اس معجزے کی طرف ہمارا دھیان لے جاتا ہے جس سے انھوں نے چاند کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے۔ کچھ ایسی ہی باتیں حضرت عباسؑ کی زبان سے بھی کہلوائی گئی ہیں جو یوں تو مبالغہ لگتی ہیں پر شاعر کی عقیدت انھیں بھی معمولی سمجھتی ہے کیوں کہ یہ سب کے سب رسولؐ کے ہی گھرانے

کے لوگ تھے۔ سنیئے۔

حملہ کریں چڑھا کے اگر آستین کو — ہم آسماں سمیت اُلٹ دیں زمین کو
منہ دیکھتے رہیں جو نگہباں ہیں گھاٹ کے — لے جائیں گھر پہ تیغ سے دریا کو کاٹ کے

نیچے ان دونوں طرح کی زوردار ٹیپوں کی کچھ اور بھی مثالیں دی جاتی ہیں جن میں کہیں ایک حقیقت کہلوائی گئی ہے، کہیں کوئی اونچا مضمون باندھا گیا ہے اور کہیں عقیدت کی راج دھائی پھر رہی ہے۔

حملہ غضب ہے بازوئے شاہِ حجاز کا — لنگر نہ ٹوٹ جائے زمیں کے جہاز کا
طاقت سے ہیں بھرے ہوئے بازو دلیر کے — خیبر کشا کا زور ہے پنجے میں شیر کے
روکے گا جو وہ موت کے پنجے میں آئے گا — ہٹ جاؤ سب کہ شیر ترائی میں آئے گا
پڑنے لگی اعدا پہ جو ضربت شہِ دیں کی — خم ہوگئی لنگر سے کمر گاوِ زمیں کی
بھاگڑ پڑی کہ ایک سے ایک آگے بڑھ گیا — دریا لہو کا کشتیِ گردوں پہ چڑھ گیا
آفت کی تیغ تھی تو قیامت کا ہاتھ تھا — گویا چھری لئے ملک الموت ساتھ تھا
پڑھ کر درود فوجِ ملک مدح خواں ہوئی — جب ہم گئے تو کعبے کے اندر اذاں ہوئی
دو ہاتھ میں علیؑ کے پسر وار پار ہیں — دریا نہیں کہ رُک گیا ہم ذوالفقار ہیں
پیدا ہے شجاعت رُخِ گلفام سے اس کے — شیروں کے جگر کانپتے ہیں نام سے اس کے
اس جنگ کا چرچا سحر و شام رہے گا — دنیا میں اگر تم نہ رہے نام رہے گا
ایوب بھی اگر ہوں تو دم بھر نہ کل پڑے — آنسو تھمیں تو منہ سے کلیجہ نکل پڑے

اس کے علاوہ میر انیسؔ نے دو چیزوں کا مقابلہ کر کے بھی ٹیپ میں زور پیدا کرنا چاہا ہے۔ وہ تشبیہہ دینے کی جگہ مشبہ کو مشبہ بہ سے بڑھا دیتے ہیں جس سے اثر کئی گنا بڑھ جاتا ہے مثلاً شاعر عام طور پر آنکھ کو نرگس سے تشبیہہ دیتے چلے آئے ہیں پر انیسؔ ممدوح کی آنکھ کے سامنے نرگس کے پھول کو کچھ نہیں سمجھتے سنیئے۔

شرمندہ حسنِ چشم سے آہو تتار کے
نرگس کے پھول پھینک دو صدقے اتار کے

اسی طرح کی کچھ اور مثالیں یہ ہیں۔

یہ فیض ہے رخِ خلفِ بوتراب سے ذرّے ملا رہے ہیں نظر آفتاب سے

بیٹا

کھوتے نہیں یہ مال زر و مال کے بدلے موتی بھی لٹا دیتے ہیں اس لال کے بدلے

کربلا

واں کی زمیں سے مرتبہ پست آسماں کا ہے کہتے ہیں جس کو عرش وہ فرش اس مکاں کا ہے

دانت

ہنسنے میں جو پڑ جاتا ہے عکس ان کا فلک پر بجلی بھی تڑپ جاتی ہے دانتوں کی چمک پر

کربلا

خورشید بن گئے طبقے ارضِ پاک کے تاروں کو گرد کر دیا ذرّوں نے خاک کے

گھوڑا

بجلی چمک کے چھپ گئی پارا تڑپ گیا جنگل میں یوں اُڑا کہ چکارا تڑپ گیا

سورج

ذرّوں کی ضو سے مہرِ جہاں تاب زرد تھا مٹی میں یہ دمک تھی کہ کندن بھی گرد تھا

زورِ کلام پیدا کرنے کے لیے میر انیسؔ نے یہ گُر بھی آزمایا ہے کہ کچھ بولوں اور فقروں کو دہرا دیا جائے اور یہ بات پورے بھروسے سے کہی جاسکتی ہے کہ اس سے بھی بہت اچھا نتیجہ نکلا ہے۔ کچھ ایسی ٹیپیں بھی دیکھئے۔

تلواروں سے سو ٹکڑے اگر ہو کے گروں گا اس قبلۂ دیں سے نہ پھرا ہوں نہ پھروں گا

رخصت نہ اگر دو گی تو قدموں پہ جھکے گا یہ صاحبِ غیرت نہ رُکے گا نہ رُکے گا

دبتے ہیں سرکشوں سے کوئی جو دلیر ہیں فاقہ ہو یا کہ پیاس ہو پھر شیر شیر ہیں

کیا سوچتے ہو صاحبو کچھ تم کو خبر ہے ماں ہے تو ماں ہے خلق میں پھر غیر غیر ہے

جو اس کی امانت تھی وہ سب دے کے چلے ہیں کچھ لے کے نہ آئے تھے نہ کچھ لے کے چلے ہیں

غم کھائیں گے خونِ دلِ مجروح پئیں گے کیا زور ہے جب تک وہ جلائے گا جئیں گے

کہتی تھی تیغ گو کہ سروہی کا ہاتھ ہوں تو میرے دم کے ساتھ ہے میں تیرے ساتھ ہوں

درپیش منزلِ لحدِ خوف ناک ہے آغاز اپنا خاک ہے انجام خاک ہے

صابر کوئی آفاق میں ایسا نہیں دیکھا یہ دل نہیں دیکھا یہ کلیجا نہیں دیکھا

یوں تو انیسؔ کے شعروں میں بیان اور بدیع کے پھول بُوٹے بہت ملیں گے پر انھوں نے ان سے ٹیپوں میں بھی ایسا چچہار رنگ بھرا ہے کہ دل پس جاتا ہے۔ میر انیس تشبیہہ کے بھی بادشاہ ہیں ان کی تشبیہوں کے گُن پوری طرح ابھی تک لوگوں کے سامنے نہیں آئے ہیں۔ ان کی تشبیہیں بہت اچھوتی ہوتی ہیں اور ان کے استعمال میں انیسؔ کا کمال اپنے عروج پر ملتا ہے۔ چند شعر پڑھیئے اور جھومیئے۔

خیمہ

صحن اس کا سب بتولؑ کے پیاروں سے بھر گیا   اک آسمان تھا کہ ستاروں سے بھر گیا

صبح عاشورہ

پتے تمام آئینۂ نور ہو گئے   صحرا کے نخل سب شجرِ طور ہو گئے

تلوار

ٹپکا جو لہو منہ سے شرارے نکل آئے   دریا سے گہر ابر سے تارے نکل آئے

شمشیرِ اجل فوج کے بھالوں سے رکی ہے   گرتی ہوئی بجلی کبھی ڈھالوں سے رکی ہے

حضرت عباسؑ

آنکھیں لہو تھیں رُخ سے جلال آشکار تھا   مشکیزہ تھا کہ شیر کے منہ میں شکار تھا

حضرت امام حسینؑ

شبیرؑ برآمد ہوئے یوں خیمے کے در سے   جس طرح نکلتا ہے جنازہ کسی گھر سے

تلوار

تیغ کشیدہ دستِ شہِ بحر و بر میں ہے   طومار ہاتھ میں ہے لفافہ کمر میں ہے

سورج

تھا چرخِ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا   کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا   تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

کم تھا نہ ہمہمہ اسدِ کردگار سے   نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے

پنجہ نہ تھا نشانِ ثریا جناب کا   تھا فرقِ جبرئیل پہ تاج آفتاب کا

خم گردنیں تھیں سب کی خضوع و خشوع میں   سجدوں میں چاند تھے مہِ نو تھے رکوع میں

صبح شبِ فراق ہے پیاروں کو دیکھ لو — سب مل کے ڈوبتے ہوئے تاروں کو دیکھ لو
گھوڑے سمندِ سرورِ ذی شاں کے ساتھ ہیں — پریوں کے غول تختِ سلیماں کے ساتھ ہیں
آنکھوں کے سامنے سے سواری نکل گئی — گویا چمن سے بادِ بہاری نکل گئی
انساں تو کیا کہ شیروں کے زہرے بھی آب تھے — آنکھیں ملائے کون کہ دو آفتاب تھے
لٹکائی پھر کمر میں وہ تیغ اس شکوہ سے — دریا اتر کے آتا ہے جس طرح کوہ سے
اژدر تھا کہ تلوار تھی دم تھا کہ ستم تھا — نا ہیں تھیں کہ گھر موت کا پانی تھا کہ سم تھا
یوں پھر رہے تھے بیچ میں فوجِ غنیم کے — جیسے سحر کو چلتے ہیں جھونکے نسیم کے
نکلا یہ نور نورِ رسالت مآبؐ سے — جس طرح کوئی عطر نکالے گلاب سے
کس منہ سے کہوں حسنِ نشستِ شہِ دیں کو — معلوم ہوا جڑ دیا خاتم پہ نگیں کو

کچھ تشبیہیں استعاروں سے بھی سجائی گئی ہیں پر ان کو اچھی طرح سمجھنے اور ان کا پورا مزا لینے کے لیے ان کے بندوں کو بھی سامنے رکھنا ہوگا۔ کچھ مثالیں یہاں درج کی جاتی ہیں۔

حضرت امام حسینؑ

شادی ہے ولادت کی ید اللہ کے گھر میں — خورشید اترتا ہے ید اللہ کے گھر میں

آنکھیں اور آنسو

روئے ہیں فرقتِ شہِ عالی جناب میں — نرگس کے پھول تیر رہے ہیں گلاب میں

حضرت علی اکبرؑ

آباد گھر حسینؑ کا تاراج ہوگیا — خورشید دوپہر سے غروب آج ہوگیا

دانت اور مسوڑے

باتوں میں لب جو ہلتے ہیں اس خوش خصال کے — ہیروں کی جھوٹ پڑتی ہے ٹکڑوں پہ لال کے

رکاب کے حلقے

نسبت ہے مہِ نو سے قدرِ است کے خم کو — آنکھوں سے رکابوں نے سنبھالا ہے قدم کو

حضرت علی اکبرؑ

شعبے صدا میں پنکھڑیاں جیسے پھول میں — بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسولؐ میں

مصاحب

تسبیح ہاتھ آئی یہ کس نیک نام کو — دُرِ نجف تھے وہ جو ملے تھے امامؑ کو

(کنارے۔دھار)

دم بھر میں نہ صف تھی نہ سواروں کا پرا تھا — اعدا کا لہو تیغ کی باچھوں میں بھرا تھا

(مسکن)

گھر ہے وہ ملک برجِ شرف کہتے ہیں جس کو — بیشہ ہے وہ اپنا کہ نجف کہتے ہیں جس کو

جسم وروح

سالم رگیں نہ جسم کی نے استخواں رہے — ٹوٹے قفس میں طائرِ وحشی کہاں رہے

اب کچھ ایسی مثالیں دی جاتی ہیں جن میں ٹیپ کنائے سے اٹھائی گئی ہے۔

صدمۂ عظیم

دل ہل گیا کی جب کہ نظر سینہ و سر پر — چوما جو گلا چل گئی تلوار جگر پر

زلزلہ

ہے تیغ بکف قوتِ بازو شہِ دیں کا — تھمتا نہیں ماہی پہ قدم گاوِ زمیں کا

قتل اولاد

ہوتا ہے قلق گل ہو اگر خار کے نیچے — رکھے تو کلیجہ کوئی تلوار کے نیچے

لب تر کرنا

پیاس ایسی تھی کہ آ گئی جاں ہونٹوں پر — صابر ایسے تھے کہ پھیری نہ زباں ہونٹوں پر

نمودِ سحر

پہنچا فلک پہ ماہ کو حکم انقلاب کا — موجِ ہوا سے پھول کھلا آفتاب کا

شکستِ حباب

لہروں کی بجلیاں جو برابر چمکتی تھیں — کھلتی تھیں اور حبابوں کی آنکھیں جھپکتی تھیں

فوجِ شام

بجلی گری پروں پہ شمال و جنوب کے — کیا کیا لڑے ہیں شام کے بادل میں ڈوب کے

بلا

لوہے کے چبانے کی صدا بھا گئی اس کو — جس چیز پہ منہ ڈال دیا کھا گئی اس کو

اس سلسلے میں میر انیسؔ نے کچھ ایسی تلمیحات بھی استعمال کی ہیں جو ہوسکتا ہے کچھ لوگوں کے لئے اجنبی ہوں اور جب تک انھیں ان کے واقعات نہ بتائے جائیں ان سے پورالطف بھی نہ لے سکیں پر میر انیسؔ کا مرثیہ سننے والے انھیں خوب جانتے تھے اس لیے انیسؔ نے جگہ جگہ ان سے بھی اپنی ٹیپ اٹھانے کا کام لیا ہے۔ان کی کچھ مثالیں نیچے دی جاتی ہیں۔

آنحضرتؐ کی معراج کا واقعہ

صاحبِ تخت ہوئے تیغ ملی تاج ملا ۔۔۔ دوشِ احمد پہ انھیں رتبۂ معراج ملا

آیت قرآنی

غل تھا کہ نماز اس کی پڑھو فرض یہی ہے ۔۔۔ اے قوم! اذا زلزلت الارض یہی ہے

آیت کا ترجمہ

سمجھو نہ یہ سفر کی تباہی میں مر گیا ۔۔۔ زندہ ہے وہ جو راہِ الٰہی میں مرگیا

صبرِ ایوبؑ کا واقعہ

ایوب بھی اگر ہوں تو دم بھر نہ کل پڑے ۔۔۔ آنسو تھمیں تو منہ سے کلیجہ نکل پڑے

حضرت یوسفؑ اور بازارِ مصر

حسن ایسا کہ خورشید کا منہ زرد ہوا ہے ۔۔۔ یوسف کا بھی بازار یہاں سرد ہوا ہے

حضرت علیؑ کی کنیت کا واقعہ

غل تھا اُلٹ چکے ہیں حسینؑ آستین کو ۔۔۔ یا بوترابؑ آکے بچالو زمین کو

حضرت علیؑ کا ذوالفقار سے جبرئیل کے پر کاٹنے کا واقعہ

کیا منہ ہے جو وار اس کا رُکے فوجِ ستم سے ۔۔۔ جبریل کے پر جلتے ہیں اس برقِ دودم سے

میر انیسؔ کا پورے کا پورا کلام شاعرانہ صنعتوں سے بھرا پڑا ہے پر انھوں نے ان سے اپنی ٹیپ نکھارنے کا بھی کام لیا ہے۔ نیچے ایسی ہی کچھ مثالیں لکھی جاتی ہیں جن میں ٹیپ کی خوبی کسی نہ کسی صنعت پر رکھی گئی ہے۔

تفریق:

آہو کا اور شیر کا انداز اور ہے ۔۔۔ حقا کہ سحر اور ہے اعجاز اور ہے

سمجھا ہے تو ثواب جسے وہ گناہ ہے ۔۔۔ تیری ہے اور راہ مری اور راہ ہے

تقسیم:

تنہا ترے اقبال سے شمشیر بکف ہوں ۔۔۔ سب ایک طرف جمع ہیں میں ایک طرف ہوں

تیر ایک طرف تیر فگن ایک طرف تھے ۔۔۔ سر ایک طرف جمع تھے تن ایک طرف تھے

مراعات النظیر:

دل ہل گیا کی جب کہ نظر سینہ و سر پر ۔۔۔ چوما جو گلا چل گئی تلوار جگر پر

اللہ رے کرم پیاس کے ماروں کو جلایا ۔۔۔ دم بھر میں مسیحا نے ہزاروں کو جلایا

رعایتِ لفظی:

پایا فروغ نیّرِ دیں کے ظہور سے ۔۔۔ جنگل کو چاند لگ گئے چہرے کے نور سے

ہلتی ہوئی دونوں جو زبانیں نظر آئیں ۔۔۔ ہونٹوں پہ ستم گاروں کی جانیں نظر آئیں

ضلع (ٹکسال)

سکّے پڑے تھے اکبرِ غازی کی حرب کے ۔۔۔ لوہا بھی دب گیا تھا یہ معنی ہیں ضرب کے

دریا

دم سے تھا بحرِ خوں کا کنارا لگا ہوا ۔۔۔ جانوں کا گھاٹ پر تھا اتارا لگا ہوا

تجنیس:

ایسے جری سے کس کو مجالِ مصاف تھی ۔۔۔ یوں پھر کے صف کی صف کو جو دیکھا تو صاف تھی

دو کرتی تھی وہ ہر کس و ناکس کو یہ کس تھا ۔۔۔ اک ہاتھ میں فارس تھا نہ زیں تھا نہ فرس تھا

دریا بھی گرم عکس سے تھا آفتاب کے ۔۔۔ برپا کئے تھے آب نے خیمے حباب کے

تجنیسِ تام:

فرق آئے گا نہ میری کبھی آن بان میں ۔۔۔ لڑکے سے لڑکے نام مٹادوں جہان میں

تاب ان کی لڑائی کی بنی جان نہ لاتے ۔۔۔ بچتی نہ کبھی جان جو ایمان نہ لاتے

تجنیسِ مقلوب:

فرفر رواں ادھر سے دم جست وخیز تھا ۔۔۔ الٹا پھرا ادھر سے تو رفرف سے تیز تھا

لف ونشرِ مرتب:

مردود جدا ہوگئے مقبول جدا ہیں ۔۔۔ دیکھو تمہیں کانٹے ہیں جدا پھول جدا ہیں

گل کر گئے سفر دلِ پُر داغ رہ گیا　　واحسرتا بہار گئی باغ رہ گیا
جو خاکی و آبی تھا وہ تھا نوحہ گری میں　　خشکی میں تباہی تھی تلاطم تھا تری میں

لف ونشرِ غیر مرتب:

شیطاں کو وصل نار کا آدم کو نور کا　　یہ عجز کا ثمر ہے وہ پھل ہے غرور کا
اعدا کو دشمنی تھی صغیر و کبیر سے　　برچھی سے ایک قتل ہوا ایک تیر سے
(حضرت علی اکبرؑ وحضرت علی اصغرؑ)

حسنِ تعلیل:

غل تھا کہ پنہ اب ہمیں یا شاہِ زماں دو　　پھیلائے تھے دامن کو پھریرے کہ اماں دو
کچھ ضعف نہیں آپ کے قدموں کی قسم ہے　　سر بار ہے تن پر کمر اس واسطے خم ہے
(حبیب ابنِ مظاہر کی گفتگو)

مجلس میں مومنوں نے جو آنسو بہائے ہیں　　دیکھو دعا کو ہاتھ علم نے اٹھائے ہیں
پانی وہ زہر تھا کہ پیا اور فنا ہوا　　ہے آج تک زرہ کا کلیجا چھنا ہوا
خاک اڑتی تھی منہ پر حرمِ شیرِ خدا کے　　تھا چیں بہ جبیں فرش بھی جھونکوں سے ہوا کے
خواہاں تھے زہرِ گلشنِ زہرا جو آب کے　　شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے
سرخی اُڑی تھی پھولوں سے سبزی گیاہ سے　　پانی کنویں میں اُترا تھا سائے کی چاہ سے
پیاسی جو تھی سپاہِ خدا تین رات کی　　ساحل سے سر پٹکتی تھی موجیں فرات کی

عدد:

حشر برپا تھا سواروں پہ فرس ٹوٹتے تھے　　دو پہ چار ایک پہ دو پانچ پہ دس ٹوٹتے تھے
مقتل میں سواروں پہ فرس ٹوٹ رہے تھے　　دو ایک پہ اور پانچ پہ دس ٹوٹ رہے تھے
کشتہ تھے ایک ضرب میں دو ہوں کہ چار ہوں　　ششدر تھے سب کہ موت سے کیوں کر دو چار ہوں

ایہام:

اعضائے بدن قطع ہوئے جاتے تھے سب کے　　قینچی سی زباں چلتی تھی فقرے تھے غضب کے
بد خواہِ خاندانِ رسالتؐ پناہ تھے　　ایسے جلے ہوئے تھے کہ چہرے سیاہ تھے
دریا بھی تلاطم میں رہا کاٹ سے اس کی　　ابھری نہ کوئی کشتی تن گھاٹ سے اس کی

باطل شقاوت و حسد و کینہ ہوگیا ایسی جلا ہوئی کہ حق آئینہ ہوگیا
مانندِ سبحہ رشتۂ ایماں قوی کرے دانا وہ ہے امام کی جو پیروی کرے

تضاد:

چرچا رہے کہ وقت پہ کیا کام کر گئی چھوٹی بہو علیؑ کی بڑا کام کر گئی
آئی ہنسی اجل کو بھی اس طرح مرگئے گھوڑوں پہ تن چڑھے رہے اور سر اُتر گئے
اس تیغ سے فولاد کا دل نرم ہوا تھا تن سرد تھے بازارِ اجل گرم ہوا تھا
رن پر چڑھے جو سوگ کے کپڑے اتار کے مارے گئے وہ شیر ہزاروں کو مار کے

مبالغہ:

دوڑے بروئے آب تو پُتلی بھی تر نہ ہو آنکھوں میں یوں پھرے کہ مژہ کو خبر نہ ہو
ایسی سبک روی نہیں دیکھی شہاب میں دوڑے تو فرق آئے نہ مخمل کے خواب میں
گر چشم سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں
گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر
پانی تھا آگ گرمیِ روزِ حساب تھی ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی

ان صنعتوں کے علاوہ انیسؔ نے محاکات سے بھی کام لیا ہے اور ٹیپ میں منہ بولتی تصویریں کھینچ کر سامنے رکھ دی ہیں تھوڑے سے شعر دیکھئے۔

طائر ہوا میں مست ہرن سبزہ زار میں جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں
زلفیں ہوا سے ہلتی تھیں ہاتھوں میں ہاتھ تھے لڑکے بھی بند کھولے ہوئے ساتھ ساتھ تھے
گلر رُو صفتِ غنچہ کمر بستہ کھڑے ہیں سب ایک جگہ صورتِ گلدستہ کھڑے ہیں
لب ان کے اودے اودے ہیں منہ گورے گورے ہیں آنکھوں میں اشک ہاتھوں میں خالی کٹورے ہیں
تھی قہر کی نگاہ غضب کا جلال تھا آنکھیں بھی سرخ سرخ تھیں چہرہ بھی لال تھا

میر انیسؔ ٹیپ میں دو ایسے برابر کے ٹکڑے بھی جمع کر دیتے ہیں جو کبھی ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور کبھی ان میں الٹی کیفیتیں بیان کی جاتی ہیں جس سے تاثیر ابھر آتی ہے۔ پہلی قسم کے فقروں کی مثالیں یہ ہیں۔

حیواں کو بھی دکھ ہوتا ہے زخموں کے تعب کا میں درد رسیدہ ہوں مجھے درد ہے سب کا

قربان تھے ملک رُخِ روشن کی شان پر — تھی چاندنی زمین پہ نور آسمان پر
انساں یہ نہیں چاند اتر آیا ہے زمیں پر — محبوبِ خدا عرش پہ سایہ ہے زمیں پر

اب کچھ متقابل فقروں کی مثالیں لکھی جاتی ہیں۔

اک طور پہ دیکھا نہ جواں کو نہ مُسنِ کو — شب کو تو چھپر کھٹ میں ہیں تابوت میں دن کو
انجامِ کار قبر کی منزل نظر میں ہے — ہم ہیں وطن میں عمر ہماری سفر میں ہے
پہنچے صفتِ نکہتِ گُل باغِ ارم میں — پیدا ہوئے برسوں میں فنا ہو گئے دم میں
تو صبر عطا کر کہ نہ فریاد کروں میں — بھولوں علی اکبرؑ کو تجھے یاد کروں میں
دریائے خوں فرات کے ساحل پہ بہہ گئے — وہ پار اتر گئی یہ اسی گھاٹ رہ گئے
رو کے ہوئے تھی نہر کو امت رسولؐ کی — سبزہ ہرا تھا خشک تھی کھیتی بتولؑ کی

کبھی ایک مصرعے کے دو ٹکڑوں کے معنی دوسرے مصرعے میں اکٹھے کر کے ٹیپ میں زور پیدا کیا ہے جیسے۔

واں بین اِدھر صبر و شکیبائی کی باتیں — افسانۂ ماتم تھیں بہن بھائی کی باتیں
شادی نہیں رہتی ہے سدا غم نہیں رہتا — دنیا کا کبھی ایک سا عالم نہیں رہتا
شب کٹتی ہے کس طرح سے دن ڈھلتا ہے کیوں کر — پوچھے کوئی ماں سے کہ پسر پلتا ہے کیوں کر
خاروں سے پوچھئے نہ کسی گل سے پوچھئے — صدمہ چمن کے لٹنے کا بلبل سے پوچھئے

کبھی ایک مصرعے میں جو کچھ کہا ہے اس کی تشریح دوسرے میں کر دی ہے جیسے۔

فتح و ظفر تھی مثلِ علیؑ اختیار میں — پنجے میں تھا وہی جسے تاکا ہزار میں
صابر بھی تڑپتے ہیں وہ کیا رنج و الم ہے — اک داغ ہے اولاد کا ایک بھائی کا غم ہے
آتی ہے خزاں باغ اجڑتا ہے ہمارا — فرزندِ جواں ہم سے بچھڑتا ہے ہمارا
باطل کے سوا حق کا کہو نام کہاں تھا — یہ دین یہ آئین یہ اسلام کہاں تھا
مردود تھا یہ دونوں جہاں میں پکار ہے — آتش کے گرز پڑتے ہیں لعنت کی مار ہے

کہیں کہیں انیسؔ نے دعوے اور دلیل کی مدد سے بھی ٹیپ سجانے کی کوشش کی ہے جیسے۔

جاتا ہے وہیں پھر کے جو آتا ہے جہاں سے — دن بھر میں کہاں مہر پہنچتا ہے کہاں سے
مسکن سے منہ پہاڑ کبھی موڑتے نہیں — ثابت قدم جو ہیں وہ جگہ چھوڑتے نہیں

دعوے کوئی درست نہیں بے دلیل کے جوہر کھنچے پہ کھلتے ہیں تیغِ اصیل کے
یکتا تھی ذوالفقار یہ قطعی دلیل ہے جو تیغ دونوں باگیں کسے وہ اصیل ہے

کسی کسی ٹیپ میں شاعر نے توصیفی جملہ رکھ کر بندش میں چستی پیدا کر دی ہے جیسے۔

تنہا کوئی لاکھوں سے لڑائی نہیں کرتا وہ تو نے کیا مجھ سے کہ بھائی نہیں کرتا
وہ نار جسے خوں کی روانی نہ بجھائے یہ آگ وہی ہے جسے پانی نہ بجھائے
دولت کو نہ حشمت کو نہ آرام کو دیکھے آنکھیں وہی رکھتا ہے جو انجام کو دیکھے
گھر لٹے اور نہ زباں پر بھی صدا آہ کی ہو یہ اسی سے ہو جو بیٹی اسد اللہ کی ہو
تسبیح ہاتھ آئی یہ کس نیک نام کو دُرِ نجف تھے وہ جو ملے تھے امام کو

کہیں استثنائی جملہ کہہ کر پڑھنے سننے والے کو چونکا دیتے ہیں جس سے ٹیپ کا اثر گہرا ہو جاتا ہے جیسے۔

چالاک آہوانِ ختن اس قدر نہ تھے اُڑ جاتا تھا ہما کی طرح اور پر نہ تھے
ایسا کسی کو خلق میں رتبہ ملا نہیں ساری خدا کی شان ہے لیکن خدا نہیں
اللہ رے شرف سبطِ رسولؐ دوسرا کے مالک تو خدائی کے ہیں بندے ہیں خدا کے
ماں شاد تھی پر غم کے بھی پہلو نکل آئے چاہا کہ نہ روؤں مگر آنسو نکل آئے
دیکھے سے نہ کیوں ہوش اڑیں اہلِ حسد کے آنکھیں تو ہیں آہو کی پہ تیور ہیں اسد کے
فرزندِ جواں کوئی بشر کھو نہیں سکتا یہ صبر بجز ابنِ علی ہو نہیں سکتا

اس سلسلے میں ایک آخری اور خاص بات یہ ہے کہ ٹیپ کا شعر ہمیشہ بند کے پہلے دو شعروں سے اونچا ہوتا ہے۔ میر انیسؔ کے پورے کلام کو دیکھ جائیے کسی ایک بند کی ٹیپ بھی ایسی نہیں ملے گی جو پہلے دو شعروں سے نیچی ہو۔ خاص طور پر ٹیپ کا دوسرا مصرع بند کے چوتھے مصرعے سے صفائی، زور، بہاؤ یا معنی میں کسی نہ کسی طرح بڑھا ہوا ہوتا ہے اس کے ثبوت کے لئے نیچے کچھ مثالیں دی جاتی ہیں۔

سر خاک پہ گر گر کے نشانوں نے جھکائے

غل تھا کہ پنہ اب ہمیں یا شاہِ زماں دو پھیلائے تھے دامن کو پھریرے کہ اماں دو

پھر کس کی رکھوں آس ہوئی آپ سے جب یاس

نانا نہیں بابا نہیں مادر بھی نہیں ہے　　میرا تو کوئی اور برادر بھی نہیں ہے

اکبرؑ سے پسر کو کوئی ہاتھوں سے گنواتا
ہوتا ہے قلق گل ہو اگر خار کے نیچے　　رکھے تو کلیجہ کوئی تلوار کے نیچے

تصویر ہو رسولؐ خدائے مجید کی
کیوں کر جدا نگاہ سے بیٹا کریں تمہیں　　آنکھیں یہ چاہتی ہیں کہ دیکھا کریں تمہیں

پُتلی وہ میری سمجھے جسے آنکھ کا تارا
دیکھی نہ سموں میں کسی گھوڑے کے یہ ضو بھی　　اک جا ہیں ستارے بھی قمر بھی مہِ نو بھی

احکام ہوئے شرع کے جاری اسی گھر سے
آتے ہیں زباں پر وہی جو کلمۂ حق ہیں　　ہم مصحفِ ناطق کے صحیفے کے ورق ہیں

ہو جائے ہوا بزم سلیماں کی بھی توقیر
یوں تختِ حسینانِ معانی اُتر آئے　　ہر چشم کو پریوں کا اکھاڑا نظر آئے

کرسی پہ جلوہ گر ہوا وہ عرش بارگاہ
ہر نخل غیرتِ شجرِ طور ہوگیا　　صحرا خدا کے نور سے معمور ہوگیا

اللہ ری سرعت کہ ہرن ہوگیا سایا
غل تھا کبھی یوں آگ سے پارا نہیں اڑتا　　اس شان سے جنگل میں چکارا نہیں اُڑتا

ہوتے ہیں خاکسار غلامِ ابوتراب

مہتاب سے رُخوں کی صفا اور ہوگئی　　مٹی سے آئینوں کی ضیا اور ہوگئی

اوپر درج کی ہوئی مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ میر انیسؔ بند کے چوتھے مصرعے کے فوراً بعد چھٹا مصرع کہتے تھے اور سب سے آخر میں پانچواں مصرعہ لگاتے تھے۔ جب پانچواں مصرع جو چھٹے مصرعے کی گرہ کے طور پر لگایا جاتا ہے بالکل چسپاں ہوجاتا ہے تو ٹیپ بہت ہی پُر کیف ہوجاتی جیسا کہ اوپر کی مثالوں سے بھی ظاہر ہے۔ پر کبھی کبھی یہ گرہ ایک جان نہیں ہو پاتی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم ایسے ہی پانچویں مصرعے کے بعد بند کا چھٹا مصرع یعنی ٹیپ کا دوسرا مصرع پڑھتے ہیں تو ہم چونک سے جاتے ہیں اور یہ سوچنے لگتے ہیں کہ میر انیسؔ نے پانچویں مصرعے میں تان کچھ مدھم کردی ہے تاکہ وہ آخری یا چھٹے مصرعے میں تاثر کا بھرپور وار کرسکیں بالکل اسی طرح جیسے کوئی کشتی لڑنے والا پہلوان آخر میں کڑی چوٹ کرنے کے لئے ایک قدم پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ نیچے کچھ ایسی ہی مثالیں دی جاتی ہیں جن میں چوتھا اور چھٹا مصرعہ مضمون کے لحاظ سے بالکل پیوست ہیں پر پانچواں مصرعہ ان کے مضمون سے اتنا میل نہیں کھاتا۔ دیکھئے۔

(دانت):　　نے برق میں یہ شرق نہ موتی میں یہ صفا

گیسو ہلے ہوا سے تو جنگل مہک گئے　　جب ہنس کے بات کی تو ستارے چمک گئے

(حضرت علی اکبرؑ)　　گلزارِ مرتضیٰؑ کے گلِ تر کا کوچ ہے

اس کربلا میں کون سی کرب و بلا نہیں　　کتنا ہے وہ نہال جو پھولا پھلا نہیں

(تلوار کا نزول)　　نازل اسی کی شان میں ہے سورۂ حدید

سفاک تھی اُپی ہوئی تھی بے دریغ تھی　　جو عرشِ ذوالجلال سے اتری وہ تیغ تھی

(ناگن)　　تیغ کیا آئی کہ اڑتی ہوئی ناگن آئی

غل تھا بھاگو کہ یہ ہنگام ٹھہرنے کا نہیں　　زہر اس کا جو چڑھے گا تو اترنے کا نہیں

(صفائی)　　پایا ہے عجب نور صفائی ہے عجب واہ

بھایا یہ مکاں دوشِ محمد کے مکیں کو جس طرح سے جھاڑے کوئی بالوں سے زمیں کو

(کفن) دنیا کے کل اسباب سے ہوتا ہے کفن ساتھ
آتی ہے وہاں موت جہاں گھر نہیں ہوتا بہتوں کو کفن تک بھی میسر نہیں ہوتا

(خوشبو) بس جائے وہ سب راہ یہ جس راہ سے جائیں
نورِ مہِ کامل کبھی سینے کو نہ پہنچے بو ایسی کہ عطر ان کے پسینے کو نہ پہنچے

(حضرت زینبؑ عونؑ محمدؑ) ماں تکتی تھی ہاتھوں سے کلیجے کو سنبھالے
رہوار کو ترجیح تھی چلنے میں صبا پر دو چاند کے ٹکڑے نظر آتے تھے ہوا پر

حضرت عباسؑ تھے عاشقِ شمعِ قدو رنگِ گل رُخسار
چھوڑا نہ کبھی ابنِ شہنشاہِ عرب کو بلبل تھے اگر دن کو تو پروانہ تھے شب کو

حضرت علی اکبرؑ ڈھونڈیں گی یہ آنکھیں تمہیں ہر سو علی اکبرؑ
دِل سینے میں کیوں کر تہ و بالا نہ رہے گا جب چاند چھپے گا تو اجالا نہ رہے گا

جنگ بَرّی میانِ بحر تھے بحری میانِ بر
گھر چھٹ گئے تھے جانوروں کے یہ رنگ تھے خشکی میں تھے نہنگ تری میں پلنگ تھے

حضرت مسلم کی شہادت اس نے کہا میں واں سے چلا تھا تو یہ تھی دھوم
بے قتل سواروں کو نہ آرام ملے گا مسلم کا جو سر لاؤ تو انعام ملے گا

اذانِ علی اکبرؑ کیا صوتِ حسن ہے کہ زمانہ ہے ثنا خواں

آوازِ حزیں سن کے دلوں کو نہ کل آئی　　بلبل بھی گلستاں سے پھڑک کر نکل آئی

اُڑا اُڑ گئی کاغذ سے سیاہی دمِ تحریر
رنگ رخِ قرطاس بھی فق ہاتھ میں دیکھا　　جھپکی جو پلک سادہ ورق ہاتھ میں دیکھا

بے ثباتی　　گہہ تخت ہے اور گاہ جنازہ بہ سرِ دوش
اک طور پہ دیکھا نہ جواں کو نہ مُسن کو　　شب کو تو چھپر کھٹ میں تھے تابوت میں دن کو

سراپا　　کوسوں فروغِ حسن سے روشن ہوئی زمیں
جن کے تنوں میں جان نہ تھی زندہ ہوگئے　　ذرّے زمیں کے اخترِ تابندہ ہوگئے

اوپر کی مثالوں میں چوتھے مصرعے کے بعد چھٹا مصرع پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کا مضمون ایک ہی ہے بلکہ چھٹا مصرع چوتھے سے کسی نہ کسی طرح بڑھا ہوا بھی ہے۔ اس کے بعد پانچواں مصرع پڑھنے سے لگتا ہے کہ مضمون اچانک بدل گیا ہے یا مصرع لگانے میں بہت کچھ بناوٹ سے کام لیا گیا ہے اور بڑی کاوش کی گئی ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ میر انیسؔ چوتھے مصرعے کے بعد چھٹا مصرع کہتے تھے اور پھر پانچویں مصرعے کی شکل میں اس پر گرہ لگاتے تھے جو کبھی بالکل گُھل مِل جاتی تھی اور کبھی اُکھڑی رہ جاتی تھی۔

اردو شاعری میں مسدّس کی ٹیپ اِس محنت اور احتیاط سے بہت کم کہی گئی ہوگی جس محنت اور احتیاط سے انیسؔ نے کہی ہے اور اتنی تعداد میں تو یقیناً آج تک کسی شاعر نے ٹیپیں نہیں کہیں۔ صفائی، بہاؤ اور زور میں میر انیسؔ کی ٹیپ اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ زبان، بیان اور معنی غرض ہر لحاظ سے اس میں رس اور رنگ پیدا کرنے اور سنوارنے سجانے میں میر انیسؔ کی سی کوششوں کا پوری اردو شاعری میں جواب نہیں ملتا۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ میر انیسؔ کی خوبیوں پر بہت کچھ کہا جا چکا ہے انھوں نے میر صاحب کے کلام پر اچھی طرح دھیان ہی نہیں دیا ہے کیوں کہ میری سمجھ سے تو ان کے فن کے ابھی بہت سے ایسے پہلو باقی ہیں جن پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی (الٰہ آباد)

اُردو شاعری پر انیسؔ کا اثر

کسی شاعر سے متاثر ہونا ایک پیچیدہ اور بڑی حد تک پُر اسرار عمل ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تاثّر قبول کرنے والا شاعر خود اس بات سے بے خبر ہو کہ اس نے کسی شاعر کا اثر حاصل کیا ہے۔ لیکن تقلید ایک نسبتاً کم پیچیدہ کارگزاری ہے۔ مقلّد کو اگر ہمیشہ نہیں تو اکثر اس بات کا احساس رہتا ہے کہ وہ کسی شاعر کی تقلید کر رہا ہے۔ نقالی ان دونوں کے مقابلے میں پست تر اور بڑی حد تک بے روح عمل ہے۔ نقال کو اچھائی بُرائی کا شعور نہیں ہوتا۔ وہ اپنے ماڈل شاعر کے رنگ کو پوری طرح اپنانے کی دُھن میں تنقیدی انتخاب اور ذاتی سوجھ بوجھ سے دست بردار ہو جاتا ہے۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی شاعر سے متاثر ہونا بڑی حد تک تخلیقی اور ایک محدود حد تک تنقیدی عمل ہے۔ تقلید بڑی حد تک تنقیدی اور ایک کم تر اعتبار کا تخلیقی کارنامہ ہے اور نقل میں نہ تخلیقی شعور ہوتا ہے اور نہ تنقیدی۔ تمام دنیا کے ادب میں تقلیدی شاعری کو ایک خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ لیکن شرط ہمیشہ یہی رہی ہے کہ جس شاعر کی تقلید کی جائے اور جو شاعر تقلید کرے دونوں اوسط سے اوپر درجے کے ہوں۔ ورنہ اگر نتھو خیرے کی تقلید ایرے غیرے کریں تو کیا حاصل۔ یہ تقلیدی روایت کی وسعت اور مضبوطی کا ہی نتیجہ ہے کہ اُردو فارسی میں غزلیات، قصائد اور مثنویات کا اتنا بڑا دفتر اکٹھا ہو سکا۔ تقلیدی شاعری پر استہزائی نگاہ ڈالنے والے نقاد یہ بھول جاتے ہیں کہ (مثلاً) سوداؔ کے اکثر قصیدے فارسی شعراء کے

مشہور قصائد کی تقلید میں ہیں اور میر انیسؔ نے اپنے بزرگ مرثیہ گویوں، علی الخصوص میر خلیقؔ کی تقلید کی تھی۔ خود میر انیسؔ کی بدقسمتی یہ تھی کہ اُن کے بعد اُن کے نقال تو ہوئے لیکن مقلّد کوئی نہ ہوا۔ اُن کے بعد مسدّس کی ہیئت کو بہت جلد زوال آ گیا اور مرثیہ گوئی تقریباً ختم ہوگئی۔ یہ بات سب جانتے ہیں، لیکن اس کی وجہ کیا ہے، اس پر غور نہیں کیا گیا۔ مرثیے اور مسدّس کے زوال کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ میر انیسؔ کے بہت کم مقلّد قابلِ ذکر شاعر تھے۔ سب تقریباً یا ''کاملاً'' نقال تھے۔ ورنہ خود مسدّس کی صنف میں اتنی دل کشی اور مرثیہ کے ساتھ اس کا تعلق اتنا زبردست ہے کہ میر انیسؔ کے بہت بعد بلکہ ہمارے عہد تک مرثیہ لکھنے کی تقریباً تمام سنجیدہ کوششیں مسدّس سے دامن کش نہ ہو سکیں۔ جوشؔ، سردار جعفری اور وحید اختر کی مثالیں سامنے کی ہیں۔ خود جوشؔ یا سردار یا وحید اختر، اور ان سے بھی بہت زیادہ میر عشقؔ سنجید مرثیہ گویوں کی فہرست میں شامل کئے جانے کے قابل ہیں لیکن ان میں سے کسی نے بھی میر انیسؔ کا تخلیقی اتباع نہیں کیا ہے۔ میر عشقؔ نے مرثیہ گوئی کے فن اور اصول کی طرف ہی توجہ کی، لیکن یہ تمام تر توجہ بندشوں کو سخت تر اور قواعد کو تنگ تر کرنے پر ہی صرف ہوئی۔ مہذبؔ لکھنوی نے میر عشقؔ کے مراثی ''آثارِ عشق'' کے عنوان سے مرتب کیئے ہیں۔ اس کی جلد اوّل کے دیباچے میں کہا گیا ہے کہ ''نظم کی قید وہ قید ہے کہ جس جس قدر اس کی سختی بڑھتی جاتی ہے اسی قدر اس کی دل کشی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔'' آگے کہا گیا ہے کہ میر عشقؔ نے ''نظم کی عام قیدوں میں مزید اضافہ کیا ہے''۔ ان اضافی قیود میں سرِ فہرست یہ اصول ہے کہ مسدّس کی بیت کو اُوپر کے چار مصرعوں کا تابع رکھا جائے۔ اگر اُوپر کے مصرعوں میں ''ہم'' کی ضمیر آئی ہے تو بیت میں جمع متکلم کی ہی ضمیر ہونا چاہیئے۔ قافیے میں ایطائے خفی کو بھی ایطائے جلی کی طرح قبیح قرار دینا اور حروف اصلی کی تخفیف کو اس درجہ ناجائز بتانا کہ دیسی الفاظ میں بھی ان کی تخفیف عیب سمجھی جائے یہ میر عشقؔ کے چند مزید کارنامے ہیں۔ اُن کے مبصر کا کہنا ہے کہ اپنے اُوپر اُن قیود کے عائد کر لینے کے نتیجے میں میر عشقؔ کا کلام بے لطف ہو جاتا تو کچھ عجب نہ تھا۔ لیکن (بقول مبصر) ''باوجود ناقابل برداشت احتیاط کے بھی اُن کے کلام میں شگفتگی اور تاثیر کی کمی نہیں پائی جاتی''۔ ظاہر ہے کہ یہ محض خوش عقیدگی ہے لیکن اہم بات یہ ہے کہ اگر میر عشقؔ نے میر انیسؔ کی حقیقی تقلید کی ہوتی تو زبان کے بارے میں ان کا بھی رویہ میر انیسؔ کی طرح تخلیقی، بے تکلف اور نسبتاً بے باک ہوتا۔ لطف یہ ہے کہ میر عشقؔ کا

اسکول خود کو میر انیسؔ سے الگ سمجھتا تھا لیکن امتیاز کی بنیاد زیادہ تر اسی بات پر تھی کہ میر عشقؔ نے میر انیسؔ کے مقابلے میں بہت زیادہ قیود و بند اختراع کئے۔ ان قیود کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ مرثیہ متحجّر (Stultify) ہو کر رہ گیا۔ میر عشقؔ چونکہ اوسط سے اُوپر شاعرانہ صلاحیت کے آدمی تھے اس لئے وہ اپنے ضابطوں کو ایک حد تک سہار گئے۔ لیکن اُن کے بعد یہ بھی ممکن نہ ہو سکا۔

اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ میر عشقؔ کے بہترین مرثیے ''درحالِ زعفر جن'' کا پہلا ہی مصرع ''عروج اے مرے پروردگار دے مجھ کو'' ان کے اصول عدم تخفیف کی نفی کرتا ہے کیوں کہ ''مرے'' کی یائے مجہول دب رہی ہے۔ بالآخر میر عشقؔ نے اس کی جگہ ایک پھُسپھُسا ''عروج خالقِ لیل ونہار دے مجھ کو'' یہ مصرع مروّج کرنا چاہا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔

ارونگ بیبٹ (Irving Babbit) نے ایک بڑی گہری بات کہی تھی کہ ''یونانی ادب اپنے بہترین لمحات میں ایک طرح کی تخلیقی تقلید ہے''۔

ایلیٹ جو بیبٹ کا شاگرد تھا اُس نے اس کُلیے کی روشنی میں اپنا شہرہ آفاق نظریہ وضع کیا جو اس کے مضمون ''روایت اور انفرادی صلاحیت'' میں تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ وہ کہتا ہے ''جب ہم کسی شاعر کے ساتھ غیر جانب داری سے معاملہ کریں گے تو اکثر یہ دیکھیں گے کہ اس کے کلام کے نہ صرف بہترین بلکہ سب سے زیادہ انفرادیت آمیز حصّے شاید وہی ہوں جن میں شعرائے گزشتہ جو اس کے اجداد ہیں، اپنی لافانیت کا اظہار سب سے زیادہ جوش اور قوت سے کرتے ہیں''۔ اس سے مراد یہ ہے کہ شعرائے گزشتہ کا اثر اور اُن کی تقلید ایک صحت مند اور ضروری روایت کا حصّہ ہیں۔ اسی اعتبار سے ہم عصر شعرا کا بھی ایک دوسرے سے اسی قسم کا معاملہ ممکن ہے۔ گزشتہ اور ہم عصر دونوں طرح کی شاعری کی تقلید کرنے والے یا غیر شعوری طور پر بھی اثر قبول کرنے والے شاعر کے ساتھ کئی طرح کی مشکلیں بھی ہوتی ہیں۔ بعض نفسیاتی نقادوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اثر پذیری یا تقلید ایک طرح کی نیوراسس پیدا کرتی ہے۔ ہیرلڈ بلوم اسی قسم کا ایک نقاد ہے وہ کہتا ہے کہ شاعرانہ اثر ہمیشہ سے ایک طرح کی لعنت ہی رہا ہے، یعنی شاعر کے لئے اس نے جتنے مسائل پیدا کئے ہیں ان سے بہت کم حل کئے ہیں۔ بلوم یہاں تک کہہ گیا ہے کہ کسی بھی نظم کا وجود ہی نہیں ہے جب تک کہ اسے شعرائے گزشتہ کے اثرات کی روشنی میں نہ دیکھا جائے۔ اس لئے تنقید دراصل ان گم شدہ یا پوشیدہ

شاہراہوں کو دریافت کرنے کا عمل ہے جو ایک نظم کو دوسری سے ملاتی ہیں۔ ایک اور جگہ اس نے لکھا ہے کہ شاعرانہ اثر ایک طرح کا (Anxiety Phinoipls) ہے۔ شاعر اپنے پیش رووٴں کے احساس سے بوجھل رہتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ ان کے کارناموں کے تعلق سے اس کا اپنا کارنامہ کیا ہے۔ کیا اس کے لئے نئی بات کہنے کی جگہ بچ رہی ہے کہ نہیں؟۔ یہاں ایک پرانے عرب شاعر کا قول یاد آتا ہے کہ قدما نے ہمارے لئے میدان ہی کیا چھوڑا ہے جس میں ہم تگ وتاز کریں۔ یا محض اس وجہ سے کہ وہ اس کے پہلے ہوگئے ہیں خود اس کے فن کا سقوط ہوگیا ہے؟ انہوں نے کہاں کہاں غلطی کی، کہاں کہاں گم راہ ہوئے، کس کس طرف ان کی مساعی مشعل راہ ہیں اور کس کس طرف خطرناک؟ اس کشاکش اور بے چینی میں اکثر شعرا اپنی اصل صلاحیتوں کا خون بھی کردیتے ہیں۔ میر عشق کی مثال ایسی ہی ہے۔ اس فکر میں کہ وہ انیس کے سامنے کس طرح ٹھہر سکیں، انہوں نے شعر پر نئی نئی بندشیں عائد کردیں، متروکات کی فہرست میں اچھا خاصہ اضافہ کیا۔ طرح طرح کی خوش رنگ لیکن سخت کتابی قاعدے سے مخدوش تراکیب (مثلاً چشمِ نم، تا بہ محشر، بہ آہ وزاری وغیرہ) سے احتراز کیا۔ بیگماتی اور عامیانہ الفاظ (مثلاً بھیا) ماں جایا، چھاتی، بے کلی، بیہڑ، ندی وغیرہ) جن سے میر انیس کو عار نہ تھا میر عشق نے اپنے اُوپر ناجائز قرار دیئے۔ ہیرلڈ بلوم کا اصولِ بے چینی ہر جگہ درست ہو یا نہ ہو لیکن میر عشق کے اُوپر پوری طرح صادق آتا ہے۔ اگر وہ اس کشاکش کے اس درجہ شکار نہ ہوتے تو ممکن تھا کہ میر انیس کا اثر دیر تک قائم رہتا اور مرثیہ ومسدّس کا چراغ اتنی جلدی نہ جھلملا جاتا۔

میر عشق میں قوتِ اظہار اور قوتِ تخیّل دونوں کی کمی نہ تھی۔ وہ میر انیس کی طرح استعاراتی اور پیکری ذہن تو نہ رکھتے تھے لیکن جزئی صورتِ حال کا احاطہ وہ محض بیانیہ کے بل بوتے پر کرلیتے تھے۔ یہ قوت بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی۔ بہرحال اس بات کے باوجود کہ حالی نے میر انیس کے مراثی کو استحسان کی نظر سے دیکھا اور ان کے مطالعے کو سودمند بتایا اور اس بات کے بھی باوصف کہ شبلی کی ''موازنہ انیس و دبیر'' اردو کی مشہور ترین تنقیدی کتابوں میں سے ایک ہے اور اس میں پلّہ انیس کی طرف یقیناً جھکا ہوا ہے، میر انیس کا اثر ہماری شاعری میں خال خال جگہ نظر آتا ہے اور موازنے کے

بعد، جسے لکھے ہوئے آج کوئی ستر برس ہو رہے ہیں میر انیسؔ پر ایک بھی قابلِ ذکر کتاب نہ لکھی گئی۔

میر انیسؔ کے کلام کی تقلید کم ہونے کی وجہ سے (یا اس کے باوجود) کم تر درجے کے شعرا ان کی نقل کرتے رہے لیکن اس سلسلے میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ اقبالؔ، جوشؔ یا ترقی پسند شعرا کے کلام میں زورِ بیان، بلندی آہنگ، زور شور کی مثالوں کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کہ یہ میر انیسؔ کے اثر کی دلیل ہیں دونوں کے ساتھ زیادتی ہے۔ اقبالؔ کی بلند آہنگی اور طرح کی ہے، اس میں معنی کو دخل ہے اور جہاں معنی کو دخل نہیں (یعنی شکوہ اور جواب شکوہ) وہاں اگرچہ مسدس کی ہیئت موجود ہے لیکن بلند آہنگی ہی نہیں ہے "شکوہ" کا آغاز ہی بہت انفعالی لہجے میں ہے:-

کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں　　　فکرِ فردا نہ کروں محوِ غمِ دوش رہوں

اس حد تک تو ایک ولولہ نظر آتا ہے جس میں نونیہ آوازوں کی جھنکار ہے (حالانکہ یہ جھنکار بھی قافیے کی شین سے متاثر ہے۔) لیکن اگلے شعر میں شکوے کا جواز پیدا کرنے کی کوشش انفعالیت کی دلیل فراہم کرتی ہے:-

نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں　　　ہم نوا میں بھی کوئی گُل ہوں کہ خاموش رہوں

بیت تک پہنچتے پہنچتے انفعال اور اعتذار کا رنگ گہرا ہو جاتا ہے، یہاں تک الفاظ بھی اسی مفہوم کے آگئے ہیں:-

جرأت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو　　　شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

خاکم بدہن نے جرأت آموزی اور تابِ سخن کے دعوے کو خاک میں ملا دیا۔ دوسرے مسدسات، مثلاً آفتاب (اور یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ اقبالؔ کے اکثر مسدسات اوائل مشق کی یادگار ہیں، جب انہوں نے اپنا مخصوص پُرجلال آہنگ پوری طرح دریافت نہیں کیا تھا اور ان کی شاعری میں غیر استعاراتی تعمیم کی بھرمار تھی)، میں میر انیسؔ کی طرح کے حرکی پیکروں اور تخلیقی رعایتِ لفظی کا نام و نشان بھی نہیں ہے۔ پہلا بند یوں ہے:-

شورشِ مے خانۂ انساں سے بالاتر ہے تو　　　زینتِ بزمِ فلک ہو جس سے وہ ساغر ہے تو
ہو دُرِ گوشِ عروسِ صبح وہ گوہر ہے تو　　　جس پہ سیمائے افق نازاں ہو وہ زیور ہے تو

صفحۂ ایام سے داغِ مدارِ شب مٹا
آسماں سے نقشِ باطل کی طرح کوکب مٹا

بیت میں معنی خیز استعارہ سر نکالتا ہوا دکھائی دیتا ہے لیکن اُوپر کے مصرعے صرف روایتی دھوم دھام والے عمومی فرضی تشبیہی بیانات پر مبنی ہیں اور جوش کی یاد دلاتے ہیں۔ اس طرح دیکھئے تو اقبال کی منزل اوّل اور جوش کی معراج یک جا نظر آتی ہیں۔ جوش صاحب کی آوازِ شاعر سنئے۔ نظم ۱۹۳۳ء کی ہے جب وہ اپنے شباب پر تھے:-

شہد میری گفتگو ہے سانس ہے میری گلاب　　نُطق سے میرے نمایاں ہے تخیّل کا شباب
پیکرِ خاکی ہوں لیکن وہ طلسمِ آب و تاب　　جس کے ہر ذرّے میں گردش کر رہا ہے آفتاب

ڈالتا ہوں پرتوِ گلشن خس و خاشاک پر
عرش کی مہریں لگاتا ہوں جبینِ خاک پر

صبح کو غنچوں میں در آتی ہے جب پہلی کرن　　مجھ سے شبنم کی زباں ہوتی ہے سرگرمِ سخن
چاندنی میں جب جھلک اٹھتا ہے برگِ یاسمن　　عشق ہوتا ہے مری محفل میں صدرِ انجمن

زمزمے سنتا ہوں شب کی محفلِ خاموش میں
حُسن آ جاتا ہے تاروں سے مرے آغوش میں

اس لفظی تام جھام میں معنی تو کیا مفہوم کا بھی پتہ نہیں۔ استعارہ اور اس کے لوازمات گھن گرج کی فضا میں دم توڑتے نظر آتے ہیں۔ مبالغہ زور پر ہے لیکن مجرد مبالغہ شاعری کا صرف شائبہ رکھتا ہے۔ مبالغے میں استعارے کا جوہر ضرور ہوتا ہے لیکن جب تک استعارہ واضح نہ ہو یا پھر تعلیل کی کیفیت نہ ہو، مبالغہ پست درجے کی شاعری کو خلق کرتا ہے۔ مبالغہ کا حُسن اسی وقت نمایاں ہوتا ہے جب اسے مقصد کے لئے استعمال کیا جائے اور اس کا بہترین مقصد رعایت لفظی یا حُسنِ تعلیل ہے اس کی مثال دیکھنا ہو تو میرؔ کے قصائد میں بے لطف بے مقصد مبالغہ اور سوداؔ یا غالبؔ اور ذوقؔ کے یہاں با مقصد (یعنی رعایتِ لفظی اور حسنِ تعلیل کا حامل) مبالغہ ملاحظہ ہو۔ میرؔ کہتے ہیں:-

لقمۂ ظلم نہیں پچتا عدالت میں تری　　بازنگلی ہوئی چڑیا کے تئیں دے ہے اُگل

سوداؔ کو اسی زمین میں سنیئے:-

جوش روئیدگی خاک سے کچھ دور نہیں　　شاخ میں گاوِ زمیں کی بھی جو پھوٹے کونپل

خاک اور زمین اور شاخ کی رعایت اور روئیدگی کے جوش کی دلیل کے لئے گاوِ زمین کے

سینگ سے کونپل پھوٹنے کا ذکر اس سیاق وسباق میں رکھئے کہ برسات میں بعض جانوروں کے سینگ سبزی مائل ہوجاتے ہیں۔ بہرحال، جوشؔ اور اقبالؔ کے مسدسات کو انیسؔ سے کوئی علاقہ نہیں۔ میر انیسؔ کے فخریہ اور رجزیہ بند اگرچہ مبالغے اور لفظی دھوم دھام سے بھرے ہوئے ہیں لیکن ان کے یہاں حُسن تعلیل، رعایتِ لفظی یا کوئی معنوی پہلو یا کم سے کم حرکی پیکر مبالغے میں اس طرح سموئے ہوتے ہیں کہ بہترین شاعری کی شان پیدا ہوجاتی ہے:۔

یہ گرزِ میل راہِ سفر ہے ترے لئے — دستِ اجل ترا یہ تبر ہے ترے لئے
برچھی کا پھل قضا کا ثمر ہے ترے لئے — کالی بلا تری یہ سپر ہے ترے لئے
ضربت نہ چل سکے گی جو ماریں گے ہم تجھے
بے آبرو کرے گی یہ تیغِ دو دم تجھے

یہ میر انیسؔ کے بہترین کلام کا نمونہ نہیں ہے لیکن نمائندہ ضرور ہے۔ کیونکہ اس میں ان کی خوبیاں اور کمزوریاں دونوں نمایاں ہیں۔ رعایت لفظی، تجنیس، استعارہ اور کنایہ سب موجود ہیں۔ انہیں اجزا کی وجہ سے معمولی تعلّی میں اصلی شاعری کا رنگ آ گیا ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس میں مبالغہ بہت زیادہ نہیں ہے، لہٰذا ایک ایسی مثال دیکھئے جس میں مبالغہ بہت نمایاں ہے:۔

تھا فوج قاہرہ میں تلاطم کہ الحذر — تھیں موج کی طرح سب ادھر کی صفیں اُدھر
چکّر میں تھی سپاہ کہ گردش میں تھا بھنور — پانی میں تھے نہنگ ابھرتے نہ تھے مگر
فوجیں فقط نہ بھاگ گئی تھیں منھ موڑ موڑ کے
دریا بھی ہٹ گیا تھا کنارے کو چھوڑ کے

پہلے مصرعے میں لفظِ تلاطم کے ذریعے پانی اور لہروں کا تلازمہ قائم کیا گیا ہے اور بقیہ تمام مصرعوں میں پیکر، تعلیل، تشبیہ، رعایتِ لفظی سب اسی رعایت سے موجود ہے۔ رعایتِ لفظی کا عالم یہ ہے کہ چکّر اور بھنور، نہنگ اور مگر کی واضح رعایتوں کے علاوہ تلاطم، موج، بھنور، گردش الحذر اور بھاگنا، موج اور ہٹنا کی مضمر رعایتیں بھی آ گئی ہیں۔ آخری مصرع تعلیل کے مثالی حُسن کا مالک ہے۔ یہ وہ خوبیاں ہیں جن کی بنا پر میر انیسؔ کا کلام اپنا جواب آپ ہی بن کر رہ گیا ہے۔ ان کے نقالوں میں سے کوئی بھی حتیٰ کہ چکبستؔ بھی، ان نکات سے آگاہ نہ تھا۔ سردار یا جوشؔ یا وحید اخترؔ کے مسدسات کو پڑھ کر قصیدے یا عام مرثیے کا گمان ہوتا ہے لیکن میر انیسؔ کا دھوکا نہیں ہوسکتا۔ مندرجہ

ذیل مثالیں دیکھئے۔

قاسم میں آن بان امامِ حسن کی ہے   قوت کلائی میں شہِ خیبر شکن کی ہے
چہرے پہ آب تاب رسولِ زمن کی ہے   زلفوں میں بھری ہوئی مشکِ ختن کی ہے
عارض کی بوسے لیتا ہے نور آفتاب کا
چہرہ نہیں ہے پھول کھلا ہے گلاب کا   (سردار جعفری)

ہم رات کو دیں حکم تو سورج نکل آئے   ہم ماریں جو ٹھوکر ابھی دریا اُبل آئے
ہم تیغ اٹھالیں تو تمہاری اجل آئے   ہم جب بھی کہیں نظمِ جہاں میں خلل آئے
مختار ارادے کے ہیں مجبور نہیں ہم
تم کیا ہو خدائی سے بھی معذور نہیں ہم   (وحید اختر)

ان اشعار سے واضح ہے کہ ان میں جوشؔ کا سا رنگ تو ہے لیکن خود جوشؔ کا رنگ جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں، میر انیسؔ کا رنگ نہیں ہے۔ میر انیسؔ کا سب سے بڑا وصف مناسبت الفاظ ہے۔ اس معنی میں کہ ان کے تقریباً ہر بند میں تمام اہم الفاظ ایک طرح کا معنوی ربط رکھتے ہیں۔ میر عشقؔ کے یہاں یہ صفت بہت محدود پیمانے میں نظر آتی ہے:-

(۱)

ہوا سے دن میں درختوں کا جھومنا ہر بار   چمن چمن سرِ تسلیم سیدِ ابرار
چھپا ہوا فلکِ پیر اس قدر پردار   جھکے ہوئے پئے تعظیم سوئے شہ کہسار
بلند سبزۂ ساحل، چڑھا ہوا دریا
پئے زیارتِ مولا بڑھا ہوا دریا

(۲)

سروہی کا پھل شانِ دلبر سے نکلا   نیامِ نفیس و معطّر سے نکلا
بس آراستہ اپنے جوہر سے نکلا   نگارِ مرصع بدن گھر سے نکلا
خزاں کا بندھا رنگ اربابِ شر میں
نئی شاخ نکلی نہالِ ظفر میں

پھر یہ سوال اپنی جگہ پر قائم رہ جاتا ہے کہ میر انیسؔ کا اثر اُردو شاعری پر کیا پڑا؟ میر عشقؔ اگر اپنی تنقیدی صلاحیتوں کو غیر ضروری قید و بند اختراع کرنے میں ضائع نہ کر دیتے تو وہ انیسؔ کی روایت قائم کرنے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔ الفاظ کا شکوہ اور بیانیئے کا زور، یہ دو صفات میر انیسؔ کے ذریعے اُردو شاعری میں خود قائم ہوئیں، لیکن یہ نکتہ اس سے زیادہ اہم ہے کہ یہ صفات خود میر انیسؔ نے قصیدے سے حاصل کیں۔ فرق یہ ہے کہ میر انیسؔ کا زور و شور غزل کی بلند آہنگی سے مشابہ ہے اور غالبؔ کی یاد دلاتا ہے۔ ایک طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ قصیدے کی بہترین صفات جو اس صنف کے زوال کے ساتھ ختم ہو جاتیں۔ میر انیسؔ کی بنا پر ان کو تسلسل مل گیا۔

میں نے ابھی کہا ہے کہ میر انیسؔ کی بلند آہنگی معنی سے مربوط ہے۔ اس لئے کہ استعارہ ان کا سب سے زبردست طریقِ کار ہے یہی وجہ ہے کہ قصیدے کے حسن کی روایت ان کے یہاں غیر معمولی طور پر زندہ نظر آتی ہے لیکن پھر بھی وہ غزل سے بہت دُور نہیں معلوم ہوتے۔ غیر شعوری طور پر سہی، لیکن میر انیسؔ، طالبؔ آملی کے بیان کردہ اس نکتے سے بہ خوبی واقف تھے۔

بدیہہ شاہدِ صدق است بے مطائبہ طالب
کہ صاحبِ سخن از استعارہ چارہ نہ دارد
سخن کہ نیست درا واستعارہ نیست ملاحت
نمک نہ دارد شعرے کہ استعارہ نہ دارد

اسی لئے میں کہتا ہوں کہ میر انیسؔ کا اثر اردو شاعری پر براہِ راست نہیں پڑا لیکن استعارہ کی اہمیت کا احساس اور مناسبتِ لفظ کا حُسن، یہ نکات اُردو شعرا نے غالبؔ کے علاوہ میر انیسؔ سے بھی سیکھے۔ یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔

میر انیسؔ:

تیسرا قافیہ تلاش کیجئے

نازک لب اس صفت کے دہن اس طریق کا
خاتم پہ جڑ دیا ہے نگینہ عقیق کا

کونین میں حواس بجا تھے نہ ایک کے
گاوِ زمیں سمٹی تھی گھٹنوں کو ٹیک کے

آمد ہوئی تھی غش کی سرِ پاک جھک گیا
واحسرتا کہ ہاتھ بھی لڑنے سے رُک گیا

اک عشق ہے ہونٹوں سے حلاوت طلبوں کو
گر دیکھے تو چاٹا کرے شیریں بھی لبوں کو

لازم ہے سدا پاس ضعیفوں کا قوی کو
دیکھا ہے کبھی شیر کی آہستہ روی کو

بے سر تھا ازل سے تھی خطا اصل میں جس کی
مارا اسے دیندار نہ تھا نسل میں جس کی

تن جلتے ہیں پھر کس سے جو برق اس میں نہیں ہے
سر جسم سے اُڑ جائیں گے فرق اس میں نہیں ہے

حق جس کی طرف ہے وہ زبردست رہا ہے
سچ ہے کہ بڑے بول کا سر پست رہا ہے

مرّیخ بھی دل باختہ تھا سامنے اس کے
گردوں سپر انداختہ تھا سامنے اس کے

سینہ نہیں سفینۂ طوفانِ نوح ہے
ایماں کی سجدہ گاہ ہے قرآں کی روح ہے

پھولوں کی بوئے خوش سے ہیں کپڑے لبے ہوئے
امت کی مغفرت پہ کمر ہیں کسے ہوئے

یہ جس شقی کے سینے سے گزرا وہ فوت ہے
اس کی سنانِ تیز سرِ انگشتِ موت ہے

یوں سر برس گئے یہ روانی تھی باڑھ میں
پڑتا ہے ڈونگرا کبھی جیسے اساڑھ میں

ہر نعلِ پا کا حسن یہ تھا اس جلوس میں
آئینہ جس طرح سے ہو دستِ عروس میں

سیّد افضال حسین نقوی

اُردو کا ایک منفرد مرثیہ

ہر فن پارے کے صحیح استحسان کے لیے ناقدین نے کچھ پیمانے وضع کیے ہیں جن پر پورا اتر کر ہم کسی فن کا صحیح ادراک اور استحسان کر سکتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ مرثیہ کا صحیح استحسان کیا ہے؟ یہ صرف مثنوی نہیں کہ واقعات کی ایک لڑی ہو، یہ صرف قصیدہ نہیں جس میں بلند تمہید کے ناتے سے ممدوح کی مدح کی گئی ہو، یہ صرف غزل نہیں جس میں رومانی کیفیات کا اظہار ہو، یہ محض رزمیہ نہیں کہ صرف میدانِ جنگ کی صحیح تصویر کشی پر اختتام پذیر ہو، یہ صرف نوحہ و بین نہیں کہ کسی کے مرنے پر تعزیۃً یا عقیدۃً یا محض دلی جذبات کے اظہار کی حد تک کیا گیا ہو۔ مرثیہ ان تمام اصنافِ سخن کا صرف و محض ایک رُخ نہیں بلکہ اس میں تمام اصنافِ سخن اپنی حسن آفرینیوں کے ساتھ شیر و شکر ہو گئے ہیں۔ یہی اس صنف کا کمال ہے۔ تو اب اندازہ فرمائیے کہ اس صنف کے انتقاد و استحسان کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے۔ زبان و بیان کے اسلوب مسلّم، لیکن شاید سب سے بنیادی چیز جو اس صنف کے استحسان کے لیے مفید ہو سکتی ہے (چونکہ اصولی طور پر یہ صنف بیانیہ شاعری کے ذیل میں آتی ہے) اس کا ابلاغ اور مصوّرانہ کمال ہے۔ اگر اس کسوٹی پر یہ صنف پوری اترتی ہے تو باقی ساری باتیں ثانوی رہ جاتی ہیں اور یقیناً ابلاغ، تاثر اور کمالِ مصوری کے بعد آتی ہیں۔

جب ہم اس منزل تک پہنچ جاتے ہیں تو ہمیں دیکھنا پڑتا ہے کہ مرثیہ کی صنف میں جو بیانیہ شاعری کا بہترین نمونہ کہی جا سکتی ہے، کون سا ایسا شاہ کار ہے جسے بصری مرقعوں کے ابلاغ اور احساسِ تاثر کے کمال کا مظہر کہا جا سکے تو ہم دیکھیں گے کہ میر ببر علی انیسؔ جنھیں مرثیہ نگاری میں خدائے سخن کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا اپنے سیکڑوں مرثیوں کے انبار میں سے صرف ایک مرثیہ کے

مقطع میں اپنے فن پارے کے متعلق ایک بہت بڑا دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ وہ مرثیہ ہے جسے سخن سنج موتیوں میں تولیں گے۔ اس مشہور مرثیے کا مطلع ہے۔

ہوتے ہیں بہت رنج مسافر کو سفر میں

یہ بات حقیقت کے منافی ہوگی اگر اس امر کا اعتراف نہ کرلیا جائے کہ اس مرثیہ کے متعلق سب سے پہلے نشاندہی ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے کرائی تھی۔ موصوف کی دقّتِ نظر کا ممنون ہونا چاہیے۔ اس تمہید کے بعد میں اس نادر مرثیہ کے متعلق بتفصیل عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ آیا انیسؔ نے کیوں اس مرثیے کو اپنے فن کی پرکھ کے لئے میزان مختص کیا۔ یہ ماننا پڑے گا کہ انیسؔ ایک بہترین فن کار کے ساتھ ساتھ اپنے فن کی پرکھ کا نہایت اعلیٰ دَرک رکھتے تھے۔

اڈمنڈ اسپنسر انگریزی شاعری کا بے مثل اور بے پناہ شاعر ہے جسے عرفِ عام میں شاعروں کا شاعر کہا جاتا ہے۔ اسپنسر کی مصورانہ قدرت، منظر کشی اور اظہارِ مضمون کے اسلوب اور طریقے اتنے بے پناہ ہیں کہ واقعات کی تصویریں آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہیں۔ لطف یہ ہے کہ انسانی اوصاف اور طبائع کی بے کم وکاست تصویریں جس میں صفت مجسّم ہوکر سامنے آجائے دراصل اسپنسر کے فن کا کمال ہے چنانچہ اڈمنڈ اسپنسر کی فیئری کوئن (Faery Queene) اس قسم کے بیانیہ مرقعوں سے بھری پڑی ہے۔

میر انیسؔ نے جس فضا اور جن روایاتِ شاعری میں جکڑ بندرہ کر شاعری کی تھی یا کررہے تھے اس میں ظاہر ہے سارے التزاماتِ شاعری ضروری تھے، مثلاً چہرہ، رزم، بزم، تلوار اور گھوڑے کی تعریف، صبح کی منظر کشی، نوحہ وبَین وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے ان روایات میں رہ کر تصویر گری اور مرقع نگاری کا بھرپور اظہار مشکل تھا۔ انیسؔ کماحقّہ، یہ بات سمجھتے تھے کہ خلّاقِ عالم نے انھیں جس فن کی تکمیل کے لیے پیدا کیا تھا وہ دراصل الفاظ میں مصوّری کا کمال تھا اور جو بیانیہ شاعری کی روح ہے۔ یقیناً وہی تصویر، دل آویز، جاذبِ نظر اور حسین ہوسکتی ہے جس کے مدّعا (Object) کو ہم دیکھ سکیں یا جس کا ہم ذہنی اور وجدانی طور پر احساس کرسکیں۔ (جس کا کوئی ہیولیٰ ہو، جس میں حرکت ہو، سکون ہو، اضطرار ہو، حسن ہو، تجمّل ہو، شان ہو، ہیبت ہو، اکراہ ہو، تظلّم ہو، ترحم ہو، ہمدردی ہو، لگاوٹ ہو) اگر یہ چیزیں مادّی یا احساسی طور سے موجود نہیں تو اس کی تصویر کشی نہیں ہوسکتی۔ اسی اعتبار سے واقعات کی ایسی لڑیاں جن کی الفاظ بدرجۂ اتم عکاسی کرسکتے ہوں، انیسؔ نے اپنے محولہ بالا

مرثیہ کے لیے چن لی تھیں۔

اس مرثیہ میں دو خصوصیات نسبتاً زیادہ نمایاں ہیں۔ اوّل تو انیسؔ کی مصورانہ صلاحیت کا کمال ہے اور دوسرے بچوں کی نفسیات کا برمحل اور بے کم و کاست بیان ہے۔ اس مرثیے کا سن تصنیف ۱۸۵۶ء ہوسکتا ہے اس لیے کہ مرثیہ ''مراثی انیسؔ'' مرتبہ نظم طباطبائی کی دوسری جلد کا آخری مرثیہ ہے۔ اس جلد کے مرثیوں کا انتہائی زمانہ ۱۸۵۶ء کا ہے اور اس کے بعد کا مرثیہ یعنی طباطبائی کی پہلی جلد کا پہلا مرثیہ ہے جس کا زمانہ ۱۸۵۶ء کے بعد سے شروع ہوکر میر انیسؔ کے انتقال تک کے زمانے پر محیط ہے۔ اغلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مرثیہ ۱۸۵۶ء کے طوفانی دور میں تصنیف کیا گیا۔ اس مرثیے کی فنی پختگی اور بلندی میں خارجی حالات اور واقعات کا بھی دخل معلوم ہوتا ہے کہ مارچ ۱۸۵۶ء میں واجد علی شاہ اخترؔ کو تختِ اودھ سے محروم کیا گیا اور اس کے بعد ہی سے ملک بغاوت کی لپیٹ میں آ گیا۔ ۱۸۵۶ء سے لے کر ۱۸۵۷ء تک کا زمانہ شمالی ہند کے لیے مسلسل بغاوت، ہنگامہ آرائی اور قتل و غارت گری میں گزرا۔ سارا اودھ اور خصوصاً لکھنؤ اس دار و گیر کے مرکزی نقطے کی حیثیت رکھتا تھا۔ انیسؔ جیسے ذکی الحس شاعر کے لیے ایسے ہنگامی دور میں انتزاعِ سلطنتِ اودھ کے بعد غربت، پریشانی، افراتفری، ابتلا، قتل و غارت گری اور قید و بند کی صعوبات کے حقیقی یا تصوراتی مناظر ضرور ذہن پر چھوٹ ڈالتے ہوں گے اور اس قسم کے مناظر کے نقشے آنکھوں کے سامنے پھر جاتے ہوں گے۔

یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ انیسؔ نے اس ہنگامہ آرائی کے دوران کہاں وقت گزارا۔ بقول مؤلف ''یادگارِ انیسؔ'' آپ کا یہ زمانہ کاکوری میں گزرا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ بہرصورت ان کا یہ زمانہ لکھنؤ سے باہر ہی گزرا۔ خارجی حالات فن کار کے لئے بسا اوقات اس کے فن کی پختگی میں معاونت کا کام دیتے ہیں۔ شاید یہی ماجرا میر انیسؔ کے ساتھ اس مرثیے کی حد تک ہوا۔ خارجی حالات نے انیسؔ جیسے فن کار کے صحیح فن کو ابھارا اور یہی وجہ ہے کہ میر انیسؔ نے اس مرثیے میں مرثیے کی تمام روایات کے بندھنوں کو توڑ کر رزم، بزم، چہرہ، آمد، صبح کی منظر کشی جیسی روایات سے ہٹ کر ایسا فن پارہ تخلیق کیا جس میں واقعات کے مرقعوں کا ایک حسین تسلسل اور تواتر ہے جو اس مرثیے کو ایک کامیاب ترین فلم بنا دیتا ہے۔

اس کے علاوہ انیسؔ کو اس زمانے میں شاید بچوں کی نفسیات کے مطالعے کا بھی کچھ زیادہ موقع ملا

۔۱۸۵۶ء میں آپ کے چہیتے نواسے پیارے میاں رشید کی عمر دس سال ہوگی۔آپ کے بیٹے میر نفیس کے بھی چھوٹی عمر کے بچے ہو سکتے ہیں۔کیونکہ میر نفیس کی اس وقت عمر تیس سال سے زیادہ ہوگی۔آپ کے بھائیوں اور دیگر اعزا کی اولادیں بھی چھوٹی عمر کی ہوسکتی ہیں۔ان میں کچھ بچوں کی عمریں دس بارہ سال کی ہوسکتی ہیں۔ممکن ہے ان میں ایک آدھ سال کا فرق بھی ہو۔ظاہر ہے انیس جیسا ذکی الحس اور بے پناہ صلاحیتوں والا شاعر اپنے نواسوں، پوتوں یا اپنے اعزا کے بچوں کی حرکات وسکنات اور نفسیات کے مطالعے میں کس حد تک نہ مستعد، منہمک اور سنجیدہ ہوگا، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ میر انیس مذکورہ بالا مرثیے میں جہاں تک بچوں کی نفسیات کا تعلق ہے نہایت کامل اور بھرپور نظر آتے ہیں۔بچوں کی ہر ایک حالت کی صحیح عکس کشی میں اپنے فن کی انتہائی بلندیوں پر نظر آتے ہیں۔جہاں آپ نے بچوں کا سراپا پیش کیا ہے ان میں انیس کے عہد کے شریف زادوں اور خودان کے بچوں کے شمائل، نشست و برخاست، آدابِ گفتگو کی جھلکیاں نظر آسکتی ہیں۔

اس مرثیے کی ابتدا دیگر مرثیوں کے چہروں سے ہٹ کر کی گئی ہے۔اس میں ایک مسافر کی صعوبات و آلام کا تذکرہ ہے جو کسی بھی مسافر کو پیش آسکتی ہیں۔انسانی ذہن کو مسافر کی پریشانی اور واماندگی کی تصویریں دکھا کر اور ذوقِ تجسس کو بیدار کر کے انیس قاری کے احساسی دریچوں کو وا کرتے ہیں۔

مسافرت کی عکاسی میں شاہِ اودھ واجد علی شاہ کی غربت اور وطن آوارگی کی ذہنی بازگشت بھی ہوسکتی ہے۔ظاہر ہے کہ اس انقلاب سے ہر ذہن متاثر ہوا ہوگا چہ جائیکہ انیس جیسی قدرتوں اور صلاحیتوں والا شاعر۔غرض اس تمہید کے بعد انیس نفسِ مضمون یعنی حضرت مسلم کے بچوں کی غریب الوطنی اور وطن آوارگی کا منظر پیش کرتے ہیں۔ابتدائی بند ملاحظہ فرمائیے:۔

ہوتے ہیں بہت رنج مسافر کو سفر میں — راحت نہیں ملتی کوئی دم آٹھ پہر میں
سو شغل ہوں پر دھیاں لگا رہتا ہے گھر میں — پھرتی ہے سدا شکل عزیزوں کی نظر میں
سنگِ غمِ فرقت دلِ نازک پر گراں ہے
اندوہِ غریب الوطنی کاہشِ جاں ہے

گو راہ میں ہمراہ بھی ہو راحلہ و زاد — جاتی نہیں افسردگیٔ خاطرِ ناشاد
جب عالمِ تنہائی میں آتا ہے وطن یاد — ہر گام پر دل مثلِ جرس کرتا ہے فریاد

اک آن غم و رنج سے فرصت نہیں ملتی
منزل پہ بھی آرام کی صورت نہیں ملتی
دکھ دیتے ہیں اک ایک قدم پاؤں کے چھالے　　منزل پہ پہنچنے کے بھی پڑ جاتے ہیں لالے
ہاتھوں سے اگر بیٹھ کے کانٹوں کو نکالے　　ڈر ہے کہ نہ بڑھ جائیں کہیں قافلے والے
واماندوں کے لینے کو بھی آتا نہیں کوئی
تھک کر بھی جو بیٹھے تو اٹھاتا نہیں کوئی

اس مرثیے کے پہلے چار بند ایک عام مسافر کی واماندگی اور پریشانی کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ ابتداء ہی سے انیسؔ ایسا منظر پیش کرتے ہیں جو فطری ہونے کے ساتھ ساتھ پُر اثر اور دل آویز بھی ہے۔ اس عام بیان کے بعد فرزندانِ مسلم کی مسافرت اور غربت کا نہایت پُر درد اور پُر تاثیر بیان ہے۔ مرثیے کا ہر بند ایک مکمل مُرقع ہے۔ یہ بیان بعد کے چودہ بند پر محیط ہے۔ بیان میں بڑی سلاست اور روانی ہے۔ ہر بند ایک واضح منظر کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ بچّے آپس میں باتیں کرتے ہیں کہ وہ کس قدر بدنصیب ہیں کہ اپنے مقتول باپ کا مزار بھی نہ دیکھ سکے، فاتحہ خوانی بھی نہ کر سکے، باپ کی تجہیز و تکفین میں شرکت نہ کر سکے، باپ کا سوئم تک نہ کر سکے۔ اس امر کے اعادہ کے لئے اس مرثیہ کے دو بند ملاحظہ کیجئے۔ بچّوں کی ذہنی کیفیت کی مجسّم تصویریں ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

ہم سا بھی زمانے میں نہ ہوگا کوئی مجبور　　تیجا تو کریں باپ کا اتنا نہیں مقدور
وارد ہیں وہاں رحم کا جس جا نہیں دستور　　ماں دور، پدر دور، چچا دور، وطن دور
کس سے کہیں چھوٹے بھی ہیں اور رنج بڑے ہیں
بابا کے تو مرنے سے تباہی میں پڑے ہیں

ایک ایک لعیں تو وہیں دشمن ہے ہمارا　　اک دوست تھا بانی سو وہ دنیا سے سدھارا
بیٹھیں کہیں چھپ کر نہیں اتنا بھی سہارا　　غربت میں ہمیں باپ کے مرجانے نے مارا
اک دم میں یقیں ہے کہ تہِ تیغ یہ سر ہیں
جب دوست نہ بابا کا بچا ہم تو پسر ہیں

آخری بند کی بلاغت اور بچّوں کی زبان کی ادائیگی بے مثل ہے۔

حضرت مسلم کے بچّے بے یار و مددگار باپ کے قتل ہوجانے کے بعد مارے مارے پھر رہے

ہیں۔ شہر میں منادی ندا دے رہا ہے کہ مسلم کے بیٹے لا پتہ ہیں۔ کوئی شخص انھیں اپنے گھر میں پناہ نہ دے انھیں معصوم سمجھ کر ان پر رحم نہ کھائے اور اگر کسی نے ایسا کیا تو اسے اپنے جان و مال اور عزت سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ منادی کی آواز سن کر پورے شہر کو سکتہ ہے۔ دشمنانِ علی خوش ہو رہے ہیں اور دوستدارِ علی مغموم و محزون ہیں۔ محبانِ علی کی خواتین (ظاہر ہے عورتیں فی نفسہٖ گداز دل ہوتی ہیں) منھ ڈھانپ ڈھانپ کر رو رہی ہیں اور کہتی ہیں کہ کاش وہ بچے انھیں مل جاتے اور وہ انھیں اپنے کلیجوں میں چھپا لیتیں۔ اس کیفیت کو انھیں کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے اور منظر کشی کی داد دیجئے۔ فرماتے ہیں۔

کہتی تھی کوئی کیا کریں کیوں کر انھیں پائیں جاسوسوں کا خطرہ ہے کہاں ڈھونڈنے جائیں
جلادوں سے چھپ کر وہ اگر یاں چلے آئیں ہم دل کی طرح ان کو کلیجوں میں چھپائیں
آقا ہیں وہ اس کے جو غلامِ شہِ دیں ہے
ہم لونڈیاں حاضر ہیں جو ماں سر پہ نہیں ہے

پھر انیسؔ فرزندانِ مسلم کا شمائل و سراپا بیان کرتے ہیں اور سچ پوچھیے تو دل نکال کر رکھ دیتے ہیں۔ اس بیان میں اس منادی کی صدا کا سا انداز ہے لیکن اس میں تو ایسا سحر سمویا ہوا ہے جسے قاری خود محسوس کر سکتا ہے۔ اس میں فطرت کی ایسی عکاسی ہے جو دیدنی ہے فرماتے ہیں:۔

دو طفل حسیں بھاگے ہیں کل قاضی کے گھر سے کر لیجو گرفتار جو آ نکلیں ادھر سے
خورشید سے ماتھے ہیں تو چہرے ہیں قمر سے چھوٹے سے عمامے ہیں لپیٹے ہوئے سر سے
گوندھی ہوئی زلفیں بسرِ دوش پڑی ہیں
آنکھیں کہیں آہو کی بھی آنکھوں سے بڑی ہیں

اس سلسلہ میں درج ذیل بند ایک مکمل مرقع ہے۔ فرماتے ہیں:۔

پیشانیاں دونوں کی ہیں جو ماہِ منوّر سجدوں کے چمکتے ہیں نشاں صورتِ اختر
تعویذوں کی دو ہیکلیں ہیں سینوں کے اوپر ملتے ہیں ستاروں کی طرح کانوں کے گوہر
بھاگے ہیں بُرا وقت جو دونوں پہ پڑا ہے
اک عمر میں چھوٹا ہے کچھ اور ایک بڑا ہے

شمائل نگاری میں ہم اودھ کے شریف زادوں کی تہذیب و معاشرت کا نقشہ دیکھ سکتے ہیں۔

فرزندانِ مسلم کے بیان میں یہ معاشرتی پیوند تاثر کو دو چند کر دیتا ہے۔

منادی بار بار ندا دے رہا ہے۔ بچے حیران اور پریشان چھپتے چھپاتے پھر رہے ہیں لیکن یہ وطن آوارہ بچے تابہ کے جاتے آخر شاہی کارندوں نے انھیں پکڑ ہی لیا۔ کشاں کشاں امیرِ شہر کے سامنے لے جانے لگے۔ اس کیفیت کو میر انیسؔ کے لفظوں میں ملاحظہ فرمایئے جس میں بچوں کی حالت، ان کی نفسیات اور عام شہر کی حالت کا بخوبی انداز ہو جاتا ہے فرماتے ہیں:۔

بازار میں بے تاب تھے سب دیکھنے والے جاتے تھے جو روتے ہوئے وہ گیسوؤں والے
تکتے تھے ہر اک کو کہ ہمیں کوئی چھڑا لے جلاّدوں میں معصوموں کے تھے جان کے لالے

حال اپنا اشارے سے جتاتے تھے کسی کو
رسّی بندھے ہاتھ اپنے دکھاتے تھے کسی کو

بیت کا حسن دیدنی ہے اور اہل دل ہی اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

غرض یہ بچے امیرِ شہر کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔ وہ ملعون کہتا ہے کہ بچو بتاؤ اب تمھیں بھاگنے کی کیا سزا دی جائے۔ بچوں کا جواب متقضائے حال ہے اور ان کے سن و سال کی نفسیات کا اس قدر عکاس ہے جس کے بیان کے لیے مناسب الفاظ نہیں ملتے۔ بہر صورت میر انیسؔ کے الفاظ میں فرزندانِ مسلم کا جواب ملاحظہ فرمایئے:۔

اس بھاگنے کی اب کہو کیا تم کو سزا دوں معصوموں سے یوں کہنے لگا حاکمِ ملعون
تھرّا کے یہ کہنے لگے وہ بے کس و محزوں صدمے سے یتیموں کے ہوا حال دگرگوں

ہاں قتل ہی کرنے کے سزا وار ہیں ہم بھی
بابا تھے گنہگار، گنہ گار ہیں ہم بھی

اس میں کوئی شک نہیں کہ بیت اپنے اسلوب بیان کے لحاظ سے بے نظیر ہے۔ بھلا بچے اس کے علاوہ کہہ بھی کیا سکتے تھے کہ ہاں بابا بھی گنہ گار تھے اور ہم بھی گنہ گار ہیں۔ انیسؔ کا یہ اسلوب نگارش حسنِ بیان کی معراج ہے۔

دربار میں بچوں کے جواب سے متاثر ہو کر ایک شخص بولا کہ بھلا یہ غریب بچے بھاگ کر کہاں جاتے۔ دراصل یہ بھوکے ہوں گے اور باپ کی تلاش میں نکلے ہوں گے۔ یہاں میر انیس دشمن کی زبان سے حق بات کہلواتے ہیں جو بچوں کی نفسیات کے لحاظ سے نہایت ہی برفطرت ہے۔ اس

بیان کو میر انیسؔ کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے اور زورِ بیان، واقعاتی تاثر اور فطرت کی عکاسی کا اندازہ کیجئے۔ فرماتے ہیں:-

دہشت کے سبب کانپتے ہیں رنگ ہے تغیر بولا کوئی معصوم ہیں یہ بے کس و دلگیر
نادان ہیں، کم سن ہیں کچھ ان کی نہیں تقصیر یہ پھول سے اندام نہیں لائقِ تعزیز
طاقت ہے کہاں بھاگ کے جاتے یہ کدھر کو
بھوکے ہیں بہت ڈھونڈتے ہوویں گے پدر کو

امیرِ شہر یہ سن کر چپ ہو گیا اور زنداں کے نگہباں کو طلب کیا اور کہا ان بچّوں کو زنداں میں ڈال دو البتہ زنداں نہایت تکلیف دہ اور تاریک ہونا چاہیے۔ بچّوں پر کسی قسم کا رحم مناسب نہیں۔ یہ سحرِ بیان ہیں ان کی باتوں میں ہرگز نہیں آنا چاہیے۔ کھانا نہ تو اچھا ہی ملنا چاہیے اور نہ پیٹ بھر کر ملنا چاہیے۔ ان بچّوں کے ستانے اور تکلیف پہنچانے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں رہنا چاہیے۔ غرض ان احکامات کے ساتھ زنداں کا نگہبان بچّوں کو لے کر چلا اور نہایت ہی خراب اور تاریک محبس میں بند کر دیا۔ میر انیسؔ کی زبانی اس زنداں کا نقشہ ملاحظہ فرمائیے:

معلوم نہ ہوتا تھا کہ کب دن ہوا کب رات تاریک وہ حجرہ تھا مثالِ شبِ ظلمات
سہمے ہوئے روتے تھے وہ آنکھوں پہ دھرے ہاتھ مرقد کے اندھیرے کو بھی اس گھر نے کیا مات
تھی پیشِ نظر وصل میں تنہائی کی صورت
بھائی کو نہ آتی تھی نظر بھائی کی صورت

تھے داغ چراغوں کی طرح سینے میں روشن دیوار میں نہ چھید نہ دروازے میں روزن
چپ بیٹھے تھے پہروں وہ جھکائے ہوئے گردن وہ صورتیں بھولی وہ غریبی وہ لڑکپن
بوندیں بھی پسینے کی ٹپکتی تھیں زمیں پر
بل کھائی ہوئی زلفیں لٹکتی تھیں زمیں پر

تاریکی کی یہ انتہا کہ ''سہمے ہوئے روتے تھے وہ آنکھوں پہ دھرے ہاتھ۔'' بلاغت اور حسنِ بیان کا کمال ہے۔ اس بند کی ہیئت کا زور ملاحظہ فرمائیے کہ وہ محبس اس حد تک تاریک تھا کہ دونوں بھائی ایک جگہ تھے اور وصل کی صورت تھی لیکن ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکنے کے باعث وہ وصال تنہائی میں بدل گیا۔ زنداں کی کیا سچی تصویر ہے جس کا جواب نہیں ہوسکتا۔ دوسرے بند میں بیان کا یہ

ڈھنگ کہ در و دیوار میں کوئی روزن یا رخنہ نہ تھا بلکہ چراغ کی جگہ دلوں کے داغ روشن تھے۔ پھر اس زنداں کی گرمی کا بیان کہ چونکہ اس میں ہوا کا گزر نہ تھا اس لیے بچّوں کا پسینے میں شرابور ہونا بدیہی تھا۔ دوسرے بند کی بیت اس کیفیت کا پورا نقشہ کھینچ رہی ہے۔

انیسؔ بعد کے بند میں بچوں کے معمولات کا تذکرہ کرتے ہیں۔ بچّے اس تاریکی میں یا تو روتے تھے یا عبادت کرتے تھے یا ماں کو یاد کرتے تھے اس لیے کہ وہی زندہ تھی۔ زنداں کے نگہبان کا خوف ان پر ہر ہر قدم مسلّط رہتا تھا۔ میر انیسؔ کی زبانی بچّوں کے معمولات ملاحظہ فرمایئے۔ کیا خوب منظر کشی ہے فرماتے ہیں:

ہر صبح یہ معمول کہ منھ اشکوں سے دھونا　　اٹھ اٹھ کے نمازیں کبھی پڑھنا، کبھی رونا
دیکھا نہ کبھی خواب میں بھی چین سے سونا　　ہر رات کو خاک اوڑھنا اور خاک بچھونا
جز شکرِ خدا منھ سے نہ کچھ کہتے تھے دونوں
رکھ کر تہہِ سر ہاتھ کو سو رہتے تھے دونوں

فاقے میں بسر کرتے تھے دن بھر وہ گل اندام　　جو مالکِ زنداں تھا وہ آتا تھا سرِ شام
جا بیٹھتے دروازے کے نزدیک وہ گل فام　　دیتا انھیں دو روٹیاں اور پانی کے دو جام
تھا خوف زبس ظالمِ اظلم کے غضب سے
اُٹھ اُٹھ کے سلام اس کو وہ کرتے تھے ادب سے

خوف کا یہ عالم تھا کہ بچّے اٹھ اٹھ کر زنداں کے نگہبان کو سلام کرتے تھے۔ زورِ بیان کی انتہا ہے اور مصورانہ چابکدستی کا کمال ہے۔ زنداں میں کھانا اس قدر خراب ملتا تھا کہ بچّوں سے وہ کھانا نہ کھایا جاتا تھا اس کیفیت کو میر انیسؔ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

کھانا وہ کہاں اور کہاں نازوں کے پالے　　رو دیتے تھے جب حلق میں پھنستے تھے نوالے
آپس میں یہی کہتے تھے وہ گیسوؤں والے　　قسمت کبھی دشمن پہ بھی یہ وقت نہ ڈالے
پانی بھی تو جی بھر نہیں ملتا ہے بھائی
یہ سخت ہے روٹی کہ گلا چھلتا ہے بھائی

زنداں کی اس پریشانی، کسمپرسی ظلم و تعدی اور خوف و ہراس سے مملو فضا میں دونوں نازوں کے پالے بچّے اپنے گھرانے کی تربیت کی پوری پوری عکاسی کرتے تھے۔ ظاہر ہے خاندانِ رسالت کی

تربیت اور ان کے بچّوں کی نشو و نما کس قسم کی ہوگی اس کا اظہار ان کے طور طریق اور معمولاتِ روز و شب سے ہوسکتا ہے۔ اس تربیت کا بھرپور اظہار اس وقت اور بھی ہوتا ہے جب وہ بچّے کسی مصیبت میں گرفتار ہوں۔ چنانچہ ان مصائب میں بھی بچّے شکرِ خداوندی بجا لاتے ہیں۔ آپس میں باتیں کرتے ہیں۔ بڑا بھائی چھوٹے بھائی سے کہتا ہے بھیا یہ شکوے کی جگہ نہیں صبر اور شکر کا مقام ہے۔ دوسرے لوگوں سے موازنہ کر کے بڑا بھائی چھوٹے بھائی کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ بہتیرے اب بھی ایسے ہوں گے جو ہم سے بدتر حالت میں ہوں گے ایسی صورت میں ہمیں خالقِ حقیقی کا صحیح معنوں میں شکر ادا کرنا چاہیے چنانچہ اس کیفیت کا بیان میر انیسؔ کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیے اور واقعی نگاری اور منظر کشی کا حسن دیکھیے۔

اس قید میں تھا رزق پہونچنے کا کوئی طور — رزّاقیِ معبودِ حقیقی پہ کرو غور
ہم اور، مکاں اور، زمیں اور، ہوا اور — دینداری سے جو دور ہیں ان لوگوں کا ہے دور
ہیں قید میں جس کی وہی دے جاتا ہے کھانا
ہر طرح خدا بندے کو پہونچاتا ہے کھانا

بند کے ابلاغ کا زور و تاثر اپنی جگہ مسلّم ہے۔

اگلے چھ بند میں بڑا بھائی چھوٹے بھائی کو صبر کی تلقین کرتا ہے۔ یہ تلقین نہایت بلیغ، جامع اور موثر ہے۔ غرض ان ہی صعوبتوں اور پریشانیوں میں بچّوں کو ایک سال گزر جاتا ہے۔ قید و بند کی ایک سال کی تکلیف اور مصائب بچّوں کو لاغر، ضعیف اور ناتواں بنا دیتے ہیں۔ میر انیسؔ کی زبان میں اس کی تصویر کشی ملاحظہ فرمائیے۔ یقیناً اس بیان میں انیسؔ کی بے پناہ مصورانہ چابکدستی نمایاں ہے۔ فرماتے ہیں:۔

گزرا جو اسی طرح انھیں قید میں اک سال — تھا دونوں کا افراطِ نقاہت سے عجب حال
تن خشک ہوئے زور گھٹے، سر کے بڑھے بال — خم ہوگئے کاہش میں مہِ عید کی تمثال
تن ضعف میں فرسودہ و لاغر ہوئے دونوں
رُخ زرد، مثالِ ورقِ زر ہوئے دونوں

بچّوں کو لڑکپن میں ضعیفی نے کیا پیر — سر چھاتیوں پر جھک گئے حالت ہوئی تغیر
تھی تن کو نہ پہروں حرکت صورتِ تصویر — یہ بڑھ گئیں زلفیں کہ ہوئیں پاؤں کی زنجیر

رونق بھی خزاں لے گئی ہستی کے چمن کی
مِسطر سی نمایاں تھیں رگیں صاف بدن کی

دونوں بند اپنی مثال آپ ہیں۔ رُخ کی زردی کی مثال ورقِ زر سے دینا اور مسطر سی رگوں کا نمایاں ہونا انیسؔ کے حسن تشبیہ کی معراج ہے۔ اس کے بعد کے چھ بند میں بچّوں کا ماں کے یاد نہ کرنے کا شکوہ ہے۔ اس کیفیت کے بیان میں انیسؔ نے بچّوں کی نفسیات کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے۔ بچے اپنے چچا جان امام حسینؑ اور اپنے چچازاد بھائی علی اکبر کے کوفہ نہ پہنچنے کا شکوہ کرتے ہیں اور یہ شکوہ فطری بھی ہے لیکن آخر کار اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اغلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھی زندہ نہیں ورنہ ناممکن تھا وہ نہ آتے۔ فرماتے ہیں:۔

بالفرض چچا جان جو تشریف نہ لاتے ہمشکل نبی بھائی کو آ کے نہ چھڑاتے
بپھرے ہوئے عباسِؑ علی شہر سے آتے کوفے کو الٹ دیتے اگر ہم کو نہ پاتے
اللہ رکھے ان کو یہ دم ہم میں نہیں ہیں
معلوم یہ ہوتا ہے کہ عالم میں نہیں ہیں

کس طرح کہیں بھول گئی ہوویں گی مادر سب بیٹوں سے اپنے انھیں الفت ہے برابر
کیا جانے کس آفت میں ہیں فرزندِ پیمبر وہ قید سے غیروں کو چھڑا دیتے ہیں اکثر
سنتے تو مدد آن کے بھائی کی نہ کرتے
تدبیر وہ بچّوں کی رہائی کی نہ کرتے

اس کے بعد کے بند سے منظر بدلتا ہے۔ زنداں کا محافظ قفلِ درِ زنداں کھولتا ہے۔ بچّے جی کڑا کر کے نگہبان کی منت سماجت کرتے ہیں۔ محافظ بچّوں کی سحر بیانی سے متاثر ہوتا ہے۔ انیسؔ کے الفاظ میں یہ کیفیت ملاحظہ فرمایئے۔ فرماتے ہیں:

تو رحم کر اے شخص کہ بے جرم و خطا ہیں وارث کوئی سر پر نہیں، پابندِ بلا ہیں
لڑکے ہیں، ستم کش ہیں، غریب الغربا ہیں احساں کو نہ بھولیں گے کہ ہم اہلِ وفا ہیں
اب قید کی تکلیف اٹھائی نہیں جاتی
روٹی بھی کئی روز سے کھائی نہیں جاتی

رکھتا ہے بڑا اجر اسیروں کو چھڑانا بھوکوں کو طلب کر کے سخی دیتے ہیں کھانا

رہ جاتا ہے عالم میں کریموں کا فسانا　　نیکی جو کرے نیک اسے کہتا ہے زمانا
محتاج ہیں ہاں اور تو کیا دیویں گے بھائی
کام آ جو ہمارے تو دعا دیویں گے بھائی

ان فصاحت بھرے کلمات سے نگہبان کا دل پسیج گیا۔ اتفاق سے دورانِ گفتگو یہ پتہ چلا کہ وہ نگہبان دوست دار اہل بیتؑ ہے۔ اس انکشاف کے بعد اس نے بچوں پر ترس کھایا۔ بچوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ وہ ان کے خاندان کا محب ہے تو ان کی جان میں جان آئی۔ انیسؔ اس حالت کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔ فرماتے ہیں۔

یہ سنتے ہی جان آ گئی ان دونوں کے تن میں　　کم ہو گیا وحشت سے جو لرزہ تھا بدن میں
خشکیدہ زباں کرنے لگی شکر دہن میں　　گویا کہ بہار آ گئی ہستی کے چمن میں
حجرے سے خوشی ہو کے وہ مہ رُو نکل آئے
اک بھائی ہنسا، ایک کے آنسو نکل آئے

بند کا حسن بے پناہ ہے اور اس پر مزید لکھنا بے سود ہے۔ اگلے پانچ بند میں نگہبان کی خفّت اور معذرت کا بیان ہے جو بڑا موثر اور نہایت برمحل ہے۔ زنداں کے نگہبان ہی نے حضرت امام حسین علیہ السلام اور ان کی شہادت کی خبر سنائی جس کا بیان اگلے سات بند میں ہوا ہے۔ پریشانیوں اور مصائب کے اس ریلے میں بچے نہایت متوحش ہو جاتے ہیں۔ نگہبان کی مہربانی سے بچے تاریکیِ شب میں رہائی پاتے ہیں۔ قید سے چھٹنے کا منظر انیسؔ کے الفاظ میں سماعت فرمایئے فرماتے ہیں:۔

جب مسلم بے کس کے پسر قید سے چھوٹے　　آوارہ وطن خستہ جگر قید سے چھوٹے
دُکھ سہہ کے عزا دارِ پدر قید سے چھوٹے　　پردیس میں وہ شمس و قمر قید سے چھوٹے
گیسو بھی پریشان تھے کُرتے بھی پھٹے تھے
خورشید سے منہ گردِ یتیمی سے اٹے تھے

وہ شہرِ پُر آشوب وہ غربت وہ شب تار　　ایک ایک قدم خوف، نہ رہبر نہ مددگار
ہاں جاگتے رہو یہ عسس کہتے تھے ہر بار　　دل ان کے دھڑکتے تھے لرزتے تھے تنِ زار
پیچھے کبھی ہٹ جاتے تھے اور بڑھتے تھے دونوں

ڈر ڈر کے کبھی نادِ علی پڑھتے تھے دونوں

بچّوں کی رہائی کی اس سے واضح تصویر کیا ہو سکتی ہے۔ پہلے بند میں ـ ''پردیس میں وہ شمس وقمر قید سے چھوٹے'' حسنِ بیان کی جان ہے اور دوسرے بند میں ـ ''ڈر ڈر کے کبھی نادِ علی پڑھتے تھے دونوں'' ماحول کے خوف کی بے پناہ عکاسی ہے اور بچّوں کی نفسیات اور خاندانی تربیت پر دلالت کرتی ہے۔

میر انیسؔ اس مرثیے میں اپنے فن کے درجۂ کمال پر فائز نظر آتے ہیں۔ بچّے رات کی تاریکی میں جب اس طرح ڈرے سہمے، حیران و پریشان شہر میں بھٹک رہے تھے تو انھیں ایک ضعیفہ ایک مکان کے دروازے پر نظر آئی جو شاید کسی کی آمد کی منتظر تھی۔ ننھے بچّوں کے لیے اس ضعیفہ کی صورت میں ماتا کا پیکر نظر آیا۔ بچّے بے ساختہ اس کے پاس پہنچ گئے اور اپنے سر چھپانے کا مدعا بیان کیا۔ اتفاق سے وہ ضعیفہ محبِ اہل بیتؑ نکلی۔ بچّوں کی سوکھی کھیتی جیسے ہری ہوگئی۔ میر انیسؔ کے لفظوں میں اس واقعہ کی منظر کشی ملاحظہ فرمائیے۔ ڈرامائی لحاظ سے منظر کی یہ تبدیلی نہایت نیچرل ہے۔ فرماتے ہیں:۔

اک پیر زن اتنے میں نظر آگئی ناگاہ — داماد کے آنے کی کھڑی دیکھتی تھی راہ
یوں کہنے لگے اس سے بصد عجز وہ ذی جاہ — اک دو گھڑی اس گھر میں اماں دے ہمیں لِلّٰہ
معصوم ہیں ہم، بے وطن و زار و حزیں ہیں
مظلوم ہیں، سیّد ہیں، گنہ گار نہیں ہیں

اس بستی میں دیندار نظر آئی ہمیں تو — وہ بولی کہ تم دونو ہو کس باغ کے گل رُو
تم سے تو عجب طرح کی آئی مجھے خوشبو — کہنے لگے تب چپکے سے وہ دیکھ کے ہر سُو
رکھتے ہیں قرابت تو رسولِ عربیؐ سے
مسلم کے پسر ہیں ہمیں کہیو نہ کسی سے

وہ پیرزن محبِ اہلِ بیت تھی لیکن اس گھر کا مالک بڑا ہی دشمنِ اہلِ بیتؑ تھا۔ اس کیفیت کا بیان اگلے تین بند میں ہوا ہے۔ ضعیفہ کی شفقت اور محبت سے خوش ہو کر دن بھر کی تھکن سے نڈھال بچّے ضعیفہ کے گھر آرام کرتے ہیں اور حجرے میں سوجاتے ہیں۔

انیسؔ منظر کی تبدیلی میں مشّاق ہیں اور ڈرامائی لحاظ سے اس میں فطرت اور نیچر کا وہ رنگ

بھرتے نظر آتے ہیں جو اپنا جواب آپ ہے۔ چنانچہ منظر کی تبدیلی اس طرح واقع ہوتی ہے کہ گھر کا مالک جو جلادِ فطرت اور دشمنِ اہل بیت ہے، رات گئے دقُّ الباب کرتا ہے۔ انیسؔ کے لفظوں میں ملاحظہ فرمایئے۔ فرماتے ہیں:۔

کھانا بھی نہ کھایا نہ پیا دونوں نے پانی اور سوئے بہم مسلمِ مظلوم کے جانی
وہ نیند نہ تھی موت کی گویا تھی نشانی دروازے پہ آ پہنچا ادھر موت کا بانی
چِلّایا ضعیفہ کو یہ زنجیر ہلاکر
کوسوں کا تھکا آیا ہوں در کھول دے آکر

یہ سن کے ضعیفہ کا لگا کانپنے اندام بولی یہ بھلا آنے کا ہے کون سا ہنگام
دربار سے ہر روز تو آتا تھا سرِ شام چِلّا کے یہ بولا میں کہیں تھا تجھے کیا کام
در کھول، نہیں آگ لگا دیتا ہوں گھر کو
لے تو نہیں آتی تو گرا دیتا ہوں گھر کو

سارے الفاظ آنے والی کی۔ قا کی، درندگی اور بے رحمی ظاہر کر رہے ہیں۔ ضعیفہ دروازہ کھولتی ہے تو سفا کی، درندگی اور بربریت کی یہ تصویر انیسؔ کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے۔

در کھولا تو کس غیظ سے آیا وہ بد افعال پھینکا کہیں خنجر، کہیں تلوار، کہیں ڈھال
تھی ریش تو اٹھی ہوئی مونچھوں کے کھڑے بال اور دیدۂ لالیں تھے وہ جوں ساغرِ خوں لال
آواز تھی ایسی کہ گزرتی تھی فلک سے
ہلتی تھی زمیں پاؤں کے رکھنے کی دھمک سے

پاس آکے ضعیفہ نے بہت باتوں میں گھولا تیور وہ چڑھائے رہا کچھ منہ سے نہ بولا
کھینچا کبھی خنجر کبھی تلوار کو تولا کہتا تھا کہ دل کا کوئی پھوٹا نہ پھپھولا
ہاتھوں کو کبھی کاٹتا تھا طیش میں آکر
رہ جاتا تھا غصہ سے کبھی ہونٹ چباکر

اور طیش میں کھانا بھی نہ جلاد نے کھایا پھر خوابِ اجل نے اسے بستر پہ گرایا
باقی تھی پہر رات کہ پھر ہوش میں آیا ابلیس نے سوئے ہوئے فتنے کو جگایا
پھولوں کی مہک حجرے سے دالان میں آئی

آواز بھی کچھ رونے کی پھر کان میں آئی

متذکرہ بالا بند جذباتِ انسانی کی نہایت نیچرل عکاسی ہیں۔ کسی شخص کی اضطراری کیفیت کی منہ بولتی تصویر کیسے ہوسکتی ہے ان بندوں میں نمایاں ہے۔ آخری بند انیسؔ کی فن کاری اور پُر کاری کا کمال ہے۔ طیش میں اس جلاّد نے کھانا بھی نہ کھایا۔ چونکہ پورے دن کا تھکا ماندہ تھا اس لیے بستر پر گر کر سو گیا، لیکن چونکہ اضطراری کیفیت کا شکار تھا اس لیے پہر رات رہے اس کی آنکھ کھل گئی اور آنکھ بھی کیا کھلی گویا ابلیس نے سوئے ہوئے فتنے کو جگا دیا اور پھر اس بند کی بیت کہ ابھی نیند سے جاگا ہی تھا کہ اسے حجرے سے پھولوں کی سی مہک آئی اور کسی بچے کے رونے کی آواز بھی سنائی دی۔ پھر کیا تھا جلاّد کے سارے حواسِ خمسہ بیدار ہوگئے۔ سارے کا سارا بند انیسؔ کی فن کارانہ صلاحیتوں کا کمال ہے۔ اس اضطرار میں سفّاکی اور درندگی کی منہ بولتی تصویر نظر آتی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔ انیسؔ فرماتے ہیں:۔

تاریک مثالِ دلِ کافر تھا وہ سب گھر　　　ہر سو صفتِ گرگ لگا ڈھونڈنے اٹھ کر
ظالم نے سرہانے سے لیا ہاتھ میں خنجر　　　پکڑے ہوئے دیوار گیا، حجرے کے اندر
واں مسلمِ مظلوم کے پیارے نظر آئے
اک بُرج میں دو عرش کے تارے نظر آئے

تاریکی کا یہ عالم کہ مثالِ دل کافر سارا گھر تاریک تھا اور اس تاریکی میں وہ جلاّد مثلِ گرگ ڈھونڈنے لگا۔ احتیاط سے سرہانے سے اپنا خنجر بھی ہاتھ میں لے لیا اور تاریکی کی سبب دیوار پکڑے ہوئے حجرے میں داخل ہوا۔ تاریکی کی حسّی کیفیت کا اس سے بہتر کیا اظہار ہوسکتا ہے۔ حجرے میں پہنچ کر اسے سوئے ہوئے بچے ملے۔ ظاہر ہے اس کیفیت اور واقعہ کے بیان میں کس قدر فطرت کی عکاّسی کا اقتضا رکھا گیا ہے وہ قاری کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں۔ اس بند سے جو بھرپور تاثر قائم ہوا ہے وہی انیسؔ کے فن کی معراج ہے۔

جب اس جلاّد نے بچّوں کو دیکھا تو بچّے خوف سے لرز گئے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ وہ کون ہیں تو بچّوں نے کہا اگر ہم سچ سچ بتا دیں تو کیا وہ ہمیں امان دے گا۔ اس نے کہا ہمیں منظور ہے۔ اس کیفیت کا اعادہ کس قدر بچّوں کی نفسیات کے عین مطابق ہے اور بچّوں کی تربیت سے ہم آہنگ ہے۔ بچّوں نے غرض بتلایا کہ وہ مسلمِ مغفور کے فرزند ہیں۔ بس پھر کیا تھا۔ جلاّد آگ بگولا ہوگیا اور

قہر وغضب کا نمونہ بن گیا۔ یہ تمام کیفیات اگلے چار بندوں میں بتائی گئی ہیں۔ بچّوں کی حقیقت کے انکشاف کے بعد اس سفاک درندے کی تصویر ملاحظہ فرمائیے۔ یاد رہے کہ یہاں درندگی کو تشخص دیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

سنتے ہی خطا کار نے بس آنکھ کو موڑا   یوں بازوؤں کو زور سے پکڑا کہ نہ چھوڑا
رسّی سے انھیں باندھ لیا عہد کو توڑا   بچّوں نے کئی بار بندھے ہاتھوں کو جوڑا
جب کھینچتا تھا گر کے مچلتے تھے وہ بچّے
پر حجرے سے باہر نہ نکلتے تھے وہ بچّے

دکھلاتا تھا خنجر انھیں جب کرتے تھے فریاد   بچّوں پہ یہ دُکھ، ہائے یتیموں پہ یہ بیداد
دروازے تلک کھینچتا لایا ستم ایجاد   کم زور تھے یہ اور زبردست وہ جلّاد
کرتے بھی پھٹے ٹوپیاں بھی گر گئیں سر سے
مجرم کی طرح باندھ دیا دونوں کو در سے

اس منظر کشی کی جس قدر تعریف کی جائے وہ کم ہے۔

متذکرہ بالا بند کے بعد منظر بدلتا ہے۔ اس منظر کی فطری تبدیلی انیسؔ کے فن کارانہ قلم کی معراج ہے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تیز بھاگنے کے بعد آدمی تھوڑی دیر دم لینے کو ٹھہر جائے۔ یہی کیفیت اس بند کی ہے۔ توجہ دراصل بچّوں سے ہٹ کر ضعیفہ کی طرف منعطف ہوجاتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

جس وقت نمودار ہوئے صبح کے آثار   دریا پہ چلا لے کے یتیموں کو جفا کار
چلّاتی چلی پیچھے ضعیفہ جگر افگار   بن باپ کے بچّے ہیں یہ ظالم نہ انھیں مار
کیوں فاطمہ زہرا کو رُلاتا ہے کفن میں
دو پھول تو رہنے دے محمدؐ کے چمن میں

اگلے تین بندوں میں ضعیفہ منت سماجت کرتی ہے کہ وہ ظالم بچّوں کو چھوڑ دے مگر وہ درندہ نہیں مانتا بلکہ ضعیفہ کو سفارش کے عوض جان سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ یہ کیفیت اس بیت میں ملاحظہ فرمائیے۔

خوں دیکھ کے دونوں جو ضعیفہ کا ڈرے تھے
دہشت سے بندھے ہاتھوں کو آنکھوں پہ دھرے تھے

توجہ ضعیفہ کی طرف سے ہٹا کر بچّوں کی طرف منعطف کرانے کا اس سے بہتر، پُر زور اور پُر اثر کیا طریقہ ہو سکتا ہے۔

غرض وہ ستم گر بچّوں کو نہر پر لے کر پہنچتا ہے اور اس طرح منظر تبدیل ہوتا ہے اور نیا مرقع سامنے آتا ہے جو نہایت درد انگیز ہے ملاحظہ فرمائیے:۔

بچّوں کو لیے نہر پہ پہنچا جو وہ بے پیر   اور دیکھی یتیموں نے چمکتی ہوئی شمشیر
دل ہل گئے ہٹ ہٹ کے یہ کی دونوں نے تقریر   کر رحم کہ معصوم ہیں ہم بے کس و دل گیر
مظلوم ہیں حامی کوئی مشکل میں نہیں ہے
ظالم نے کہا رحم مرے دل میں نہیں ہے

بچّے جان بچانے کی کوشش میں کبھی دولت کا لالچ دیتے ہیں کہ وہ انھیں بازار میں بیچ دے اور اس طرح دولت حاصل کرے لیکن وہ بدخُو کسی طرح نہیں مانتا۔ اس کا تو یہی کہنا ہے کہ وہ ان کے سر ضرور اتارے گا۔ بچّے کہتے ہیں کہ اچھا ہمیں نماز پڑھنے کی اجازت تو دیدے مگر وہ اس پر بھی رضامند نہیں ہوتا۔ آخرکار وہ سخت گھڑی آ پہنچتی ہے جب وہ کم بخت بچّوں پر حملہ آور ہوتا ہے۔ اس دل دوز منظر کی تصویر ملاحظہ فرمائیے۔

نامرد نے حملہ کیا تلوار اٹھا کر   سر رکھ دیا چھوٹے نے وہیں جلد بڑھا کر
تب ہاتھ سے چھوٹے کو بڑا بھائی ہٹا کر   جا بیٹھا تہہ تیغ دو دم سر کو جھکا کر
تلوار چمکتی تھی تو ہٹ جاتا تھا بھائی
پھر دوڑ کے بھائی سے لپٹ جاتا تھا بھائی

بند کی حقیقت نگاری اور مصوری کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ غرض دونوں بچّے یہی کوشش کرتے ہیں کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کا پہلے سر اتارا جائے۔ مرثیے کا آخری قیامت خیز بند ملاحظہ کیجیے:۔

ناگاہ چلی ظلم کی تلوار بڑے پر   بالائے زمیں کٹ کے ستارہ سا گرا سر
دریا میں ستم گار نے پھینکا تنِ اطہر   چلّا کے یہ چھوٹے نے کہا ہائے برادر
دیکھا جو بڑے بھائی کا سر دستِ عدو میں
وہ گر کے تڑپنے لگا بھائی کے لہو میں

زمین پر کٹ کر ستارہ سا سر گرنا بلاغتِ کلام کی منتہا ہے۔ بیت کے مضمون کی ادائیگی برمحل اور

حقیقت آفریں ہے۔ الفاظ اس کے صحیح حسن کے بیان سے قاصر ہیں۔ یقیناً یہ ادائیگی مصوری کا کمال ہے۔ بعد کا بند ملاحظہ فرمائیے۔

آیا جو شقی تیغ علم کرکے دوبارا — چلّانے لگا بھائی کو وہ بھائی کا پیارا
مادر کو پکارا کبھی بھائی کو پکارا — جلّاد نے تن پر سے سر اس کے بھی اتارا
دھبّا بھی نہ خوں کا لگا شمشیر عدو میں
بھائی کا لہو مل گیا بھائی کے لہو میں

ایک بچّے کی نفسیات کا اس سے بہتر اور کون سا بیان غمّاض ہوسکتا ہے۔ موت کا خوف بہت بڑا خوف ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر بچّے کا بھائی اور ماں کو یاد کرنا نہایت ہی نیچرل بات ہے۔ دوسرے بچّے کے سر اتروانے کے بعد یہ کہنا کہ بھائی کا خون بھائی کے خون میں مل گیا انیسؔ کی منظر نگاری کا نقطۂ عروج ہے۔ ان محاسن کے بعد انیسؔ کا مقطع کے بند میں اپنے فن کے متعلق دعویٰ کرنا کلیتاً مبنی بر حقیقت ہے۔ فرماتے ہیں:۔

خاموش انیسؔ اب کہ ہے دل پر الم و رنج — یہ مرثیہ تو لیں گے جواہر میں سخن سنج
دنیا کی دو رنگی سے نہ کر دل میں شش و پنج — مومن ہیں جو اُن کے لئے یاں رنج ہے واں گنج
مطلب نہ کسی سے نہ علاقہ ہے کسی سے
لیویں گے صلہ اس کا حسینؑ ابن علیؑ سے

منظر کشی کے لیے الفاظ کس حد تک کسی فنکار کا ساتھ دے سکتے ہیں میر انیسؔ کے اس مرثیے کو سامنے رکھ کر نقادانِ فن غور فرمائیں کہ کیا یہ انیسؔ کے فن کا اعجاز نہیں ہے۔ یہاں موازنہ کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ صرف یہ اشارہ کرنا ہے کہ اڈمنڈ اسپنسر جسے بیانیہ منظر نگاری کا نقطۂ عروج کہا جاتا ہے کیا اس منظر نگاری سے کوئی بہتر منظر نگاری کا تصور کرسکتا ہے۔ صاحبانِ علم مجھ سے اتفاق کریں گے کہ ایسا نہیں ہے اور اس کا تصور بھی محال ہے۔ زبان و بیان پر کسی شاعر کو اس حد تک قدرت ہوسکتی ہے طالبانِ فن انیسؔ سے سیکھیں۔

منظر نگاری اور مصوری کا جو موڈ میر انیسؔ نے اس مرثیے میں طاری کیا تھا اور جس فنی رچاؤ کو پائے تکمیل تک پہنچایا تھا اس کی جھلکیاں اس کے بعد کے مرثیہ میں بھی ملتی ہیں۔ مطلع ہے:

''دشت وغا میں نورِ خدا کا ظہور ہے''

مقالہ کی طوالت کے سبب اس مرثیہ کے اقتباسات پیش نہیں کئے جاسکتے۔ بہرصورت جس طرح انیسؔ نے پہلے مرثیہ کے مقطع میں اپنے کمالِ فن کا دعویٰ کیا ہے اسی طرح اس مرثیے کے مقطع میں حسنِ بیان اور خاندانی زبان کا بھی دعویٰ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

بس اے انیسؔ بزم میں ہے نالہ ہو وفغاں　　پوچھو ان کے دل سے جو ہیں سخن فہم نکتہ داں
حق ہے سنا نہیں کبھی اس حسن کا بیاں　　گویا کہ یہ خلیق کی ہے سر بہ سر زباں
سچ ہے کہ اس زباں کو کوئی جانتا نہیں
جو جانتا ہے اور کو وہ پہچانتا نہیں

یقیناً انیسؔ کا دعویٰ صدفی صد صحیح ہے۔ نہ تو اس حسن کا بیان دیکھنے میں آیا اور نہ ہی اس تیور کی زبان سننے میں آئی۔ مولوی ذکاء اللہ مرحوم نے انیسؔ کے لیے کہا تھا۔

''معلوم ہوتا تھا ایک شخص منبر پر بیٹھا سحر کر رہا ہے''

ایمان سے کہیے کیا غلط کہا تھا۔

مہذبؔ لکھنوی

بیش بہا جواہر

انیس کون تھے؟ خاندان سادات کی ایک فرد۔ کبھی مبتدی بھی تھے۔ اُن کی محنت و جانفشانی اور تائید پروردگار نے وہ جوہر مرحمت فرمادیا کہ اپنے ہمعصروں اپنے ہم فنون میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہوگئے۔ مدّاحی سیّدالشہدا شروع کی خدا معلوم کیا خلوص تھا کہ قدرت نے کلام میں کوٹ کوٹ کے تاثیر بھردی۔

خوش قسمتی نے زندگی میں بھی ساتھ دیا اور مرنے پر بھی دامن نہ چھوڑا۔ آج انیس کی یاد اسی طرح تازہ ہے۔ جس طرح زندگی میں دنیا کے دلوں میں گھر کرلیا تھا جو کچھ چھوڑ گئے وہ نہ دولت تھی نہ زر و جواہر۔

جلد فنا ہوجانے والے کاغذ پر کچھ مرثیے کچھ سلام کچھ رباعیاں چھوڑی تھیں اللہ! اثر اس کا نام ہے، تائید غیبی اسی کو کہتے ہیں کہ وہی مرثیے چھ جلدوں میں طبع ہوئے ہر ہر مرثیے کی ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں نقلیں عالم کے گوشے گوشے میں پہنچ گئیں۔ کیا حقیقت کچھ نہ تھی صرف خوش قسمتی یا تائید غیبی تھی؟

نہیں ایسا نہیں بلکہ مرنے والے نے وہ بیش بہا جواہر چھوڑے تھے کہ باوجود اتنی کوششوں کے دنیا کے جوہری اچھی طرح ابھی تک پرکھ نہ سکے۔

کلام کا جتنا جتنا مطالعہ کرتے جایئے اُتنے اُتنے انکشافِ کمالات ہوتے جائیں گے۔ قدرت نے اپنی صنّاعی کا ایک نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا تھا ہر ذات کے لیے کچھ خصوصیات ہوتے ہیں جو اُس کی زندگی کے لیے ایک طویل مدت کے لیے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اس ذات بے مثال فرشتہ خصال نے اس خلوص سے مدّاحی کی کہ مقبول بارگاہ معصومین علیہم السلام ہوگئی۔

(وقارِ انیس جلد دوم)

شمس الرحمٰن فاروقی

میر انیسؔ کے ایک مرثیے میں استعارے کا نظام

''بے شک اللہ ارض وسموات کا نور ہے'' قرآن

''نور کے معنی ہیں روشنی، علی الخصوص نور الٰہی جو غیر مخلوق ہے اور جس میں تمام ظہور شامل ہے، اور جو وجود بطور اصل الاصول کے ہم معنی ہے۔'' (ٹائٹس برک ہارٹ)

(مسیح)۔۔۔۔نور کا نور جو محمول مخلوق ہے۔

ملٹن، فردوس، بازیافتہ (کتاب چہارم)

لیکن ان شعلوں سے کوئی روشنی نہیں، بلکہ یوں کہو کہ تاریکی منظور و مبصر تھی۔

ملٹن، فردوس، گم گشتہ (کتاب اول)

اچھی شاعری میں استعارے کی کلیدی اہمیت کے بارے میں ہم بہت کچھ جانتے ہیں۔ اسی طرح، یہ بات بھی ہم سب پر واضح ہے کہ بڑے شاعر کے کلام کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ اس کے یہاں بعض استعارے اور علامتیں یا علامتی استعارے کلیدی اور مرکزی اہمیت رکھتے ہیں۔ کلیدی اور مرکزی اہمیت کے ان الفاظ (استعارے، علامت، پیکر وغیرہ) کی پہچان اور ان کی تفہیم گویا اس شاعر کے تمام پیدا و پنہاں معانی کی تفہیم اور اس کی بڑائی کے راز کی نشان دہی کا حکم رکھتی ہے۔ مثلاً

یہ کہنا کہ اقبال نے انسان اور خدا کے مرکزی رشتوں، انسان اور وقت کی نبرد آزمائی، انسان اور غیر انسان کی کشمکش کو اپنا موضوع بنایا ہے، محض ایک بیان ہے۔ اس بیان کو تنقیدی اہمیت اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے جب ہم ان کے یہاں ایسی علامتوں اور استعاروں کو تلاش کرسکیں جن کی جڑوں سے یہ مسائل پھوٹتے دکھائی دیتے ہوں۔

کلیدی الفاظ کا انتخاب شعوری بھی ہوسکتا ہے، غیر شعوری بھی۔ ارادی بھی اور غیر ارادی بھی۔ یہ ممکن ہے کہ انتخاب کردہ الفاظ کی اہمیت شاعر پر اپنے تہذیبی ورثہ اور ماحول کے مطالعہ کے ذریعہ منکشف ہوتی ہو۔ روزمنڈ ٹیو Rosemun Tuve کی کتاب Allegolical Imagery میں تہذیبی ورثہ اور ماحول کے زیر اثر قرون وسطیٰ کی مغربی شاعری میں چند مخصوص الفاظ اور ان کے مفاہیم سے بحث کی گئی ہے۔ نکتہ دراصل یہ نہیں ہے کہ شاعر نے ان الفاظ کو بالکل طبع زاد طریقے سے اختیار کیا ہے یا تہذیب وثقافت کے وسیع سرمائے سے اس نے یہ موتی چنے ہیں۔ بنیادی نکتہ یہ ہے کہ کلیدی الفاظ کی تفہیم وتشریح کیا ہوگی اور انہیں شاعر نے کس غرض سے استعمال کیا ہے۔

مثلاً جدید شاعری کی بہت سی علامتیں / علامتی استعارے خود ساختہ ہیں، بہت سے ایسے ہیں جو ہمارے اجتماعی لاشعور کا حصہ ہیں۔ قرون وسطیٰ کی شاعری میں بہت سی علامتیں مذہبی روایات مذہبی مصوری (Iconography) علم الاسرار اور عام عقیدے سے جہاں تہاں اٹھالی گئی ہیں۔ علامت ذاتی ہو یا اجتماعی، خود ساختہ ہو یا شاعر کو بنی بنائی ملی ہو، اصلی شاعر کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ اس نے ان علامتوں سے کوئی کام لیا ہے، یا ان الفاظ کو محض برائے بیت رسمی طور پر استعمال کیا ہے۔ اردو شاعری کے بہت سے کلیدی الفاظ اس کی اچھی مثال ہیں کوچہ، دل دار، گل، زلف، رخسار وغیرہ کو فیض نے بھی استعمال کیا ہے اور بہت سے روائتی شعرانے بھی۔ دونوں کا فرق ظاہر ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ روائتی اظہار اور علامتی اظہار میں فرق کیوں کر کیا جائے؟ بالفاظ دیگر، یہ کیوں کر واضح کیا جائے کہ فیض کے یہاں کوچہ دل دار کی اہمیت کچھ اور ہے ہما شما کے یہاں کچھ اور؟ اس سوال کے کئی نظریاتی جواب ممکن ہیں۔ اگر چہ ایک جواب کبھی کبھی دوسرے کو قطع کرتا ہوا بھی محسوس ہوتا ہے۔ مثلاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ فیض کی شاعری کا مجموعی تاثر ایک مخصوص معنی رکھتا ہے، یہ

مخصوص معنی ان تمام روائتی علامتوں کے معانی کو متغیر کرتے ہیں جن سے فیض کا کلام مملو ہے۔ تب سوال یہ ہو سکتا ہے کہ فیض کے مجموعی تاثر کے مخصوص معنی میں کیا صفت ہے جو (مثلاً) ابرار حسنی گنوری کے یہاں نہیں ہے۔ جواباً کہا جا سکتا ہے کہ ابرار حسنی کے کہاں کوئی مجموعی تاثر (جو معنی خیز ہو) ہے ہی نہیں دوسری طرف یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ روائتی ہی سہی، اگر یہ علامتیں واقعی معنی خیز ہیں تو ان میں ایک مخصوص ربط اور نظام ہوگا یہ مخصوص ربط اور نظام تمام شاعری پر، تمام الفاظ پر اس طرح اثر انداز ہوگا کہ شاعری کا تاثر اور اس کے الفاظ (جن کے ذریعہ تصور خلق کیا گیا ہے) باہم دیگر اثر انداز ہوں گے، اس طرح ایک مکمل شاعرانہ ہیئت خلق ہوگی جو قائم بالذات ہوگی۔

لیکن سب سے بڑا امتحان، جو روائتی اور علامتی اسلوب کو الگ الگ کر کے دکھاتا ہے، علامتی اسلوب کی Cousistency ہے بدیں معنی کہ اگر ایک لفظ کسی مخصوص علامتی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ تو اس کی پہچان یہ ہوگی کہ جہاں بھی وہ مخصوص تاثر درکار ہوگا جس کے لئے اس معنی کی ضرورت ہوگی تو وہی علامت یا اسی نظام کی علامت استعمال ہوگی عام اس سے کہ منطقی طور پر اس کا محل ہو یا نہ ہو۔ ردیف و قافیہ کی مجبوری بھی حائل نہ ہوگی، شاعر کسی نہ کسی طرح اس علامت کے لئے راستہ ڈھونڈ لے گا۔ (منطق سے میرا مطلب ہے جامد اور انسانی منطق، نہ کہ شعری منطق شعری منطق اپنا جواز آپ ہوتی ہے، اسے کسی خارجی حوالے کی ضرورت نہیں پڑتی) یہ فرق اس قدر نازک ہے کہ اس کی وضاحت ذرا تفصیل سے کرنا ضروری ہے۔ مثلاً کسی شاعر نے سورج کو قاہر و تباہ کن قوت کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ لفظ سورج جب اس مفہوم میں استعمال ہوا تو اس نے ایک مخصوص تاثر (تخریب، قہر و غضب، موت، اسرار) خلق کیا۔ اب جہاں بھی اس طرح کا، یا اس سے ملتا جلتا تاثر خلق کرنا ہوگا شاعر لامحالہ سورج، روشنی، آگ یا اس نظام سے متعلق کوئی ایسا لفظ استعمال کرے گا جو قاری کا ذہن خود بہ خود اس تاثر کی طرف منعطف کر دے گا جو مرکزی علامت (سورج) کا تاثر ہے۔ جب ایسی صورت حال ہوگی تو اظہار خود بہ خود علامتی اظہار کی شدت اور شوکت اختیار کر لے گا۔ علامت، یا علامتی استعارہ (یعنی ایسا استعارہ جو مکرر استعمال ہوا اور جس میں علامت جیسی ہیبت، اہمیت اور ابہام ہو) کلام میں منتشر اور غیر مربوط طریقے سے نہیں واقع

ہوتے۔

یہاں یہ سوال اُٹھتا ہے کہ کیا ایسی مربوط علامتی فکر کے لئے شاعر کوئی پلان بناتا ہے، کوئی نقشہ تیار کرتا ہے موافق اور مخالف، ہاں اور نہیں قسم کے اعداد و شمار مرتب کرتا ہے؟ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ صاحب یہ کیوں کر ممکن ہے کہ شاعر نے اتنا وسیع اور پیچیدہ نظام محض اتفاقاً ہی اپنی شاعری میں ڈال دیا ہو؟ یقیناً اس کے لئے بڑی کدو کاوش، بڑا تفصیلی مطالعہ اور نقشہ سازی درکار ہوئی ہوگی۔ اس کا سادہ جواب یہ ہے کہ بطور ناقد و قاری، ہماری یہ بحث بالکل نہیں ہے کہ کسی نظم یا تحریر کو وجود میں لانے کے لئے شاعر نے کتنے پاپڑ بیلے ہوں گے۔ ایلیٹ کے بارے میں دنیا جانتی ہے کہ وہ ان الفاظ کو، جو اسے اچھے یا دلچسپ معلوم ہوتے تھے، اپنی نوٹ بک میں درج کر لیتا تھا کہ وقت ضرورت پر انھیں اپنی نظموں میں استعمال کر سکے۔ پو کا مشہور مضمون ''شعر گوئی کا فلسفہ'' ایک انتہائی منضبط اور مشینی قسم کے عمل تخلیق کا تفصیلی تذکرہ کرتا ہے جس کے نتیجے میں اس کی شہرہ آفاق نظم پر بت کاگ (The Raven) وجود میں آئی۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے سب سے پہلے تو یہ سوچا کہ موسیقیت کی خاطر نظم میں کوئی ایسا مصرع ترجیح ہونا چاہئے جو خوبصورت اور دلکش ہو۔ اثریت کی خاطر نظم میں کسی ایسی ہستی کا تذکرہ ہو جس سے شاعر کو محبت ہو۔ پھر میں نے سوچا کہ اگر کیفیت رنجیدگی اور افسردگی کی ہو تو بہت خوب ہوگا۔ موسیقیت اور رنجیدگی کے اس امتزاج کو حاصل کرنے کے لئے، میں نے سوچا، بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ الفاظ میں ایک گونج اور طویل بازگشت کا تاثر ہو۔ اس لئے میں نے دو لفظ منتخب کئے جن میں مصوتوں اور مصوتوں کا نظام حسب دل خواہ تھا اور معنی بھی افسردگی کے تھے، یعنی Never More۔ پھر میں نے سوچا کہ محبوبہ کا نام بھی ایسا ہو جو موسیقیت سے بھرپور ہو اور Never More کا ہم قافیہ بھی ہو، اس طرح میرے ذہن میں Lenore آیا، وغیرہ۔ اس طرح سارا مضمون The Raven کی تنظیم کو، جو نظم پڑھتے وقت پس پردہ تھی، اس طرح واضح کرتا ہے جس طرح کوئی بازی گر کسی حیرت انگیز شعبدے سے ہم کو متحیر کرنے کے بعد یہ بھی آشکار کر دے کہ شعبدہ کس طرح عمل میں آیا تھا، وہ تو محض ہاتھ کی صفائی تھی!

حاصل کلام یہ کہ شاعر اپنا علامتی نظام کس طرح حاصل کرتا ہے، کس طرح اپنے الفاظ مجتمع کرتا

ہے، ان میں کون سے معنی رکھنا چاہتا ہے۔اور بالآخران سے کیا معنی نکلتے ہیں، یہ سب فروعی باتیں ہیں۔بنیادی بات ان استعاروں اور علامتوں یعنی جدلیاتی الفاظ کی ہے جن سے شاعر نے اپنے کلام کو مزین کیا ہے۔ یہ الفاظ کیا ہیں، کیا کام کر رہے ہیں، شاعر کی تہذیب سے ان کا کیا رشتہ ہے، وغیرہ۔ یہ بنیادی اور اصلی اور اصلی سوالات ہیں۔ مثلاً اقبال کے کلام میں آسمان، ستارہ، وقت، زمانہ، شاہین، مومن، خدا، شیطان وغیرہ الفاظ بہت آئے ہیں۔تنقید کا کام یہ ہے کہ ان الفاظ کی اہمیت پر غور کرے، یہ نہ پوچھے کہ اقبالؔ نے یہ الفاظ اپنی عقل سے منصوبہ بنا کر اپنے کلام میں داخل کئے تھے، یا ازخود اور غیر شعوری طور پر یہ ان کے ذہن میں آئے تھے؟ لیکن اس سلسلے میں نکتہ بھی غور طلب ہے کہ کوئی شاعر کوئی مخصوص لفظ یا علامت اگر شعوری طور پر بھی اختیار کرتا ہے تو بھی اس کی نظر انتخاب اسی مخصوص لفظ یا علامت پر کیوں پڑتی ہے؟ اس کی مثال یوں ہے کہ کوئی شخص یہ فیصلہ کرتا ہے کہ میں سفر کروں گا۔ سمت اس کے ذہن میں متعین نہیں ہے، وہ صرف یہ کہتا ہے کہ کل میں سفر کروں گا۔ صبح اٹھ کر وہ (فرض کیجئے) شمال کی سمت میں چل دیتا ہے۔ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ سمت شمال کا انتخاب شعوری ہے، اس معنی میں کہ ہمارے مفروضہ شخص نے سفر کا ارادہ کیا اور شمال کی طرف چل نکلا۔لیکن سوال اصل میں یہ ہے کہ شمال ہی کیوں؟ جنوب کیوں نہیں؟ ظاہر ہے کہ شمال کا تعین ایک غیر شعوری تعین ہے (چاہے اس کے پیچھے کتنے ہی عوامل کیوں نہ کام کر رہے ہوں، تجربہ، حافظہ، مطالعہ، روایت وغیرہ) کیوں کہ اس نے شمال کا انتخاب کرتے وقت کسی عقلی اور منطقی اصول کو نہیں اختیار کیا تھا، اگر اس انتخاب کو عمل میں لانے والے کچھ خارجی محرکات (تجربہ، حافظہ مطالعہ، روایت وغیرہ) تھے بھی تو وہ لاشعور یا تحت شعور میں تھے۔ اسی طرح، کسی شاعر نے سوچا کہ میں علامت استعمال کروں گا (یعنی سفر کروں گا) پھر وہ ایک مخصوص علامت اختیار کرتا ہے (شمال کی طرف سفر کرتا ہے) ظاہر ہے کہ ارادہ اور تجویز کے باوجود علامت کا انتخاب غیر شعوری سرچشموں کی تحریک کا مرہون منت ٹھہرتا ہے۔

لہٰذا اگر یہ کہنا کسی کو برا لگے کہ شاعر علامتوں کا استعمال چاہے شعوری طور پر کرے یا غیر شعوری طور پر، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، تو ہم اس سے کہہ سکتے ہیں کہ آخری تجزیے کی روشنی میں علامت

کا ہر انتخاب غیر شعوری ہی ٹھہرتا ہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ اپنے مرثیے

بخدا فارس میدان تہور تھا حر

میں میر انیسؔ نے نور اور اس سے متعلق الفاظ کو کس طرح ایک استعاراتی نظام کے تحت استعمال کیا ہے۔ مسعود حسن رضوی ادیب کہتے ہیں کہ میر انیسؔ نے اپنے مرثیوں میں "نفس انسانی کی انتہائی شرافت کے نقشے جن مؤثر پیرایوں میں کھینچے ہیں ان کا جواب ممکن نہیں۔۔۔ حسینؑ اور رفیقانِ حسینؑ کی سیرتوں میں اخلاقِ حسنہ کی انتہا اس حُسن سے دکھائی ہے کہ وہ حُسنِ اخلاق کے محض خیالی معیار ہو کر نہیں رہ گئے، بلکہ قابلِ تقلید نمونے بن گئے ہیں"۔

یعنی میر انیسؔ نے حسینؑ اور اصحابِ حسینؑ کو خیر و خوبی کی تصویر بنایا ہے، ان کے کرداروں کی نقاب کشائی ہمارے سامنے اس طرح کی کہ وہ بہترین انسان معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن محض خیالی اور غیبی حیثیت سے نہیں، بلکہ انسان کی حیثیت سے، لہٰذا وہ قابلِ تقلید انسان ہیں، لیکن حُسن و خوبی کا مجموعہ ہیں۔ یہاں پر سوال اُٹھ سکتا ہے کہ انسان میں مجرد خوبی کے وہ کون سے خواص ہیں جو کرداروں کے ایک گروہ میں مشترک بھی ہوں اور ساتھ ہی ساتھ منفرد بھی ہوں، کم سے کم اتنے منفرد تو ہوں کہ جب ان کا ذکر کیا جائے تو یہ محسوس نہ ہو کہ یہ باتیں تو ہم فلاں فلاں کے بارے میں بھی سن چکے ہیں؟

میر انیسؔ کے سامنے یہ ایک بہت بڑا مسئلہ تھا۔ حسینؑ کی اختصاصی خوبیاں وہی تھیں جو ان کے اصحاب میں تھیں۔ فرق صرف درجے کا تھا، نوع کا نہیں۔ جگر گوشۂ رسولؐ ہونے کی ایک صفت ان میں ایسی تھی جو ان کے اصحاب میں سے کسی میں (کم از کم ان کی حد تک) نہ تھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس صفت کا اعادہ ہزار بار ممکن نہ تھا۔ شجاعت، حُسنِ اخلاق، ایثار، حق پرستی، ضبط و تحمل، ایمان، یہ صفات حسینؑ اور ان کے اصحاب میں مشترک تھیں۔ چند اوصاف ذاتی (مثلاً علی اکبرؑ کا حُسن اور نوجوانی، عونؑ و محمدؑ کی کم سنی، عباسؑ کی شجاعت، ان کی سکینہؑ سے محبت وغیرہ) جو بعض اصحاب میں تھے، وہ ایسے نہ تھے کہ ان پر کوئی ایسی شاعرانہ عمارت تعمیر ہو سکتی جو قائم بالذات ہونے کا شرف حاصل کر

سکتی۔ (ملحوظ رہے کہ میں یہ ساری گفتگو مرثیے کہ سیاق وسباق میں کر رہا ہوں، مذہب کے سیاق و سباق میں نہیں۔ مرثیے کی دنیا میں حسینؑ کے تمام اصحاب بہادر، کامل الایمان اور اعلائے کلمتہ الحق کے شرف سے مشرف تھے، ان کے مذہبی مرتبے سے کوئی بحث نہیں ہے۔) شاعر کا مسئلہ یہ تھا کہ اگر ہر ایک کی تلوار یکساں تیز، ہر ایک کا گھوڑا یکساں صبا رفتار اور ہر ایک کی شجاعت یکساں رشک رستم و اسفندیار دکھاتی ہے تو ایک دوسرے سے ممیز کیوں کر کیا جائے؟

ظاہر ہے کہ یہ امتیاز عملاً ممکن نہیں تھا، کیوں کہ میر انیسؔ کے مرثیے میں ہزار وسعت سہی، لیکن اتنی وسعت نہ تھی (اور نہ ان کا موضوع اس قسم کی وسعت کا متحمل ہو سکتا تھا) کہ وہ اپنے کرداروں کو ڈرامے یا ناول کے کرداروں کی طرح نمو کرتے دکھائیں، ان کی پیچ در پیچ ذہنی واردات کا تذکرہ کریں، اس طرح ایک کو دوسرے سے مفرق کریں۔ صرف یہ کہنا کہ حسینؑ اور ان کے اصحاب اچھے، بہت اچھے تھے۔ وہ بہادر، بہت بہادر تھے، وہ حق پرست، بہت حق پرست تھے، عقیدے کے اعتبار سے کتنا ہی درست سہی، لیکن شاعری کے اعتبار سے تکرار محض تھا۔ لہٰذا انیسؔ یا تو کم تر درجے کے مرثیے گویوں کی طرح فقط مراتب اور مقتضائے مقام کو نظر انداز کر کے حسینؑ کو کہیں مسکین، کہیں شیر، ان کے ساتھیوں کو کہیں ہراساں، کہیں غراں دکھاتے، یا پھر کوئی ایسی شکل وضع کرتے کہ ان کا مرثیہ، مرثیہ ہوتے ہوئے بھی ناول بن جاتا۔ یہ دونوں صورتیں ناممکن تھیں۔ ایسے موقع پر میر انیسؔ نے وہی کیا جو بڑا شاعر کرتا ہے۔ انھوں نے حسینؑ اور اصحاب حسینؑ کی خوبیاں اہل ظاہر کی خوشنودی کے لئے بیان کیں، اور انھیں الفاظ میں، جو ان خوبیوں کو ظاہر کرنے کے لئے ہم آپ استعمال کرتے ہیں، لیکن اصل قوت اور حُسن کے اظہار کے لئے انھوں نے یہ کیا کہ ان کرداروں کو علامتی رنگ میں رنگ دیا۔ ظاہر میں نظریں بھی مطمئن ہو گئیں اور شاعری کا حق بھی ادا ہو گیا۔ صرف یہ کہتے رہنے سے کہ حسینؑ اور ان کے اصحاب بہت اچھے لوگ تھے، وہ صورت حال ہرگز نہ پیدا ہوتی جس کی طرف مسعود حسن رضوی ادیب نے اشارہ کیا ہے۔ یعنی یہ کردار مثالی کردار بھی ہیں اور انسان بھی ہیں۔ محض خوبیوں کی فہرست گنانے سے ایک دو مرثیوں میں تو کام چل سکتا تھا لیکن ہر بار نہیں۔ ہر بار وہی باتیں کہنے سے عقیدہ تو مطمئن ہو جاتا لیکن شاعری خاک میں مل جاتی۔

میرا کہنا یہ ہے کہ میر انیسؔ نے اپنے بہترین مراثی میں حسینؑ اور اصحاب حسینؑ کے کرداروں کے لئے کوئی نہ کوئی مخصوص علامت استعمال کی ہے، اور وہ ہر جگہ استعمال ہوئی ہے ذکر چاہے براہ راست ہو بر سبیل تذکرہ۔ ان کی جنگ و حرب و ضرب کا بیان ہو یا ان کے اعمال واخلاق کا، وہ مخصوص علامت کسی نہ کسی پیرائے میں ضرور نمودار ہوتی ہے اور پورے تصور و تاثر کو منظم و متحد کرتی ہے۔

''بخدا فارس میدان تہور تھا حرؑ'' میں یہ علامت ''نور'' ہے۔ نور اور اس کے نظام سے منسلک الفاظ (خورشید، ماہ، ستارہ، برق وغیرہ) حسینؑ اور اصحابِ حسینؑ کی صفت میں استعمال ہوئے ہیں۔ نور سے منسلک ''نار'' کا تصور بھی ہے، لیکن جیسا کہ ملٹن کے دوسرے اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے ''نار'' اگر چہ روشن ہوتی ہے۔ لیکن ''روشنی'' نہیں ہوتی۔ بلکہ اس سے ایک طرح کا اندھیرا تراوش کرتا ہے۔ چنانچہ جہنم کے تذکرے میں ملٹن نے شعلوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ ان شعلوں سے روشنی نہیں بلکہ ایک طرح کی تاریکی منظور و مبصر تھی۔ (Not light, but rather darkness visible) نور کی تعریف قرآن میں جس طرح ہوئی ہے وہ پہلے اقتباس سے ظاہر ہے۔ اس تعریف کی باطنی تشریح میں برک ہارٹ اس بات کا ذکر کرتا ہے کہ یہ نور غیر مخلوق ہے، اس میں تمام ظہور شامل ہے، اور یہ وجود کے ہم معنی ہے۔ اسی نظریئے کا دوسرا رخ ملٹن کے پہلے اقتباس میں ملتا ہے جہاں وہ حضرت عیسیٰؑ کو نور کا نور اور محمول و مخلوق (یعنی نور کے انعکاس اور نور کی تاب کار Radiation کا سرچشمہ Coneeired light of light بناتا ہے) نور کا یہ تصور میر انیسؔ کے لئے نیا نہیں تھا۔ سفید و سیاہ، روشنی و تاریکی، یہ علامتیں قبل التاریخ سے ہی حق و باطل کے کسی نہ کسی تصور کے اظہار کے لئے مستعمل رہی ہیں۔ انجیل بھی نور و ظلمت کی علامتوں سے بھری پڑی ہے۔ شیطان کے علاوہ دوسری شخصیتوں کے بارے میں انجیل میں سیاہ روشنی یا اس سے ملتی جلتی علامتیں استعمال ہوئی ہیں۔ (وہ آوارہ ستارے جن کے حق میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تاریکی کی سیاہی لکھی ہے وغیرہ) لیکن نور کا مطلق تصور البتہ ایک طرح سے خالص اسلامی تصور ہے۔ (یعنی نور کا وہ تصور جو برک ہارٹ نے ابن عربی کے حوالے سے پیش کیا ہے) لہٰذا یہ میر انیسؔ کے لئے اور بھی مناسب و موزوں تھا۔

نور کا استعارہ مرثیہ زیر بحث کے پہلے ہی تین بندوں میں قائم ہو گیا ہے:

نارِ دوزخ سے ابوذر کی طرح حر تھا حر
(بنداول، مصرع ۳)

نار سے نور کی جانب اسے لائی تقدیر
(بندسوئم، مصرع ۱)

تیسرے بند کا دوسرا مصرع نار اور نور کے تقابل کو چھوڑ کر واضح استعارہ قائم کرتا ہے:

ابھی ذرّہ تھا ابھی ہو گیا خورشیدِ منیر

دوسرے بند کے پہلے مصرے میں ''شہ عرش پناہ'' کا ٹکڑا خورشید کے استعارے کی طرف اشارہ کرتا ہے کیوں کہ جب ایسے بادشاہ کی نظر کرم ہونے والی ہو جس کی پناہ میں خود عرش ہو (جو نور کا تخت ہے، عرش نشینی خدا کی صفت ہے اور خدا نور ہے) تو ظاہر ہے وہ شخص خورشید صفت نہ بنے گا تو کیا بنے گا؟ اور پھر صرف ''خورشید'' کہہ کر بات ختم نہیں کی ہے۔ نار سے کسی قسم کا علاقہ باقی نہ رہ جائے اس لئے لفظ ''خورشید'' کو ''منیر'' سے مستحکم کیا ہے۔ اب یہ گماں نہیں ہوسکتا کہ خورشید کا استعارہ کسی طرح کے التہاب کی طرف بھی اشارہ کناں ہوسکتا ہے۔ دوسرے ہی بند میں ''فردوس'' کا لفظ بھی آیا ہے:

پیشوائی کو گئے آپ شہ عرش پناہ
خضر قسمت نے بتا دی اسے فردوس کی راہ

اس کے بعد پانچویں بند میں پھر ''فردوس'' کا ذکر ہے:

حق نے لکھ دی تھی جو تقدیر میں فردوس کی سیر

فردوس کی راہ معلوم ہوئی، خورشید منیر بنا، فردوس کی سیر ہوئی۔ لفظ ''فردوس'' کے ساتھ نور کا تصور اسی طرح وابستہ ہے جس طرح ''جہنم'' کے ساتھ ''نار'' کا۔ کہا گیا ہے کہ فردوس میں روشنی ایک نہایت لطیف نور کی شکل ہوگی۔ نہ وہاں اندھیرا ہوگا نہ تمازت۔ اس کے بعد آٹھویں بند میں پھر اسی لطیف روشنی کی طرف اشارہ ہے:

دل صفا ہو گیا سینے میں تو پائے یہ شرف
جب کہ آنکھیں ہوئیں حق بیں تو ملا دُرِ نجف

دل، صفا، سینہ، آنکھیں، دُر، یہ الفاظ روشنی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ صفائے قلب صوفیوں کی اصطلاح ہے۔ جس کا مفہوم ہے دل کا آئینہ کی طرح متجلی ہو جانا۔ نویں بند میں نور کا استعارہ امام کی طرف براہِ راست منتقل ہوتا ہے:

مہرِ افلاکِ امامت نے کیا رن میں ظہور مصرع ۴

اے فلک دیکھ زمیں پر بھی ستارے نکلے مصرع ۶

دسویں بند میں یہ استعارہ پھیل کر اصحابِ حسینؑ کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے:

کیا کہوں شانِ جوانان جنود اللہ

کوئی ہم طلعتِ خورشید کوئی غیرتِ ماہ

تیرھویں بند میں پھر ایک اشارہ ملتا ہے جس طرح فردوس ایک اشارہ تھا:

پسرِ مصحفِ ناطق ہوں سنو میرا کلام

بظاہر مصحفِ ناطق بولتے ہوئے قرآن، یعنی حضرت علیؑ کا مفہوم رکھتا ہے۔ لیکن قرآن نے جگہ جگہ خود کو کھلی ہوئی کتاب اور روشن کتاب کا نام دیا ہے۔ لہٰذا پسر مصحف ناطق بھی روشنی کے استعارے پر دلالت کرتا ہے۔ اسی طرح، دُرِ نجف (بند ۸) کی مناسبت سے بند پندرہ میں:

یوں گہر بار ہوئے شہ کے لبِ گوہر بار

گوہر کا استعارہ فردوس کے دودھیا نور کی یاد دلاتا ہے۔ اگلے دو بندوں میں امام خود اپنے لئے نور کے استعارے استعمال کرتے ہیں۔

شمعِ ایماں ہوں اگر سر مرا کٹ جائے گا

یہ مرقع ابھی اک دم میں اُلٹ جائے گا

(بند ۱۶، مصرع ۵، ۶)

مجھ سے روشن ہے فلک مجھ سے منور ہے زمیں

(بند ۱۷، مصرع ۴)

ابھی نظروں سے نہاں نور جو میرا ہو جائے

محفلِ عالمِ امکاں میں اندھیرا ہو جائے

(بند۱۷،مصرع ۵،٦)

موتی کا استعارہ اٹھارھویں بند میں پھر موجود ہے:

قلزمِ عزّو شرف کا درِ شہوار ہوں میں

اکیسویں بند میں گھوڑے کے لئے ''برق'' کا استعارہ غیر متوقع طور پر استعمال ہوا ہے، اور آئندہ پھر اسی قسم کے الفاظ گھوڑے اور تلوار کی صفت میں لائے گئے ہیں:

تھام سکتا تھا لجام فرس برق مثال

بیچ کے کچھ بند امام اور حر کے پہلے مقابلے کے بیان میں ہیں اس کے بعد حر نے امام کی مدح میں زبان کھولی ہی ہے کہ نور کے استعارے جابہ جا نظر آتے ہیں:

ذرہ پرور جنھیں کہتے ہیں وہ خورشید ہیں یہ

(بند۳۳،مصرع٦)

مثل خورشید ہے روشن وہ شرف ان کا ہے

(بند۳۴،مصرع ۵)

یہ دونوں مصرعے ہمیں تیسرے بند محولہ مصرعے کی یاد دلاتے ہیں:

ابھی ذرہ تھا ابھی ہو گیا خورشیدِ منیر

اب پھر کئی بندوں میں اور عمر سعد کی گفتگو بیان ہوئی ہے حر جہاں جہاں امام کے مناقب بیان کرتے ہیں وہاں استعاروں کا وہی نظام موجود ہے:

ہاں مجھے شاہ نے فردوسِ بریں بخشا ہے

(بند۴۵،مصرع ۲)

عشق آنکھوں کا ہے مردُم کے لئے نورِ نگاہ

ہے وہ یوسف جسے ہو مصحف رخسار کی چاہ

(بند۵۰،مصرع ۳،۴)

عاشقِ لب کو خدا لعل و گہر دیتا ہے

(بند۵۰،مصرع۶)

وصف دنداں میں زباں جس کی رہے گوہر بار

موتیوں سے دہن اس شخص کا بھر دے غفار

حوریں غرفوں سے دکھائیں اسے رنگِ رخسار

(بند۵۲،مصرع۴،۵،۶)

چشم کو اس کی زیارت سے جلا ہوتی ہے

(بند۵۳،مصرع۶)

''جلا ہوتی ہے'' کا پیکر خاص طور پر لائق توجہ ہے۔ موتی پر جلا ہوتی ہے اور آئینۂ دل پر بھی۔ آنکھ آئینہ بھی ہے اور موتی بھی۔

اصحابِ حسینؑ میں سے اب تک کسی کا ذکر نہیں آیا تھا۔ بند۶۴ میں عباسؑ علم دار کا نام آتے ہی وہی استعارہ موجود ہو جاتا ہے:

ہنس کے عباسؑ سے فرمایا کہ اے غیرتِ ماہ

(مصرع۲)

حر اور امام کی ملاقات ہونے پر حر کی زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہیں:

مہر ذرّے پہ جو ہو نیّرِ تاباں ہو جائے

(بند۵۷،مصرع۲)

مہر اور نیّر کی رعایت لفظی سے قطع نظر یہاں پھر بند سوم کا خیال دھرایا گیا ہے:

ابھی ذرہ تھا ابھی ہو گیا خورشیدِ منیر

چند رسمی باتوں کے بعد حر میدان جنگ کی طرف جاتے ہیں۔ اوپر میں اشارہ کر چکا ہوں کہ گھوڑے کے لئے برق کا استعارہ جو بند۲۱ میں استعمال ہوا ہے، اس کا التزام آگے بھی ہوگا۔ لہٰذا حر کے جنگی ساز وسامان کے ذکر میں ہم پڑھتے ہیں:

خود رومی کی جو ضو تا بہ فلک جاتی تھی

چشمِ خورشید میں بجلی سی چمک جاتی تھی

(بند۸۷، مصرع ۵،۶)

اس کے بعد:

آفتابی وہ سپر جس سے خجل گردہ ماہ
تیر ترکش میں نہ تھے آگ کے پرکالے تھے

(بند۸۸، مصرع ۴،۶)

حر کا میدان جنگ میں ورود ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

تتق نور سر راہ نظر آتا ہے
جلوہ قدرتِ اللہ نظر آتا ہے

(بند۸۹، مصرع ۵،۶)

اس کے آگے کے کئی بند ان استعاروں سے بھرے پڑے ہیں:

غل تھا آتا ہے ملک پہنے ہوئے خلعتِ نور

(بند۹۰، مصرع ۴)

ذرہ خاک کو خورشید کیا اک دم میں
نور یہ حور میں دیکھا نہ بنی آدم میں

(بند۹۱، مصرع ۲،۳)

مہر ذرہ ہے جہاں چہرہ روشن ایسا
چاند بھی جس سے کرے کسب ضیاتن ایسا

(بند۹۲، مصرع ۱،۲)

مجھ کو خورشید کیا نور خدا کی ضو نے
نور بخشا قمر فاطمہ کے پرتو نے

(بند۹۴، مصرع ۱،۲)

رخ روشن کو مرے تکتے ہو کیا حیرت سے
نور وہ ہے جسے دیکھیں نظر رغبت سے
(بند۹۵،مصرع۱،۳)

قمر برج امامت کو غنیمت جانو
نور خالق کی زیارت کو غنیمت جانو
(بند۹٦،مصرع۳،۴)

حر کی جنگ کے بیان میں پھر یہی استعارے ہیں:

شعلہ تیغ سے بجلی کی چمک گرد ہوئی
(بند۹۸،مصرع۱،۲)

برقِ شمشیر سے ڈر ڈر کے فرس بھی چمکے
(بند۹۹،مصرع۱،۲)

تلوار کے لئے یہ استعارہ کثرت سے استعمال ہوا ہے:

آگ برسانے کو بجلی سوئے جنگاہ چلی
(بند۱۰۱،مصرع۲)

شور تھا برق پئے جلوہ گری نکلی ہے
(بند۱۰۲،مصرع۵)

ایک بجلی تھی مگر لاکھ جگہ گرتی تھی
(بند۱۰۵،مصرع٦)

برق کہتی تھی کہ تلوار ہے یہ یا میں ہوں
تیغ کرتی تھی اشارہ یہ چمک میری ہے
(بند۱۰۷،مصرع۲،۴)

تھی چمک جانے میں بجلی تو پری چال میں تھی
(بند۱۰۹،مصرع۴)

بیچ کے بندوں میں تلوار کے لئے روشنی سے متعلق استعارے کم سے کم چار بار اور آئے ہیں۔

اس کے بعد حر کی شہادت کے بیان میں کہا گیا ہے کہ اے حر:

نزع میں نور الٰہی کی زیارت کر لے

(بند۱۲۹،مصرع۶)

نورالٰہی سے یہاں امام مراد ہیں، حر آگے کہتے ہیں:

فرش سے عرش تلک نور نظر آتا ہے

(بند۱۳۱،مصرع۶)

اس طرح حر نے مرثیے کے شروع میں نار سے نور کی طرف جو سفر شروع کیا تھا اس کا اختتام ہوتا ہے۔

یہاں یہ سوال اُٹھ سکتا ہے کہ امام حسینؑ اور ان کے اصحاب کے لئے نور اور ان کی تلواروں کے لئے نور سے متعلق استعاروں میں کوئی ایسی ندرت بظاہر نہیں ہے کہ ان پر مرثیے کی قوت کا دار و مدار بتایا جائے۔تشبیہ و استعارہ کی بہت سی ندرتیں اس مرثیے میں موجود ہیں، ہم کیوں نہ ان پر اپنی بحث قائم کریں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نور اور برق وغیرہ کے علاوہ اس مرثیے میں یقیناً اور بھی استعارے ہیں، ظاہر ہے کہ میر انیسؔ کا کلام استعاروں سے بھرا پڑا ہے۔لیکن اس بحث کا مقصد صرف یہ ظاہر کرتا ہے کہ سفید و سیاہ، حق و باطل، میمنہ اور میسرہ کے دو فریقوں کی کردار نگاری اگر محض اوصاف کے سہارے کی جاتی تو بات محض تکرار تک محدود رہ جاتی۔ ایک گروہ کو نور کے وسیع استعارے سے منور کر کے میر انیسؔ نے یہ مشکل آسان کر دی۔دوسرے یہ کہ کسی اور استعارے کی تکرار مرثیے میں نہیں ہے۔ ہر طرف نور ہی نور کا تذکرہ ہوا ہے۔ رہا سوال نور کے استعارے میں ندرت نہ ہونے کا، تو اس سلسلے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ اگر یہ علامت اتنی ہی پیش پا افتادہ اور سہل الحصول ہوتی تو دوسرے مرثیہ گو اس کو کیوں نہ اختیار کرتے؟ ظاہر ہے کہ جس باقاعدگی اور Consistency سے میر انیسؔ نے اس مرثیے میں یہ علامت استعمال کی ہے اس کی مثال ہر جگہ نہیں مل سکتی۔لیکن زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس علامت کی مبینہ پیش پا افتادگی اس کے طویل پیچیدہ معنوی پس منظر میں کوئی معنی نہیں رکھتی۔ علامت یا علامتی استعارے کے لئے ندرت کی شرط اتنی اہم نہیں جتنی یہ شرط کہ اس کا تعلق ہمارے معاشرے، تہذیب یا اجتماعی لاشعور سے بہت قریبی

اور گہرا ہو۔ لفظ ''نور'' کے جو مفاہیم میں نے اوپر بیان کئے ہیں وہ پیش پا افتادہ نہیں ہیں بلکہ ایک مخصوص تہذیبی روایت میں جاری و ساری ہیں۔ اگر ان مفاہیم کو نظر انداز کر دیا جائے تو یقیناً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس مرثیے میں اور کیا ہے، صرف چند قمقمے روشن ہیں لیکن ظاہر ہے کہ ایسا کرنا شاعری کے ساتھ انصاف نہ ہوگا۔ ہمیں یہ پتہ لگانا ہے کہ شاعر نے کسی مسئلے کا حل کیا نکالا ہے؟ اور جو حل نکالا ہے اس کی قوت کا راز کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ ان دونوں سوالوں کے جواب میں یہی کہنا ہوگا کہ نور کی علامت اور اس کے مفاہیم کی دورس میں جڑوں نے اس زمین کو اس قدر معنی خیز بنا دیا ہے۔

بالکل یہی بحث تمام اچھی شاعری کی علامتی تفہیم کے سلسلے میں کی جا سکتی ہے۔ علامت چاہے ذاتی ہو چاہے اجتماعی، اس کا مفہوم اس مخصوص نظام ہی کے حوالے سے سمجھا جا سکتا ہے جو اس علامتی شاعری نے خلق کیا ہے۔ اس نکتے میں جدید شاعری کے نکتہ چینیوں کے لئے فکر کے کئی گوشے پوشیدہ ہیں۔ (افلا تعقلون)

سیّد غلام امام ایڈوکیٹ مرحوم
انگریزی سے ترجمہ : سیّد احمد امام

موازنہ انیسؔ و شیکسپیئر

موازنہ انیسؔ و شیکسپیئر ایک ندرت ہے جو کہ حقیقت پر مبنی ہے یہ موازنہ انیسؔ سے والہانہ محبت کا نتیجہ ہے بلکہ ان کے کلام کی بلندی کا مسلّم الثبوت اظہار ہے جو کہ مغربی دنیا کے مشہور و معروف شاعر سے موازنہ ہی کے ذریعہ کیا جاسکتا ہے۔ میں شیکسپیئر کا انتخاب اس مقصد کے لئے ذہن میں اس وقت سے کرتا رہا جب میں کالج میں شیکسپیئر کو اپنے کورس میں ہونے کی وجہ سے پڑھتا تھا اور ہر سال محرم میں کلام انیسؔ سے مجالس میں محظوظ ہوتا تھا۔ یہ بات کھٹکتی رہی کہ یہ مغربی شاعر اور ڈرامہ نگار انیسؔ سے مشابہ ہے۔ شیکسپیئر کے گہرے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی گئی اور اس موضوع پر تحقیق نہ کرنا کوتاہی معلوم ہونے لگی۔

اگر موازنہ منصفانہ ہو تو قابل دید و شنید ہے ورنہ تنگ خیالی کی تصویر بن جاتا ہے اور تہذیب و ادب کے معیار پر نہیں اترتا۔ اسی لئے میں نے اس کی کوشش کی کہ انیسؔ اور ان کے ہیرو کی عظیم محبت جو میرے دل میں ہے مجھے بہکا نہ دے اور شیکسپیئر کے ساتھ ناانصافی میرے دامن پر دھبہ نہ بن جائے جبکہ اس موازنہ کے بغیر ہی دونوں مانے ہوئے عظیم شعراء ہیں اور چاند و سورج کی طرح ان کے کلام کی کرنیں اب تک ادبی دنیا میں دوسروں کو چکا چوند کر رہی ہیں۔

شیکسپیئر انیسؔ سے تین سو سال قبل پیدا ہوا اور انیسؔ اور ان کی سوسائٹی انگریزی ادب کے ان جواہر پاروں سے بالکل نابلد تھے۔ دونوں میں وہ تمام باتیں ہیں جو کہ ایک کو دوسرے سے مختلف بنا سکتی ہیں رنگ و نسل کی تفریق مذہب و ملت ملک اور زمانہ کا بعد ترتیب مزاج اور زندگی بسر کرنے کے طریقوں میں دونوں ایک دوسرے سے بہت متضاد اور علیحدہ ہیں انیسؔ کربلا کے واقعات میں مستغرق شرح محمدی کے پابند شیکسپیئر مغربی تہذیب اور تمدن اور آزاد خیالی کا پیکر اور ڈرامہ نگاری کے

علاوہ اسٹیج پر جا کر کچھ ایکٹنگ بھی کرنا پسند کرتا تھا۔ اس تمہید قلیل کو مدنظر رکھتے ہوئے اب پہلے یہ ملاحظہ کیجئے کہ دونوں شعراء کا ادب اور اپنے کلام کو کس معیار پر پہنچانے کا نظریہ اس کے پیش نظر ہے۔

کلام کا معیار

Shakespeare:

" Suit the action to the word, the word to the action; with this special observance, that you overstep not the modesty of nature;

شیکسپیئر:۔ جو لفظ ہو وہ واقعات کا آئینہ دار ہو اور نیچر کے حقائق اور واقعات اپنے الفاظ میں نہ کم ہوں نہ زیادہ۔ اور ایسی تصویر الفاظ بنائیں کہ نیچر اس آئینہ میں اپنی حقیقت دیکھ لے۔

انیسؔ:۔

وہ مرقع ہو کہ دیکھیں اسے گر اہلِ شعور
ہر ورق میں کہیں سایہ نظر آئے کہیں نور
غل ہو یہ ہے کششِ مو قلمِ طُرّہ کہ حور
ایک اک حرف میں ہو صنعتِ صانع کا ظہور
کوئی ناظر جو یہ نایاب نظیریں سمجھے
نقشِ ارژنگ کو کاواک لکیریں سمجھے

قلمِ فکر سے کھینچوں جو کسی بزم کا رنگ
شمعِ تصویر پہ گرنے لگیں آ آ کے پتنگ
صاف حیرت زدہ مانی ہو تو بہزاد ہو دنگ
خوں برستا نظر آئے جو دکھاؤں صفِ جنگ
رزم ایسی ہو کہ دل سب کے پھڑک جائیں ابھی
بجلیاں تیغوں کی آنکھوں میں چمک جائیں ابھی

تو یہ تنافر کلمات اور یہ دہن
جملے صحیح شستہ ورفتہ ہر اک سخن
پھولا ہوا فصاحت الفاظ کا چمن

تقریر وہ سمجھ لیں جسے صاف مرد و زن
معنی کا بھی یہ حال ہے حسنِ قبول سے
خوشبو سحر کو جیسے نکلتی ہے پھول سے

اسی مضمون پر شیکسپیئر پھر کہتا ہے

ارے تمہارا آرٹ اور نیچر اس قدر مشابہ ہیں کہ تفریق نہیں ہوتی اور سلاست کا مسکن تمہارا کلام ہے۔
انیسؔ نے جس تشریح سے کسی کلام کی خوبی کا معیار بیان کیا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔

زنداں میں ایک شہزادہ

Shakespeare:

But now will canker sorrow eat my bud,
And chase the native beauty from cheeks
And he will look as hollow as a ghost,
And dim and meagre as an ague's fit.
And so him die.

شیکسپیئر:- اب غم اسے کھائے جا رہا ہے اور اس کے حُسن کے چہرے پہ اب کچھ نشانیاں ہی رہ گئی ہیں۔ گھل گھل کر جسم زار سے اب روح ناتواں کا گماں ہوتا ہے۔ موت ہی کا صرف انتظار ہے۔

انیسؔ:-

کاہیدہ تھے مثل تن مدقوق تن زار
ہر موئے بدن جسم پہ تھا کوہ گراں بار
رکتا تھا جو دم زیست سے دق تھے وہ گرفتار
معلوم یہ ہوتا تھا کہ برسوں کے ہیں بیمار
باقی تھا فقط تارِ نفس سینے کے اندر
اک بال ہو جس طرح سے آئینے کے اندر

اسی مضمون کو شیکسپیئر پھر یوں ادا کرتا ہے۔

So thin, that life looks through, and will break out.

نقاہت کا یہ عالم تھا کہ جسم سے روح جھانکنے لگی تھی اور نکلنے ہی والی تھی۔

سورج

Shakespeare:

"The sun is overcast with blood, fair day adieu".

شیکسپیئر:-

سورج خون سے ڈوبا ہوا ہے۔ اے وقت الوداع۔

انیسؔ:-

تھا بس کہ روزِ قتل شہ آسماں جناب
نکلا تھا خوں ملے ہوئے چہرے پہ آفتاب

تھکا مسافر

Shakespeare:-

Then thou shalt see the dew-bedabbled wretch
Turn, return, indenting the way,
Each shadow makes him stop, each murmur stay,
For misery is trodden on by many
And being low, never relieved by any.

شیکسپیئر:-

اے غریب مسافر تو چل رہا ہے، رات بھر ہر سایہ سے بھڑکتا ہے، ہر آواز سے رک جاتا ہے، غربت میں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا اور سب چلے جائیں اور کوئی تجھے تھامے گا بھی نہیں۔

انیسؔ:-

غربت میں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا
شمعیں بھی جلاؤ تو اُجالا نہیں ہوتا

دکھ دیتے ہیں اک ایک قدم پاؤں کے چھالے
منزل پہ پہنچنے کے بھی پڑ جاتے ہیں لالے
ہاتھوں سے اگر بیٹھ کے کانٹوں کو نکالے

ڈر ہے کہ نہ بڑھ جائیں کہیں قافلے والے

درماندوں کو لینے کو بھی آتا نہیں کوئی
تھک کر اگر بیٹھے تو اٹھاتا نہیں کوئی

دم لیتے کبھی گاہ قدم جلد اُٹھاتے
سہمے ہوئے مڑمڑ کے کبھی دیکھتے جاتے
تنہائی پہ آنکھوں سے کبھی اشک بہاتے
گر پڑتے کبھی اور کبھی ٹھوکریں کھاتے

چڑھ جاتے نقاہت سے جو دم ہانپنے لگتے
سایہ نظر آتا تو بدن کانپنے لگتے

طلائی تاج

Shakespeare:-
Whilse that his mountain sire, on mountain standing
Up in the air, *crowned with the golden sun,-*

شیکسپیئر:-
وہ پہاڑی پر کھڑا ہوا تھا اور آفتاب کا طلائی تاج سر پر تھا۔
انیسؔ:-

پرتو فگن تھا نور رسالت مآب کا
سر پر لگا تھا چترِ زری آفتاب کا

سونے کے پھول

Shakespeare:-
Look how the floor of heaven
Is thick inlaid with patines of bright gold

شیکسپیئر:-
دیکھو صحن جنت طلائی نقش و نگار سے مزین ہے۔

انیسؔ:-

ذرّے نہ تھے زمین پہ سونے کے پھول تھے۔

مٹی اور سونا

Shakespeare:-

All that glitters is not gold
Often have you heard that told;
Many a man his life had sold,
But my outside to behold
Gilded tombs do worms infold.

شیکسپیئر:-

ہر چمک دار شے سونا نہیں ہوتی۔

اکثر سنا ہوگا کہ طلائی مقبروں کے اندر صرف کیڑے ہوتے ہیں۔

انیسؔ:-

کچھ خارِ مغیلاں گلِ تر ہو نہیں جاتا
قلعی سے کچھ آئینہ قمر ہو نہیں جاتا
ہر قطرۂ ناچیز گہر ہو نہیں جاتا
مس پر جو ملمع ہو تو زر ہو نہیں جاتا

جس پاس عصا ہو اسے موسیٰ نہیں کہتے
ہر ہاتھ کو عاقل یدِ بیضا نہیں کہتے

Shakespeare:-

But all hoods make not monks:
Hiding base sins in plaits of majesty.

شیکسپیئر:-

پادری کو چغا پہن لینے سے تقدس نہیں ملتا۔

شاہی لباس سے اپنے گناہوں کو چھپائے ہوئے ہے

انیسؔ :-

خلعت پہن کے بھی نہ رذالت کی بو گئی۔

خوشبو تعارف کی محتاج نہیں

Shakespeare:-

To guard a title that was rich before,
To gild refined gold, to paint the lily,
To throw a perfume on the violet
To smooth the ice, to add another hue
Unto the rainbow, or with taper light
To seek the beauteous eye of heaven to garnish,
Is wasteful and ridiculous excess.

شیکسپیر :-

اعلیٰ لقب اظہار کا محتاج نہیں۔کھرا سونا کیا پرکھا جائے ،خوشبودار پھولوں پر عطر لگانا حماقت ہے۔چراغوں سے آسمان روشن نہیں کیئے جاتے۔

انیسؔ :-

خورشید کو کچھ حاجتِ زیور نہیں زنہار
پھولوں پہ کوئی عطر لگائے تو ہے بیکار
اعلیٰ ہے اگر جنس تو کیا حاجتِ اظہار
خود مشک ہو خوشبو نہ کہ خوشبو کہے عطار

جو بد ہے سو بد ہے جو نکو ہے سو نکو ہے
چھپنے کی نہیں آپ اگر عود میں بو ہے

انسان

Shakespeare:-

What a piece of work is man!
How noble in reason ! how infinite in faculties !
In form and moving; how express and admirable!
In action, how like an angle ! in apprehension, how

like a
a god! The beauty of the world !
Paragon of animals ! and yet to me,
What is this quintessence of dust.

شیکسپیئر:-

انسان بھی کیا نمونہ قدرت ہے۔کیسی بے پناہ صلاحیت اس میں چھپی ہے۔چال ڈھال ہر ایک سے اعلیٰ ہے۔عمل میں فرشتہ خصلت سمجھداری خداداد ایسی کہ خدا ہونے کا دھوکا ہو جائے۔خلق کا تمام حُسن انسان میں ہے مگر میں یہ سوچتا ہوں یہ سب صرف ایک مشت خاک ہی تو ہے۔

انیسؔ:-

آدم کو عجب خدا نے رتبہ بخشا
ادنیٰ کے لئے مقام اعلیٰ بخشا
عقل و ہنر و تمیز و جان و ایماں
اس ایک کفِ خاک کو کیا کیا بخشا

معرفتِ الٰہی

Shakespeare:-
This our life exempt from public haunt,
Finds tongues in trees, books in running brooks,
Sermons in stones and g od in everything.

شیکسپیئر:-

زندگی میں وعظ چشمے سے ملے گا جو بہہ رہے ہیں
درخت یوں کھڑے ہیں جیسے کچھ بول رہے ہوں
پتھروں میں معرفت جم گئی ہے
ہر شے میں خوبیاں ہیں

انیسؔ:-

اسی کا نور ہر اک شے میں جلوہ گر دیکھا

اسی کی شان نظر آ گئی جدھر دیکھا

ہر برگ سے قدرتِ احد پیدا ہے
ہر پھول سے صنعتِ صمد پیدا ہے

گلشن میں پھروں کہ سیرِ صحرا دیکھوں
یا معدن و کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

لحنِ داؤدؑ

Shakespeare:-

Orpheus, with his lute, made trees
And the mountain tops that freeze
Bow themselves, when he did sing:
To his music plants and flowers
Ever sprung; as sun and showers
There had made a lasting spring
Everything that heard him play,
Even the billows of the sea,
Hung their heads, and then lay by,
In sweet music is such art;
Killing care and grief of heart
Fall asleep or hearing die.

For Orpheu's lute was strung with poets sinews,
Whose golden touch could soften steel and stones,
Make tigers tame, and huge leviathans
Forsake unsounded deeps
To dance on sands.

شیکسپیئر:-

اس کے ساز کی آواز کو درخت اور کہسار جھک کر سنتے تھے، پودے اور پھول یہ سریلی آواز کو سن کر نکل آتے تھے اور بہار آ جاتی تھی، ترنم سے سمندر بھی اثر پذیر ہوتا تھا اور فکریں اور غم مٹ جاتے

تھے۔ نیند آ جاتی تھی جیسے موت کی نیند

انیسؔ:-

سجادے بچھ گئے عقبِ شاہ انس و جاں
صوتِ حسن سے اکبرِ مہرو نے دی اذاں
ہر ایک چشم آنسوؤں سے ڈبڈبا گئی
گویا صدا رسولؐ کی کانوں میں آ گئی

چپ تھے طیور جھومتے تھے وجد میں شجر
تسبیح خواں تھے برگ و گل و غنچہ و ثمر
محوِ ثنا کلوخ و نباتات و دشت و در
پانی سے منھ نکالے تھے دریا کے جانور
اعجاز تھا کہ دلبرِ شبیر کی صدا
ہر خشک و تر سے آتی تھی تکبیر کی صدا

یہ حُسنِ صوت اور یہ قرات یہ شدّ مد
حقّا کہ افصح الفصحا ہے انہیں کا جد
گویا ہے لحنِ حضرتِ داؤدِ با خرد
یا رب رکھ اس صدا کو زمانے میں تا ابد
شعبے صدا میں پنکھڑیاں جیسے پھول میں
بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسولؐ میں

Shakespeare:-

Twenty Caged nightingles sing.

شیکسپیئر:-

بیس ۲۰ بلبلیں چہک رہی ہیں پنجرے میں

انیسؔ:-

نیچر میں توازن

Shakespeare:-

Nature, what things they are
Most abject in regard and dear in use,
What things again most dear in esteem and poor in
worth!
O ! mickle is the powerful grace that lies
In herbs, plants, stones, and their true qualities:
For naught so vile that on the earth doth live
But to the earth some special good doth give
Nor aught so good but, strained from their fair use,
Revolts from true birth, stumbling an abuse;
Virtue itself turns vice, being misapplied;
And vice sometimes by action dignified.
Within the infant rind of this small flower
Poison hath residence and medicine power;
For this, being swelt, with that part cheers each parts;
Being tasted slays all all senses with the hearts.

شیکسپیر:-

زندگی میں ہر شے ہر موقع کے اعتبار سے استعمال کیئے جانے کے لئے ہے، کچھ چیزیں بہت عزیز ہوتی ہیں مگر دام میں حقیر۔ پودے، جڑی بوٹی، رنگ ایک ایک شے اپنے مقام و محل پر انمول ہے۔ اچھائی برائی میں بدل جاتی ہے اگر بے محل ہو۔ برائی سے اکثر اچھائی ہو جاتی ہے۔ پھول میں زہر بھی ہے اور امراض کی شفا بھی۔ متضاد صفات برمحل استعمال سے کارآمد ہو جاتی ہیں۔

انیسؔ:-

ہے کجی عیب مگر حسن ہے ابرو کے لئے
تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لئے
سرمہ زیبا ہے فقط نرگس جادو کے لئے

زیب ہے خالِ سیہ چہرۂ گلرو کے لئے

داندآں کس کہ فصاحت بہ کلامے دارد
ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

تعریف

Shakespeare:-

O Queen of Queens
How dost thou excel,
No thought can think
No tongue of mortal tell.

شیکسپیئر:-

اوملکہ زماں کیا کہنا تیرا تیری خوبیوں کو خیال تک سوچ نہیں سکتے اور زبان بشر تیری توصیف سے عاجز ہے۔

انیس:-

نورِ خدا کی مدح بشر کی ہے کیا مجال
پہنچا کہیں نہ خیلِ ملک کا جہاں خیال
اوصافِ آل میں فصحا کی زباں ہے لال
ناقص کو ہاں اگر وہی چاہے تو دے کمال
برسوں لکھے تو وصفِ ائمہ بیاں نہ ہو
ہر موئے تن زباں ہو توشمہ بیاں نہ ہو

منقبت

Shakespeare:-

And When he was babe, a child a shrimp
Thus did he strangle serpents in his manus.

شیکسپیئر:-

جب وہ چھوٹا بچہ تھا تو اکثر گہوارے میں سانپ مٹھی میں پکڑ لیتا تھا اور گرفت اس کی ایسی تھی کہ سانپ مر جاتے تھے۔

انیس:-

طفلی میں جوانوں کے کیئے کام علیؑ نے
گہوارے میں اژدر کو بھی چیرا ہے کسی نے

ترحُم

Shakespeare:-

The quality of mercy is not strained
Its droppeth as the gentle rain from heaven
Upon the place beneath: It is twice blest
It blesses him that gives and him that takes
It is mightiest: It Becomes
The throned monarch better than his crown
His sceptre shows the force of temporal power
The attribute to awe and majesty,
Wherein doth sit the dread and fear of kings;
But mercy is above this sceptered sway
It is enthroned in hearts of kings,
It is an attribute to God Himself
And earthly power doth then show
When mercy seasons justic.

شیکسپیئر:-

رحم آسمانی جنس ہے اور ابر باراں کے مانند آسمان سے زمین پر آتا ہے۔ جس پر رحم کیا جائے۔ سلوک کیا جائے احسان کیا جائے وہ بھی اس جذبہ اعلیٰ و عرفہ سے فیض یاب اور جو اس لائق ہو کہ سلوک کر سکے احسان کر سکے وہ بھی سبب میں انتخاب ہو جاتا ہے کرم فرمائی کی خصلت نیک ہے۔ یہ احدی خصوصیات میں سے ہے اور بادشاہوں میں اس جذبہ کا ہونا اس کے تاج شاہی سے زیادہ زیبائش و آرائش کا سبب بن جاتا الوہی کردار کا پرتو اس جذبہ ترحم سے زیادہ کہیں نہیں ملتا۔ انصاف

میں اس کی آمیزش لائق تحسین ہے۔

انیسؔ:-

ایک میں کیا ہوں زمانے پہ ہے احساں ان کا
ابرِ رحمت ہیں خطا پوش ہے داماں ان کا
خشک و تر پر ہے کرم خلق میں یکساں ان کا
ہے خوشا بخت جو غربت میں ہو مہماں ان کا
ان سے قطرہ کوئی مانگے تو گہر دیتے ہیں
ہیں سخی ابن سخی بات پہ سر دیتے ہیں

شہ نے فرمایا کہ خالق کی عنایت ہے یہ سب
دے کسی شخص کو بندے میں یہ مقدور ہے کب
اس مسبّب کی عنایت کے یہ سارے ہیں سبب
وہی منعم وہی محسن وہی رازق وہی رب
اپنے کیسے سے نہ ہم دام و درم دیتے ہیں
جب وہ خالق ہمیں دیتا ہے تو ہم دیتے ہیں

لاکھ ہاتھ اس کے ہیں دینے کے وہ ایسا ہے جواد
ہم اسے بھولیں تو بھولیں وہ ہمیں رکھتا ہے یاد
رزق وہ حوصلۂ حرص سے دیتا ہے زیاد
شکر کرتے نہیں معبود کا اس پر بھی عباد
وہ غنی ہے کہ ہے محتاج زمانہ اس کا
کبھی خالی نہیں ہوتا ہے خزانہ اس کا

جس قدر اس سے طلب کیجیئے خوشنود ہے وہ
صاحب جود ہے وہاب ہے محمود ہے وہ

ہاتھ پھیلائے جو سو بار تو موجود ہے وہ
بخش دیتا ہے کہ ہم عبد ہیں معبود ہے وہ
پرورش جرم پہ بھی صبح و مسا ہوتی ہے
یاں سے ہوتی ہے خطا واں سے عطا ہوتی ہے

آنسو

Shakespeare:

He has strangled
His language in his tears.

شیکسپیئر:-

اس کے آنسو اس کی زباں بن گئے۔

انیسؔ:-

گردن جھکا دی تا نہ ادب میں خلل پڑے
قطرے لہو کے آنکھوں سے لیکن نکل پڑے

تفکّر اور پشیمانی

Shakespeare:-

My lord, we have
Stood here observing him: some strange commotion
Is in his brain: he bites his lips, and starts;
Stops on a sudden, looks upon the ground,
Then lays his finger on his temple; straight
Springs out into fast gait; then, stops again,
Strikes his breast hard; and anon, he casts
His eyes against the moon: in most strane postures
We have seen him set himself:
It may well be there is mutiny in his mind.

شیکسپیئر:-

میرے سرکار میں نے اس کوغور سے دیکھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس دماغ میں غیر معمولی الجھن ہے۔ وہ اپنے ہونٹ چباتا ہے اور اک دم سے اچھل پڑتا ہے۔ پھر ساکت ہو جاتا ہے اور بغور زمین کی طرف دیکھنے لگتا ہے اور ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کچھ سوچنے لگتا ہے اور یک بیک تیزی سے چلنے لگتا ہے اور پھر ساکت ہو جاتا ہے، کبھی داڑھی کھینچتا ہے اپنی کبھی سینے پر ہاتھ مارتا ہے ماتم اور افسوس میں اور کبھی چاند کی طرف دیکھنے لگتا ہے اور ایک جگہ قرار نہیں ہے جیسے دماغ میں اس کے خیالات باہم فساد اور جھگڑے میں مبتلا ہوں۔

انیسؔ:-

اپنے بے چوبے میں بیٹھا تھا حرؑ باتوقیر
سامنے رکھی تھی مسند کے سپر پر شمشیر
دست و پا میں کبھی رعشہ کبھی حالت تغیر
کبھی نالے تھے زباں پر کبھی ہے ہے شبیرؑ
تپ غم دل میں ، دہن تلخ، شکن ابرو پر
ہاتھ ماتھے پہ کبھی تھا کبھی سر زانو پر

کبھی اٹھا کبھی بیٹھا کبھی ٹہلا وہ جری
گرم آہیں کبھی کیں سرد کبھی آہ بھری
قلب میں تھی کبھی سوزش کبھی درد جگری
سخن یاس کبھی لب پہ کبھی نوحہ گری
آلِ احمدؐ کی صدا سن کے تڑپ جاتا تھا
دم بدم خیمے سے گھبرا کے نکل آتا تھا

متحیر متردد متفکر بے چین
یہ دعا تھی کہ بچے فاطمہؑ کا نورالعین

نوٹ: (یہ میر مونس کے بند ہیں)

ایک ماں کے بین

Shakespeare:-

When yet he was but tender bodied and
My only son, of my womb,
When youth with comeliness plucked all gaze his way;
When for a day of kings entreaties
A mother should not sell him an
Hour from her beholding; I, considering
How honour would become such a person,
than it was no
Better than picture-like to hang by the wall, if renown
made
It not stir, was pleased to let
Him seek danger where he was
Like to find fame. To a cruel
War I sent him; from whence
He returned his brows bound with
Oak. I sprang not more in joy
At first hearing he was manchild
Then now in first seeing he had
Proved himself a man.

شیکسپیئر:- میرے بچے آرتھر تیرے بعد تیرا غم ہے، تیرے کمرے میں رہتا ہے تیرا غم، تیرے بدلے تیرے بستر میں سوتا ہے اور میرے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ تیری طرح کبھی تیری حسین صورت میں تیرا غم میرے سامنے آتا ہے اور مجھے تیری پیاری پیاری حرکتیں یاد دلاتا ہے۔ اب تیرے غم جدائی کو تیرے کپڑے پنھاں دے میرے پیارے بچے میری زندگی، میرا چین، میری غذا میری دنیا کی لذت میرے رنڈاپے کا سہارا میرے غموں کا درماں۔

انیسؔ:-

چلائی بے حواسی میں بانوئے خستہ جاں
دیکھو تو بیبیو کہ ہے اصغرؔ مرا کہاں
دل پر سکینہ جان کے صدمے گزر نہ جائیں

بچے مرے دہل کے اندھیرے میں مر نہ جائیں

پھرتا تھا گھٹنیوں ابھی یاں میرا نونہال
بچے کا مرے صاحبو رکھیو ذرا خیال
کہنے لگی یہ زینبؑ بیکس بصد ملال
کس کی تلاش میں ہو کہاں ہے تمہارا لال
ملتا نہیں ہے پھر جسے ہاتھوں سے کھوتے ہیں
تم جن کو ڈھونڈھتی ہو وہ جنگل میں سوتے ہیں

چھاتی کو پیٹ کر یہ پکاری وہ سوگوار
لو جانتی تھی میں کہ یہیں ہے وہ گلعذار

ہے ہے مرے شفیق پسر مہرباں پسر
خوش رو پسر سعید پسر قدرداں پسر
مادر کا چین باپ کا آرام جاں پسر
کم گو پسر شہید پسر نوجواں پسر
مقتل کدھر ہے کوئی بتاتا نہیں مجھے
اے نورِ عین کچھ نظر آتا نہیں مجھے

گھوڑے کا سراپا و غصّہ

Shakespeare:-

Imperiously he leaps, he neighs, he bounds,
The bearing earth with his hard hoof he wounds,
His ears pricked up; his braided hanging mane
Upon his compassed crest now stand on end;
His nostrils drink the air, and forth again,
As from furnace, vapours doth he send;
His eye, which scornfully glisters like fire,
Shows his hot courage and high desire,
Sometimes he trots, as if he told the steps,

With gentle majesty, and moderate pride;
Anon he rears upright; curvets and leaps,
Look when a painter would surpass the life,
In limning out a well proportioned steed,
His art with nature's woskmanship at strife
As if the dead the living should exceed;
So did this horse excel a common one
In shape, in courage, colour, pace and bone.
Round hooped, short jointed, fetlocks shag and long,
Broad breast, full eye, small head, and mostril wide,
High crest, short ears, straight legs, and passing
Thin mane, thick tail, broad buttocks, tender hide;
Anon he starts at stirring of a feather;
To bid the wind a base he now prepares.

شیکسپیئر:- وہ (گھوڑا) دوڑتا ہے اور ٹاپوں سے زمین کے سینے کو زخمی کیئے دیتا ہے کنوتیاں مل گئیں ہیں ایال کے بال غصہ سے کھڑے ہیں۔ نتھنوں سے فراٹے کی آواز آتی ہے جیسے تنور سے گرم دھواں نکلتا ہے، آنکھیں غصہ سے انگارہ ہیں۔ بلند ہمتی اور امنگ سے لہک رہا ہے، کبھی تو آہستہ روی سے چلتا ہے جس میں شاہانہ چال کی جھلک ہے کبھی جست کرتا کبھی شائستہ ہونے کا ثبوت دیتا کوئی مصور بھی اپنے تخئیل سے اس حسن کا گھوڑا نہیں بنا سکتا، عام سے جدا ہے، چوڑا سینہ، بڑی آنکھ، چھوٹا سر، بڑے نتھنے، چھوٹے کان، بڑے پٹھے، موٹی دُم، ایک پیر سے چابک کا کام لیجیئے۔

انیسؔ:-

سیماب تھا ہوا تھا چھلاوا تھا راہوار
اس کو نہ چین تھا نہ اسے ایک جا قرار
قربانِ ذوالجناحِ شہنشاہ نامدار
جاتا تھا یوں حریف کے گھوڑے پہ بار بار
جس طرح جائے شیرِ گرسنہ غزال پر
ہر بار تھیں کلائیاں گھوڑے کی یال پر
ملتی ہوئی کنوتیاں، لال آنکھیں، منہ میں کف

بجلی سا اس طرف تھا کبھی گاہ اس طرف
حیراں تھی اس کی تیز روی پر اُدھر کی صف
نتھنوں سے تھی نفس کی صدا یا شہِ نجف
ظالم سے معرکہ جو پڑا تھا لڑائی کا
مطلب یہ تھا کہ وقت ہے مشکل کشائی کا

قربان اس تگاورِ ضیغم شکار کے
پامال کر دے شیر کو ٹاپوں سے مار کے
شائستگی کو پوچھ لو دل سے سوار کے
چاہے تو ایک طفل چڑھے باگ اتار کے
رکھ دے قدم تو رنگ نہ میلا ہو پھول کا
پیارا فرس ہے راکبِ دوش رسولؐ کا

سینہ کشادہ تنگ کمر چست جوڑ بند
گردن میں خم ہلال کا اور اس پہ سربلند
جاں دار بردبار عدوکش ظفر پسند
بجلی کسی جگہ کہیں آہو کہیں پرند
سرعت ہے ابر کی تو لطافت ہوا کی ہے
اتنے ہنر فرس میں یہ قدرت خدا کی ہے

وہ جست و خیز و سرعت و چالاکیٔ سمند
سانچے میں تھے ڈھلے ہوئے سب اس کے جوڑ بند
سم قرص ماہتاب سے روشن ہزار چند
نازک مزاج شوخ و سیہ چشم و سربلند
گر ہل گئی ہوا سے ذرا باگ اڑ گیا
پتلی سوار کی نہ پھری تھی کہ مڑ گیا

اختصار

Shakespeare:

Brevity is the soul of wit.,

شیکسپیئر:-

اختصار روحِ سخن ہے۔

انیسؔ:-

بس اے انیسؔ طول سے بہتر ہے اختصار

زندگی

Shakespeare:-

Why, what is pomp, rule, reign, but earth and dust!
And, live we how we can, die we must.

شیکسپیئر:-

یہ زندگی کیا ہے شان شوکت حکومت سب ایک دن خاک میں ملیں گے۔ زندگی جیسے بھی بسر ہو انجام موت ہے۔

انیسؔ:-

درپیش ہر بشر کو ہے یہ ناگزیر راہ
نے موت سے فقیر بچے گا نہ بادشاہ

شادی ہو کہ اندوہ ہو آرام ہو یا جور
دنیا میں گزر جاتی ہے انساں کی بہرطور

سردار کا خطبہ

Shakespeare:-

Rightly to be great
Is not to stir without great argument,
But greatly to find quarrel in a straw
When honour is at the stake.

شیکسپیئر:-
بلند کردار کی نشانی یہ ہے کہ انسان اعلیٰ ظرف ہو مگر جب عزت و وقار کو ٹھیس لگے تو معمولی بات جان دینا صحیح ہے۔

انیسؔ:-

عجلت کو جانتے ہیں سبک جو ہیں بردبار
بے وقت دوڑتے نہیں ذی قدر و ذی وقار
دیکھو تماشا فوج کی کثرت ہے بے شمار
باجے بجا کے کھولیں گے رایت ستم شعار
جلدی نہ کچھ گرچہ لڑائی میں دیر ہو
تم تو خدا کے شیر کے شیروں کے شیر ہو

فصاحت و بلاغت

Shakespeare:-

I had rather be a kitten and cry mew.
Than one of those same meter ballad-mongers;
I had rather bear a brazen candle-stick turned,
Or a dry wheel grate on the axle-tree:
And that would set my teeth nothing on edge,
Nothing so much as mincing poetry:-
It is like the forced gait of a shuffling nag.

شیکسپیئر:-
میں بلی ہونا پسند کروں گا اور میاؤں میاؤں کروں گا بہ نسبت اس کے کہ ایک تُک بند شاعر اور ردیف قافیہ اور بحر کا ماہر شاعر گنا جاؤں جس میں لطف سخن اور شگفتگی نہ ہو۔

انیسؔ:-

نمکِ خوانِ تکلّم ہے فصاحت میری
ناطقے بند ہیں سن سن کے بلاغت میری
رنگ اڑتے ہیں وہ رنگیں ہے عبارت میری
شور جس کا ہے وہ دریا ہے طبیعت میری
عمر گزری ہے اسی دشت کی سیّاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیرؑ کی مدّاحی میں

ایک قطرے کو جو دوں بسط تو قلزم کردوں
بحرِ موّاجِ فصاحت میں تلاطم کردوں
ماہ کو مہر کروں ذرّے کو انجم کردوں
گنگ کو ماہرِ اندازِ تکلّم کردوں
دردِ سر ہوتا ہے بے رنگ نہ فریاد کریں
بلبلیں مجھ سے گلستاں کا سبق یاد کریں

قناعت

Shakespeare:-

My crown is in my heart, not on my head;
Not decked with diamonds, and Indian stones,
Nor to be seen: my crown is called content;
A crown it is that seldom kings enjoy.

شیکسپیئر:-

میرا تاج سر پہ نہیں ہے دل میں ہے اس میں ہیرے اور ہندوستانی جواہرات نہیں لگے ہیں نہ وہ تاج دیکھا جا سکتا ہے۔ میرا تاج قناعت ہے یہ تاج بہت کم شہنشاہوں کو نصیب ہے۔

انیسؔ:-

یہ اوج یہ مرتبے ہما کو نہ ملے   یہ دلق مرصع امرا کو نہ ملے

بخشی ہے خدا نے مجھے وہ دولت فقر   برسوں ڈھونڈھے تو بادشاہ کو نہ ملے

مرقد

Shakespeare:-

If I must die.
I will encounter darkness as a bride, and hug it in my arms.

شیکسپیئر:-

اگر میں مروں تو قبر سے عروس کی طرح ہمکنار ہوں گا اور بصد شوق اپنی بانہیں قبر کے اندھیرے کے گلے میں ڈال دوں گا۔

انیس:-

مر مر کے مسافر نے بسایا ہے تجھے
رخ سب سے پھرا کے منہ دکھایا ہے تجھے
کیونکر نہ لپٹ کر تجھ سے سوؤں اے قبر
میں نے بھی تو جان دے کے پایا ہے تجھے

شیکسپیئر ایک مشرقی صوفیانہ انداز میں قبر کے بارے میں لکھ رہا ہے اور ایسا توارد انیس سے حیرت انگیز ہے۔

Shakespeare:-

For death remembered should be like a mirror
Who tells us life is but breath, to trust it error.

شیکسپیئر:-

موت وہ آئینہ ہے کہ جس میں اگر ہم زندگی کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ دنیا ایک جھونکا ہے اور اس کا اعتبار ایک عظیم غلطی ہے۔

انیس:-

نمود و بود کو عاقل حباب سمجھے ہیں
وہ جاگتے ہیں جو دنیا کو خواب سمجھے ہیں

کمینے دشمن کی طعن

Shakespeare:-

Was it you that would be king of England?
Was it you that revelled in our parliament,
And made a preachment of your high descent?
Where are your mess of sons to back you now?
The wanton Edward and the lusty George
And where is that valiant crook-back prodigy
Dicky your boy, that with his grumbling voice
Was wont to cheer his dad in mutinies ?
Or with rest, where is your darling Rutland
Look York: I stained this napkin with the blood,
That valiant Cliford, with his rapiers point,
Mad issue from the bosom of the boy;
And if thine eyes can water for his death,
I give thee this to dry thy cheeks withal.
Alas poor York! but that I hate thee deadly
I should lament thy miserable state.
I pray thee grieve, to make me merry York,
What, hath thy fiery heart so parched thine entrails,
That not a tear can fall for Rutland's death?
Why art thou patient, man? Thou should be mad;
And, I, to make thee mad, do mock thee thus.
Stamp, rave, and fret, that I may sing and dance.
Thou wouldest be fee'd, I see, to make me sport;
York cant speak unless he wear a crown
A crown for York! and lords bow low to him;
Hold you his hands whilst I do set it on.

شیکسپیئر کیا تم ہی انگلینڈ کے بادشاہ تھے اور اپنی اعلی نسبی پر بد دماغ تھے اور تمہاری آواز سے تمہاری پارلیمنٹ گونجتی تھی۔ ارے تمہارے لڑکے سب کہاں ہیں۔ ایڈورڈ اور جارج جو بڑے چھبیلے، بانکپن جن پر ختم تھا ڈکی تمہارا لڑکا کیا ہوا جس کی گرج دار آواز سے تمہارا دل بڑھتا تھا اور رٹلینڈ کہاں۔ میں

نے اس کے خون میں یہ رومال ڈبو دیا ہے اور بہادر کلی فورڈ کہاں ہے جو بات بات پر تلوار کھینچ لیتا تھا۔اس خونی رومال سے اپنے آنسو پونچھ لو۔تمہاری آنکھوں سے آنسو نہیں بہہ رہے ہیں۔ارے رنج سے پاگل ہو جاؤ تا کہ میں خوشی سے ناچوں۔

انیسؔ:-

بڑھ کر پکارا شمر کہ یاور کدھر گئے
پیدل ہیں آپ کیوں وہ دلاور کدھر گئے
عباسؑ کیا ہوئے علی اکبرؑ کدھر گئے
اے فاطمہؑ کے لال وہ گوہر کدھر گئے
جویا پسر کا صورت یعقوب کون ہے
غلبہ ہے کس کی فوج کو مغلوب کون ہے

تھا روم و شام جنگی زبردستیوں سے زیر
اب آپ کی مدد کو نہیں آتے وہ دلیر
اس دشت کیں میں دوڑتے تھے جو مثالِ شیر
شاید انہیں کی لاشوں کے ہیں خاک پر یہ ڈھیر
سر سب کے پاش پاش ہیں تن ریز ریز ہیں
تلواریں کیا یزید کے لشکر کی تیز ہیں

دیکھو تو کس کے سینہ میں برچھی کا ہے یہ پھل
اٹھارویں برس میں کسے کھا گئی اجل
دولھا کے خواب کرنے کا کیا تھا یہی محل
دریا پہ کس کی لاش پڑی ہے وہ منہ کے بل
محتاج بعد مرگ جو گور و کفن کے ہیں
کس نخل کے ثمر ہیں یہ گل کس چمن کے ہیں

آنکھیں

Shakespeare:

Admirable ! how this grace
Speaks his own standing ! what a mental power
This eye shoots forth. How big immagination
Move this lip ! to the dumbness of gesture
One might interpret.

* * * *

From women's eyes this doctrine I derive,
They sparkle still the right Promethean fire;
They are the books, the arts, the academies,
That show, contain, and nourish all the world,
Else, none at all in aught proves excellent.

* * * *

These eyes, that now are dimmed with death's black veil,
Have been as piercing as the midday sun,
To search the secret treasons of the world.

* * * *

Faster than his tongue
Did make offence, his eye did heal it up.

* * * *

Thou tellest me, there is murder in mine eye;
This is pretty, sure, and very probable,
That eyes--that are the frailest and softest things,
Who shut their coward gates on atomies:-
Should be called tyrants, butchers, murderers.

شیکسپیئر:-

اس کی آنکھیں جو کہ فردوس بریں کے جواہرات کی مانند ہیں۔اس کی سنہری پلکوں کی چلمن جب ذرا اٹھتی ہے تو دُنیا اُن بیش بہا ہیروں سے جگمگا اٹھتی ہے۔

میں نے اُس کی آنکھ سے یہ سیکھا ہے کہ جہنم کی آگ کو بھی وہ ماند کرسکتی ہے۔آنکھیں کھلی ہوئی کتابیں ہیں۔پُرفن ہیں کتب خانوں کے علوم جیسے ان میں پنہاں ہیں اور دنیا کی زندگی میں سارے لطف اور کیف کی حامل ہیں۔بس ساری دنیا آنکھیں ہیں۔

تم کہہ رہے ہو کہ میری آنکھوں میں خون اور قتل کا ارادہ اُبل رہا ہے یہ ہوسکتا ہے حالانکہ آنکھیں سب اعضاء سے ضعیف وناتواں اور نازک ہیں بزدلی سے ذرا سے جھونکے سے بند ہوجاتی ہیں۔مگر

آنکھوں کو قاتل درندہ اور خونخوار بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایسے رنگ بدلتی ہیں۔

ان آنکھوں پر اب موت نے گہرے پردے ڈال دیئے ہیں زندگی میں ان کی چمک آفتاب نصف النہار کی چمک دکھا دیتی تھی اور تاریک پردوں میں چھپے ہوئے فتنوں پر ان کی روشنی پڑ جاتی تھی۔

اس کی آنکھیں اس کی زبان درازی کے زخموں کا مرہم وعلاج زخم لگتے ہی کر دیتی تھیں۔

انیسؔ:-

یاں دیدۂ آہو بھی نگاہوں سے گرے ہیں
آنکھیں ہیں کہ دو شیر نیستاں میں کھڑے ہیں

پتلی کا رعب سب پہ عیاں ہے خدائی میں
بیٹھا ہے شیر پنجے کو ٹیکے ترائی میں

روئے ہیں فرقتِ شۂ عالی جناب میں
نرگس کے پھول تیر رہے ہیں گلاب میں

تصویرِ رسولؐ عربی دیکھ رہے ہیں
آنکھوں کی ہے گردش کہ نبیؐ دیکھ رہے ہیں

ڈورے جو سرخ سرخ ہیں چشم سیاہ میں
پھرتی ہیں خوں بھری ہوئی تیغیں نگاہ میں

اس چشم میں پتلی سے عجب جلوہ گری ہے
پلکیں یہ نہیں نور کی چلمن میں پری ہے

آنکھوں کو کہیئے عین تو عین خطا ہے یہ
پردے نہ کیوں ہوں سات کہ نورِ خدا ہے یہ
سب کو ہے چشم داشت کہ عین عطا ہے یہ

بیمار خود پہ سب کے مرض کی دوا ہے یہ
سر خوش ہے جام ان کی جو الفت کا پی گیا
دیکھا نگاہِ لطف سے جس کو وہ جی گیا

احسان بھی حیا بھی مروت بھی قہر بھی
خود موت بھی حیات بھی امرت بھی زہر بھی
بینا بھی نکتہ سنج بھی دانائے دہر بھی
تسنیم بھی بہشت بھی کوثر کی نہر بھی
سرشرم سے جھکائے ہے نرگس ریاض میں
جنّت سواد میں یدِبیضا بیاض میں

آہو شکار و تیروکماں دارو شیر گیر
ہشیار و خوش نگاہ و سخن سنج و دلپذیر
خونریز و جاں فریب و دلآویز و بے نظیر
قبضے میں ابروں کی کمانیں مژہ کے تیر
جس سادہ دل کو ان کی سیاہی کی یاد ہو
ناخواندہ بھی اگر ہو تو روشن سواد ہو

ذرّہ نواز و زہد نما صاحب امتیاز
طنّاز و شرمگین و گراں خواب و سرفراز
حق بین و پاک باز و خدا بین و بے نیاز
بیدار و داغ دادہ و خوں بار و غم طراز
گرد اس کے پھر یہ کعبۂ ایماں کا طوف ہے
بس اے انیس بس نظرِ بد کا خوف ہے

خوبصورت جوان اور جنگ

Shakespeare:-

By Jupiter, an angle ! or, if not,
An earthly paragon! Behold divineness
No elder than a boy.

شیکسپیر:-

ارے دیکھو یہ فرشتہ ہے کہ کوئی افضل ترین صفات کا مالک بشر ہے
اس کمسنی میں یہ تکمیل فضائل ___ اللہ اللہ

انیسؔ:-

حیران تھا لشکر یہ ملک ہے کہ بشر ہے

اٹھارہ برس کا تو سن اور صاحبِ توقیر
تھا شور کہ انساں ہے کہ ہے نور کی تصویر

دو بہادر بچّے

Shakespeare:-

How Hard it is to hide the sparks of nature:
These boys know little they are sons to the king;
Nor Cymbeline dreams they are alive,
They think they are mine; and though trained up thus meanly

شیکسپیر:-

وہ ایسے شریف اور نیک تھے کہ ان کے خصائل نسیم سحری سے ملتے تھے اور ان کے وجیہہ چہرے غصہ سے آشنا نہ ہوتے تھے مگر جب ان کے شاہی وقار کو ٹھیس لگ جاتی تو وہ ان تیز رفتار آندھیوں کی مانند ہو جاتے جو کہ پہاڑوں کی چوٹیوں کو جھکا دیتی ہیں وادیوں کے دامن میں

انیسؔ:-

جد و پدر کی طرح جری تھے دلیر تھے
بچے تھے یوں پہ غیظ جو آئے تو شیر تھے

عزّت و وقار

Shakespeare:-

By Jove, I am not covetous of gold,
Nor care, I who doth feed upon my cost,
It yearns me not, if men my garments wear;
Such outward things dwell not in my desires:
But if it be a sin to covet honour,
I am the most offending soul alive.

شیکسپیئر:-

واللہ میں زر و جواہر کا طالب نہیں ہوں اور کون مجھ سے کیا لیتا ہے چاہے میری دولت ہو یا میری بیش قیمت قبائیں ہوں مجھے ان سب کی پروا نہیں ہے، اگر حصولِ عزت و وقار گناہ ہے تو مجھ سے بڑا گنہگار کوئی نہیں ہے۔

میری عزت ہی میری زندگی ہے عزت ختم ہو جائے تو موت ہے

سب کو زندگی پیاری ہے مگر عاقل کو عزت عزیز ہے۔

انیسؔ:-

میں حشمتِ دنیا کی تمنا نہیں رکھتا
قطرے کی طمع فیض کا دریا نہیں رکھتا
اعلیٰ جو ہے ادنیٰ کی وہ پروا نہیں رکھتا
پتّے سے علاقہ سرِ طوبیٰ نہیں رکھتا

کافر کی طرف صاحب ایماں نہیں جاتے
بت خانہ میں کعبہ سے مسلماں نہیں جاتے

خورشید کو محتاجی ذرّہ نہیں ذرا
دیندار سدا کرتے ہیں کافر پہ تبرّا
ظالم ترے حاکم کو ہے کس بات کا غرّا

اسلام سے عاری ہے تو ایماں سے معرّا
قاروں کا خزانہ ہو تو عزت نہیں ملتی
دولت سے کمینے کو شرافت نہیں ملتی

دولت نہیں ، انسان کی کچھ قدر بڑھاتی
دنیائے دنی کام کسی کے نہیں آتی
گو فقر ہو عالی نسبی پر نہیں جاتی
بینا جو ہیں وہ دیکھتے ہیں جوہرِ ذاتی
محتاجی سے کم رتبۂ عالی نہیں ہوتا
عزت وہ خزانہ ہے جو خالی نہیں ہوتا

شبنم

Shakespeare:-

And that same dew, which sometimes on the buds
Was wont to swell, like round and orient pearls,
Stood now within the pretty flow'rets' eyes.
Like tears, that did their own disgrace bewail.

* * * *

I must go seek some dew-drops here,
And hang a pearl in every cowslips ear.

شیکسپیئر:-

شبنم کلیوں پر مشرق کے بیش بہا موتیوں کی طرح آویزاں تھی۔ شبنم پھولوں میں بھر گئی تھی جیسے آنسو ہوں جو پھول آنے والی خزاں کے تصور میں اپنی آنکھوں میں بھر لائے تھے۔

میں جا کر شبنم کے قطرے تلاش کرتا ہوں تا کہ ہر پھول میں موتی لگا دوں۔

انیسؔ:-

شبنم کے وہ گلوں پہ گہر ہائے آبدار

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزا ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

اس دشت میں روتی تھی جو شبنم شہ دیں پر
تھا موتیوں کا فرش زمرّد کی زمیں پر

وہ گل کے کٹوروں پہ در افشانیٔ شبنم

ہیرے خجل تھے گوہر یکتا نثار تھے
پتّے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار
پھولوں پہ جا بجا وہ گہر ہائے آبدار

خواہاں تھے نخل گلشن زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے

اوس نے فرش زمرّد پہ بچھائے تھے گہر

اس طرح تھا عرق رخ پُر آب و تاب پر
جیسے پڑے ہوں قطرۂ شبنم گلاب پر

دوساتھی

Shakespeare:-

In which array brave soldiers doth he lie
Larding the pain; and by his bloody side,
The noble earl of Suffolk also lies.
Suffolk first died: and York all haggled over,
Comes to him, where in gore he lay insteeped,
And takes him by the beard, kisses the gashes
That bodily did yawn upon his face;

And cries aloud, Tarry dear cousin Suffolk!
My soul shall thine keep company to heaven:
Tarry, sweet soul, for mine, then fly a breast,
As in this glorious and well faughten field
We kept together in chivalry!
Upon these words I came and cheered him up;
He smiled me in the face, raught me his hand,
And with a feeble grip, says, Dear my lord,
Commend my service to my sovereign
So did he turn and over Suffolk's neck
He threw his wounded arm, and kissed his lips,
And so spoused to death, with blood he sealed.

شیکسپیئر:-

ارل سفوک زخمیوں کی صف میں زخموں سے چور پڑے تھے اور عالم فانی کو خیر باد کہہ چکے۔ یارک بھی قریب ہی زخموں سے چور ان کی لاش پر آئے اور ان کے زخموں کو چوما اور چلائے کہ اے ابن عم ذرا ٹھہر جاؤ۔ میری روح تمہاری رفاقت کرے گی سفر جنت میں ذرا رک جاؤ ابن عم ساتھ چلیں گے جیسے ساتھ اس میدان میں بہادری سے لڑے۔ یہ کہہ کر یارک نے بانہیں سفوک کے گلے میں ڈال دیں اور موت میں ساتھی بن گئے۔ میں جو پہنچا تو کہا بادشاہ سے میری وفاداری کا تذکرہ کرنا اور ہلکی مسکراہٹ چہرہ پر آ ئی۔

انیسؔ:-

(حضرت عون و محمد کی شہادت پر حضرت امام حسینؑ، حضرت عباسؑ، حضرت علی اکبرؑ دونوں کی لاشیں اٹھانے پہنچے ہیں)

پہنچے یہ تین شیر جو مقتل میں ایک بار
کیا پیدلوں کا ذکر فراری ہوئے سوار
ریتی پہ شہ کو یوں نظر آئے وہ گلعذار
بند آنکھیں منھ کھلے ہوئے ہونٹوں پہ جان زار
دنیا سے وقت کوچ بھی دونوں کا ساتھ تھا
گردن میں ایک بھائی کے بھائی کا ہاتھ تھا

قربانی

Shakespeare:-

Why, then God's soldier be he!
Had I as many sons as I have hairs,
I would not wish them to fairer death:
And so his knell is knolled.

شیکسپیئر:-

خدا کی راہ میں میرا بیٹا ایک سپاہی ہے
اگر مجھے اللہ میرے بالوں سے زیادہ تعداد میں بیٹے دیتا تو بھی اس موت سے انہیں نہ روکتا۔
ارے میرا بیٹا اب ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔

انیسؔ:-

اکبرؔ تھا تو وہ کیا تھا اگر ہم ہیں تو کیا ہیں
سَو ایسے جو بندے ہوں تو خالق پہ فدا ہیں

غم تھا جو سر اس راہ میں فرزند نہ دیتا
کیا کرتے اگر وہ ہمیں فرزند نہ دیتا

ہیں مبتلائے رنج، بھلا کیا ہمارا پیار
تم سے جو سو پسر ہوں تو اس راہ میں نثار

پرچم

Shakespeare:-

Where the Norwegan banners flout the sky
And fan our people cold.

شیکسپیئر:-

نارویجین پرچم آسمان کو چھو رہے ہیں اور ہمارے قلوب تو ساکت ہیں اس شکوہ پر

انیسؔ:۔

غازی کی وہ شوکت و شکوہِ علمِ نور
کہتی تھی یہ گیتی کہ انا الطور انا الطور
پرچم تھا کہ بکھرے ہوئے تھے موئے سرِ حور
ہم پنجہ ہو پنجے سے ہے کیا مہر کا مقدور
سب فوجِ ملائک کی نظر اس سے لڑی تھی
اوڑھے ہوئے اک سبز ردا حور کھڑی تھی

مندرجہ بالا موازنہ سے چند نتائج ضرور اخذ کرنا چاہئیں۔ اولاً تو شیکسپیئر اور انیسؔ میں جو مشابہت ہے وہ ایک سرسری نظر سے بھی نگاہ کرنے سے نظرانداز نہیں کی جاسکتی۔ بہت سے مقامات پر انیسؔ کا کلام شیکسپیئر کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے اور اکثر و بیشتر انیسؔ اور شیکسپیئر کے خیالات اور کسی موضوع پر طریقۂ فکر جو دونوں شعراء اختیار کرتے ہیں وہ حیرت انگیز طور پر یکساں ہے اور یہ یگانگت ایک نفسیاتی مسئلہ دلچسپ بھی بن جاتی اور اس پہلو پر بھی نگاہ فکر سے دیکھنا پڑتا ہے۔ تو یہ موازنہ عقل انسانی کو متحیّر کرنے کے لئے کافی ہے اور دماغ بے ساختہ خلاقِ عالم کی وحدانیت کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ ایک ہی مصوّر کی تصویروں میں مشابہت کا پایا جانا مقامِ تحیّر اور تفکّر نہیں۔ یہ نتیجہ اسلامی رنگ کے لئے ہوئے ہے اور شاید یہ کہا جائے کہ یہ مذہبی مذاق سلیم کا نتیجہ ہے۔ یہ بات اس لئے سامنے آئی کہ انیسؔ محض اپنے مذہبی پیشوا کے تذکرہ کو ہی قابل ذکر و فکر سمجھتے ہیں یا یوں کہہ دیا جائے کہ جیسے شکلوں میں شباہتیں ہیں جو کہ ملک اور زمانے کی پابند نہیں اسی طرح دماغوں اور خیالات کی مشابہتیں مگر اعلیٰ دماغ جو کہ مالک کی دین ہے یا نایاب اور کمیاب ہوتا ہے جب بھی کسی کو ملتا ہے تو اس کے طریقۂ فکر مشابہت میں ڈوبے ہوتے ہیں۔

شیکسپیئر نے جو اپنے لیئے ادب کا معیار رکھا ہے وہ انیسؔ سے مختلف نہیں ہے۔ تفریق یہ ہے کہ انیسؔ اپنے کلام کی نوک و پلک سنوار کر اسے ایسا پختہ اور معیاری حسب مرضی بنا گئے اور شیکسپیئر اس کوشش میں اکثر و بیشتر ناکام رہ جاتا ہے۔ کلام انیسؔ اور شیکسپیئر کی مثال ایک حسینہ و جمیلہ اور ایک قبول صورت عورت کی سی ہے۔ انیسؔ میں حُسن کا پہلو مل جائے گا اور کلام کا کوئی گوشہ متوازن اور

جمیل ہے مگر شیکسپیئر کا کلام کچھ مقامات پر ایسا اعلیٰ ہے کہ مثال انیسؔ میں نظر نہیں آتا مگر یہ حال تمام کلام کا نہیں ہے۔ خامیاں ہیں بدنمائیاں ہیں۔ داغ دھبہ ہیں جو جمال کو کامل نہیں ہونے دیتے آنکھوں کی تعریف میں انیسؔ نے کوئی گوشہ کسی کے لئے نہیں چھوڑا ہے۔ شیکسپیئر اس تعریف میں بدمست ہو جاتا ہے اور انیسؔ توازن کا پیکر بنے رہتے ہیں۔ یہ قصور آنکھوں کا ہے کہ شیکسپیئر کا؟ انیسؔ نے یہ ثابت کیا کہ قصور اکثر ہمارا ہی ہوتا ہے۔

پڑھیں درود نہ کیوں دیکھ کر حسینوں کو
خیالِ صنعتِ صانع ہے پاک بینوں کو

یہ فلسفہ شیکسپیئر کے یہاں نہیں ملتا ہے زورِ طبع کی روانیاں فلسفہ نہیں بن سکتیں وحدانیت کا اعتراف اور یقین نظم کے سنوارنے میں جیسے انیسؔ نے استعمال کیا ہے اس سے شیکسپیئر بے بہرہ ہے گھوڑے کی تعریف میں شیکسپیئر کا کلام جو اوپر ترجمہ کیا گیا ایک گوہر نایاب ہے مغربی ادب کی دنیا میں اور انیسؔ نے اس جانور میں جو حسن دیکھا ہے اور جس والہانہ انداز سے اسے بیان کیا ہے اور اس سے نہ تو ان کے وقار کو ٹھیس لگتی ہے اور نہ کہ ان کا ہیرو اور اس کا تذکرہ کسی طرح ماند پڑتا ہے بلکہ سوار کی شوکت گھوڑے کی شان دیکھ کر سمجھ میں زیادہ آنے لگتی ہیں۔ یہ ایک قومی متوازن ذہن کی فکر کا نتیجہ ہے اور معمولی عقلیں ضرور بہک جائیں۔ یہ میدان ایسا ہے۔ شیکسپیئر کے ملک کے ایک نقاد نے کہا ہے کہ شیکسپیئر گھوڑے کی تعریف میں شاعری کرتے ہوئے اس معیار سے گر گیا اور معلوم ہوتا ہے کہ کوئی گھوڑا بیچنے والا اپنے گھوڑے کو بیچنے کے لئے اس کی تعریف بڑھا چڑھا کر کر رہا ہے۔ انیسؔ پر یہ الزام کوئی نہ عائد کر سکا حالانکہ اس کے ہر مرثیہ میں گھوڑے کی تعریف لا کلام ہوتی ہے صبح کے مناظر میں الفاظ کا استعمال بے مثال اور طرّہ یہ کہ منظر کشی اس غم انگیز افسانے میں اور درد بھر دیتی ہے جبکہ انیسؔ نہ تو واقعات کو گھٹا سکتے ہیں نہ زورِ بیان سے بڑھا سکتے۔ حدود تاریخ میں رواں ہیں اور ہر روایت کے خدوخال کو صرف دلچسپ انداز سے بیان کرنا ان کا کام ہے۔ کمی و بیشی ان کے نہ بس کی ہے نہ ان کا مسلک و مذہب ہے جس کے وہ سخت پابند ہیں۔ ان پابندیوں میں کلام کو شاعری کے بلند ترین منازل تک پہنچانا صرف ایک عظیم الشان دماغ اور اس کے استعمال کا نتیجہ ہے۔ شیکسپیئر نے تاریخی ڈرامہ لکھے ہیں مگر وہ اپنی آزادی کسی پابندیوں کے ہاتھوں کھوئے ہوئے نہیں ہیں۔ ہر جگہ اس تخئیل آزاد کا استعمال ہے مگر اب انیسؔ سے توازن اور بلندی میں کم رہ جاتا ہے تو یہ اسی لئے

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے یہ ایک دلچسپ تر نفسیاتی مسئلہ بھی ہے۔ مذہبی پیشوا روکھے پھیکے ہوتے ہیں بلند ترین اصولوں میں ان کے اعمال جکڑے ہوئے ہوتے ہیں ان بلندیوں تک عموماً پرواز کرتے ہیں جہاں طائر خیال بھی تصور ہی سے تھک جاتا ہے۔ ایسوں کے تذکرے ظاہر ہے کہ عوام کی دلچسپی کا باعث نہ ہوں گے عوام کا مذاق یہ بغیر الجھن کے کہا جا سکتا ہے نیچی سطحوں پر رہتا ہے مگر انیسؔ انہیں کے لئے بلند کردار تذکرے نظم کرتے تھے اور اگر وہ عوام میں مقبول ہیں تو کیا یہ غیبی امداد ہے جس کے وہ طالب تھے یا پھر اسی نفسیاتی مسئلہ کی ایک گتھی ہے جسے سلجھانے سے تحقیق کا ایک نیا باب وا ہوتا ہے۔ انیسؔ کے ہیرو نے گہوارے میں اژدر کو چیرا۔ شیکسپیئر اپنے ہیرو کو اپنی آزاد تخئیل کے استعمال کے بعد بھی اس سے بڑھا نہ سکا۔ کیا یہ انیسؔ کے ہیرو کی اعلیٰ مدح نہیں ہے؟ ـــــــ اس دلچسپ موازنہ کلام پر غور اور فکر ضرور بہت سے مفید اور کار آمد نتائج کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

سید فیضی (راولپنڈی)

مرزا غالبؔ اور میر انیسؔ

برصغیر پاک و ہند میں مرزا غالبؔ اور میر انیسؔ اس دور کی پیداوار ہیں جسے ادب اُردو میں مسلمات کا دور کہا جاتا ہے۔ یہ ایسا زمانہ تھا کہ زندگی اپنی تسلیم شدہ قدروں سے پہچانی جاتی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ رنگ سخن، طرز کلام اور فکر وفن کی حدیں بھی متعین ہو چکی تھیں۔ زندگی اور فن شناسی کی اس چہار دیواری سے باہر نکلنا اور اپنے لئے ایک نیا راستہ بنانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ تقلید کے سانچوں میں ڈھلی ہوئی فکر کو کسی نئے آہنگ واسلوب سے روشناس کرانا بہت مشکل تھا۔ غالبؔ میں یہ اپج موجود تھی۔ وہ اپنی بات نئے ڈھنگ سے کہنا چاہتے تھے۔ چنانچہ مروّجہ طریق شاعری میں فکری تبدیلی پیدا کرنے کیلئے انہوں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے۔ ''تنگنائے غزل'' کو بقدر ظرف وسعت دینے کی کوشش بھی کی لیکن وہ ان شعری راستوں کو نہ چھوڑ سکے جو روش عام بن چکے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ غالبؔ کی دنیا مادّی وسائل کے لحاظ سے تو انقلاب آشنا ہو رہی تھی لیکن شعروادب کی جس روایت کے وہ قائل تھے اس میں بنیادی تبدیلی لے آنا اور تبدیلی بھی ایسی جسے قبولِ عام کی سند حاصل ہو جائے، یہ غالبؔ کے بس کا روگ نہیں تھا۔ وہ ایک کلاسیکی ذہن کے مالک تھے۔ روایت پرستی کے بندھنوں سے رہائی مشکل تھی۔ اسی لئے وہ اپنے آپ کو نہ تو غزل کی فضا سے آزاد کر سکے اور نہ اس راستے کو چھوڑ سکے جس پر ان کے ہمعصر گامزن تھے۔ ان کے ہیئتی تجربے وہی معیاری فارسی دنیا کے تجربے رہے اور وہ شاعری جو فارسی معیار پر پوری نہ اتر سکی غالبؔ کی نظر میں کم معیاری

ہی رہی۔

میر انیسؔ بھی غالبؔ کے ہمعصر تھے لیکن یہ ان کی قادر الکلامی کا اعجاز تھا کہ شعر گوئی کی اس قدیم روش پر جو انہیں ورثے میں ملی تھی قائم رہتے ہوئے انہوں نے معانی اور بیان کے ایسے پھول کھلائے جن کی تازگی و خوشبو سدا بہار ہوگئی ہے۔

غالبؔ بالطبع غزل کی طرف مائل تھے۔ ان کے نزدیک غزل ایک ایسا آئینہ خانہ تھا جس میں شعر کی نہ صرف ایک حساس تہذیب اور ایک رنگین تاریخ کی جلوہ گری ہوتی ہے بلکہ مذاق لطیف اور کیف وجدان کی عکاسی بھی۔ رمز و ایما اس کے فطری نقوش ہیں جو ناتمام نہیں۔ غالبؔ نے غزل کو اپنی جدّت پسندی کا پیرایۂ اظہار بنالیا۔ انہوں نے غزل کی صحت مند روایتوں کو برقرار رکھا۔ اسے ہندوستانی تہذیب و ثقافت سے ہم رشتہ کیا، فنّی نزاکتوں کا خیال رکھتے ہوئے معنی آفرینی سے اس کی قدروں کو آگے بڑھایا۔ اس کے دلکش خدوخال درست کئے اس میں زندگی کی حرارتیں پھونکیں، احساس کی لطافت سے اسے شگفتہ بنایا اور فکر کی گہرائی سے اس میں فلسفیانہ رنگ پیدا کیا۔

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک — کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب — دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک
یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل — گرمیٔ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک
غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج — شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

مرزا غالبؔ دبستانِ دہلی کے نمائندے تھے۔ ان کے زمانے تک اُردو زبان و ادب میں معنوی اور اسلوبی اعتبار سے جو روایات قائم ہو چکی تھیں، ان پر دبستانِ دہلی کی چھاپ تھی۔ اس لئے یہ ضروری تھا کہ اس شاعری میں دہلوی ماحول، معاشرت اور تہذیب کا عکس نمایاں ہو۔ چنانچہ اس دور کی شاعری کے آئینے میں یہ عکس نمایاں تھا اور یہ عکس اس وقت تک نظر آتا رہا جب دلّی کے بزرگ اور جوان شعرا دلّی کی سیاسی بے اطمینانی اور اقتصادی بدحالی کی وجہ سے لکھنؤ منتقل ہوگئے۔ لکھنؤ میں بھی انہوں نے شاعری کے اس مزاج کو برقرار رکھا لیکن اسے دیر تک قائم رہنے کا موقع نہ مل سکا۔ دلّی میں ابھی تک غالبؔ ایسا طوطیٔ خوش گلو غزل سرا تھا جس کے نالے سن کر بلبلیں تک غزل خواں ہو چکی تھیں لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ قائم تھی کہ حقائق شعری کو سیدھے سادھے الفاظ میں کہنے کی بجائے

تخئیل کی دشوار گزار راہوں کا اب بھی سہارا لینا پڑتا تھا۔ دہلی کے اربابِ سخن اسی میں اپنی ناموری خیال کرتے تھے اور غالبؔ تو اس فن کے امام تھے۔ بعض اوقات ان کی یہ بلند پروازیاں اور نازک خیالیاں اس قدر بلندی پر پہنچ جاتی تھیں کہ نظروں سے اوجھل ہو کر شعر کا مطلب اور اثر بالکل جاتا رہتا تھا۔ یہ غالبؔ کی افتادِ طبع کا نتیجہ تھا کیونکہ وہ اپنے آپ کو ہر چیز میں عام لوگوں سے علیحدہ رکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے شاعری کا جو رنگ اختیار کیا وہ فارسیت آمیز تھا۔ اسی لئے حکیم آغا جان عیشؔ نے ان پر طنز کیا تھا۔

کلامِ میرؔ سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

لیکن یہ اس وقت کی باتیں ہیں جب مرزا غالبؔ کی شعر گوئی کا ابتدائی زمانہ تھا۔ آہستہ آہستہ غالبؔ نے یہاں تک مشق بہم پہنچائی کہ فکرِ غالبؔ ندرتِ خیال کے ساتھ ساتھ زبان کی لطافت اور شستگیٔ کلام کی آئینہ دار ہوگئی:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

اِدھر لکھنؤ گہوارۂ سخن بنا تو وہاں کے شعراء نے بھی مشق و مزاولت سے کام لے کر اُردو شاعری کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا اور اس میں طرح طرح کی جدّتیں اور رنگینیاں پیدا کیں۔ مرثیہ ایک قدیم صنفِ شاعری تھی جو ابھی تک اپنی ابتدائی حالت میں تھی۔ شعرائے دہلی نے اسے ایک مذہبی فریضے کی حیثیت سے قلم بند کیا۔ اس لئے اس میں حقیقی جذبات اور اثر کی کمی محسوس ہوتی رہی۔ رزمیہ نظم کا رواج ابھی تک نہیں ہوا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ضمیرؔ پہلے شخص تھے جنہوں نے مرثیے کے دامن کو وسعت دی۔ مرثیہ تاریخ اسلام کے ایک المیہ یعنی میدانِ کربلا کے واقعات پر مشتمل ہوتا ہے اور چونکہ ان واقعات کا محور سرورِ کائنات ﷺ کے نواسے حضرت امام حسین علیہ السلام کی ذات ہے اس لئے لامحالہ انہیں نظم کرنے میں محبت اور عقیدت کے جذبات کارفرما ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انہی مقدّس جذبات کے تحت انہیں قالب نظم میں ڈھالا گیا اور میر ضمیرؔ کے بعد جس نے مرثیہ کو اوجِ کمال تک پہنچایا وہ میر انیسؔ کے پہلے یا ان کے بعد پھر کسی اور کے لئے ممکن نہ ہو سکا۔ غالبؔ کی

طرح الفاظ کی سجاوٹ اور شکوہ میں انہیں بھی کمال حاصل تھا۔ بہت سے نئے محاورے ان کی وجہ سے داخل زبان ہوئے۔ مرقع نگاری، اظہارِ جذبات اور کردار نویسی مرثیہ کے لوازمات قرار دیئے گئے۔ چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، رجز، جنگ، شہادت اور آخر میں بین مرثیہ کے اجزائے ترکیبی بن گئے اور اس طرح مرثیہ کی عمارت ہی مذہب کی بنیادوں پر اٹھی۔ اس لحاظ سے مرثیہ اس حقیقی شاعری کا پرتو بن جاتا ہے جو اعلیٰ جذبات کو برانگیختہ کرتی ہے۔ لڑائیوں کے ہوبہو نقشے، نبرد آزماؤں کے مقابلے کی تصویریں، مبارزوں کی رجز خوانیاں، مخالفین کے جوابات، دشمنوں کا قتل، کمزوروں کی اعانت یہ سب ایسی چیزیں ہیں جو مرثیے کی بدولت اردو نظم میں رزمیہ کا اضافہ کرتی ہیں۔ اسی طرح مناظر قدرت اور انسانی جذبات جس زور کے ساتھ مرثیہ میں دکھائے گئے ہیں اس کا جواب بھی اردو زبان میں کہیں اور نہیں ملتا۔ اور یہ سب اختراعیں میر انیسؔ کے تر و تازہ ذہن کی مرہونِ منت ہیں جن کے پیش نظر انہوں نے دعویٰ کیا تھا کہ ''اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں'' اور غالبؔ کیلئے جو مضامین پردۂ غیب سے آیا کرتے تھے، ان کیلئے انہوں نے یہ بلند بانگ دعویٰ کیا:

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

یہ واقعہ ہے کہ میر انیسؔ کو مناظر قدرت کی تصویریں کھینچنے کے ساتھ ساتھ اظہار جذبات پر بھی پوری قدرت حاصل تھی۔ مرثیوں میں تسلسل بیان قائم رکھنا حیرت انگیز ہے لیکن مراثیٔ انیسؔ میں یہ تسلسل برابر قائم ہے اور وہ بھی تمثیلوں، استعاروں اور صنائع بدائع کے استعمال کے ساتھ اثر آفرینی میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے انیسؔ کا جواب نہیں۔ ان کی شاعری حقیقی جزبات کا آئینہ ہے اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جس نیچر شاعری کا آغاز حالیؔ اور آزادؔ کے زمانے سے ہوا، اس کی داغ بیل انیسؔ نے ہی ڈالی تھی۔ انیسؔ کی خاص توجہ زبان کی صفائی اور حلاوت، بندش کی چستی اور محاورے کی درستی پر رہا کرتی تھی۔ سادگی ان کے کلام کا جوہر تھا اور یہ شرف انہیں ابتدا ہی میں حاصل تھا۔ مرزا غالبؔ نے اسے اپنایا بھی تو آخر عمر میں۔

جذبات نگاری کے معاملے میں غالبؔ اور انیسؔ دونوں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں فرق صرف اتنا ہے کہ مرزا غالبؔ کے اشعار ان کے خیالات کے بہترین عکاس ہیں جو ان کے سر پر

پڑتی ہے بے کم و کاست بیان کردیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ اپنا ہی دکھڑا روتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے ہاں جانکاہ مصائب، دلگداز تکلیفیں، ناقابلِ برداشت مصیبتیں جو لازمۂ زندگی ہیں نہایت مؤثر الفاظ میں بیان ہوتی ہیں:

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غالبؔ کے اشعار پڑھ کر رنج و غم کی رفعت اور مصیبت کی عظمت کا احساس تو ہو جاتا ہے لیکن اس میں میر انیسؔ کی وہ شدت مفقود ہے جس کا لفظی اظہار دوسروں کو بھی اپنے درد میں شامل کر لینے پر مجبور کر دیتا ہے۔

میدانِ جہاد میں حضرت حُر جب زخموں سے چور ہو کر زمین پر گر جاتے ہیں اور نزع کا وقت طاری ہونے لگتا ہے تو امام حسین علیہ السلام سے کہتے ہیں:

قبلہ رو کیجئے لاشۂ مرا اے قبلۂ دیں   پڑھیئے یاسین کہ اب ہے یہ دم بازپسیں
کوچ نزدیک ہے اے بادشہ عرش نشیں   لیجئے تن سے نکلتی ہے مری جانِ حزیں
بات بھی اب تو زباں سے نہیں کی جاتی ہے
کچھ اڑھا دیجئے مولا مجھے نیند آتی ہے

لاش اٹھا کر شہؑ دیں خیمہ کے در پر آئے   پاؤں مہماں کے سنبھالے علی اکبرؑ آئے
غل ہوا خیمۂ عصمت میں کہ سرور آئے   پیچھے پردے کے حرم کھولے ہوئے سر آئے
دخترِ فاطمہ سامان عزا کرنے لگی
فضہ پردے کے ادھر آہ و بکا کرنے لگی

اسی طرح تصویر کشی کے معاملے میں غالبؔ بھی ایک کامل مصور ہیں ذہن و ادراک سے کام لے کر انہوں نے خیالی تصویریں کھینچنے کا بہترین ملکہ بہم پہنچایا ہے:

نینداس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں   تیری زلفیں جس کے شانوں پر پریشاں ہو گئیں

لیکن میر انیسؔ جذبات، محسوسات اور قلبی کیفیات بیان کرنے میں اتنے باریک بیں تھے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان کی ذہنی نگاہیں دل کے ہر گوشے پر حاوی تھیں۔ وہ نفسیات کی گہرائیوں سے پوری طرح واقف تھے اور ان کے تجزیے پر انہیں پوری قدرت حاصل تھی۔ مناظر قدرت کی تصویر قلم

بند کرتے ہوئے جب غالبؔ یہ فرماتے ہیں:

صبح دم دروازۂ خاور کھلا مہر عالم تاب کا منظر کھلا
آ گیا پھر جانبِ مشرق نظر اک نگارِ آتشیں رُخ سر کھلا

تو سورج کے طلوع ہونے کے تمام دلکش مناظر آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں۔ اسی میدان میں جب انیسؔ پر نظر پڑتی ہے تو ان کے مراثی میں بھی ہمیں ایسی تصویریں مل جاتی ہیں جن میں صبح کا سہانا منظر ہے، شبِ ماہ کی دل آویزی ہے۔ بھیانک رات کی تاریکی ہے۔ شام کی رنگینی ہے۔ موسموں کا بیان ہے۔ گرمی کی شدّت ہے اور بادِ سموم کا ذکر ہے لیکن ان ساری چیزوں کے بیان میں انہوں نے مرثیت کے دامن کو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور نہ مناظر کی اہم خصوصیات کو تشنہ رہنے دیا:

چلنا وہ بادِ صبح کے جھونکوں کا دمبدم مرغانِ باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ آب و تاب نہر کی موجوں کا پیچ و خم سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

وہ نورِ صبح اور وہ صحرا، وہ سبزہ زار تھے طائروں کے غول درختوں پہ بے شمار
چلنا نسیمِ صبح کا رہ رہ کے بار بار کوکو وہ قمریوں کی وہ طاؤس کی پکار
وا تھے دریچے باغِ بہشتِ نعیم کے
ہر سُو رواں تھے دشت میں جھونکے نسیم کے

غالبؔ کی تمام خصوصیاتِ شعری میر انیسؔ کے مرثیوں میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ منظر کشی، کردار نگاری اور جذبات آفرینی ان کی شاعری کے ترکیبی عناصر ہیں۔ ان کے شاعرانہ کمال کا دعویٰ خود اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ انہوں نے ایک مضمون کو واقعی سو سو رنگوں میں نظم کیا ہے اور ہر رنگ میں ایک جداگانہ معنوی گہرائی اور ایک مختلف تہ داری نظر آتی ہے۔ اس میں الفاظ کے فنّی برتاؤ کو بہت دخل حاصل ہے۔ انہوں نے الفاظ و تراکیب کو کچھ ایسی صنائع اور کچھ ایسے حُسنِ التزام سے استعمال کیا ہے کہ شعر کا ایک ایک لفظ فی الواقع گنجینۂ معنی کا طلسم بن گیا ہے۔ غالبؔ نے عام طور پر شوخی کو تغزل کی جان قرار دیا ہے۔ میر انیسؔ نے غزل

کے اس لازمی عنصر کو مرثیہ میں بھی برقرار رکھا ہے اور غزل کے تتبع میں اسے سلام کی صورت عطا کی ہے۔
مرثیے میں شوخی کا عنصر سموتے ہوئے کہتے ہیں:

آگے کبھی نہ دیکھی تھی اس حسن کی سپاہ دنیا بھی خوبیوں کا مرقع ہے واہ واہ
دیکھیں کسے کسے کہ ہے اک ایک رشکِ ماہ جاتی ہے جس کے رُخ پہ تو پھرتی نہیں نگاہ
دیکھو انھی دموں سے ہے رونق زمین کو
چن کر حُسینؑ لائے ہیں کس کس حَسین کو

ہمشکلِ مصطفیٰؐ کا ہے کیا حسن کیا جمال صبح جبیں ہے اور شب گیسوئے بے مثال
یہ خط، یہ لب، یہ چشم، یہ ابرو، یہ رخ، یہ خال یاقوت و مشک و نرگس و نجم و مہ و ہلال
اک گل پہ یاں ہزار طرح کی بہار ہے
چہرہ نہ کہیئے قدرتِ پروردگار ہے

ایک اور جگہ غزل کی شوخی و لطافت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہے کجی عیب مگر حسن ہے ابرو کے لئے سرمہ زیبا ہے فقط نرگس جادو کے لئے
تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لئے زیب ہے خالِ سیہ چہرۂ گلرو کے لئے
داندآں کس کہ فصاحت بہ کلامے دارد
ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

فراق، جدائی اور شبِ ہجر کی تنہایاں اور ایذا رسانیاں غزل کے عام اور فرسودہ سے مضمون ہیں لیکن یہاں بھی میر انیسؔ نے اس میں سے نئی بات پیدا کی ہے:

گر نام کو خورشید نہاں ہوتا ہے پیارے تو دیکھتے ہیں لوگ اسے صبح کو سارے
گر دِن کو چھپے شب کو نکلتے ہیں ستارے تو کون سی بدلی میں ہے اے چاند ہمارے
حیرت ہے مرے دیدۂ دیدار طلب کو
جلوہ ترا دِن کو نظر آتا ہے نہ شب کو

کچھ پھول تو دکھلا کے بہار اپنی ہیں جاتے کچھ سُوکھ کے کانٹوں کی طرح ہیں نظر آتے
کچھ گُل ہیں کہ پھولے نہیں جاتے ہیں سماتے غنچے بہت ایسے ہیں کہ کِھلنے نہیں پاتے

بلبل کی طرح روتے ہیں فریاد و فغاں سے
کچھ بس نہیں چلتا چمن آرائے جہاں سے

غزل میں عام طور پر اخلاقیات کے نظریئے یا اصول بتائے جاتے ہیں لیکن مرثیے میں نظریات کے علاوہ مختلف کرداروں کا عمل بھی دکھایا جاتا ہے۔ انہی عملی مظاہروں نے ہمارے لئے اخلاقیات کا اتنا ذخیرہ فراہم کردیا ہے کہ ہماری اخلاقی شاعری کی سطح بلند سے بلند تر ہوچکی ہے۔ کربلا کے تپتے ہوئے میدان میں اہلبیت رسول ﷺ کے ہر فرد کا عمل اپنی جگہ پر اتنا گراں قدر ہے کہ انسانیت کے اعلیٰ مقام تک پہنچادینے کے لئے کافی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ میر انیسؔ نے ایمان وروح کی بالیدگی اور دنیا میں تکمیل انسانیت کے لئے مرثیہ نگاری سے جو کام لیا ہے وہ ہر ایک کے بس کا نہیں۔

رہی یہ بات کہ آیا کبھی غالبؔ اور انیسؔ کی آپس میں ملاقات بھی ہوئی کہ نہیں تو اس ضمن میں شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی اپنے ایک مضمون بعنوان ''غالبؔ کا ایک مشہور تاریخی سفر'' میں رقمطراز ہیں کہ غالبؔ جب لکھنؤ میں مقیم تھے تو میر انیسؔ سے ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ غالبؔ نے جب ان سے کسی غزل کی فرمائش کی تو انیسؔ نے غزل کی بجائے ایک سلام سنایا اور کہا کہ اب آپ جواباً کوئی مرثیہ سنائیے جو آپ نے کہا ہو۔ غالبؔ نے اپنے کہے ہوئے مرثیے کے تین بند سنائے اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ مرثیہ کہنا آپ ہی کا حق ہے اور وہ بند یہ ہیں:

ہاں اے نفسِ بادِ سحر شعلہ فشاں ہو اے دجلۂ خوں چشم ملائک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قم لب عیسیٰ پہ فغاں ہو اے ماتمیانِ شہ مظلوم کہاں ہو
بگڑی ہے بہت بات بنائے نہیں بنتی
اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

تاب سخن و طاقتِ غوغا نہیں ہم کو ماتم میں شہ دیں کے ہیں سودا نہیں ہم کو
گھر پھونکنے میں اپنے محابا نہیں ہم کو گر چرخ بھی جل جائے تو پروا نہیں ہم کو
یہ خرگہ نہ پایہ جو مدت سے بپا ہے
کیا خیمۂ شبیر سے رتبے میں سوا ہے

کچھ اور ہی عالم ہے دل و چشم و زباں کا کچھ اور ہی نقشہ نظر آتا ہے جہاں کا

کیسا فلک؟ اور مہر جہاں تاب کہاں کا! ہوگا دلِ بے تاب کسی سوختہ جاں کا

اب صاعقہ و مہر میں کچھ فرق نہیں ہے
گرتا نہیں ، اس رو سے کہو ، برق نہیں ہے

غالبؔ اور انیسؔ کی عظمت جس طرح ان کی زندگی میں مسلّم تھی وہ آج بھی قائم ہے۔ دونوں اس بلند مقام پر فائز ہیں جہاں گنتی کے لوگ ہی نظر آتے ہیں۔ ہم انہیں دیکھتے ہیں۔ محسوس کرتے ہیں۔

حضرت قاسمؑ کا جاذب نظر لباس

(جو عصمت چغتائی کی نظرِ بد سے محفوظ رہا)

عصمت چغتائی نے اپنے ناول "ایک قطرۂ خون" کے انتساب میں لکھا کہ یہ کہانی میں نے انیس کے مرثیوں میں پائی صفحہ نمبر ۲۲۵ پر حضرت قاسم کے لباس کے بارے میں لکھتی ہیں۔

"دبلے پتلے جسم پر زرہ بکتر عجیب بے تکی سی لگ رہی تھی"

جبکہ میر انیس کے یہاں جناب قاسم کی خوش لباسی کا تذکرہ یوں ہے جو عصمت چغتائی کے نقص مطالعۂ انیس کا غماز ہے۔

اے خوشا حُسنِ رُخِ یوسفِ کنعانِ حسنؑ   راحتِ روحِ حسینؑ ابنِ علیؑ جانِ حسنؑ
جسم میں زورِ علیؑ طبع میں احسانِ حسنؑ   ہمہ تن خُلقِ حسنؑ حُسنِ حسنؑ شانِ حسنؑ

تن پہ کرتی تھی نزاکت سے گرانی پوشاک
کیا بھلی لگتی تھی بچپن میں شہانی پوشاک

عصمت چغتائی کو شاید "بے تکی" اور "بھلی" کا فرق نہیں معلوم تھا..............

سیّد علی احمد دانشؔ (لکھنؤ)

میر انیسؔ کا نودریافت کلام

سیّد ببر علی ۱۲۱۸ھ میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ تیرہ چودہ سال کی عمر میں شاعری غزل سے شروع کی۔ ان کے والد میر خلیقؔ نے ابتدا میں حزیںؔ تخلص رکھا جو لکھنؤ میں ناسخؔ نے غزلوں پر اصلاح کے زمانے میں بدل کر انیسؔ کر دیا۔ تذکرۂ خوش معرکہ زیبا قلمی مرتبہ ناصرؔ لکھنوی کا جو نسخہ پٹنہ میں موجود ہے اس کے حاشیے پر یہ عبارت تحریر ہے:

عہدِ شباب میں جبکہ فیض آباد میں تھے اوائل میں چند غزلیں بھی کہی ہیں جب سے لکھنؤ میں تشریف لائے شوق مرثیہ گوئی کا ہوا۔ وہ سب غزلیں یک قلم دھوڈالیں، نسیاً منسیاً کیں..... غزل میر صاحب اب عنقا و نایاب ہے۔ بہت تلاش سے ایک غزل دستیاب ہوئی ہے.....'' (۱)

انیسؔ نے تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی، غزل کے علاوہ نوحہ، رباعی، سلام، مسدس، مخمس بھی کہے، اپنے والد میر خلیقؔ، بھائی میر نواب مونسؔ کے بعض سلاموں کی تضمین اور خمسے بھی کیے۔

بقول مصنف آبِ حیات خلیقؔ کے کہنے پر انیسؔ نے غزل گوئی کو ترک کر دیا اور ان غزلوں کو سلاموں کے قالب میں ڈھال دیا۔ اس سلسلے میں میں میر محمد ہادی لائقؔ مرحوم (۲) بیان فرماتے تھے کہ: ''میری نظر سے انیسؔ کی تقریباً ۴۵ غزلیں گزری ہیں جو انہوں نے اپنے ایک مداح و مہربان نواب مرزا محمد تقی خاں ترقی کے فرزند کو دے دی تھیں اور وہ تمام غزلیں ۱۸x۲۲/۸ سائز کے گلابی کاغذ پر لکھی ہوئی کتابی صورت میں تھیں۔ بڑے آغا صاحب مرحوم نے اپنا کتب خانہ مدرسۂ سلطان

المدارس کو دے دیا تھا اسی میں وہ غزلیں بھی منتقل ہوگئیں۔ جستجو کی جائے تو عین ممکن ہے کہ وہ مل جائیں"۔

اس کے علاوہ انیسؔ کی غزلیں قدیم تذکروں میں پائی جاتی ہیں۔ سید مسعود حسن رضوی مرحوم نے ۱۹۵۷ء میں تذکرۂ نادرؔ کو بڑی جاں فشانی سے مرتب کیا اور سرفراز قومی پریس لکھنؤ میں طبع کروا کے شائع کیا تھا۔ تذکرۂ نادرؔ دراصل کلب حسین خان نادرؔ کے دیوانِ غریب کی تلخیص ہے۔ یہ تذکرہ ۱۲۸۴ھ میں مطبع دل کشا فتح گڑھ میں چھپا تھا۔ ہم دیوان غریب سے انیسؔ کی ایک غزل پیش کرتے ہیں۔

وجد ہو بلبل تصویر کو جس کی بو سے — اُس سے گلرنگ کا دعویٰ کرے پھر کس رو سے
کس سے اے شوخ ہوئی رات کو ہاتھا پائی — نورتن آج جو ڈھلکے ہیں ترے بازو سے
کل تو آغوش میں شوخی نے ٹھہرنے نہ دیا — آج کی شب تو نکل جاؤ مرے قابو سے
شمع کے رونے پہ بس صاف ہنسی آتی ہے — آتش دل کہیں کم ہوتی ہے چار آنسو سے
ایک دن وہ تھا کہ تکیہ تھا کسی کا زانو — اب سر اٹھتا ہی نہیں اپنے سرِ زانو سے
نزع میں ہوں مری مشکل کروں آساں یارو — کھولو تعویذ شفا جلد مرے بازو سے
شوخیِ چشم کا تو کس کے ہے دیوانہ انیسؔ — آنکھ ملتا ہے جو یوں نقشِ سم آہو سے

اس غزل کے علاوہ چند شعر یہ ہیں:-

سبب ہم پر کھلا اس شوخ کے آنسو نکلنے کا — دھواں لگتا ہے آنکھوں میں کسی کے دل کے جلنے کا

رکھ کے منھ سو گئے ان آتشیں رخساروں پر — دل کو تھا چین تو نیند آ گئی انگاروں پر
چُن کے افشاں نظر اس مہ نے جو کی تاروں پر — آسماں رات کو لوٹا کیا انگاروں پر

متذکرہ بالا شعر اس طرح بھی نظر سے گزرا ہے:-

چُن کے افشاں جو گئی اس کی نظر تاروں پر — رات بھر آسماں لوٹا کیا انگاروں پر

خال سیہ ہے ابروے خم دار کے تلے — ننھی سی ڈھال رکھی ہے تلوار کے تلے

اس شعر میں انیسؔ نے خال کو ڈھال کہہ کر اور ابروے خمدار کو تلوار نظم کر کے اپنی جدت پسند انداز

فکر سے کس درجہ حسین استعارے پیش کیے ہیں۔ انیسؔ نے لاتعداد رباعیاں کہیں جو زیادہ تر چھپ گئیں لیکن اب بھی غیر مطبوعہ رباعیاں باقی ہیں انہی رباعیوں میں سے یہ غیر مطبوعہ رباعیاں درج ذیل ہیں:-

صد حیف کہ یارِ جاودانی نہ رہا　　شبیرؑ کی مجلسوں کا بانی نہ رہا
افسوس افسوس میر مہدی افسوس　　جیتے ہیں پہ لطف زندگانی نہ رہا

یہ رباعی میر انیسؔ نے اپنے سمدھی میر مہدی علی لکھنوی کی وفات سے متاثر ہو کر کہی تھی۔ میر مہدی علی لکھنوی کی پوتی اور قاضی میر عابد متخلص بہ عابدؔ کمیدان کی بیٹی میر انیسؔ کے منجھلے فرزند میر عسکری رئیسؔ کو منسوب تھیں۔ (۳) میر عابد علی عابدؔ خود بھی بہت اچھے مرثیہ گو اور جناب میر نواب مونسؔ کے شاگرد تھے۔ راقم کے پاس میر عابد علی عابدؔ کا ایک غیر مطبوعہ مرثیہ موجود ہے جس کا مطلع یہ ہے ''پھر تازہ بہار آئی گلستانِ سخن میں'' یہ مرثیہ عون و محمدؑ کے حال میں نظم کیا گیا ہے۔ تعداد بند ۱۷۰ اور تاریخ کتابت ۱۵ محرم ۱۳۰۶ھ ہے۔ مقطع یہ ہے:-

پورا نہیں کچھ بَین کا مضمون ہوا ہر چند　　رونے کو مگر کافی و وافی ہیں یہ بند
عابدؔ کو شفا دے کے شہا کیجئے خورسند　　میں عون و محمدؑ کی تمہیں دیتا ہوں سوگند
کب تک یہ غم و رنج اٹھایا کروں مولا
پھر مجلسوں میں آپ کی جایا کروں مولا

انیسؔ کے شاگرد اور ہمعصر نواب امجد علی خان آف شیش محل میر انیسؔ سے اپنے یہاں مجالس پڑھواتے تھے، انہی کے یہاں مجلس سے قبل آپ نے یہ رباعی پڑھی:- (۴)

دھوپ آتے ہی یاں پہ زرد ہو جاتی ہے　　آندھی آتی ہے گرد ہو جاتی ہے
پنکھے آہوں کے آنسوؤں کا چھڑکاؤ　　یاں گرم ہوا بھی سرد ہو جاتی ہے

جب دور سے ایوان علا کو دیکھا　　لاریب کہ عرش کبریا کو دیکھا
سو بار کیا طواف کعبہ اے دل　　اک بار جو روضۂ رضا کو دیکھا

ہم کو جناب سید محمد رشید صاحب کے نایاب ذخیرہ مراثی میں ایک قدیم مطبوعہ جلد فراہم ہوئی۔ اس مطبوعہ جلد کی بدولت راقم اس حقیقت سے واقف ہوا کہ انیسؔ کا کچھ کلام ان کی حیات ۱۲۶۸ھ

مطابق ۱۸۵۱ء میں مطبع اسلامی بمبئی میں چھپا تھا۔ اس کا عنوان ''مجموعۂ بکا'' اور جس کا سائز $\frac{۱۸\times۲۲}{۸}$ ہے۔ اس میں انیسؔ کے علاوہ ضمیرؔ اور فصیحؔ وغیرہ کا کلام شامل کیا گیا ہے۔ انیسؔ کے حسب ذیل دو مرثیے شامل ہیں:-

۱۔ جب فوج خدا قتل ہوئی راہِ خدا میں۔ ۶۶ بند (۵)

۲۔ اے مومنو کیا مرتبۂ سبط نبی ہے۔ ۵۷ بند (۶)

''یہ نسخہ مجموعۂ بکا جناب شاہ شہیدانِ شہدا شائقانِ عالی شان کی فرمائش سے تاریخ دوسری ذالحجہ ۱۲۶۸ھ میں جزیرہ معمورۂ بمبئی میں شہاب الدین ابن کرم الدین کے مطبع اسلامی میں چھاپا گیا''۔

اس مجموعے کے علاوہ حیات انیسؔ ۱۲۶۸ھ میں مطبع مخدومی بمبئی سے میر انیسؔ کے دو مرثیے شائع ہوئے جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ جب فوج قتل ہوئی راہِ خدا میں۔ ۱۰۴ بند، مکمل مرثیہ

۲۔ آمد ہے کربلا میں شہ دیں پناہ کی۔ ۱۳۰ بند، مکمل مرثیہ

مذکورۂ بالا نمبر ۲ مرثیہ ''آمد ہے کربلا میں شہ دیں پناہ کی'' نایاب مرثیہ ہے۔ اس مرثیے کی تقطیع ۶×۴ ہے اور کتاب پر ''مجلس نو'' اور انیسؔ'' لکھا ہے۔ تمام صفحات پر ''پہنچنا امام حسینؑ کا دشتِ کربلا میں'' لکھا ہوا ہے۔ اب یہ مرثیہ ۱۲۶۸ھ کے بعد پہلی مرتبہ منشی امیر علی جونپوری مالک اُردو پبلشرز لکھنو جواھرات انیسؔ جلد سوم میں شائع کر رہے ہیں اور پروفیسر اکبر حیدری کاشمیری نے اسے اپنی مرتب کردہ مراثی کی جلد باقیات انیسؔ میں شامل کیا ہے۔ بزرگوں سے سنی سنائی روایات کے مطابق انیسؔ بذات خود طباعت کے سلسلے میں بہت محتاط تھے اور اشاعت کلام کے سلسلے میں اپنے ایک دوست سیّد آغا منصور نگری پر بہت برہم ہوئے تھے۔ سیّد آغا منصور نگری کے شائع کردہ مراثی نایاب ہیں جنھیں انیسؔ نے طباعت کی غلطیوں کی بنا پر ضائع کر دیا تھا۔ باقاعدہ طور سے انیسؔ کے کلام کی اشاعت کا سلسلہ ان کے انتقال ۱۰ دسمبر ۱۸۷۴ء کے دو سال کے بعد نومبر ۱۸۷۶ء میں منشی نول کشور نے شروع کیا اور سیّد تصدق حسین صاحب کنتوری نے بڑے اہتمام سے یکے بعد دیگرے انیسؔ کے مراثی کی تین جلدیں مرتب کیں۔ پہلی جلد میں ۲۹، دوسری میں ۲۷، تیسری میں ۱۹ مرثیے شائع کئے۔ مجموعی طور پر نول کشور پریس نے انیسؔ کے مرثیے چار جلدوں میں شائع کئے۔ ان جلدوں

کے علاوہ مراثی کی ایک جلد مرزا محمد مہدی مالک مطبع جعفری نخاس نے ۱۸۹۵ء مطابق ۱۳۱۳ھ میں ''مرثیہ ہائے میر انیسؔ مرحوم'' کے نام سے چھاپی اور مرثیے جناب میر خورشید علی نفیسؔ فرزند جناب انیسؔ سے حاصل کئے۔ جناب نفیسؔ نے انھیں ایک ہبہ نامہ بھی لکھ دیا تھا جو درج ذیل ہے:

اعلان

صاحبان مطابع وتاجران پر واضح ہو کہ جو مرثیہ جلد پنجم میں تصنیف سے جناب والد مرحوم اعلیٰ اللہ مقامہ کے ہیں اس کی اجازت راقم نے مرزا محمد مہدی صاحب کو دی ہے احیاناً اگر کوئی اس جلد کو کل یا جزو چھاپے گا اس سے مواخذہ حسب قانون بذریعہ عدالت کیا جائے گا اور حق تصنیف مرزا صاحب موصوف کو ہبہ کر دیا ہے۔

(مہر) العبد سید خورشید علی نفیس عفا عنہٗ

اس جلد پنجم میں میر انیسؔ کے مستند اور نایاب ۲۲ مراثی شامل ہیں جن کے مطلعے مع تعداد بند درج ذیل ہیں:-

	مطلع	تعداد بند
۱۔	خورشید فلک عکسِ دُرِ تاجِ علی ہے	۱۴۰ بند
۲۔	اے مومنو کیا شور ہے ماتم کا جہاں میں (۱)	۹۱ بند
۳۔	رخصت ہوئے حضرت جو محبانِ وطن سے (۲)	۱۰۰ بند
۴۔	جس دم یزید شام میں مسند نشیں ہوا	۱۰۲ بند
۵۔	جاتی ہے کس شکوہ سے رن میں خدا کی فوج	۱۸۴ بند
۶۔	تھے حسن میں یوسف سے بھی بہتر علی اکبر	۹۱ بند
۷۔	جب خاتمہ بخیر ہوا فوج شاہ کا (۹)	۱۷۰ بند
۸۔	کیا زخم ہے وہ زخم کہ مرہم نہیں جس کا (۱۰)	۷۴ بند
۹۔	جب قصد کیا نہر کا سقائے حرم نے	۵۲ بند
۱۰۔	جب شام کے زنداں میں ہوئی شام حرم کو	۴۴ بند
۱۱۔	دی رن کی رضا شاہ نے جب ابن حسن کو	۶۸ بند
۱۲۔	اے اہلِ عزا رخصت اکبر ہے پدر سے	۸۰ بند
۱۳۔	جب کہ خاموش ہوئی شمع امامت رن میں	۴۰ بند

۱۴۔	روتے ہیں ملائک یہ عزاخانہ ہے کس کا	۱۶۸ بند
۱۵	ہند آتی ہے زنداں میں بڑے جاہ وحشم سے	۱۰۳ بند
۱۶۔	ہے آمد عباس کا غل فوج ستم میں	۱۰۹ بند
۱۷۔	جب کٹ گیا تیغوں سے گلستان محمدؐ	۱۲۱ بند
۱۸۔	آمد ہے جگر بند شہ قلعہ شکن کی	۱۲۰ بند
۱۹۔	اے خضر بیابانِ سخن راہ بری کر (۱۱)	۹۷ بند
۲۰۔	دوزخ سے جو آزاد کیا حُر کو خدا نے	۱۶۷ بند
۲۱۔	جب نیزے سے مجروح ہوا قاسم نوشاہ	۲۲ بند

اس جلد کے شائع ہونے کے بعد سیّد عبدالحسین تاجر کتب لکھنو نے ۱۹۰۱ء میں مراثی انیس کی تین جلدیں (جلد پنجم جدید، جلد ششم اور جلد ششم جدید) شائع کیں جن میں کئی مرثیے الحاقی ہیں مثلاً:

غمِ پدر سے جو صغرا نحیف و زار ہوئی

کھولا جو مہر نے علمِ زرنگار کو

دراصل میر انیس کے بھانجے میر احسان علی رئیس کے ہیں یا مندرجہ ذیل مرثیے:

۱۔ کیوں آج زلزلے میں زمیں کربلا کی ہے

۲۔ کھولا علم جو خسرو زرّیں کلاہ نے

۳۔ سب سے جدا روش مرے باغِ سخن کی ہے

مذکورہ بالا مرثیے عبدالحسین تاجر کتب لکھنؤ اور پاکستانی جلد بک لینڈ کراچی میں شامل ہیں، جو دراصل میر انیس کے منجھلے بھائی میر مہر علی انس کے ہیں، پاکستانی جلد میں نمبر۳ مرثیہ بغیر مقطع کے شائع کیا گیا ہے، اس کے کئی نسخے راقم کی نظر سے گزرے، مقطع بند ۶۳ درج ذیل ہے:-

اے انس گو ملول ہے طبع رسا کمال   پر دیکھئے تو بند سے ہے بند بے مثال

کیا حسن سے رقم کیا ابن حسنؑ کا حال   سحر حلال ہے یہ اگر کیجئے خیال

رنگیں کیا ہے نظم فصاحت نظام کو

زیور پہنا دیا ہے عروس کلام کو

ان جلدوں کے علاوہ سلسلۂ آصفیہ کے تحت نظامی پریس بدایوں سے جناب علی حیدر نظم طباطبائی نے مراثی انیسؔ کی تین جلدیں (۱۹۲۴ء تا ۱۹۳۰ء) میں شائع کیں اور مرثیے انیسؔ کے سب سے چھوٹے فرزند میر محمد صاحب سلیسؔ سے حاصل کیئے۔ جناب سیّد مسعود حسن رضوی مرحوم نے انیسؔ کے سات مراثی کو ترتیب دے کر اور مقدمہ وفرہنگ لکھ کر روحِ انیسؔ کے عنوان سے شائع کیا۔ یہ جلد بہ اعتبار کتابت وطباعت بہترین ہے اور تصحیح کا بھی بڑا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس میں فاضل مرتب نے رباعیاں اور سلام بھی شامل کیئے ہیں۔

۱۹۴۳ء میں شاہ کار انیسؔ کے نام سے مالک نظامی پریس لکھنؤ جناب مرزا محمد جوّاد نے جو ایک بہترین خطاط بھی تھے میر انیسؔ کا مندرجہ ذیل مرثیہ:

جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے

چھاپا۔ یہ مرثیہ اس سے قبل نول کشوری جلدوں میں چھپتا رہا تھا۔ اس مرثیے کی جلد کا سائز $\frac{۲۰\times۲۶}{۸}$ ہے، اس کے ابتدائی صفحات میں شیخ ممتاز حسین جونپوری مرحوم نے اس میں شامل قلمی تصاویر اور اشاعت کے سلسلے میں ضروری وضاحتیں کی ہیں۔ 'عرضِ حال' سید مسعود حسن رضوی مرحوم اور تعارف سید احتشام حسین مرحوم نے لکھا ہے۔ اس کے علاوہ سر تیج بہادر سپرو اور ممتاز ناقد وفلسفی علّامہ سید اختر علی تلہری نے انیسؔ کی شاعری کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے آخر میں جناب سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ مرحوم نے ایک جامع مقدمہ لکھ کر اور واقعات کربلا کے اسباب وعلل پر روشنی ڈالتے ہوئے انیسؔ کے سے عظیم شاعر کی فنی صلاحیتوں پر روشنی ڈالی ہے، جو کتاب کی افادیت میں اضافہ کا سبب ہے، یہ جلد اب نایاب ہے، ایسی جلد کسی اور نے اب تک نہیں چھاپی۔ اس کا سہرا مرزا محمد جوّاد صاحب مرحوم کے سر ہے جن کی انتھک کوششوں اور صلاحیتوں کی بدولت ایسی کتاب چھپ سکی۔ اس جلد کے بعد سید نائب حسین نقوی امروہوی نے مراثی انیسؔ کو جدید ترتیب کے ساتھ چار جلدوں میں شائع کیا جس میں زیادہ تر نول کشوری جلدوں کے مراثی شامل ہیں۔ یہ مرثیے غلام علی اینڈ سنز لاہور نے چھاپے تھے۔ انتخاب میر انیسؔ کے نام سے ادارہ یادگار میر انیسؔ کراچی نے ۸ ایڈیشن چھاپے۔ ۱۹۶۱ء میں بک لینڈ کراچی نے بھی انیسؔ کے مراثی کی ایک جلد چھاپی جو دراصل عبدالحسین تاجر کتب لکھنؤ کی نقل ہے۔ انیسؔ کی صد سالہ برسی کے موقع پر مجلس ترقی ادب لاہور سے

پاکستان میں سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی نے بارہ مرثیے چھاپے جس میں مقدمہ اور مفید حواشی بھی لکھے۔ یہ جلد لاجواب ہے۔ ابھی حال ہی میں مالک اردو پبلشرز منشی امیر علی جونپوری نے جواھراتِ انیس کے نام سے تین جلدیں شائع کیں جن میں بعض غیر مطبوعہ مراثی شامل کئے گئے۔۔ دلّی سے محترمہ صالحہ عابد حسین صاحبہ نے بڑی محنت سے انیس کے ۱۸ مرثیے شائع کیئے جو بہ اعتبار کتابت وطباعت عمدہ ہیں۔ تصحیح کی وجہ سے بعض غلطیاں ہوئی ہیں جنہیں کوشش کی جائے تو دوسرے ایڈیشن میں درست کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان میں انیس کے مراثی کی چھ جلدیں زیرِ طبع ہیں جن کو راقم کے چچا سید یوسف حسین (۱۲) شائق نے ترتیب دیا ہے۔ یہ جلدیں عنقریب بہ اہتمام ڈاکٹر سید صفدر حسین زیدی متخلص بہ صفدر شائع ہونے والی ہیں۔

رثائی ادب کی نزاعی شخصیت محقق کلامِ انیس جناب سید نائب حسین نقوی امروہوی (متوفی ۹ مئی ۱۹۷۹ء) ادھر کچھ عرصے سے جن غیر مطبوعہ مراثی کا اعلان کرتے رہے تھے وہ بھی بہت جلد منظر عام پر آ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ مراثی انیس کی ترتیب وتدوین سید بلاغت حسین رضوی معروف بہ شہاب سرمدی بھی فرما رہے ہیں۔

۱۹۶۲ء میں وقارِ انیس کے عنوان کے تحت صاحب مہذب اللغات سید محمد مرزا مہذب لکھنوی نے دو جلدیں شائع کیں جن میں بارہ مراثی انتخاب کر کے شائع کیئے۔ اسی دوران قمر پاکٹ بک سیریز الہ آباد نے انتخاب انیس کے نام سے میر انیس کے اچھے مراثی کو چھاپا۔ اس کی یہ دو جلدیں ابن سعید ایم۔اے نے مرتب کیں۔

میری نظر سے ایک قدیم فہرست کتب خانہ حیدری گزری جو انیس کے الحاقی مرثیوں کے سلسلے میں بڑی مفید ثابت ہوئی۔ اس فہرست کو اس کے مالک سید شمشاد علی وسید امداد علی تاجر کتب چوک سبزی منڈی لکھنو نے شائع کیا تھا۔ اس میں موجود ایک اشتہاری اطلاع کے مطابق خاندان انیس کے شعرا کی تین سو رباعیاں اور مجموعہ سلام خاندان انیس شائع کیا گیا تھا جو اب عنقا ہے۔

۱۹۰۵ء مطابق ۱۳۲۲ھ میں سید محمد حسن بلگرامی گورنمنٹ ایڈیٹر ریلوے ومعدنیات متعلق سرکار آصفیہ نے بڑے اہتمام سے انیس کی ۱۴۵ رباعیاں مرتب کیں جو مطبع نامی کان پور میں چھپیں۔ اس مجموعے کو محمد حسن بلگرامی نے میر اسد علی خاں نظام یار جنگ کے نام معنون کیا تھا۔ اس کی ابتدا

میں میر انیسؔ کی ایک تصویر اور دیباچہ مصنف بھی موجود ہے جس میں ان رباعیوں سے متعلق ضروری وضاحتیں درج کی گئی ہیں۔ ۱۹۴۵ء میں عم محترم جناب سید محمد عباس آصفؔ ایم، اے نبیرۂ میر انیسؔ نے انیسؔ کی رباعیوں کو مرتب کیا جو مجموعۂ رباعیات میر انیسؔ مرحوم کے نام سے نول کشور پریس لکھنو سے شائع ہوئیں۔ اب اسی جلد کو جدید ترتیب و حواشی کے ساتھ جناب سید علی جوّاد زیدی ترتیب دے رہے ہیں۔ جناب آصفؔ نے انیسؔ کی اخلاقی رباعیوں کا ایک انتخاب انیسؔ الاخلاق کے نام سے بری عرق ریزی سے مرتب کر کے نظامی پریس لکھنؤ سے شائع کیا تھا۔ ۱۹۵۲ء میں انیسؔ کے ایک سو دو سلاموں کو مرتب کیا جو اب گلدستۂ انیسؔ کے عنوان سے اُردو پبلشرز لکھنو نے اپریل ۱۹۷۶ء میں شائع کیئے۔ پاکستان میں سید یوسف حسین شائق مرحوم نے تجلّیاتِ انیس کے نام سے انیسؔ کے ۸۰ سلاموں کو ترتیب دیا۔ اس جلد میں جناب شائقؔ نے نول کشور کی جلدوں کی اتباع کی ہے اور کچھ نئے سلام شامل کیئے ہیں۔ ان تمام مجموعوں کے مطالعے کے بعد راقم السطور اس نتیجے پر پہنچا کہ انیسؔ کا کچھ کلام اب بھی غیر مطبوعہ ہے اور اب تک کہیں شائع نہیں ہوا۔ اس مضمون کا مقصد انیسؔ کے اس کلام میں سے چند نمونے پیش کرنا ہے۔

میر انیسؔ کا سلام ''نمود و بود کو عاقل حباب سمجھے ہیں'' میرے خیال میں آج تک مکمل طور سے شائع نہ ہو سکا۔ یہ سلام سب سے پہلے نول کشور کی جلد میں چھپا جس میں صرف ۱۱ شعر چھاپے گئے۔ یہ سلام تذکرۂ میر انیسؔ صاحب اذکار اصحاب خاندانِ انیسؔ مولفہ حفیظ الدین احمد مزاجؔ دہلوی نے بھی چھاپا جس میں ۱۱ شعر شامل کیئے۔ جناب سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ کی مرتّب کردہ جلد روح انیس میں صرف ۱۱ شعر شائع کیئے گئے۔ جناب سید عبّاس آصفؔ کی ترتیب کردہ جلد گلدستۂ انیسؔ میں ۳۴ شعر شائع ہوئے۔ ۱۸۸۸ء/۱۳۰۶ھ میں میر علی محمد عارفؔ نے انیسؔ اور خاندان کے دوسرے شاعروں کے سلاموں اور رباعیوں کا ایک مجموعہ مرتّب کیا تھا جس کا نامکمل مخطوطہ راقم کے پاس محفوظ ہے۔ اس مجموعے میں یہ سلام ۱۶ اشعار پر مشتمل ہے۔ چند ماہ قبل لفظ 'گھرامی' کی تفصیل کے لئے غیاث اللغات کی ورق گردانی کے دوران محولہ بالا سلام جو انیسؔ کا تحریر کیا ہوا ہے، دستیاب ہوا۔ ابتدا میں انیسؔ نے ''بسم اللہ خیر الاسماء'' لکھ کر نظم کی ابتدا کی ہے اور ۵۲ شعر لکھے ہیں۔ لیکن قرین واثق ہے کہ وہ صرف ۱۱ شعر انتخاب کر کے مجالس میں پڑھتے رہے جو عام طور سے لوگوں کے

ذخیروں میں پایا جاتا ہے۔ اس سلام میں مطبوعہ صورت کے مقابلے میں بعض لفظی اختلاف بھی پائے گئے اب تک تمام مجموعوں میں زیرنظر شعر یوں چھپتا رہا ہے:-

کریم مجھ کو عطا کر وہ فقر دنیا میں
کہ جس کو فخر رسالت مآب سمجھے ہیں

انیسؔ کے تحریر کیئے ہوئے سلام میں یہ شعر اس طرح موجود ہے:-

کریم دے مجھے وہ فقر اپنی رحمت سے
کہ جس کو فخر رسالت مآب سمجھے ہیں

یا مطبوعہ جلد میں موجود یہ شعر:-

ابوترابؑ کے در کا ہے ذرۂ بے قدر
ہم آسماں پہ جسے آفتاب سمجھے ہیں

قلمی نسخہ میں مذکورۂ بالا شعر اس طرح ہے:-

ابوترابؑ کے در کا ہے ذرۂ کم قدر
سب آسماں پہ جسے آفتاب سمجھے ہیں

مثلاً سلام کا یہ شعر:-

خدا کی راہ میں ایذا سے جن کو راحت ہے
زمینِ گرم کو وہ فرش خواب سمجھے ہیں

قلمی نسخہ میں یہ شعر اس طرح ہے:-

خدا کی راہ میں ایذا سے جن کو راحت ہے
وہ دھوپ کو بھی کرم کا سحاب سمجھے ہیں

اسی طرح سلام کا بیسواں شعر مطبوعہ سے مختلف ہے:-

لحد میں آئیں نکیرین آئیں بسم اللہ
ہر اک سوال کو ہم بھی جواب سمجھے ہیں

قلمی نسخہ میں کچھ اس طرح ہے:-

لحد میں آئیں نکیرین آئیں بسم اللہ
ہر اک سوال کا ہم بھی جواب سمجھے ہیں

اس سلام کو انیسؔ کی ترتیب کے مطابق پیش کیا جاتا ہے اور جو حصے پڑھے نہ جاسکے ان پر اس طرح کا نشان [.........] بنادیا گیا ہے:-

نمود و بود کو عاقل حباب سمجھے ہیں — وہ جاگتے ہیں جو دنیا کو خواب سمجھے ہیں
نبیؐ کا عزّ وشرف بوتراب سمجھے ہیں — علی کی قدر رسالت مآب سمجھے ہیں
کبھی برا نہیں جانا کسی کو اپنے سوا — ہر ایک ذرّے کو ہم آفتاب سمجھے ہیں
کریم دے مجھے وہ فقر اپنی رحمت سے — کہ جس کو فخر رسالت مآب سمجھے ہیں
کہاں یہ مشک ختن اور کہاں حسینؑ کی زلف — یہ موشگاف خطا کو ثواب سمجھے ہیں
بھگو کے کھاتے ہیں پانی میں نانِ خشک کو وہ — اس آبرو کو جو موتی کی آب سمجھے ہیں
ابوتراب کے در کا ہے ذرّۂ کم قدر — سب آسماں پہ جسے آفتاب سمجھے ہیں
سیاق رحمت معبود ہے قیامت و حشر — ہم اس کو بھی کرمِ بے حساب سمجھے ہیں
جنہیں حصول ہوا رتبۂ فنا فی اللہ — حیات و موت کو وہ ایک خواب سمجھے ہیں
عجب نہیں ہے جو شیشوں میں بھر کے لے جائیں — ان آنسوؤں کو فرشتے گلاب سمجھے ہیں
ارے نہ آئیو دنیائے دوں کے دھوکے میں — سراب ہے یہ جسے موج آب سمجھے ہیں
یہ اشکِ تاک ہے کہتے ہیں جس کو آبِ طرب — یہ خونِ گل ہے جسے سب گلاب سمجھے ہیں
زمانہ ایک طرح پر کبھی نہیں رہتا — اسی کو اہل جہاں انقلاب سمجھے ہیں
نہیں ہے کچھ ہمیں روز شمار کا [صدمہ] — علی کے شیعوں میں اپنا حساب سمجھے ہیں
انھیں کو دارِبقا کی ہے پختگی کا خیال — جو بے ثباتیٔ دہرِ خراب سمجھے ہیں
شباب کھو کے بھی غفلت وہی ہے پیروں کو — سحر کی نیند کو بھی شب کو خواب سمجھے ہیں
جھکائیں سر کو نہ کیونکر عراق کے فصحا — سوال شاہ کو سب لاجواب سمجھے ہیں
جو ذوالجناح کو سمجھے ہیں آسماں شوکت — قمر کو زیں مہِ نو کو رکاب سمجھے ہیں
بہشت دیگا خدا خود انھیں تعال تعال — درِعلی کو جو رحمت کا باب سمجھے ہیں

صدا یہ دھوپ میں آتی تھی لاشہ شہ سے — کہ سہل ہم تپشِ آفتاب سمجھے ہیں
خدا کی راہ میں ایذا سے جن کو راحت ہے — وہ دھوپ کو بھی کرم کا سحاب سمجھے ہیں
لحد میں آئیں نکیرین آئیں بسم اللہ — ہر اک سوال کا ہم بھی جواب سمجھے ہیں
حسین کہتے تھے مرنا ہے خوب بیعت سے — ہم اس کو نیک اُسے ناصواب سمجھے ہیں
حبیب ابن مظاہر نے عرض کی مولا — غلط ہے سب جو یہ خانہ خراب سمجھے ہیں
ہم اس حصار کو اک دم میں توڑ ڈالیں گے — یہ جس کو قلعۂ خیبر کا باب سمجھے ہیں
اگر غرور ہے اعدا کو اپنی کثرت پر — تو اس حیات کو ہم بھی حباب سمجھے ہیں
نہ کچھ خبر ہے حدیثوں کی ان سفیہوں کو — نہ یہ معانی ام الکتاب سمجھے ہیں
کبھی شقی متمتع نہ ہوں گے دنیا سے — جسے یہ آب اسے ہم سراب سمجھے ہیں
گلا کٹانے کو بیعت سے بہتر وخوشتر — حضور سمجھے ہیں یا بوتراب سمجھے ہیں
جو سلسبیل کو اک دن سبیل کر دے گا — خدا کی شان اسے محتاجِ آب سمجھے ہیں
تلف ہوا کوئی بیٹا جواں تو جانیں گے — ہمارے صبر کو جو اضطراب سمجھے ہیں
مزیل عقل ہے دنیا کی دولت اے منعم — اسی کے نشے کو صوفی شراب سمجھے ہیں
مرارتیں ہیں مآل حلاوتِ دنیا — وہ زہر ہے جسے ہم شہدِ ناب سمجھے ہیں
علیؑ کو بعد نبیؐ جانتے ہیں جو بے فصل — وہی نکات حدیث و کتاب سمجھے ہیں

مذکورہ بالا اشعار مع اختلاف نسخ درج کیئے گئے اب وہ اشعار پیش ناظرین ہیں جو کہیں طبع نہ ہوئے:-

علی کے رتبۂ اعلا کو کوئی کیا جانے — خدا کے بعد رسالت مآب سمجھے ہیں
حسین پیاس میں منہ کھولتے ہیں ذبح کے وقت — چمک کو خنجر قاتل کی آب سمجھے ہیں
خدا پناہ دے صدقے میں پنجتن کے اسے — ہم آبرو کی جسے آب و تاب سمجھے ہیں
خدا نے دی ہے اماموں کو چشم [آخربیں] — وہی بجا ہے کہ جو کچھ جناب سمجھے ہیں
دیا ہے جن کو شرف حق نے خاکساری کا — زمین گرم کو وہ فرش خواب سمجھے ہیں
لگا رہے ہیں جگر گوشۂ رسول کو تیر — خطا کی راہ کو خاطی صواب سمجھے ہیں
ہے جن پہ دامن خاتون حشر کا سایہ — وہ سرد گرمی روز حساب سمجھے ہیں
شباب و شیب عجب غفلتوں میں گزرا ہے — وہ شب کا خواب اسے دن کا خواب سمجھے ہیں

دیئے ہیں عالم دوانا نے جن کو اپنے علوم	وہی دقائق ام الکتاب سمجھے ہیں
انھیں کو طول امل سے غرض نہیں جو لوگ	قلیل عمر جہانِ خراب سمجھے ہیں*

یہاں میر انیسؔ نے مصرعہ اولیٰ دوسرا قائم کیا ہے جو یہ ہے:-

*بقائے دولتِ عقبیٰ وہی سمجھتے ہیں

نہ کنہہ ذاتِ الٰہی کوئی بشر سمجھا	مگر جناب رسالت مآبؑ سمجھے ہیں
عرق کو چہرۂ سرور کے اور گیسو کو	اسے گلاب اسے مشکناب سمجھے ہیں
مفرح جگر و قلب ہے تو قوّتِ روح	ہم اشکِ دیدۂ تر کو گلاب سمجھے ہیں*

یہاں مصر ثانی انیسؔ نے پہلے یہ لگایا تھا:-

*ان [.......] خالص گلاب سمجھے ہیں

پکارتے تھے یہ خندق کی جنگ میں جبریل	خدا کا قہر علی کا عتاب سمجھے ہیں
تمام قبر میں ہے روشنی مثالِ فلک	ہم اپنا داغِ جگر آفتاب سمجھے ہیں
یہ نقش کفش رسولِ خدا ہے جلوہ نما	جسے سپہر پہ سب آفتاب سمجھے ہیں
انیسؔ مخمل و دیبا سے کیا فقیروں کو	اسی زمین کو ہم فرش خواب سمجھے ہیں

(۲)

اودھ اپنی گنگا جمنی تہذیب، اخلاق و کردار، نفاست و نزاکت اور قومی یک جہتی کا مسکن رہا ہے۔ اس کلچر کو یہاں کے روسائے کے علاوہ اُن شعرانے جو مذہب کے اعتبار سے مسلمان نہ تھے اپنایا اور بڑی حد تک کامیاب بھی رہے۔ انیسؔ بھی اسی تہذیب و ثقافت کے حامی اور علمبردار تھے اور اپنے مراثی میں اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ سامعین کے ذہنوں پر کوئی بار نہ ہو کیونکہ ان کے سامنے ہر مکتبِ فکر کے افراد موجود ہوتے تھے۔ انھیں رواداریوں کی بدولت ہمیں ایک پاکیزہ معاشرہ ملا تھا، جس پر آج بھی ہم فخر کرتے ہیں۔ میری نظر سے میر انیسؔ کے عزیز شاگرد سید آغا میر متخلص بہ ثباتؔ فیض آبادی (۱۳) کے ذخیرۂ مراثی میں بعض ایسے مرثیے گزرے جن کے متعدد بند میر صاحب نے نظری کر دیئے۔ ان میں بعض ایسے بھی مراثی ہیں جو نامعلوم وجوہ کی بنا پر طبع نہ ہو سکے اور ایک صدی سے زائد عرصہ گزرنے کے بعد آج تک حتمی طور پر یہ فیصلہ نہ کیا جا سکا کہ انیسؔ نے اپنی وفات ۱۰

دسمبر ۱۸۷۴ء تک کتنے مرثیے نظم کیئے۔ وہ اپنے ایک سلام میں فرماتے ہیں:-

فیضِ غمِ حسینؑ سے ہوتے ہیں اے انیسؔ

ہر سال ایک حال کے دفتر جدا جدا

انہوں نے اپنے مراثی کے بارے میں اپنے ایک شاگرد میر سلامت علی رضوی ساکن مفتی گنج لکھنؤ سے پوچھا تھا: ''ارے بھئی سلامت علی تم نے عون و محمد کے حال کے کتنے مرثیے جمع کیئے ہیں۔ میر سلامت علی نے پندرہ مطلع پڑھ کر سنائے۔ کچھ سکوت کے بعد انیسؔ نے مطلع سنانا شروع کیئے اور پوچھتے رہے کہ یہ تمہارے پاس ہیں، جواب میں سلامت علی نے کہا... نہیں۔ پھر میر انیسؔ نے ان سے کہا کہ، ارے بھئی سلامت علی تم کس پھیر میں پڑے ہو، خود ہمیں بھی یاد نہیں کہ ہم نے اب تک اس حال میں کتنے مرثیے تصنیف کیئے ہیں۔ پھر کچھ سکوت کے بعد فرمایا، مجھے ابتدا ہی سے عون و محمد کے حال سے زیادہ دلچسپی رہی ہے اور فیض آباد سے قیام لکھنؤ تک ان کے حال میں دو سو سے زائد مرثیے میں نے تصنیف کیئے''۔

اگر میر صاحب کی اس روایت کو صحیح نہ بھی سمجھا جائے تو بہر حال انہوں نے اس حال میں کم از کم پچاس ساٹھ مرثیے تو ضرور کہے ہوں گے وہ سب ذخیرۂ بے بہا کہاں گیا کسی کو علم نہیں۔ لیکن ذوق و شوق کا موجودہ سلسلہ جاری رہا تو ممکن ہے کہ اس سلسلے میں محققین کو کامیابی حاصل ہو جائے۔ ذیل میں انیسؔ کے ایک مطبوعہ مرثیے سے وہ حصے دیئے جا رہے ہیں جو اب تک شائع نہ ہو سکے۔ میرے پاس زیرِ نظر مرثیے کا مخطوطہ ہے اس میں ۱۳۶ بند ہیں جبکہ مطبوعہ جلدوں میں یہ مرثیہ ۱۱۲ بندوں میں چھپتا رہا ہے، یہ مرثیہ انیسؔ کے شاہکار مراثی میں ہے۔ اس کا موضوع شہادت امام حسینؑ ہے۔ ان غیر مطبوعہ بندوں میں سے چند بند انیسؔ کی ترتیب کے مطابق بند نمبر کے ساتھ درج کیئے جاتے ہیں:-

جب قطع ہوئے نخل گلستانِ علی کے　　سر کٹ گئے تیغوں سے جوانانِ علی کے

بیدم ہوئے دلدار، دل و جانِ علی کے　　عاشق نہ رہے یوسفِ کنعانِ علی کے

خاک اڑنے لگی پنجتن پاک کے گھر میں

لوٹا گیا زہرا کا چمن تین پہر میں

(غیر مطبوعہ بند نمبر ۲۵)

کپڑے بھی سیہ دل بھی سیہ رنگ بھی کالے تحت الحنکیں باندھے ہوئے آنکھیں نکالے
خنجر تو کمر بند میں اور ہاتھوں میں بھالے سادات کے سب قافلے کو لوٹنے والے
مانا نہ علیؑ کو نہ رسولِ عربیؐ کو
دنیا کے لئے ذبح کیا آل نبیؐ کو

(غیر مطبوعہ بند نمبر ۲۶)

پتھر کے کلیجے تھے تو فولاد کے تھے قلب بدکیش و جفا جو و شقی و ولدالقلب
دلجوئی و دیں پروری و مہر و وفا سلب برقع میں تو شیروں کے نجاست میں مگر کلب

....

....

(غیر مطبوعہ بند نمبر ۱۰۰)

اس بات کو سنتے ہی نہ حضرت کو رہی تاب تھرا گئے گویا کہ لگا زخم پہ تیزاب
فرمایا کہ کیا بکتا ہے او کافر و کذّاب تھے بہر امامت کے علی گوہرِ نایاب
تو دشمنِ دامادِ رسولِ دوسرا ہے
بہتان یہ اس شاہ پہ جو دستِ خدا ہے

(غیر مطبوعہ بند نمبر ۱۰۳)

بیعت سے حسن کے بھی ہے آگاہ خدائی تھی مصلحت وقت وہ جو کر گئے بھائی
کرتے وہ بھلا کس کے بھروسے پہ لڑائی انصار دغا دے گئے سب کچھ نہ بن آئی
دشمن کا ہر اک دوست تھا منظور بدی تھی
تدبیر رفیقوں نے پکڑ دینے کی، کی تھی

(غیر مطبوعہ بند نمبر ۱۰۶)

اس روز یہ ممکن تھا کہ میں جنگ نہ کرتا بیٹا اسد اللہ کا روباہوں سے ڈرتا
شمشیر کو میں خون سے کفار کے بھرتا نانا ہی کے پہلو میں حسن بھائی کو دھرتا

تابوت سے آئی مجھے آواز حسنؑ کی
للہ حمایت سے رہو باز حسنؑ کی

(غیر مطبوعہ بند ۱۰۷)

بھائی یہ نہیں وقت لڑائی کا تمہاری اس روز لڑو تم یہ نہیں مرضیٔ باری
وہ اور ہی دن ہے کہ تمہیں گھیریں گے ناری تیغوں سے قلم فوج بھی ہو جائے گی ساری
ملعوں تو ہر اک نہر پہ خورسند رہے گا
سادات پہ پانی کئی دن بند رہے گا

(غیر مطبوعہ بند نمبر ۱۰۸)

بیٹا بھی بھتیجا بھی ہر اک جائے گا مارا جز عابد بیکس نہ بچے گا کوئی پیارا
تنہائی میں ہووے گا کسی کا نہ سہارا کٹ جائے گا عاشور کو سر تن سے تمہارا
نیزے پہ مرے سر کے یہ معراج کا دن ہے
فرمایا تھا جو بھائی نے وہ آج کا دن ہے

(مطبوعہ سے مختلف مقطع بند نمبر ۱۳۶)

خاموش انیسؔ اب کہ ہے سینے میں جگر چاک ہے ترا مدّاحِ سبطِ شہِ لولاک
حاسد سے نہ کچھ خوف نہ دشمن سے ہے کچھ باک نافہم ہے وہ چاند پہ ڈالے جو کوئی خاک
سب مدح کریں نظم کا یہ نظم و نسق ہے
باطل ہے سو باطل ہے جو حق ہے سو وہ حق ہے

حوالہ جات

(۱) ماخوذ از ''انیسیات'' صفحہ ۱۵۴۔ مرتبہ جناب صباح الدین عمر ناشر اتر پردیش اُردو اکاڈمی۔ سال اشاعت نومبر ۱۹۷۶ء۔

(۲) ملاحظہ ہو راقم کا مضمون ''والد ماجد میر محمد ہادی لائق'' ضمیمہ ''قومی آواز'' مورخہ ۲۹ مئی ۱۹۷۷ء۔

(۳) میر عسکری رئیسؔ کا دوسرا عقد انیسؔ کی حیات میں ۱۸ رجب ۱۲۸۳ھ میں شیخ بنگا صاحب کی

دختر امامی خانم کے ساتھ ہوا۔ نکاح سید باقر صاحب قبلہ مجتہد نے پڑھا۔ یہ عقد میر عسکری رئیسؔ نے پہلی بیوی کی موجودگی میں کیا جو میر انیسؔ اور میر نفیسؔ کے منشاء کے مطابق نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نکاح نامے پر رئیس کے والد میر انیسؔ اور بڑے بھائی میر خورشید علی نفیسؔ کے دستخط یا مہر موجود نہیں۔

نکاح نامے پر جن افراد کے دستخط یا مہریں ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

مہر و دستخط۔ سید باقر مجتہد، دستخط۔ شیخ ہنگا، دستخط۔ یعقوب علی بیگ، مہر و دستخط۔ سید محمد سلیسؔ، مہر و دستخط۔ ننگ خاندان سید عسکری بقلم خود۔

(۴) ماخوذ از سوانح عُمری عروجؔ۔ مرتبہ ڈاکٹر سید نیّر مسعود رضوی۔

(۵) پہلا مرثیہ 'جب فوج خدا قتل ہوئی راہ خدا میں' ص ۲۲ سے شروع ہو کر ص ۳۴ پر تمام ہوا ہے جو بہ اعتبار تعداد بند نامکمل ہے۔

(۶) دوسرا مرثیہ 'اے مومنو کیا مرتبۂ سبط نبیؐ ہے' ص ۵۳ سے شروع ہوا ہے اور ص ۶۶ پر ختم ہوا ہے۔ یہ بھی نامکمل ہے۔

(۷) اس مرثیے کا درمیانی مطلع یہ ہے 'اے چرخ ستمگاری یہ کیا جور و جفا ہے' مرثیہ بہ اعتبار بین لاجواب ہے۔

(۸) رخصت ہوئے حضرت ...... الخ دراصل 'کنعان محمدؐ کے حسینوں کا سفر ہے' کا درمیانی حصہ ہے اور تمام نول کشوری ایڈیشنوں میں موجود ہے۔

(۹) اس مرثیے کا مطلع اولی یہ ہے 'واحسرتا کہ عہد جوانی گزر گیا' اس کے علاوہ اس مطلعے سے بھی ایک مرثیہ نظر سے گزرا 'جب خاتمہ بالخیر ہوا فوج خدا کا'۔

(۱۰) اس مرثیے کا مطلع ثانی یہ ہے 'جب باغ جہاں اکبر ذی جاہ سے چھوٹا'۔

(۱۱) مذکورہ بالا مطلع 'اے خسرو بیابان سخن... الخ دراصل میر انیسؔ کے ایک بہت مشہور مرثیہ ''یا رب چمنِ نظم کو گلزار ارم کر' کا درمیانی حصہ ہے۔

(۱۲) آپ میر علی محمد عارفؔ کے سب سے چھوٹے فرزند تھے۔ کلام انیسؔ پر بے پناہ عبور تھا۔ ڈاکٹر صفدر حسین زیدی اپنے مکتوب مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۷۸ء میں رقمطراز ہیں۔ ''عزیز گرامی۔ دعائیں۔ آپ نے جو تصویریں عنایت فرمائی ہیں ان کا شکریہ۔ میں نے میر انیسؔ کی مراثی کی چھ جلدیں مع اضافۂ غیر مطبوعہ کلام طبع کرانے کا منصوبہ بنایا تھا جو جناب یوسف حسین صاحب شائق

مرحوم کے تعاون سے روبہ تکمیل تھا، اب اس کا تمام بوجھ میرے ذہن واعصاب پر ہے۔ بہر حال ع 'توفیق بہ اندازۂ ہمت ازل سے' فقط۔ مخص صفدر حسین'' شائق کا ۱۴ امارچ ۱۹۷۸ء کو کراچی میں انتقال ہوا، جنت البقیع کراچی میں سپرد خاک ہوئے۔

(۱۳) میر قادر علی فیض آبادی کے فرزند آغا میر متخلص بہ ثبات میر انیس کے عزیز شاگرد تھے۔ ثبات کے بارے میں میرے دادا میر عارف اپنی ڈائری میں رقمطراز ہیں '' آغا میر شاگرد جدّم میر انیس'' وہ یہ بھی بیان کرتے تھے کہ '' میر انیس اکثر اپنے بیٹوں کے سامنے آغا میر کی خواندگی کی تعریف کیا کرتے تھے اور نیا مرثیہ نظم کرتے تو پہلے آغا میر سے پڑھواتے تھے۔ آغا میر کا پڑھنا انیس سے بہت مشابہ تھا۔'' فنون سپہ گری سے بھی واقف تھے (مثلاً نیزہ، لیز، مگدر، بانک وغیرہ) آپ کی شمع زندگی کو ۱۲۸۸ھ میں بہ عمر بیالیس سال ایک مجلس میں زہر دے کر گل کر دیا گیا۔ کربلائے امین الدولہ میں منبر کے آگے سیڑھیوں کے پہلو میں داہنی جانب سپرد خاک ہوئے۔ بہ طور نمونہ کلام رباعی دستیاب ہوسکی۔

بادل آ آ کے رو گئے ہائے غضب   آنسو نایاب ہوگئے ہائے غضب
جی بھر کے حسین کو نہ روے اس سال   آنکھوں کے نصیب سو گئے ہائے غضب

آغا میر فیض آبادی کے فرزند سید محمد جعفر مونس ونفیس کے شاگرد تھے۔ انیس کے انتقال کے وقت آپ کی عمر سات سال تھی۔ میر نفیس گھر میں حوض کے ارد گرد گھوم گھوم کر رباعیاں اور سلام پڑھنے کی مشق کروایا کرتے تھے۔ اور کبھی لکڑی کے مونڈھے پر بیٹھ جاتے تھے۔ سید محمد جعفر کی خواندگی کا یہ عالم کہ آخر زمانہ میں وہ اللہ باندی کے امام باڑے میں میر انیس کا یہ مرثیہ 'جب لشکرِ خدا کا علم سرنگوں ہوا' پڑھ رہے تھے، جب اس مقام تک پہنچے۔

جاگے ہیں رات کے تو نقاہت ہے آشکار   ڈورے جو سرخ ہیں تو یہ ہے نیند کا خمار
مستانہ ہے یہ طور کہ جھکتے ہیں بار بار   آنسو ہیں یہ صدف میں ہیں یا دُرِ شاہوار
روئے ہیں فرقتِ شہِ عالی جناب میں
نرگس کے پھول تیر رہے ہیں گلاب میں

صرف آنکھوں کے ڈھیلوں کو حرکت دے کر اس انداز سے منظر کشی کی کہ واہ واہ اور سبحان اللہ

کی آوازوں سے مجلس گونج گئی اور بار بار اسی بیت کو پڑھوایا گیا۔ آپ کا ۱۹۲۳ء میں انتقال ہوا۔ کربلائے امین الدولہ میں اپنے والد آغا میر ثابت کے پہلو میں سپرد خاک ہوئے۔ بہ طور نمونہ کلام سلام کا یہ شعر درج ہے ۔

قاسمِ ابن حسنؑ جب رن میں گھوڑے سے گرے ہو گیا پامال لاشہ خوں میں بھر جانے کے بعد

۱۴ ☆ میر انیس گھر میں میر عارف سے کہتے تھے کہ :

''وہ شاعر ہی کیا جو روزانہ شمعیں جلا کر روزانہ کچھ نہ کچھ مشقِ سخن نہ کرے'' اور وہ اس اصول کو خود بھی اپنائے ہوئے تھے، اگر طبیعت موزوں ہوئی تو پوری رات گزر جاتی تھیں، بعض مراثی کے خاتمے پر تحریر فرماتے ہیں کہ :

''بعونی وتعالیٰ روز سہ شنبہ ۲۹ رمضان المبارک ۱۲۷۲ھ وقتِ شب تمام رسید''

''بعونی وتعالیٰ۔ بتاریخ ہفتم رجب ۱۲۸۶ھ روز چہار شنبہ وقت شب تمام رسید''

علی سردار جعفری

انیسؔ کی معجز بیانی

گزشتہ چار ماہ سے میرا معمول یہ ہے کہ ہر سنیچر اور اتوار کو کسی مشاعرے یا ادبی تقریب کے لیے بمبئی سے باہر جانا اور پھر منگل تک واپس آنا اور کچھ لکھنے پڑھنے کی کوشش کرنا۔

تین دن مسہل سے پہلے تین دن مسہل کے بعد
تین مسہل تین تبریدیں یہ کل کے دن ہوئے

اس عالم میں انیسؔ پر مقالہ لکھنا ممکن نہیں ہے بلکہ مقالہ لکھنے کی کوشش کرنا انیسؔ کی بارگاہ میں ایک طرح کی بے ادبی ہے۔ اتنے بڑے شاعر پر لکھنے کے لیے سیکڑوں اشعار یاد ہونے کے باوجود یہ ضروری ہے کہ ایک بار مکمل کلام کا پھر سے مطالعہ کیا جائے اور اس کے بعد قلم اٹھانے کی ہمت کی جائے تاکہ شاعری کے زیادہ سے زیادہ گوشوں پر نگاہ پڑ سکے۔ اس کام کے لیے جتنا وقت درکار ہے میں اپنی بدقسمتی سے نہ نکال سکا اور انیسؔ کا قرض ادا نہ کر سکا جس کا اعتراف اپنی نوعمری کی مشق سخن کے دوران یوں کیا تھا۔

ملتا نہیں دماغ جو طبع نفیس کا
اک خوشہ چیں ہوں باغِ جناب انیسؔ کا

میرے بچپن میں جن آوازوں نے میرے ذوق کی تربیت کی ہے ان میں سب سے زیادہ اہم انیسؔ کی آواز ہے۔ انیسؔ کے مرثیے محرّم کی مجلسوں میں پڑھے جاتے تھے اور مجلسوں سے الگ بھی ان کا مطالعہ جاری رہتا تھا۔ بچپن کے کھیلوں میں بیت بازی بھی شامل تھی اور اس میں اساتذہ کی غزلوں کے علاوہ انیسؔ کے مرثیوں کے اشعار بھی استعمال ہوتے تھے۔ اس کے زیر اثر میں نے شاعری شروع کی اور غالباً پندرہ سولہ برس کی عمر میں پہلا شعر کہا۔

عرش تک اوس کے قطروں کی چمک جانے لگی
چلی ٹھنڈی جو ہوا تاروں کو نیند آنے لگی

یہ شعر معنوی اعتبار سے میرے ذاتی مشاہدے کا نتیجہ تھا لیکن فنی اعتبار سے انیسؔ کا فیض تھا۔ اس کا آہنگ ٹیپ کے دو مصرعوں کے لیے زیادہ موزوں تھا۔ اس سے مجھے مرثیہ لکھنے کی ترغیب ہوئی اور مرثیے سے نظم نگاری تک ہر سفر میں انیسؔ کی شاعری نے میری بہت رہنمائی کی ہے۔

انیسؔ کے اثرات جوشؔ ملیح آبادی کے یہاں بہت واضح ہیں اور اقبالؔ کے یہاں بھی تلاش کیے جاسکتے ہیں بیسویں صدی کی نظم کی زبان کو انیسؔ انیسویں صدی میں مستند بنا چکے تھے۔

میں انیسؔ کا شمار اردو کے چار عظیم شعرا میں کرتا ہوں۔ باقی تین میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ ہیں۔ دراصل ان چاروں کا شمار دنیا کے عظیم شعرا میں ہے۔ انیس کا موضوع دنیا کا عظیم ترین موضوع، شجاعت اور قربانی ہے جس کو انیسؔ کے حسن زبان اور اعجاز بیان نے آسمان پر پہنچادیا ہے۔ یہ زمانے کے اعلیٰ تین جذبات ہیں جو آزادی اور صداقت کی زمین سے پیدا ہوتے ہیں اور کسی ایک ملک اور قوم تک محدود نہیں ہیں۔ ان جذبات کو جس تاریخی داستان نے عظمت عطا کی ہے وہ بہت سادہ ہے۔ اسی سادگی میں اس کی گہرائی ہے اور اسی سادگی میں اس کی بلندی۔ اس داستان میں نیکی اور بدی کی کشمکش ایک رزمیہ کا انداز اختیار کرلیتی ہے اور داستان جتنی آگے بڑھتی ہے اتنی ہی اس کی حیرت ناک عظمت بڑھتی جاتی ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس میں ظاہری شکست، فتح بن کر نمودار ہوتی ہے اور بدی کی شاہانہ شان و شوکت حقیر نظر آنے لگتی ہے۔ آج حسینؑ کا لفظ یزداں کے اور یزید کا لفظ اہرمن کے ہم معنی بن گیا ہے ~

موسیٰ و فرعون و شبیرؑ و یزید
ایں دو قوت از حیات آید پدید

سب سے پہلے مجھے انیسؔ کی شاعری کے جن حصوں نے متاثر کیا وہ صبح کی منظر کشی سے متعلق تھے اور اس کی وجہ میرا ذوق آوارگی تھا۔ میں ترائی کے جنگلوں اور پہاڑوں میں بہت گھوما ہوں اور میں نے ترائی کے میدانوں سے ہی صبح کو طلوع ہوتے ہوئے اور آسماں پر تاروں کو

بجھتے ہوئے دیکھا تو ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ انیسؔ کے یہاں یہ منظر نگاری تخیلی نہیں ہے بلکہ حقیقی ہے۔ میرے نزدیک مثنویوں کے بعد اس کو اردو شاعری میں فطری منظر نگاری کی ابتدا کہا جاسکتا ہے (جوشؔ کی شاعری میں صبح کی منظر نگاری اس کا تسلسل ہے) صبح کی جس نرم ہوا کا ذکر انیسؔ نے کیا ہے اس کے جھونکوں سے میرے تخیل نے فرحت حاصل کی ہے اور طلوع آفتاب سے میری آنکھیں روشن ہوئی ہیں۔

اس منظر نگاری کا انیسؔ کے موضوع سے گہرا تعلق ہے۔ غور فرمائیے کہ ان مرثیوں میں طلوع ہی طلوع ہے۔ غروبِ آفتاب کا کہیں نام و نشان بھی نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صبح عاشور، صبح شہادت اور صبح سعادت ہے۔ ان مراثی میں جہاں رات آئی ہے وہ اپنی تمام ہولناکی کے باوجود اس صبح شہادت اور صبح سعادت کی بشارت لے کر آئی ہے۔

رات کی ایک تصویر یہ ہے ؎

جب زلف کو کھولے ہوئے لیلائے شب آئی | پردیس میں سادات پہ آفت عجب آئی
فریاد کناں روحِ امیرِ عرب آئی | غل تھا کہ شبِ قتلِ شہ تشنہ لب آئی

سادات کو کیا کیا غمِ جاں کاہ دکھائے
رات ایسی مصیبت کی نہ اللہ دکھائے

اور دوسری تصویر یہ ہے ؎

جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے | جلوہ کیا سحر کے رُخِ بے حجاب نے
دیکھا سوئے فلک شہ گردوں رکاب نے | مڑ کر صدا رفیقوں کو دی اس جناب نے

آخر ہے رات حمد و ثنائے خدا کرو
اٹھو فریضۂ سحری کو ادا کرو

ہاں غازیو یہ دن ہے جدال و قتال کا | یاں خوں بہے گا آج محمدؐ کی آل کا
چہرہ خوشی سے سُرخ ہے زہراؑ کے لال کا | گزری شبِ فراق دن آیا وصال کا

ہم وہ ہیں غم کریں گے ملک جن کے واسطے
راتیں تڑپ کے کاٹی ہیں اس دن کے واسطے

اس کے بعد مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ انیسؔ کے مرثیوں میں منظر نگاری

رسمی چیز نہیں ہے اور نہ وہ ظاہری آرائش کے لیے ہے۔ اس منظر نگاری کا کربلا کی عظیم الشان قربانی سے ایک گہرا رشتہ ہے۔ فطرت کو انیسؔ نے حساس بنادیا ہے۔ چناں چہ ایک بند میں فطرت کا غم اور اضطراب واقعاتِ کربلا پر اس طرح ظاہر ہوتا ہے۔

تھا بس کہ روزِ قتلِ شہ آسماں جناب ۔۔۔ نکلا تھا خوں ملے ہوئے چہرے پہ آفتاب
تھی نہرِ علقمہ بھی خجالت سے آب آب ۔۔۔ روتا تھا پھوٹ پھوٹ کے دریا میں ہر حباب
پیاسی جو تھی سپاہِ خدا تین رات کی
ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

ایک اور مقام پر انیسؔ نے فطرت کے غم اور اضطراب کو اس طرح ظاہر کیا ہے کہ وہ پیاسوں کو پانی پلانا چاہتی ہے۔ ایک مصرعے کے بعد دوسرے مصرعے میں صبح کا بیان ہو رہا ہے کہ یکایک ٹیپ کے مصرعوں میں ایک نئی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ۔

وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار ۔۔۔ پھولوں پہ جا بجا وہ گہر ہائے آب دار
اٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار ۔۔۔ بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار
خواہاں تھے نخلِ گلشنِ زہراؑ جو آب کے
شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

یہ صبح جو آسمان پر تاروں کے بجھنے، زمین پر ہوا کے چلنے اور پھولوں کے کھلنے سے شروع ہوتی ہے۔ طائروں کے چہچہوں اور زمزموں سے گزرتی ہوئی اس منزل پر پہنچتی ہے جہاں مجاہدوں کی اذان ہوتی ہے۔ اذان صبح کی علامت بھی ہے اور حسینی کارواں میں کلمہ حق کا اعلان بھی ۔

ناگاہ چرخ پر خطِ ابیض ہوا عیاں ۔۔۔ تشریف جا نماز پہ لائے شہِ زماں
سجّادے بچھ گئے عقبِ شاہِ انس و جاں ۔۔۔ صوتِ حَسن سے اکبرؑ مہرو نے دی اذاں
ہر ایک چشم آنسوؤں سے ڈبڈبا گئی
گویا صدا رسولؐ کی کانوں میں آگئی

اور اب فطرت اس اذان سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے ۔

چپ تھے طیور جھومتے تھے وجد میں شجر　　تسبیح خواں تھے برگ و گل و غنچہ و ثمر
محوِ ثنا کلوخ و نباتات و دشت ودر　　پانی سے منہ نکالے تھے دریا کے جانور
اعجاز تھا کہ دلبر شبیرؑ کی صدا
ہر خشک و تر سے آتی تھی تکبیر کی صدا

یہ حسنِ صوت اور یہ قرأت یہ شدّومد　　حقا کہ افصح الفصحا ہے انہیں کا جد
گویا ہے لحنِ حضرتِ داؤدِؑ باخرد　　یارب رکھ اس صدا کو زمانے میں تا ابد
شعبے صدا میں پنکھڑیاں جیسے پھول میں
بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسولؐ میں

اسی صبح عاشور کو انیس نے نہایت شاعرانہ چابک دستی کے ساتھ فوج یزید میں متضاد منظر میں پیش کیا ہے جس میں حق وباطل کی تفریق صاف نظر آجاتی ہے۔ جہاں فوج حسینی میں: ’’خم گردنیں تھیں سب کی خضوع و خشوع میں، سجدوں میں چاند تھے مہ نو تھے رکوع میں‘‘ وہاں:

ہے لشکر یزید میں سامانِ قتلِ شاہ　　ہر سو جمارہا ہے صفیں شمرِ روسیاہ
گیتی کو تہلکہ ہے، یہ ہے کثرت سپاہ　　ممکن نہیں کہ ہو گزرِ طائرِ نگاہ
سب مستعد ہیں قتلِ شہ کائنات پر
طوفانِ آبِ تیغ اٹھا ہے فرات پر

ایک بار یہ مصرع پھر پڑھیے کہ ’’ہر سو جمارہا ہے صفیں شمرِ روسیاہ‘‘ اور پھر یہ بند پڑھیے ؎

قرآں کھلا ہوا کہ جماعت کی تھی نماز　　بسم اللہ جیسے آگے ہو یوں تھے شہِ حجاز
سطریں تھیں یا صفیں عقبِ شاہِ سرفراز　　کرتی تھی خود نماز بھی ان کی ادا پہ ناز
صدقے سحر، بیاض پہ بین السطور کی
سب آیتیں تھیں مصحفِ ناطق کے نور کی

یہ ہے انیس کی معجز بیانی۔ اس میں انیس نے تمام ادبی اور شاعرانہ حربوں سے کام لیا ہے جو اس وقت کے لکھنؤ میں رائج تھے۔ ہر طرح صنائع، بدائع، تشبیہ، استعارے، مبالغے،

لیکن اتنی فصاحت، بلاغت اور لطافت کے ساتھ کہ ذوقِ سلیم پر گراں نہیں گزرتے۔ یہ جائے خود ایک طویل مقالے کا موضوع ہے۔ شبلؔی نے موازنہ ودبیرؔ میں اس طرف ذرا سا اشارہ کیا ہے لیکن اس پر زیادہ کام کرنے کی ضرورت ہے اور خاص طور سے آج کل جب امیج اور علامت پر بہت زور ہے۔ انیسؔ کی تربیت شاعر کو بد مذاقی اور مصنوعی پن سے بچا سکتی ہے۔

مثال کے طور پر انیسؔ نے مبالغہ آرائی اس طرح کی ہے کہ پڑھنے والا لطف لینے پر مجبور ہو جاتا ہے اور بات دور از کار نہیں معلوم ہوتی۔ کربلا میں گرمی کی شدت کو بیان کرنے کے لئے یہ مصرع کہنا کہ "بُھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر" اعجازِ سخن کی مثال ہے۔ کم تر درجے کے شعرا یہ مصرع نہیں کہہ سکتے کہ "خس خانہ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر" میں اس کو انتہائی حقیقت نگاری کی مثال سمجھتا ہوں۔ جو لوگ ریگستان کی دھوپ میں ہو کر گزرے ہیں وہ جانتے ہیں کہ گرمی اور آفتاب کی تیزی سے آنکھیں آدھی بند ہو جاتی ہیں اور نگاہ پلکوں سے چھن کر باہر نکلتی ہے اس مصرعے کے بعد یہ مبالغہ نہیں معلوم ہوتا۔

گر آنکھ سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

یہاں مبالغہ تخیّل کی بلندی بن جاتا ہے

صنعتِ ایہام کا استعمال انیسؔ کے یہاں بہت زیادہ ہے لیکن ذوقِ سلیم پر گراں نہیں گزرتا بلکہ لطف میں اضافہ کر دیتا ہے۔

جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے
اقلیمِ سخن میری قلم رو سے نہ جائے

پیدل میں تھی نہ جان نہ دم تھا سوار میں
ٹوٹی ہوئی صفیں تھیں بھلا کس قطار میں

تعریف میں چشمے کو سمندر سے ملا دوں
قطرے کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں

انیسؔ نے بہت سی نئی تشبیہیں استعمال کی ہیں اور ان میں تخیل کی بلندی، ندرت اور ذوق کی لطافت سے کام لیا ہے۔ مثلاً حضرت عباسؑ کے دونوں ہاتھ کٹ چکے ہیں اور وہ مشکیزہ کو دانتوں میں پکڑ لیتے ہیں۔ اس وقت انیسؔ نے یہ حیران کن تصویر فراہم کی ہے ''مشکیزہ تھا کہ شیر کہ منہ میں شکار تھا'' حضرت عباسؑ کی خوب صورت آنکھوں کا بیان، لیکن میدان کارزار میں جاتے وقت ؎

ڈورے جو سُرخ سُرخ ہیں چشمِ سیاہ میں
پھرتی ہیں خوں بھری ہوئی تیغیں نگاہ میں

انیسؔ کی یہ تشبیہیں جن کا ذکر پہلے دوسرے انداز سے آیا ہے صرف نئی نہیں ہیں بلکہ اردو شاعری میں اضافے ہیں ؎

تھا چرخِ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کِھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

ع ؎

شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے

تھا بس کہ روز قتلِ شہ آسماں جناب
نکلا تھا خوں ملے ہوئے چہرے پہ آفتاب

یہ ذکر میں ایک پورا بند سنا کر ختم کرنا چاہتا ہوں۔ عونؑ محمدؑ دو کم سِن سپاہی میدانِ جہاد میں آرہے ہیں۔ چھ مصرعوں میں چھ تشبیہیں ہیں ؎

دو صاعقے لشکر پہ چمکتے ہوئے آئے
شعلے تھے کہ آندھی میں لپکتے ہوئے آئے
دو شیر صفِ جنگ کو تکتے ہوئے آئے
دو گل تھے ہوا پر کہ مہکتے ہوئے آئے

تھا شور کہ ہوش اڑتے ہیں یاں کبکِ دری کے
گھوڑے نہیں جھونکے ہیں نسیم سحری کے

انیسؔ کے مراثی میں کئی ہزار تشبیہیں اور استعارے ہیں جو انسان کو حیران کر دیتے ہیں۔ اس مقام پر مجھے حضرت عباسؑ کی ایک تصویر یاد آرہی ہے جو میرے نزدیک بیانیہ

شاعری کا معجزہ ہے۔

زور بازو کا نمایاں تھا بھرے شانوں سے دستِ فولاد دبا جاتا تھا دستانوں سے
برچھیوں اُڑتا تھا دب دب کے فرس رانوں سے آنکھ لڑ جاتی تھی دریا کے نگہبانوں سے

آخر میں انیسؔ کی معجز بیانی کے ایک اور پہلو کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جسے شاعر نے خود اس طرح بیان کیا ہے۔

گلدستہ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضموں ہوں تو سو رنگ سے باندھوں

انیسؔ نے ایک سے مضامین کو مختلف مرثیوں میں بار بار باندھا ہے۔ کہیں مرثیوں کی بحریں بدل جاتی ہیں کہیں کردار مختلف ہو جاتے ہیں۔ لیکن ایک ایسا مرثیہ بھی ہے جس میں ایک ہی جگہ انیسؔ نے ایک مجاہد کی پانچ جنگیں دکھائی ہیں اور کہیں کسی قسم کی تکرار نظر نہیں آتی۔ مرثیہ ''پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زار صبح'' حضرت قاسمؑ میدان جنگ میں آتے ہیں اور فوج میں بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ اس وقت بد حواس ہو کر ابن سعد اپنے مشہور پہلوان ارزق شامی سے کہتا ہے کہ صرف تو اس نوجوان کو قتل کر سکتا ہے۔ ارزق بگڑ کر جواب دیتا ہے۔

فرق آئے گا کبھی نہ مری آن بان میں
لڑکے سے لڑ کے نام مٹادوں جہان میں

اس لیے اس کے چار بیٹے یکے بعد دیگرے لڑنے کے لیے نکلتے ہیں۔ پہلا یہ کہتے ہوئے آگے بڑھتا ہے۔

نکلا یہ بات سنتے ہی اُن میں سے ایک یل پیچھے چلی شریر کے ہنستی ہوئی اجل
نعرہ کیا یہ غیظ سے موذی نے کھا کے بل ہاں اے حسنؑ کے لال، خبردار ہو، سنبھل
کام آئے کچھ تو نامِ شہِ ذوالفقار لے
پشتی پہ ہو کوئی تو مدد کو پکار لے

قاسمؑ یہ نعرہ زن ہوئے چمکا کے راہوار امداد، وقتِ جنگ ہے شیروں کو ناگوار
کافی ہے بس ہمیں سپرِ حفظِ کردگار او خیرہ سر، اجل تری گردن پہ ہے سوار

دشمن کو اپنی ضرب طمانچہ قضا کا ہے
آ کوئی وار کر جو ارادہ وغا کا ہے

یہ سنتے ہی کماں کو اٹھا کر بڑھا شریر چلّے میں بین بھال کا جوڑا شقی نے تیر
تھا بس کہ تیز دست حسنؑ کا مہِ منیر بجلی سی آئی کوند کے شمشیرِ بے نظیر
یوں قطع انگلیاں ہوئیں اس تیرہ بخت کی
جیسے کوئی قلم کرے شاخیں درخت کی

اک ہاتھ میں جو کٹ کے گرے دستِ نابکار بولے کمر میں رکھ کے یہ شمشیر آب دار
اب دیکھ میرے تیر کا توڑ اے خطا شعار پکڑا کماں کے قبضے کو یہ کہہ کے استوار
چلّے جو کھینچنے لگے سرکش کو تاک کے
رستم کی روح چھپ گئی تودے میں خاک کے

چٹکی سے چھوٹ کر جو چلا تیرِ بے اماں قربان تیرے ہاتھ کے چلّائی یہ کماں
بچتی ہے کیا خدنگِ اجل سے کسی کی جاں نکلا وہ تیر توڑ کے سینے کے استخواں
اک دم میں دی شکست خطا کو صواب نے
غل تھا قفس کی تیلیاں توڑیں عقاب نے

اب دوسری جنگ ہے کہ جس میں نیزے استعمال ہوئے ہیں ؎

مرکب سے گر کے مر گیا جب وہ عدوئے دیں نکلا ادھر سے تب پسرِ ثانی لعیں
نیزے کو تولتا ہوا مغرور و خشم گیں ابرو پہ بل، نگاہ میں قہر اور جبیں پہ چیں
ہمراہ اس کے تیغ بکف سو سوار تھے
اور اس طرف مدد کو شہ ذوالفقار تھے

نیزے کا وار کرنے لگا جب وہ خود پسند بجلی سا کوندنے لگا دولہا کا بھی سمند
نیزہ اڑا کے نیزے سے کی یہ صدا بلند "کیوں تو نے دیکھے نیزۂ مشکل کشا کے بند"
یہ سن کے اس نے ڈھال کو چہرے پہ گولیا
پتلی کو بے حیا کی سناں میں پرولیا

بے کار کور ہو کے ہوا جب وہ خیرہ سر　　پٹکے میں ہاتھ ڈال کے پٹکا زمین پر
آواز دی زمیں نے کہ فی النّار والسّقر　　جا تو بھی ہے برادر عینی ترا جدھر
جز موت کچھ شقی کو نہ اس دم نظر پڑا
آنکھیں کھلیں تو قعرِ جہنّم نظر پڑا

اب تیسری اور چوتھی جنگ ہے۔ اس میں گرز اور تلوار کا استعمال ہے ۔

جھپٹا برادر سوّم اس کا بہ کرو فر　　تانے ہوئے وہ گرزِ گراں سر کہ الحذر
یاں بہر حفظ، دستِ ید اللہ تھے سپر　　تیغِ دو دم کو شیر نے تولا بچا کے سر
یوں دو کیا عمودِ سرِ نابکار کو
جس طرح تیغ تیز اڑا دے خیار کو

مرتے ہی اس کے فوج سے چوتھا پسر بڑھا　　قاسمؑ پکارے "او یلِ خود سر کدھر بڑھا؟"
سنتے ہی یہ وہ تیغِ دو دم کھینچ کر بڑھا　　جھنجھلا کے مجتبیٰؑ کا بھی لختِ جگر بڑھا
لڑتا وہ کیا کہ تیرِ اجل کا نشانہ تھا
اک ہاتھ میں نہ سر تھا نہ بازو نہ شانہ تھا

یہ چاروں لڑائیاں جن کو انیسؔ نے مختلف انداز سے نظم کیا ہے دراصل تمہید ہیں اس پانچویں لڑائی کی جس میں خود ارزق شامی سامنے آتا ہے۔ یہ وہی پہلوان ہے جس نے غرور سے کہا تھا کہ ۔

فرق آئے گا کبھی نہ مری آن بان میں　　لڑکے سے لڑ کے نام مٹا دوں جہان میں
بیٹوں کو میرے بھیج کہ چاروں دلیر ہیں　　جنگ آزما ہیں، سور ہیں، صفدر ہیں، شیر ہیں

یہ چاروں جنگ آزما، سُور، صفدر اور شیر جب حضرت قاسمؑ کے ہاتھ سے قتل ہو گئے تو ارزق شامی ۔

جیبِ قبا کو مثلِ کفن پھاڑتا ہوا
نکلا پرے سے دیو سا چنگھاڑتا ہوا

اس کے بعد ارزق شامی کی ہیبت ناک تصویر ہے یہ ڈرامائی عنصر ہے۔ انیسؔ یہ کہہ رہے ہیں کہ معمولی پہلوان نہیں ہے۔ اس سے حضرت قاسمؑ کی جنگ کی اہمیت بڑھتی ہے۔ اس

ڈرامائی عنصر کے بعد دوسرا ڈرامائی عنصر وہ انسانی جذبات ہیں جن کو امام حسینؑ سے منسوب کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ سے بھی ارزق شامی کی ہیبت میں اضافہ ہوتا ہے۔ چناں چہ انیسؔ فرماتے ہیں ؎

شانے پہ تھی شقی کے وہ دو تانک کی کماں — ارجن بھی جس سے سہم کے گوشے میں ہو نہاں
چار آئینہ وہ پہنے تھا بر میں کہ الاماں — دب جائیں جس کے بوجھ سے رستم کے استخواں
کہتی تھی یہ زرہ بدنِ بدخصال میں
جکڑا ہے پیلِ مست کو لوہے کے جال میں

آمد شقی کی دیکھ کر گھبرا گئے امام — عباسؑ نامور سے یہ حسرت کیا کلام
لو بھائی جنگ ہوچکی قصّہ ہوا تمام — آیا سوئے یتیمِ حسنؑ موت کا پیام
ہم شکل مصطفیٰؐ کو بلالو پکار کے
مانگو دعا سروں سے عمامے اُتار کے

یہ کہہ کے قبلہ رو ہوئے سلطانِ کائنات — درگاہِ کبریا میں دعا کی اٹھا کے ہات
اے خالقِ زمین و زماں ربِ پاک ذات — ارزق کے ہاتھ سے مرے قاسمؑ کو دے نجات
تو حافظِ جہاں ہے کریم و رحیم ہے
یارب بچا اسے کہ یہ لڑکا یتیم ہے

اس ڈرامائی انسانی عنصر کے بعد جنگ کا لطف بڑھ جاتا ہے۔ حضرت قاسمؑ کی نوعمری اور ارزق کی تجربہ کاری اور ہیبت مرثیہ سننے والوں کے ذہن میں کام کرتی رہتی ہے۔ اس مقام پر انیسؔ نے ان چاروں ہتھیاروں میں سے تین کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے جن کا ذکر ارزق کے بیٹوں سے جنگ کے دوران میں الگ الگ ہوا تھا۔ نیزہ، کمان اور تلوار ؎

نیزہ ہلا کے جانب قاسمؑ بڑھا وہ یل — دولہا نے مسکرا کے صدا دی سنبھل سنبھل
گھوڑا نہ گر پڑے ترے لنگر سے منہ کے بل — تو ہے فرس پہ اور تری گردن پہ ہے اجل
ضیغم ہیں بیشہ اسدِ ذوالجلال کے
کیجو سناں کا وار ذرا دیکھ بھال کے

یہ کہہ کے اپنے چھوٹے سے نیزے کو دی تکاں — چمکی انی تو برق پکاری کہ الاماں
اک بند باندھ کر جو فرس سے کہا کہ ہاں — ڈانڈ آئی ڈانڈ پر تو سناں سے لڑی سناں

بل کیا کرے کہ زور ہی موذی کا گھٹ گیا
غل تھا کہ اژدہے سے وہ افعی لپٹ گیا

قاسمؑ نے زور سے جو، انی پر رکھی انی
بھاگا شقی کے جسم سے زورِ تہمتنی
بگڑا جو ڈھنگ جان پہ ظالم کی آبنی
تھی اس سناں کی نوک کہ ہیرے کی تھی کنی
اڑ کر گری زمیں پہ سناں اس تکان سے
گرتا ہے جیسے تیرِ شہاب آسمان سے

جھلا کے چوبِ نیزہ کو لایا وہ فرق پر
قاسمؑ نے ڈانڈ ڈانڈ پہ ماری چچا کے سر
دو انگلیوں میں نیزۂ دشمن کو تھام کر
جھٹکا دیا کہ جھک گئی گھوڑے کی بھی کمر
نیزہ بھی دب کے ٹوٹ گیا نابکار کا
دو انگلیوں سے کام لیا ذوالفقار کا

سنبھلا وہ بے شعور یہ جھٹکا اٹھا کے جب
قبضے میں لی کمانِ کیانی بصد غضب
چلّے میں تیر جوڑ چکا جب وہ بے ادب
تیوری چڑھائی قاسمِ نوشاہ نے بھی تب
تیرِ نگاہ سے وہ خطا کار ڈر گیا
کانپے یہ دونوں ہاتھ کہ چلّہ اتر گیا

بولا یہ مسکرا کے جگر گوشۂ حسنؑ
"رُخ پھیریو نا او ستم ایجاد، پیل تن"
چلائے بڑھ کے حضرت عباس صف شکن
"کیا خوب تجھ کو یاد ہیں تیرا فگنی کے فن"
دیکھا ہمارے شیر کی چتون کی شان کو
کیوں منہ اتر گیا ہے چڑھا لے کمان کو

دو سمت سے چلے جو ملامت کے اس پہ تیر
چلّایا تیغ تیز علم کرکے وہ شریر
ہاں اے حسنؑ کے لعلِ بدخشاں بدہ بگیر
نکلی چمک کے یاں سے بھی شمشیرِ بے نظیر
چمکا کے تیغ تیز جو قاسمؑ سنبھل گئے
سمجھا جو کچھ، فرس کے بھی تیور بدل گئے

مانندِ شیرِ غیظ میں آیا وہ پیل تن
آنکھیں ابل پڑیں صفتِ آہوئے ختن
ماری زمیں پہ ٹاپ کہ لرزا تمام بن
چلائے سب کہ گھوڑے پہ بھی او چڑھا ہے رن

میخیں زمیں کی اس کی تگاپو سے ہل گئیں
دونوں کنوتیاں بھی کھڑی ہو کے مل گئیں

دونوں طرف سے چلنے لگے وار یک بیک — دو بجلیاں دکھانے لگیں ایک جا چمک
تکنے لگے فلک کے دریچوں سے سب ملک — اک زلزلہ تھا اوج ثریّا سے تاسمک
چہرے پہ آفتاب کے مقتل کی گرد تھی
یہ خوف تھا کہ دھوپ کی رنگت بھی زرد تھی

ہر بار جانبین سے ہوتے تھے وار رد — تھا حرب و ضرب میں وہ شقی بھی بلائے بد
.ب بڑھ کے وار کرتا تھا وہ بانیِ حسد — کہتا تھا بازوئے شہِ دیں "یا علیؑ مدد"
یوں روکتے تھے ڈھال پہ تیغِ جہول کو
جس طرح روک لے کوئی شہ زور پھول کو

لایا جو حرفِ سخت زباں پر وہ بد خصال — جھپٹا مثالِ شیرِ درندہ حسنؑ کا لال
گھوڑے سے بس ملادیا گھوڑا بصد جلال — اتنے بڑھے کہ لڑگئی اس کی سپر سے ڈھال
اوجھڑ لگی کہ ہوش اڑے خود پسند کے
گھوڑے نے پاؤں رکھ دیے سر پر سمند کے

عباسِ نامدار نے پہلو سے دی صدا — ہاں اب نہ جانے دیجیو اَحسنت، مرحبا
دشمن کے مار ڈالنے کی بس یہی ہے جا — سنتے ہی یہ فرس کو فرس سے کیا جدا
گھوڑا بھی اس طرف کو ادھر ہو کے پھر پڑا
مارا کمر پہ ہاتھ کہ دو ہو کے گر پڑا

آج ہم اردو کے اس عظیم شاعر کی معجز بیانی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ یقین ہے کہ انیسؔ کی شاعری کے مختلف پہلو ہمارے سامنے آئیں گے۔ مجھے خوشی ہے کہ اس سیمینار میں ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے دانشور شریک ہیں اور جو خود نہیں آسکے، انہوں نے مقالے بھیج دیے ہیں۔

قمر حسین رضوی (کانپور، بھارت)

میر خورشید علی نفیسؔ بنام شیعانِ میر انیسؔ

یہ امر واقعہ ہے کہ اردو مرثیہ کا نام آتے ہی میر ببر علی انیسؔ کا نام ہی ذہن میں آتا ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں ہے کہ میر انیسؔ نے مرثیہ نگاری میں جو نام پیدا کیا وہ کسی بھی مرثیہ نگار کو نصیب نہیں ہوا۔ انہوں نے اس صنف سخن کو بامِ عروج تک پہنچایا۔ میر انیسؔ کے ہم عصر مرزا دبیرؔ کی دوسری قد آور شخصیت مرثیہ نگاری میں نظر آتی ہے مگر میر انیسؔ کو جو شہرت عام حاصل ہوئی وہ دوامی ہے۔ میر انیسؔ کی اقلیم سخن میں شہر اور دیہات سب شامل ہیں آج بھی مراثی انیسؔ کا دور دورہ قائم ہے۔ گویا اس میدان سخن میں وہی واحد شاعر تھے باقی مرثیہ نگاروں کو اس شجرِ سایہ دار کے نیچے پنپنے کا نہ ان کی زندگی میں موقع ملا نہ ان کے بعد ہی۔ یہ کہنا کسی حد تک درست ہے کہ مرثیہ نگاری بعدِ انیسؔ رفتہ رفتہ معدوم ہوتی چلی گئی۔ مرثیہ نگاروں کی طویل فہرست ہے جنھوں نے اس صنف ادب میں اپنے حوصلے بھر مقام حاصل کیا بہت سے گمنام بھی رہ گئے۔ میر انیسؔ کے دونوں بھائی، مونسؔ، انسؔ، اور بیٹے سلیسؔ اور میر خورشید علی نفیسؔ میر انیسؔ کے شاگرد تھے سبھی مرثیہ نگار تھے ان میں قابل ذکر مرثیہ نگار مونسؔ برادر انیسؔ اور میر خورشید علی نفیسؔ فرزندِ انیسؔ نے شہرت پائی۔ حیات انیسؔ میں بالخصوص میر نفیسؔ کے ساتھ یہ ظلم مستقلاً روا رکھا گیا کہ میر نفیسؔ اپنے باپ کا کلام پڑھتے ہیں دراں حالیکہ میر نفیسؔ خود ایک پختہ گو مرثیہ نگار تھے۔ میر نفیسؔ مرنجاں مرنج درویش صفت عالم تھے ان کے علم کی تھاہ نہ تھی۔ میر انیسؔ کے چہلم کی مجلس سید تقی صاحب مرحوم کے امام باڑے میں ۵ ذی الحجہ ۱۲۹۱ھ بروز پنج شنبہ ہوئی جس میں روسائے شہر کے علاوہ ہزارہا آدمی شہر کے شریک جلسہ تعزیت تھے۔ اس مجلس میں میر نفیسؔ نے منبر پر اپنا نو تصنیف ۷ بند کا مخمس بہ زبان فارسی پڑھا:۔

از باغِ جہاں بلبلِ بستاں سخن رفت — در برجِ لحد نیرِ تابانِ سخن رفت
ہیہات کہ سر دفترِ دیوان سخن رفت — افسوس کہ شاہنشہِ عرفانِ سخن رفت
ویرانی نظم است کہ سلطان سخن رفت

سامعین کلامِ نفیسؔ سن کر دنگ رہ گئے غالباً پہلی مرتبہ انہیں ہوش آیا کہ خورشید علی نفیسؔ جانشین انیسؔ کس عظیم مرتبے کی شخصیت کا نام ہے؟ میر انیسؔ نے ان گنت مرثیے کہے جن کی تعداد لوگ ہزاروں میں بھی بتاتے ہیں مرکزی انیسؔ صدی کمیٹی کی دریافت کے مطابق میر انیسؔ کے کل مرثیوں کی تعداد ۳۲۶ بتائی گئی۔ جن کے قلمی نسخے ملے ہیں ان مراثی کو میر انیسؔ کی تصنیف تسلیم کر کے پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ نے فہرست کروایا تھا۔ ڈاکٹر سبطین فاطمہ رضوی نے اپنے مقالہ "میر خورشید علی نفیسؔ حیات اور شاعری میں" میر خورشید علی نفیسؔ کی مطبوعہ مراثی کی تعداد ۳۷ اور غیر مطبوعہ مراثی کی تعداد ۴۴ درج کی ہے یعنی ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مراثی کی کل تعداد ۸۱ ہوتی ہے ان میں سے کچھ مراثی ایسے بھی ہیں جو میر انیسؔ کے مرثیے سمجھے گئے یہاں صاحبان فن اور شیعان انیسؔ نے باپ، بیٹے کے کلام کا نمایاں فرق بھی نظر انداز کر دیا۔ سید بلاغت حسین شہاب سرمدی انیسؔ کے ۳۳ غیر مطبوعہ مراثی میں اپنے مقدمے کے صفحہ ۲۱ پر لکھتے ہیں "میر حسنؔ، میر خلیقؔ اور میر انیسؔ کے کلام پر سرسری تقابلی نظر ڈال کر زبان کی امتیازی خصوصیات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔" ویسے میر انیسؔ اس خانوادۂ فضل و فن کے خاتم ہوئے ہیں۔ راقم کے خیال سے شہاب سرمدی مرحوم خاتم الشعراء میر نفیسؔ کو بھول گئے جو دراصل اس خانوادے کے خاتم ہیں۔ راقم کی نظر میں ایسے بہت سے ارباب فن ہیں جن سے ذاتی طور پر راقم التحریر واقف ہے جو شیعان انیسؔ ہیں انہیں میر انیسؔ کا کلام تو ازبر ہے مگر انہوں نے اعتراف کیا کہ انہوں نے میر نفیسؔ کو کبھی پڑھا ہی نہیں عمداً یا سہواً اردو کی بڑی شخصیتوں نے میر نفیسؔ کے ساتھ بڑی ناانصافی کی ہے۔ میر نفیسؔ کے کلام کو بغیر کسی بیّن ثبوت کے میر انیسؔ کا کلام قرار دیا ان میں بہت سی نامور شخصیتیں شامل ہیں بالخصوص حضرت مہذبؔ لکھنوی، ضمیر اخترؔ نقوی، نائب حسین نقوی امروہوی، ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری اور بالآخر پروفیسر سید مسعود حسن ادیبؔ مرحوم اور سید شہاب سرمدی مرحوم جنھوں نے میر انیسؔ کے ۳۳ غیر مطبوعہ مراثی میں نہایت دیدہ دلیری

کے ساتھ میر انیسؔ کے دو مرثیے۔

مفتاحِ قفلِ بابِ دہن ہے زباں مری، مرثیہ ۱۳اور ''جب تیغ ظلم سے سر سرؔ ور جدا ہوا، مرثیہ ۱۶ادرج کیا ہے واضح ہو کہ ۔ مفتاحِ قفلِ بابِ دہن ہے زباں مری، مطبوعہ مرثیہ میر نفیسؔ ہے جو مرثیہ نمبر ۳ پر بہار نفیسؔ میں طبع ہوا ہے جسے حافظ علی صابر نے ۱۹۶۶ء میں شائع کیا''جب تیغ ظلم سے سر سرؔ ور جدا ہوا'' غیر مطبوعہ مراثی نفیسؔ میں سے ایک ہے۔ جو ۴۶ بند پر مشتمل ہے جس کا قلمی نسخہ آلِ انیسؔ سید علی احمد دانش صاحب کے پاس محفوظ ہے۔ نائب حسین نقوی امروہوی فرہنگ انیسؔ میں اسے غیر مطبوعہ مرثیہ انیسؔ تسلیم کیا ہے اور جسے غیر مطبوعہ مرثیہ انیسؔ سمجھ کر ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری نے باقیات انیسؔ میں مرثیہ نمبر ۱۱ کے تحت درج کیا ہے۔ حیدری صاحب رقم طراز ہیں کہ راقم کے ایک اور نسخہ نظر سے گذرا ہے اس میں نفیسؔ تخلص درج ہے اس لئے یہ مرثیہ انیسؔ سے متعلق مشکوک ہے۔ ڈاکٹر سبطین فاطمہ رضوی، میر خورشید علی نفیسؔ حیات اور شاعری کے صفحہ ۴۴ پر لکھتی ہیں کہ راقم الحروف کو اس کا ایک قدیم قلمی نسخہ میر علی احمد دانش آلِ انیس وعارف کے ذخیرۂ مراثی میں نظر آیا انہوں نے فرمایا کہ یہ مرثیہ خورشید علی نفیسؔ اعلی اللہ مقامہ کا ہے تعداد بند ۴۶ ہی ہے۔ جہاں تک مرثیہ کا مطلع ہے ''مفتاح قفلِ بابِ سخن ہے زباں مری'' کا معاملہ ہے جناب شہاب سرمدی انیسؔ کے ۳۳ غیر مطبوعہ مرثیئے کے مقدمے میں صفحہ ۵۴ پر لکھتے ہیں کہ یہ ویسے چھپا تو اب تک کہیں نہیں مگر اس کے دو ایک نسخے چوں کہ میر نفیسؔ کے تخلص سے بھی پائے جاتے ہیں اس لئے ہو سکتا ہے یہ انہیں کی تصنیف ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میر انیسؔ کی ہو بہر صورت ذخیرۂ مسعودی والا نسخہ اپنی عبارت سرورق اپنے مقطع جس میں تخلص انیسؔ کا ہے اور نیز اس سے پروفیسر مرحوم حضرت ادیبؔ نے اسے انہیں کا مرثیہ قرار دیا میر انیسؔ ہی کی تصنیف فرض کیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے یہ مرثیہ میر نفیسؔ کا حتماً ہے اور مطبوعہ ہے اس مرثیہ ہذا کو میر انیسؔ کا مرثیہ فرض کرنا میر نفیسؔ کے ساتھ سراسر ناانصافی ہے اسی طرح میر نفیسؔ کا ایک غیر مطبوعہ مرثیہ ہے جس کا مطلع ہے۔ ''رخصت ہے پدر سے علی اکبر سے جواں کی'' ڈاکٹر اکبر حیدری نے باقیات انیسؔ میں اپنے نادر و نایاب مراثی انیسؔ میں شامل کر کے دیدہ دلیری کا ثبوت دیا جبکہ وہ اس کے معترف ہیں کہ ایک نسخہ جھلس تخلص نفیسؔ درج

ہے اس مرثیے کو سید سجاد علی صاحب ناشر نے یکم اپریل کو ۱۹۱۹ء میں شائع کیا تھا پہلے صفحہ پر مندرجہ ذیل عبارت ملتی ہے۔

در حال رزم و بزم و شہادت علی اکبرؑ، مصنف افصح الفصحا جناب میر نفیسؔ صاحب مرحوم اور اختتام مرثیہ پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے، کاپی رائٹ محفوظ ہے لہذا کوئی صاحب طبع نہ فرمائیں سجاد علی رضوی تاج کتب لکھنؤ مطبع اثنا عشری ۱۹۱۹ء طوالت کے اعتبار سے ان ادبی شخصیتوں کا ذکر ضروری نہیں ہے جنھوں نے میر نفیسؔ کے ساتھ ظلم روا رکھا خدا بھلا کرے ڈاکٹر سبطین فاطمہ رضوی کا جنھوں نے اپنے مقالہ میر خورشید علی نفیسؔ حیات اور شاعری مطبوعہ ۴ اگست ۹۵ء کے ذریعہ میر نفیسؔ حیات اور شاعری مطبوعہ ۴ اگست ۹۵ء کے ذریعہ میر نفیسؔ کے ادبی مقام سے عوام و خواص کو روشناس کرایا اور میر نفیسؔ کو زندہ جاوید بنادیا۔ موصوفہ کا احسان نہ صرف خاندان انیسؔ پر ہے بلکہ اردو ادب پر بھی ہے۔ میر نفیسؔ جانشینِ انیسؔ بھی تھے اور ثانی انیسؔ بھی جن کے مراثی فصاحت کے اعتبار سے میر انیسؔ کے برابر اور بلاغت کلام کے اعتبار، سے مرزا دبیرؔ کے بہت آگے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ میر نفیسؔ اپنے خانوادے کے خاتم مرثیہ نگار تھے تو صحیح ہو گا وہ خانوادۂ انیسؔ میں پانچویں پشت میں تھے۔ ڈاکٹر تمقام حسین جعفری کا کہنا بالکل درست ہے کہ میر نفیسؔ کا کلام گنجینۂ معانی کا طلسم ہے ان کے کلام کی فصاحت و بلاغت قابل صد تحسین و داد ہے۔

محمد عبّاس نقوی

جشنِ یادگارِ میر انیسؔ

آلِ عبا ریسرچ ٹرسٹ اور مرکزِ علوم اسلامیہ کے اشتراک سے امام بارگاہِ آلِ عبا، گلبرگ میں مورخہ ۳۰ شوال ۱۴۲۴ھ مطابق بروز ہفتہ ۴ جنوری ۲۰۰۳ء کو ایک عظیم الشان جلسۂ جشنِ یادگارِ میر انیسؔ (بسلسلۂ دوسو سالہ ولادتِ میر انیسؔ کا جلسہ) منعقد کیا گیا، جس میں شہر بھر سے معروف شعرأ، ادبأ و پروفیسر حضرات نے شرکت فرمائی۔ جشن کی صدارت علاّمہ ضمیر اختر نقوی صاحب نے فرمائی جبکہ مہمانانِ خصوصی میں منسٹر آف ہاوسنگ اینڈ پلاننگ جناب صفوان اللہ صاحب اور ممبر نیشنل اسمبلی جناب حیدر عباس رضوی صاحب کے علاوہ آلِ عبا ریسرچ سینٹر کی جانب سے ڈاکٹر محسن جعفر صاحب نے بھی میر انیسؔ سے متعلق اپنے خیالات اور عزائم کا اظہار کیا۔ شعرأ کرام میں جناب حیدر حسین کربلائی، علامہ کمال حیدر صاحب، کوثر نقوی صاحب اور محترم پروفیسر حسن اکبر کمال صاحب نے میر انیسؔ کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت پیش فرمایا اور محترم ظہور مہدی صاحب نے ''میر انیسؔ شاعرِ فطرت'' کے عنوان سے مقالہ پیش فرمایا، جشن کی نظامت ڈاکٹر ماجد رضا عابدی صاحب فرمارہے تھے جو وقفے وقفے سے میر انیسؔ سے متعلق دلچسپ و معلوماتی گفتگو گوش گزار کرتے رہے اس دوران کراچی کی معروف شخصیت جناب ہاشم رضا صاحب کی جانب سے پیغام اور نظم بھی پڑھی گئی۔

جلسے کا آغاز تلاوتِ قرآن وحدیثِ کسأ سے کیا گیا جس کے بعد جناب سلمان جعفر نے سلامِ انیسؔ پیش فرمایا۔

سدا ہے فکرِ ترقی بلند بینوں کو ہم آسمان سے لائے ہیں اِن زمینوں کو
یہ غُل تھا مُہرِ نبوت پہ جب چڑھے حسنینؑ جڑا ہے ایک انگوٹھی پہ دو نگینوں کو
بجا ہے اس لئے اکبرؑ سے تھا حسینؑ کو عشق کہ دوست رکھتا ہے اللہ بھی حسینوں کو
پڑھیں دُرود نہ کیوں دیکھ کر حسینوں کو خیالِ صنعتِ صانع ہے پاک بینوں کو
یہ جھرّیاں نہیں ہاتھوں پہ ضُعفِ پیری نے چُنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو
لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

خیالِ خاطرِ احباب چاہئے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

ڈاکٹر ماجد رضا عابدی صاحب نے جلسے کا باقاعدہ آغاز کرتے ہوئے اور صدرِ جلسہ ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی صاحب کو اسٹیج پر تشریف لانے کی دعوت دیتے ہوئے کہا کہ علامہ ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی موسّس ادارۂ مرکزِ علومِ اسلامیہ، بانی میر انیسؔ اکیڈمی، اور 1968ء سے میر انیسؔ اعلیٰ اللہ مقامہٗ کی صد سالہ برسی کے حوالے سے شروع کی گئی تحریک کے بھی محرک رہے ہیں، اس کے ساتھ ہی جناب سید حیدر حسین کربلائی صاحب کو دعوتِ کلام دی گئی۔ جناب حیدر کربلائی صاحب نے مخصوص انداز و انتہائی پُر اثر لحن میں کلامِ انیسؔ پیش فرمایا۔

گنہ کا بوجھ جو گردن پہ ہم اٹھا کے چلے خُدا کے آگے خجالت سے سر جُھکا کے چلے
خیال آ گیا دنیا کی بے ثباتی کا چلے جہاں سے جو اصغرؑ تو مسکرا کے چلے
کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی چلے جو راہ تو چیونٹی کو بھی بچا کے چلے
حسینؑ کہتے تھے واحسرتا علی اکبرؑ بہارِ باغِ جوانی ہمیں دکھا کے چلے
ملی نہ پھولوں کی چادر تو اہلبیتِ انام مزارِ شاہؑ پہ لختِ جگر چڑھا کے چلے
چلے وطن کو جو عابدؑ تو کہتے تھے رو کر علی کے چاند کو ہم خاک میں چُھپا کے چلے

تمام عُمر جو کی سب نے بے رُخی ہم سے کفن میں ہم بھی عزیزوں سے منہ چھپا کے چلے

انیسؔ دَم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

ناظم جلسہ جناب ماجد رضا عابدی نے میر انیسؔ کے درج بالا پیش کئے گئے کلام کی ہی زمین میں میر انیسؔ کی غزل کا شعر اور ایک حمدیہ رباعی نذرِ سامعین کی۔

غزلیہ شعر

پُکار کہتی تھی حسرت سے لاش عاشق کی
صَنم کہاں ہمیں تم خاک میں مِلا کے چلے

حمدیہ رباعی

گُلشن میں پھروں کہ سیرِ صحرا دیکھوں
یا مَعدن و کوہ، دشت و دریا دیکھوں
ہر سُو تِری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

اس کے ساتھ ہی آلِ عبا ٹرسٹ اور جلسے کے مہتمم جناب ڈاکٹر جعفر محسن صاحب کو اپنے خیالات کے اظہار کے لئے دعوت دی گئی جنہوں نے آلِ عبا ٹرسٹ کے سابق مینجنگ ٹرسٹی اور روحِ رواں جناب ڈاکٹر محمد علی صاحب کو اسٹیج پر دعوت دیتے ہوئے تمام شریکِ محفل صاحبان کا شکریہ ادا کیا اور خصوصاً علامہ ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی صاحب کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے فرمایا کہ ''اس دور کے محقق، ادیب وخطیب علامہ ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی صاحب کا شکر گذار ہوں جنہوں نے اس جلسے کے انتظام میں ہمارے ساتھ تعاون فرمایا، انہوں نے مزید آلِ عبا ریسرچ سینٹر و لائبریری کے قیام کے لئے علامہ ضمیر اختر، علامہ ناصر عباس صاحب، جناب ایاز امام صاحب وغیرہم کا شکریہ ادا

کرتے ہوئے آلِ عبا ٹرسٹ کی خدمات و مقاصد کی وضاحت فرمائی۔

جشنِ یادگارِ میر انیسؔ کے حوالے سے بات کرتے ہوئے ڈاکٹر جعفر محسن صاحب نے فرمایا کہ شاعرِ آلِ عبا جناب ظہور مہدی صاحب نے مقالہ تیار فرمایا اور پھر ہم نے ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی صاحب سے رجوع کیا جنہوں نے فرمایا کہ اس کے لئے ہم ایسے وقت کا تعین کریں گے تاکہ سب لوگ اس میں شریک ہوسکیں، اور بہر حال اس کی تیاری میں ہمیں قریب ایک برس لگ گیا، البتہ میری سمجھ میں یہ نہیں آسکا کہ لوگوں نے مرثیے کے فروغ کے لئے مختلف ناموں سے ادارے بنائے، لیکن ابھی تک میر انیسؔ کے نام سے کوئی ادارہ تشکیل نہیں دیا گیا، ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک ایسا مرکزی ادارہ تشکیل دیا جائے۔ اسی سلسلے میں انہوں نے علامہ صاحب کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ میر انیسؔ کے حوالے سے علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب کا کنٹری بیوشن بہت زیادہ ہے اور ہمیں یہ سعادت حاصل ہوئی کہ ہم نے اس جلسے کے لئے ایسی شخصیت کو صدارت کے لئے منتخب کیا جو قریب 40 برس سے اس سلسلے میں ہر طرح اپنی فعالیت ثابت کررہے ہیں۔

استقبالیے کے بعد ڈاکٹر ماجد رضا عابدی نے ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز کے مقالے The Tragedy of Karbala کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر ڈیوڈ نے میر انیسؔ کے مقبول زمانہ مرثیوں سے ایک ''جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے'' کا ترجمہ کیا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے، انہوں نے کہا کہ دامنِ وقت میں گنجائش نہیں ہے کہ یہ پورا مقالہ پیش کیا جاسکے، انہوں نے اس کے اردو ترجمے سے چند اقتباس پیش کئے اور کہا کہ ڈاکٹر ڈیود نے حسینی لشکر کی تفصیل اور کردار بیان فرمائے ہیں، حسنؑ، حسینؑ، شہر بانو، ام البنینؑ، عباسؑ، علی اکبرؑ، علی اصغرؑ، قاسمؑ، عبداللہ، عونؑ و محمدؑ، کلثومؑ، فاطمہ کبریٰ، فاطمہ صغریٰ، پھر یزیدی لشکر کے کردار مثلاً یزید، عبیداللہ ابن زیاد، عمر ابن سعد، حُرملا ابنِ کاہل، اعور سلمی، ازرق، سنان ابن انس اور دیگر کردار۔

ڈاکٹر ماجد رضا عابدی

ڈاکٹر ماجد عابدی نے کہا کہ ادب کی یہ صنفِ مرثیہ جو طویل رزمیہ صنف کہلاتی ہے، اس میں مجھے جس وجہ سے مرثیے نے Attrract کیا وہ سوائے میر انیس کوئی دوسری نہیں، کیوں کہ جو زبان انسانی نفسیات اور انسانی روزمرہ سے نزدیک ہوگی، دو اشخاص آپس میں جس قدر سلیس، سادہ اور اخلاقی زبان میں گفتگو کریں گے اتنا ہی ایک دوسرے سے متاثر ہوں گے، لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ میر انیسؔ کی چھ جلدیں جو ہمارے سامنے موجود ہیں جس میں مرثیے، سلام اور رباعیاں موجود ہیں ،اندازہ ہوتا ہے کہ میر انیسؔ، جو ڈیڑھ سو سال قبل مرثیہ کہہ رہے تھے آج بھی اس کی تازگی کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔احساس ہوتا ہے کہ انیسؔ آج کے دور میں مرثیہ کہہ رہے ہیں، آج کا نوجوان بھی میر انیسؔ سے متاثر ہے۔ یہ کمال ہے انیسؔ کا کہ ہر دور سے متصل ہو کر چل رہے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ جہاں تک اردو زبان جائے گی انیسؔ اس کے ساتھ ساتھ چلتے رہیں گے۔اس کے ساتھ انہوں نے جناب کمال حیدر رضوی صاحب کو منظوم خراجِ عقیدت پیش کرنے کی دعوت دی۔

علاّمہ کمال حیدر:

علامہ کمال حیدر صاحب نے کہا کہ میرے دادا سید وزارت حسین رضوی اعلی اللہ مقامہٗ کے ذخیرۂ کتب میں میر انیسؔ، میر نفیسؔ اور میر مونسؔ کے کچھ مرثیے موجود تھے لہٰذا میر انیسؔ کو میں نے شعور سنبھالنے کے بعد پڑھ رکھا تھا، دس برس کی عمر تھی جب شاعرِ اہلِ بیت جناب سخن فتحپوری اعلی اللہ مقامہٗ کے یہاں چھ محرم کو شہزادۂ علی اکبرؔ کی مجلس ہوتی تھی جس میں پہلی مرتبہ میں نے ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی صاحب کو سنا تھا [illegible] میں نے کسی خطیب کی زبانی میر انیسؔ کو سنا، میرے لئے میر انیسؔ کے مرثیوں [illegible]

BIBAULIKAN [illegible]

اور بات تھی لیکن خطابت میر، میر انیسؔ کو پڑھنا نئی بات تھی۔ مجھے میر انیسؔ کے کلام کی وہ کشش آج تک یاد آتی ہے انہوں نے مزید فرمایا کہ ''ہم ایسی ہستی کو خراجِ عقیدت کیا پیش کریں گے جو خود اپنی عظمت کا عارف تھا جس نے خود یہ بات کہی کہ۔

مری قدر کر اے زمین سخن
تجھے بات میں آسماں کر دیا

میر انیسؔ نے یہ بتایا کہ جب کسی کی مدح کرو تو لفظوں کو کیسے استعمال کیا جائے اور لفظوں کا انتخاب کیسے کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر کمال حیدر نے کلام پیش فرمایا:

بات تو ہوگی نہ ہوگا یہ طلاقت کا مزہ　　لفظ کب دیں گے معانی کی بلاغت کا مزہ
جو نہ چکھے نمکِ خوانِ سخن ہائے انیسؔ　　اُس کو ملتا نہیں اردو کی فصاحت کا مزہ

....　　..........

ہم نے جو کہا اردو کے پیارے ہیں انیسؔ　　تہذیبِ غم شہہ کے دُلارے ہیں انیسؔ
آئی یہ حسین ابنِ علیؑ کی آواز　　شیعوں کے ہیں ہم اور ہمارے ہیں انیسؔ

....　　..........

میخانۂ اردو ترے ساقی کا بیاں ہے　　کیا مجمعِ رندانِ بلاغت ہے جو یاں ہے
آمادۂ مئے نوشی ہر اک اہلِ زباں ہے　　کیا نہرِ مئے ذکرِ انیسؔ آج رواں ہے

اِس مئے سے جو ہے بیر، عداوت کی یہ خو ہے
ساقی کا جو دشمن ہے وہ اردو کا عدو ہے

....

تھی ہند نشیں کچھ نہ تھا اردو کا حوالہ　　گمنامی سے تھا میرؔ نے بھی اس کو نکالا
دیتے تھے اسے ناسخؔ و آتشؔ بھی سنبھالا　　بخشا ہے انیسؔ ایسا مگر تم نے اُجالا

تب جا کے کہیں اہلِ فصاحت پہ کھلی ہے
جب کوثرِ مدحت سے ترے گھر میں دھلی ہے

....

قابو میں یہ آتی ہے کہاں یوں تو کسی کے فقرے نہیں تسلیم اسے بے ادبی کے
لہجے میں پنپتی ہے غمِ سبطِ نبی کے سکھلائے ہنر تو نے اسے تیغِ علی کے
جو اور کسی کی بھی حکومت نہ سہے گی
وہ اردو سدا تیری کنیزی میں رہے گی

....

محرابِ طلاقت میں اذاں ہے ترے دَم سے الفاظ کے اُجساد میں جاں ہے ترے دَم سے
یہ آج محبت کی زباں ہے ترے دَم سے قرآن کا اردو پہ گماں ہے ترے دَم سے
کتنی ہیں زبانیں یہ نہیں وصف کسی میں
یہ اردو زباں وقف ہے اَب مدحِ علیؑ میں

....

ان کے بعد ڈاکٹر ماجد عابدی نے جلسے کی کارروائی کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ ''غالبؔ نے صرف یہ کہہ کر مرثیہ نہیں لکھا کہ ''جب میر انیسؔ موجود ہیں تو مرثیہ لکھنا اُنہی کا حق ہے''۔ شادؔ عظیم آبادی نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ میر انیسؔ مرثیہ پڑھ رہے تھے، تلوار کی تعریف میں ایک بند پڑھا..

قد کتنا خوشنما ہے، بدن کس قدر ہے گول جوہر شناس ہے تو اسے موتیوں میں تول
مفتاحِ فتح ہے درِ نصرت کو اس سے کھول وہ تیغ ہے خراجِ صفاہاں ہے جس کا مول
اشراف کا بناؤ ، رئیسوں کی شان ہے
شاہوں کی آبرو ہے سپاہی کی جان ہے

آتش جو پہلے سے ہی جھوم رہے تھے، اس بیت کے بعد نصف قد سے کھڑے ہو گئے اور بآواز بلند کہا کہ ''کون کہتا ہے کہ تم محض مرثیہ گو ہو، واللہ ثمہ باللہ تم شاعر گر ہو، شاعری کا مقدس تاج تمہارے سر کے لئے موزوں ہے، مبارک ہو'' شاد عظیم آبادی جنہوں نے فکرِ بلیغ دو جلدوں میں لکھی، میر انیس کی وفات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

''روز روز بیماری بڑھتی چلی گئی، لوگوں کو یقین ہو گیا کہ میر انیس اب نہ بچیں گے، میرے دوست حافظ ممدوح روز روز کے حالات لکھا کرتے تھے کہ، ایک خط میں لکھا تھا کہ میر انیس کا حال پوچھنے مطب میں اتنے لوگ آتے ہیں کہ مجھ کو حسرت ہوتی ہے کہ کاش میں بھی ایسا با کمال ہوتا، ایک اور خط میں لکھا تھا کہ شہر بھر کے شیعہ سُنی اور ہندو میر انیس کے چلے باندھنے درگاہ گئے ہیں...... یا، یہ کہ حکیم صاحب لکھتے ہیں کہ کل میر انیس کو دیکھنے گیا تھا قرینہ اچھا نہیں معلوم ہوتا ہے وہاں ایک ڈھیر امام ضامن کا دیکھا حکیم صاحب نے پوچھا تو میر نفیس نے کہا کہ جو لوگ عیادت کو آتے ہیں اشرفی، روپیہ پیسہ باندھ جاتے ہیں، انہیں کھلوایا جا رہا ہے'' مزید لکھتے ہیں کہ۔

''لیجئے حضرت پرسوں مسجد سے گھر واپس آ رہا تھا کہ چوک میں غل خل پائی معلوم ہوا کہ میر انیس کا ابھی انتقال ہوا ہے، شائد ایسا با کمال پیدا نہ ہوگا، شیخ فضل احمد کیف، خواجہ عزیز الدین سب رو رہے تھے، اس گھر سے میر انیس کا گھر اتنی دور ہے جیسے آپ کے گھر سے مدرسہ، کہرام کی آواز یہاں تک آ رہی تھی، رات بھر میرے یہاں نہ کسی نے کھایا نہ سویا''

شیخ فضل احمد کیف نے فی البدیہ مصرعہ کہا کہ۔

حال بہ شب اول ذیقعد داد

ڈاکٹر ماجد رضا عابدی نے کہا کہ ''آج تیس شوال ہے اور آج بھی ذیقعد کی شب اول ہے، میر انیس کا انتقال 29 شوال کو ہوا تھا، عجیب اتفاق ہے کہ آج کا جلسہ اسی دن

ہورہا ہے۔ یہ ہے انیسؔ کا عہد، ان کی قدرومنزلت، ان کا فن جس نے لوگوں کے دلوں پہ سکہ جما دیا"

اگلے مقرر جناب ظہور مہدی صاحب کو دعوت دینے سے قبل ڈاکٹر ماجد عابدی نے معروف شاعر و بزرگ شخصیت جناب ہاشم رضا صاحب (جو کراچی کے پہلے ایڈمنسٹریٹر اور گورنر مشرقی پاکستان رہے، ICS کے بعد پاکستان میں سول سروس سے متعلق رہے اور خدمتِ ملت وقوم میں بھی ہمیشہ آگے رہے، ہاشم رضا صاحب کا تعلق ایک شاعر گھرانے سے ہے، آپ معروف مرثیہ گو شاعر جناب آلِ رضا صاحب کے چھوٹے بھائی ہیں اور معروف شاعر ہیں) کا اس موقع کے لئے لکھوایا گیا پیغام پیش فرمایا۔

پیغام از جناب سیّد ہاشم رضا صاحب

''اودھ میں دو ایسے شہر تھے جن کی وجہ سے ادب پروان چڑھا یعنی فیض آباد اور لکھنؤ جہاں ایک ہی قسم کے شاعر اور مرثیہ گو تھے۔ مرثیہ گوئی میں میر ببر علی انیسؔ کا کوئی مدِ مقابل نہ تھا۔ یہ پورا خاندان امامِ عالی مقام اور ان کے خاندان کی شہرت کا سبب تھا۔ لکھنؤ کے لئے جہاں وہ فیض آباد سے منتقل ہو کے آ ئے تھے انہوں نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ۔

گلزارِ مومنیں ہے زہے شانِ لکھنؤ
نعرے علیؑ علیؑ کے ہیں قربانِ لکھنؤ

ایک صاحب جو پٹنہ کے رہنے والے تھے اور میر انیسؔ کو آخری وقت دیکھنے کے لئے لکھنؤ آئے ہوئے تھے ایک روز نصف شب کے وقت انہوں نے لوگوں کو دہاڑیں مار مار کر روتے ہوئے سُنا اور جب گھر کے باہر آئے تو معلوم ہوا کہ میر انیسؔ کا انتقال ہو گیا ہے، انہوں نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ میں نے کسی شخص کی اتنی عزت ہوتے ہوئے نہیں دیکھی جتنی میر انیسؔ کی تھی۔ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ ایک ہی زمانے میں تھے اور

دونوں کا کلام ایسا دلکش تھا کہ۔

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

مرزا دبیرؔ اور میر انیسؔ ایسا نام چھوڑ گئے کہ کوئی ان کی عظمت تک نہ پہنچ سکا، جب میر انیسؔ کا انتقال ہوا تو ان کے چالیسویں کی مجلس میں مرزا دبیرؔ نے ایک تعزیتی نظم پڑھی ایک مصرعہ تھا۔

طورِ سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیسؔ

میر انیسؔ نے کچھ غزلیں بھی کہی تھیں مگر بعد میں غزلیں نہیں کہیں اور مرثیے کو ایسے عروج پر پہنچا دیا کہ انیسؔ اور دبیر کا نام ایک ہی بلندی پر قائم ہے۔ میر انیسؔ کی غزل جب ان کے والدِ ماجد نے سُنی تو کہا کہ تم بہت خوب کہتے ہو مگر یہ غزل کا راستہ ترک کر دو اور مرثیہ کہنے لگو، میر انیسؔ نے اپنے والد ماجد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے مرثیے کہے جو اہلِ لکھنؤ کے لئے آج بھی قابلِ فخر ہیں۔

نظم.... ماہِ دسمبر 1971ء دبستانِ انیسؔ راولپنڈی

عروجِ مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا — انیسؔ! جب تجھے دیکھا بلند تر دیکھا
جہاں میں سطوتِ شاہی کو مختصر دیکھا — سخن میں تیری خدائی کو معتبر دیکھا
انیسؔ! تیرا دبستاں کھلا ہے چار طرف — ریاضِ مدحتِ شبیرؑ کا ثمر دیکھا
انیسؔ! زندگیٔ جاوداں مبارک ہو — شہیدِ حق کی عنایات کا اثر دیکھا
یہ معجزہ ہے تری مرثیہ نگاری کا — جو کربلا میں ہوا وہ بچشمِ تر دیکھا
سند ہیں شعر ترے مستند زباں تیری — ترے ہنر کا ہے پرتو جدھر جدھر دیکھا
وہ طرزِ خاص ترا سادگی میں پُرکاری — کہ جس کا خواب ادیبوں نے عمر بھر دیکھا
وہ تیری شانِ تکلم کہ سامعہ حیراں — سبھوں کی تو نے نظر موڑ دی جدھر دیکھا

ہر ایک بیت میں ہیروں کو منتشر دیکھا ہر ایک بحر میں تو نے گہر فشانی کی
تری رَوِش کو مسلسل بہار پر دیکھا خزاں بھی ہے چمنِ نظم میں بہار کے ساتھ
جسے بھی فکر ہوئی اس نے تیرا دَر دیکھا خزانہ تو نے لٹایا ہے شعر و معنیٰ کا
کہ دیدہ ور نے سدا جن کو تازہ تر دیکھا دکھائی تو نے فضا گلشنِ محمدؐ کی
خدا پرستوں کو مجلس میں جلوہ گر دیکھا حدودِ شعر ملائے درِ عبادت سے

محل سراؤں میں دیکھا نہ خانقاہوں میں
وہ سیلِ نور جو تیرے مزار پر دیکھا

جناب ہاشم رضا صاحب کے پیغام و نظم کے بعد محترم سید ظہور مہدی صاحب نے ''میر انیس شاعرِ فطرت'' کے عنوان سے مقالہ پیش فرمایا۔

مقالہ از ظہور مہدی صاحب......میر انیسؔ شاعرِ فطرت

اردو پہ اللہ کی رحمت ہیں انیسؔ
قرطاس و قلم کی حرمت ہیں انیسؔ
عالم میں نہیں کوئی بھی ثانی ان کا
واللہ کہ شاعرِ فطرت ہیں انیسؔ

حضراتِ گرامی قدر!

آج کا یہ جلسہ جو تاجدار اقلیم سخن میر ببر علی انیسؔ کی دوسو سالہ یومِ پیدائش پر مرکزِ علوم اسلامیہ کے اشتراک سے منعقد کیا جارہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میر انیسؔ جیسے عظیم شاعر کی شخصیت اور شاعری پر مجھ جیسے طالبِ علم کا اظہار خیال کرنا سورج کو چراغ دکھلانے کے مترادف ہے۔

ان کی شخصیت اور روح پرور شاعری پر ہر زاویے نگاہ سے اب تک سینکڑوں بلکہ ہزار ہا کتابیں لکھی جاچکی ہیں، میں میر انیسؔ کی شاعری کو شاعرِ فطرت کے طور پر پیش

کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں کہ

جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے   اقلیم سخن میری قلمرو سے نہ جائے

ان کی دعا قبول ہوگئی اور انشاءاللہ ان کی شاعری کا سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ اقلیم سخن پر چمکتا رہے گا، اردو زبان پر میر انیسؔ کا بڑا احسان ہے، انہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے اردو زبان کو اوجِ ثریا تک پہنچا دیا، وہ صرف زبان و بیان اور رزم و بزم کے عظیم شاعر ہی نہیں تھے بلکہ انہوں نے شاعری اور فن مرثیہ گوئی سے محمدؐ وآل محمدؐ کے اسوۂ حسنہ کی ایسی تفسیر و تصویر پیش کی ہے جو اسلامی معاشرے کے اعلیٰ ترین اقدار کی ترجمان بھی ہے اور جو عالم انسانیت کے لئے عزت نفس، امن و سلامتی، حسن و سلوک، حق پرستی، عبادت و بندگی، شجاعت اور شہادت کا پیغام بھی ہے، میر انیسؔ کو خدا نے وہ تمام صلاحیتیں عطا فرمائیں جنہوں نے ان کے کلام کو تجلیات فطرت کا مظہر اور محبت وانکساری کا پیکر بنا دیا تھا، ان کے کلام میں حسن بیان، سلاست روانی کے ساتھ اصول وعقائد، قرآن واحادیث سے استفادے کا بھرپور اظہار ہوتا ہے، انہوں نے تلمیحات استعارات اور اشارات کو اپنے کلام میں اثرانگیز طور پر پیش کر کے اردو شعر و ادب کو گراں مایہ بنا دیا اور مرثیہ گوئی عالمی ادب کا سرمایہ بن گئی، چنانچہ خود فرماتے ہیں کہ۔

مری قدر کر اے زمین سخن
تجھے بات میں آسماں کر دیا

میر انیسؔ کے قلم کی سحر کاری کا ایک راز یہ بھی ہے کہ انکا قلم ان کے ارادے کے ساتھ ہی مصور کا قلم بھی بن جاتا ہے اور ان کے الفاظ ایسی رنگ آمیزی شروع کر دیتے ہیں جس کے آگے مصور کے مرقعے کے رنگ بھی پھیکے پڑ جاتے ہیں، فرماتے ہیں کہ۔

گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

انہیں اپنی کمالِ شاعری سے زیادہ مداحیٔ امام مظلوم پر ناز تھا، فرماتے ہیں۔

شہرہ جو ہر سو خوش کلامی کا ہے
باعثِ مدحِ امامِ نامی کا ہے
میں کیا، آواز کیسی، پڑھنا کیسا
آقا یہ شرف تیری غلامی کا ہے

میر انیسؔ کی قادر الکلامی نے واقعات وشخصیات کو آئندہ ادب کے لئے مستقل اشاریہ اور علامت بنا دیا ہے یعنی اب یزید فقط ایک انسان کا نام نہیں رہا بلکہ ظلم کا اشاریہ بن گیا ہے اور حضرت امام حسینؑ صرف ایک بشر نہیں بلکہ ثباتِ حق واستقلال کی علامت بن گئے۔ میر انیسؔ کا مرکزی نقطۂ شاعری، شہادتِ امام حسینؑ اور واقعاتِ کربلا کا غم انگیز سانحہ ہے جو تزکیۂ ایمان، امتیازِ حق و باطل اور نشاطِ روح کا بھی سامان مہیا کرتا ہے اس لئے مرثیہ نگاری ہماری ادبی، تہذیبی اور مذہبی ورثہ بھی بن گئی ہے، میر انیسؔ نے زندگی کے ہر پہلو کا اک فطرت شناس مبصر کی حیثیت سے گہرا مطالعہ کیا ہے جس نے انہیں تخلیقی قوت کے ساتھ روحانی بصیرت کا مالک بھی بنا دیا ہے، اسی لئے ان کی شاعری ایک الہامی شاعری معلوم ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کو مدارِ حق کے اوصافِ حمیدہ، ان کے لازوال کردار کے اظہار کا ذریعہ بنا کر عالم اسلامیت کو حریت اور حق پرستی کا درس دیا ہے اور مصیبت وغم واندوہ کی فضا میں مایوسی اور انتشار کے بجائے صبر ورضا اور شہادت کو عظمت انسانی کی معراج بنا دیا ہے۔ میر انیسؔ کو جتنی بار پڑھئے وہ ایک نئی شان سے سامنے آتے ہیں وہ انسانی جذبات اور واقعاتِ کربلا کے تمام کرداروں کو فطرت کے مطابق پیش کرنے پر غیر معمولی دسترس رکھتے ہیں۔ ہمارے سماجی پہلو، آدابِ مجلس، اذان ونماز کی صف بندی، حق کے لئے سینہ بہ سپر ہونا، شوق شہادت اور بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہونے کے شوق کا اظہار اور بازارِ کارزار کے مناظر اس انداز سے پیش کرتے

ہیں کہ حقیقی مرقع سامنے آجاتا ہے بند ملاحظہ فرمائیے۔

ناگاہ چرخ پر خطِ ابیض ہوا عیاں　　تشریف جانماز پہ لائے شہہ زماں
سجادے بچھ گئے عقب شاہِ انس و جاں　　صوتِ حسن سے اکبرِ مہرو نے دی اذاں
ہر اک کی چشم آنسوؤں سے ڈبڈبا گئی
گویا صدا رسولؐ کی کانوں میں آگئی

....

شوقِ جہاد کا منظر ملاحظہ ہو

جاتی ہے کس شکوہ سے رن میں خدا کی فوج　　کمریں وغا پہ باندھے ہے مشکل کشا کی فوج
صف بستہ آگے پیچھے ہے سب پیشوا کی فوج　　جنت کا رخ کئے ہے شہہِ کربلا کی فوج
ڈیوڑھی پہ جن و انس و ملک کا ہجوم ہے
خیمے سے اب علَم کے نکلنے کی دھوم ہے

....

ملتا ہے ہنس کے ایک جواں ایک کے گلے　　ساری خوشی یہ ہے کہ بس اب خُلد کو چلے
چہرے وہ سرخ سرخ وہ جرأت وہ ولولے　　حق سے یہ التجا کہ نہ رن سے قدم ٹلے
مر کر بھی دل میں الفتِ حیدر کی بو رہے
پانی ہمیں ملے نہ ملے آبرو رہے

میر انیس نے جنابِ زینبؑ کے بیٹوں عون و محمد کے شوقِ شہادت کو اس طرح بیان کیا ہے

کہ ماں کو دیکھتے تھے کبھی جانب علم　　نعرہ کبھی یہ تھا کہ نثارِ شہہِ اُمم
کرتے تھے دونوں بھائی کبھی مشورہ بہم　　آہستہ پوچھتے کبھی ماں سے وہ ذی حشم
کیا قصد ہے علی ولی کے نشان کا
اماں کسے ملے گا علم نانا جان کا

زینبؑ نے تب کہا کہ تمہیں اس سے کیا ہے کام   کیا دخل تم کو مالک و مختار ہیں امام
دیکھو نہ کیجو بے ادبانہ کوئی کلام   بگڑوں گی میں جو لوگے زباں سے علم کا نام
لو جاؤ بس کھڑے ہو الگ ہاتھ جوڑ کے
کیوں آئے تم یہاں علی اکبرؑ کو چھوڑ کے

ان ننھے ننھے ہاتھوں سے اُٹھے گا یہ علم   چھوٹے قدوں میں سب سے سنوں میں [illegible]ں سے کم
نکلیں تنوں سے سبطِ نبی کے قدم پہ دم   عہدہ یہی ہے بس، یہی منصب یہی حشم
رخصت طلب اگر ہو تو یہ میرا کام ہے
ماں صدقے جائے آج تو مرنے میں نام ہے

ہاتھوں کو جوڑ جوڑ کے بولے وہ لالہ فام   غصے کو آپ تھام لیں اے خواہرِ امام
واللہ کیا مجال جو لیں اب علم کا نام   کھل جائے گا لڑیں گے جو یہ باوفا غلام
فوجیں بھگا کے گنجِ شہیداں میں سوئیں گے
تب قدر ہوگی آپ کو جب ہم نہ ہوئیں گے

میرانیسؔ کا واقعہ نگاری و منظر نگاری میں بھی کوئی ثانی نہیں، بند ملاحظہ ہو،

چلنا وہ بادِ سبک کے جھونکوں کا دم بدم   مرغانِ باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ آب و تابِ نہر وہ موجوں کا پیچ و خم   سردی ہوا میں، پر نہ زیادہ بہت نہ کم
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

مظاہرِ فطرت کے گہرے مشاہدے، مطالعے اور قدرت کی بے شمار نعمتوں کے اظہار کے لئے میرانیسؔ نے اپنے کلام میں معنویت اور تاثر پیدا کرنے کے لئے رنگوں کو بطور استعارہ استعمال کیا ہے، جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ کائنات کی ہر شئے میں جو رنگوں کا وجود پایا جاتا ہے وہ میرانیسؔ نے اپنے کلام میں بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

قلزمِ فکر سے کھینچوں جو کسی بزم کا رنگ
شمعِ تصویر پہ گرنے لگیں آ آ کے پتنگ

حسنِ فطرت میں جلال اور جمال دونوں پائے جاتے ہیں بقول علی جواد زیدی صاحب کے میر انیس کو کلام میں رنگوں کے استعمال کا سلیقہ اس طرح آتا ہے جیسے کوئی ماہرِ فن آرٹسٹ اپنی تصویروں میں موقع و محل کے مطابق تناسب کے ساتھ تصویر میں رنگ بھرتا ہے۔

اس موقع پر میں جناب علامہ ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی صاحب (صدر نشیں) کی معرکۃ الآرا کتاب ''میر انیس کی شاعری میں رنگوں کا استعمال'' کا میں نے مطالعہ کیا ہے اور اس سے بخوبی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ ضخیم کتاب انیس شناسی کے تازہ ترین گوشوں میں ایک عہد آفریں اضافہ ہے۔ قرآنِ مجید میں متعدد آیات میں کائنات کی خلقت اور رنگوں کے فہم و ادراک کے لئے صاحبانِ بصیرت کو غور و فکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

اس کتاب کے حوالے سے اسی سلسلے میں آیت ملاحظہ فرمائیں۔ (ترجمہ) اور جو کچھ تمہارے لئے زمین کے اندر مختلف رنگوں میں پیدا کیا گیا ہے اس میں بھی تذکرہ کرنے والی قوم کے لئے اللہ کی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد اصولِ کافی میں ہے جس سے قرآن کے لفظ ضیاء کی تفسیر کو علامہ صاحب نے واضح کیا ہے، حضرت علی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالی نے عرش کو چار رنگوں میں خلق فرمایا ہے۔ نورِ اظہر، نورِ اخضر، نورِ اصفر، نورِ ابیض، یہی وہ رنگ ہیں جنہیں اللہ تعالی نے اپنے انبیاً کو دکھلایا ہے، غرض کائنات کا ذرہ ذرہ رنگ کے کرشموں کی شہادت دے رہا ہے، اسلام کی تاریخ میں سب سے پہلے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن یمن کا بنا ہوا سیاہ رنگ کا غلاف کعبۃ اللہ پر چڑھایا، قرآن مجید میں تقریباً دس مقامات پر سبز رنگ کا تذکرہ بھی ہے۔ سورۃ کہف آیت ۳۱ میں (ترجمہ ہے) اہل

جنت باریک اور ریشم کے دبیز سبز کپڑے زیب تن کئے ہوں گے، جنابِ فاطمہ زہرا کی
چادرِ تطہیر کا رنگ بھی سبز بتایا ہے، جسے میر انیسؔ نے یوں پیش کیا ہے۔

اک سیدہ ہیں سبز ردا چہرے پہ ڈالے
دو حوریں ہیں لٹکی ہوئی چادر کو سنبھالے

مشہور روایت ہے کہ رضوانِ جنت عید کی شب جنابِ فاطمہ کے دونوں شہزادوں
حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ کے لئے سرخ اور سبز جوڑے لائے تھے اور
جبرئیل امین نے رسولؐ اللہ کو بتایا تھا کہ جنابِ امام حسنؑ زہر سے اور جناب امام حسینؑ تلوار
سے شہید ہوں گے اور ان کا جسم مبارک خون سے سرخ ہو جائے گا، کربلا میں امام حسینؑ
کے پرچم کا رنگ سبز تھا جو امن، انسانیت اور ہدایت کی طرف بلانے کا ایک اشارہ تھا جبکہ
یزید کے لشکر میں سیاہ پرچم اور سرخ پرچم شمرِ ملعون کا تھا، میر انیسؔ فرماتے ہیں۔

واں لعینوں نے درِ ظلم و ستم کھول دیا
بڑھ کے عباسؑ نے یاں سبز علم کھول دیا
پنجے کا نور سبز پھریرے کے ساتھ ہے
طوبیٰ کی شاخ سبز پہ مریم کا ہاتھ ہے

علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب فرماتے ہیں کہ رنگ دنیا کی ہر زبان و ادب کا مرکزی
نقطہ ہے، تہذیب اللغات میں رنگ کے سینتیس معنیٰ بیان کئے گئے ہیں میر انیسؔ نے
سینتیس سے زیادہ معنوں میں اس لفظ کو استعمال کیا ہے، چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

مائل بہ سپیدی ہوا رنگِ رخِ مہتاب
اور دیدہ مردم سے سفر کرنے لگا خواب
کم ہوں گے گنہ غنچۂ امید کھلے گا
سو رنگ کا اجر اس سے غازی کو ملے گا

میر انیسؔ نے لفظ رنگ کو چار مختلف معنوں میں بھی استعمال کیا، دہشت، خوف، تشویش، طور طریقے۔

آنا تھا کہ کچھ اور ہی لشکر کا ہوا رنگ
سینوں میں جگر ہل گئے چہروں سے اڑا رنگ
سب سوچ میں تھے دیکھئے اب ہوتا ہے کیا رنگ
بولا کوئی ہے آج لڑائی کا نیا رنگ
لاکھوں ہیں مگر فتح سے دل سرد ہیں سب کے
بے جنگ کئے خوف سے منہ زرد ہیں سب کے

رشید احمد صدیقی نے میر انیسؔ کے کلام کو اردو کی آبرو کہا ہے، پروفیسر مسعود حسن رضوی فرماتے ہیں فطرتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں اور مدارج کو ملحوظ رکھ کر بیان کرنا انیسؔ کا وہ امتیاز ہے جو سچی کردار نگاری کے بغیر ناممکن ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ میر انیسؔ نے مرثیہ گوئی کے ساتھ ساتھ مرثیہ خوانی کو بھی ایک فن بنا دیا، وہ اپنے طرزِ سخن سے کلام کو ایسا خد وخال عطا کرنے پر پوری قدرت رکھتے تھے کہ سننے والا عش عش کر اٹھتا تھا اور یہی میر انیسؔ کے گھرانے کی خصوصیت سب پر فوقیت رکھتی ہے۔

شاعرِ فطرت میر انیسؔ کے بعد مرثیہ نگاری میں بتدریج تبدیلیاں آئیں اور واقعاتِ شہادتِ عظمیٰ کے ساتھ اخلاقی موضوعات پر بھی مرثیہ نگاری میں اضافہ ہوا ہے، بعد کے آنے والوں میں جوشؔ، آلِ رضا، نسیم امروہوی، ڈاکٹر یاور عباس، وحید الحسن ہاشمی، کلیم آلِ عبا جناب شاہد نقوی صاحب، نئی نسل کے مرثیہ نگاروں میں قسیم ابن نسیم امروہوی اور شاعرِ شیریں سخن ڈاکٹر ماجد رضا عابدی نے بھی تہذیبی اور مذہبی اقدار کو ملحوظ رکھتے ہوئے مرثیے کی توسیع اور ترقی کی کامیاب کوششیں کی ہیں اور یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا

سکتی ہے کہ یہ سب خدائے سخن میر انیسؔ کے چشمۂ آبِ بقا سے سیراب ہونے کا نتیجہ ہے۔ اس سلسلے میں قیامِ پاکستان کے بعد کراچی میں جناب ڈاکٹر یاور عباس کی یادگار مجالس کا سلسلہ، کلیم آلِ عبا شاہد نقوی کا تقدیسِ قلم، اسلام آباد میں ڈاکٹر سبطِ حسن مرحوم، کوئٹہ میں پروفیسر کرار حسین، پروفیسر مجتبیٰ حسین، لاہور میں جناب مرتضیٰ حسین لکھنوی کی متعدد تصانیف، بہاولپور میں آغا سکندر مہدی، ملتان میں ڈاکٹر اسد اریب، کراچی میں زیڈ اے بخاری، اور جناب ہاشم رضا صاحب، اسلام آباد میں افتخار عارف کی مرثیہ کے فروغ کے سلسلے میں قابلِ قدر اور اس عہد کے قابلِ فخر ماہر انیسیات، صدر نشیں، ڈاکٹر علامہ ضمیر اختر نقوی جو برصغیر میں انیسیات پر اتھارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قابلِ صد تحسین ہیں جنہوں نے تقریباً 18 برس کی عمر سے جب کہ کرکٹ وغیرہ کھیلنے کی عمر ہوتی ہے لیکن انہوں نے قرطاس وقلم کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا اور تن تنہا ایک ادارے کی شکل اختیار کر کے میر انیسؔ و دبیرؔ کی شخصیت ان کے خاندان اور فنِ مرثیہ نگاری پر بے شمار تصانیف شائع کر کے اردو زبان اور مرثیہ نگاری میں بڑا اہم کردار انجام دیا ہے۔ میری مؤدبانہ گذارش ہے کہ میر انیسؔ کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے بہت ضروری ہے کہ ادیب، شاعر و دانشور حضرات اس قومی ورثے کو جو میر انیسؔ کی صورت میں ہمیں ملا ہے اسے مزید ترقی دینے کے لئے قومی سطح پر حکومت کی سرپرستی میں انیسؔ اکیڈمی تشکیل دے کر مذہبی فریضہ انجام دیا جائے، میں اس سلسلے میں جناب حیدر عباس رضوی اور جناب صفوان اللہ صاحب سے درخواست گذار ہوں کہ وہ اس سلسلے میں اپنی کاوشیں بھی قوم کے سامنے لے آئیں، جس طرح اقبال اکیڈمی ہے اسی طرح انیسؔ اکیڈمی کو بھی فروغ ملنا چاہئے جو حکومت کا بڑا اہم کارنامہ ہوگا۔ انہوں نے اپنے مقالے کا اختتام مرزا دبیرؔ کے شعر پر کیا جو مرزا دبیرؔ نے میر انیسؔ کی رحلت پر پیش کیا تھا۔

آسماں بے ماہِ کامل، سدرہ بے روح الامیں

طورِ سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیسؔ

اس موقع پر جناب ماجد رضا عابدی نے ممبر نیشنل اسمبلی جناب صفوان اللہ اور حیدر عباس رضوی صاحب کے ساتھ تشریف لائے ہوئے انکے دیگر احباب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ'' آج جبکہ عزیز آباد میں بھی ایک جشن برپا ہے بلکہ یہ کہوں کہ آپ دونوں حضرات نے اُس جشن کو چھوڑ کر اِس جشن میں آکر اِس جشن سے اُس جشن کو متصل کر دیا ہے اور اس کے ساتھ ہی ممبر نیشنل اسمبلی جناب حیدر عباس رضوی صاحب کو خیالات کے اظہار کے لئے دعوت دی گئی۔

جناب حیدر عباس رضوی (ممبر نیشنل اسمبلی)

واجب الاحترام مونسانِ انیسؔ، یہاں پر موجود دونوں ڈاکٹرین یعنی ضمیر اختر بھائی اور ماجد عابدی، ہمارے پارلیمانی لیڈر صفوان اللہ بھائی اور مہمانانِ گرامی اور میرے براہِ راست استاد جناب حسن اکبر کمال صاحب کی اجازت سے میں اپنی بات شروع کرنا چاہوں گا۔

پہلی بات یہ ہے کہ اوتوالعلم کے اس ذکر اور اس محفل میں جب کہ اتنے صاحبان علم جمع ہوں مجھے اپنی کم علمی کا بہت زیادہ ادراک ہو جاتا ہے، سمجھ میں نہیں آتا چونکہ پیشے سے میں مہندس ہوں اس ادب کی صنف کے بارے میں اور خصوصاً جب تذکرہ انیسؔ کا ہو تو میں کیا کہہ سکتا ہوں، یقیناً مجھے اپنی کم علمی کا بہت زیادہ ادراک ہے، مولائے کائنات کے دو فرمان ہیں کہ'' انسان اپنی زبان کے نیچے چھپا ہے'' اور دوسرا فرمان ہے کہ'' کلام کرو تا کہ پہچانے جاؤ'' ان دونوں فرمودات کی روشنی میں اگر میں زیادہ طویل بات کرنے کی کوشش کروں گا تو میری کم علمی افشا ہوتی چلی جائے گی، ایسا میں نہیں چاہوں گا، پہلی بات تو یہ کہ ابھی ایک محترم شاعر کمال حیدر رضوی صاحب اپنے خوبصورت اشعار سے نواز رہے تھے، انہوں نے ایک مصرع پڑھا۔

"شیعوں کے ہیں ہم اور ہمارے ہیں انیسؔ"

جناب!.....مجھے اس فکر سے دست بستہ معذرت کے ساتھ اختلاف ہے، حسینؑ ایک کسوٹی ہے، ایک عالمگیر فکر ہے، کسی شخصیت کا نام نہیں ہے، جب بھی ناپا تولا جائے گا، وہ حسینؑ کی کسوٹی پر پرکھا جائے گا، کون کس قدر حق پر ہے، خدا کے لئے حسینؑ اور حسینیت کو لمیٹڈ نہ کیجئے۔ خدا کے لئے ہم اہل تشیع اور حسینؑ کے شیعہ جب ان موضوعات پر بات کر رہے ہوں تو ہمیں محتاط ہو جانا چاہئے کہ حسینؑ صرف شیعوں کے نہیں ہیں، کون سا اردو ادب میں ایسا شاعر ہے جس نے حسینؑ کو خراجِ عقیدت پیش نہ کیا ہو۔

ایسے ہی جون ایلیا جو اپنے آپ کو دہریہ کہا کرتے تھے، میں تو انہیں شعیانِ علیؑ مانتا تھا، مانتا ہوں، مانتا رہوں گا۔ ان کا ایک شعر پیشِ خدمت ہے کہ

خدا نہیں ہے تو کیا حق کو چھوڑ دیں اے شیخ
غضب خدا کا ہم اپنے امام کے نہ رہیں

تو دیکھئے دہریے خدا کی وحدانیت سے انکار کر رہے ہیں اور امام حسینؑ کی اہمیت سے انکار نہیں کر رہے تو ہم جو اہل تشیع ہیں ذرا محتاط ہو جانا چاہئے کہ لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے۔

اب بات انیسؔ پر ہو جائے کہ انیسؔ کی شاعری کے بنیادی طور پر دو رخ ہیں جس سے لوگ کسی بھی شاعر کی شاعری کو پرکھتے ہیں ایک تو وہ جو فقط اسلامی اور مذہبی نقطے ہیں، کیوں کہ انیسؔ پر جو ایک لوگوں کی تنقید ہے وہ یہ کہ "جناب فقط مرثیہ نگاری کے شاعر تھے" لیکن اس کے ساتھ ہی ان کا دوسرا رخ بھی اتنا ہی بڑا ہے، مثال کے طور پر یہ شعر دیکھئے کہ۔

خیالِ خاطرِ احباب چاہئے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

یہ شعر نہایت بڑا ہے لیکن اس میں مذہب کہیں نہیں ہے۔

برگِ حنا پہ بیٹھ کے لکھتا ہوں دل کی بات
شائد کہ رفتہ رفتہ لگے دل ربا کے ہات

یا

چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

یہ مصرعے زبان زدِ عام ہیں، اور انیسؔ کی مذہبی شاعری سے ہٹ کر بھی انیسؔ کے قد کو بے انتہا بلند کرتے ہیں۔ انیسؔ بنیادی طور پر بانیانِ رزمیہ شاعر تھے، جب ہم رزمیہ شاعری کی بات کرتے ہیں تو بڑے بڑے لوگ سامنے آتے ہیں، ہیومر کی ایلیٹ جو تقریباً ڈھائی سے تین ہزار برس قبل یہ لکھا گیا، اس کے بعد ورجل لاطینی شاعر ہے جس کی نظم اوڈیسے کے نام سے ہے، اس کے بعد ملٹن کی معرکتہ الآرا نظم پیراڈائس لاسٹ اور پیراڈائس ریگین وغیرہ آپ کے سامنے ہیں، پھر شیکسپیئر کا نام آتا ہے جنھوں نے ڈراموں کو رزمیہ انداز میں نظم میں لکھ کر دنیا کے سامنے پیش کیا، یہ دنیا کے وہ عالمگیر شعرا ہیں جنھوں نے رزمیہ شاعری کی بنیاد رکھ کر اسے پروان چڑھایا یہ مغرب کے لوگ ہیں، پھر یہاں پر کالی داس آتے ہیں مہا بھارت، سورداس آتے ہیں رامائن، یا فردوسی کا شاہنامہ، یہ وہ شاعر ہیں جو رزمیہ شاعر ہیں اور ایسٹ میں ہیں، ان میں آخر میں بہت بڑا نام جو بذاتِ خود انیسؔ کا آتا ہے۔ آپ کی توجہ اس نکتے پر مرکوز کرانا چاہتا ہوں کہ ارسطو کی کتاب بوطیقا یقیناً پہلی کتاب تھی جس میں شاعری کے تنقیدی موضوعات لکھے گئے، دنیا کے بڑے بڑے ناقدین نے بوطیقا کو کسوٹی بنا کر ان تمام نظموں کو پرکھا ہے۔ اس مقام پر حیدر عباس رضوی نے اپنے استاد حسن اکبر کمال صاحب سے صاد چاہتے ہوئے کہا کہ جب ان تمام نظموں کو بوطیقا پر پرکھا گیا تو وہ پوری نکلیں، اب جب جدید شعرا و تنقید نگاروں نے انیس کو بوطیقا پر پرکھا تو انیسؔ کا نام سب سے زیادہ بڑا نظر آیا، اس کی وجہ یہ

ہے کہ یہ تمام مغرب کے شعرأ کے کل اشعار کی تعداد کسی بھی نظم کی کل 40، 50یا60ہزار سے زیادہ نہیں ہے جبکہ صرف انیسؔ کے اشعار کی تعداد ڈھائی لاکھ سے زیادہ ہے، اس لئے انیسؔ کو دنیا بھر میں رزمیہ شاعری میں سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے، اور ہمیں اس کا علم نہیں۔

دوسرا نکتہ عرض کروں کہ انیسؔ کے فکر و فلسفے کی بات کی جائے تو ہمارے یہاں تو اگر کسی شاعر کے فکر و فلسفے کی بات کی جاتی ہے تو وہ آپ جانتے ہیں حضرتِ علامہ اقبال کا فکر و فلسفہ بہت زیادہ مشہور ہے، اور ہم سیالکوٹ سے باہر نکلنا ہی نہیں چاہتے فکر و فلسفے کی تلاش میں۔ اب اس حوالے سے دیکھئے کہ اقبال کی کل شاعری ایک آئیڈیل انسان کی تلاش میں ختم ہو جاتی ہے، اور انیسؔ کی شاعری کی ابتدا ایک آئیڈیل انسان سے ہوتی ہے، اب میں کیا کروں، بہت پابندیاں ہیں میرے اوپر، مسئلہ یہ ہے کہ کہنے کو تو میں بہت کچھ کہہ سکتا ہوں، بہت سے موضوعات ہیں لیکن کچھ پابندیاں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان میں دو شاعروں کو ان کا جائز مقام نہیں دیا گیا، ایک حضرتِ جوشؔ ملیح آبادی اور دوسرے میر انیسؔ، ان کو ہم آپس میں تذکرہ کر کے خوش ہو لیتے ہیں، لیکن میڈیا میں ان کو جائز مقام نہیں ملتا، میں کوشش کروں گا کہ میڈیا میں ان دونوں حضرات کو جس قدر زیادہ Promote کیا جا سکتا ہے کروں۔

تیسرا اور آخری نکتہ عرض کرتا چلوں کہ دنیا کا سب سے بڑا سچ شہادت ہے، اس سے بڑا سچ تو ہو ہی نہیں سکتا، اگر آپ کسی بھی نظریے سے تعلق رکھتے ہیں، آپ اپنی جان اس نظریے کے لئے دے دیتے ہیں تو آپ سے بڑا سچا انسان کوئی ہو ہی نہیں سکتا، اور شاعری بھی سچائی کی تلاش کا سفر ہے، قتیلؔ شفائی مرحوم کا شعر ہے کہ۔

لاکھ پردے میں رہوں، بھید مرے کھولتی ہے
شاعری سچ بولتی ہے

چونکہ شہادت دنیا کی سب سے بڑی سچائی ہے اور انیسؔ کی پوری شاعری دنیا کے سب سے بڑے سچ کے گرد گھومتی ہے اور اس کو اجاگر کرتی ہے اس لئے دنیا کی سب سے بڑی شاعری ہے۔ گو کہ میں ایک بہت کم علم طالبِ علم ہوں اور انیسؔ کو اتنا ہی جانتا ہوں، جیسا کہ ظہور مہدی صاحب نے کہا کہ انیسؔ اکیڈمی ہونا چاہئے، تو میں چونکہ خود ایک بہت بڑا مونسِ انیسؔ ہوں، ان کا جائز مقام جو ادب میں ہے، اسمبلی کے اندر بلکہ تا زندگی آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ کوشش کرتا رہوں گا۔

ڈاکٹر ماجد رضا نے جناب حیدر رضوی صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت ان کی تقریر سن کر یونیورسٹی کے وہ مباحثے اور ڈبیٹ کمپٹیشن (Debate competition) یاد آ گئے جب وہ (حیدر عباس رضوی) ایوان میں کسی ایک طرف سے، حزبِ اختلاف یا اتفاق سے قائدِ ایوان کی حیثیت سے تقریر کرتے تھے، ماجد عابدی نے کہا کہ ''مقرر کی اک مجبوری ہوتی ہے (اور چونکہ ان کا مشغلہ بھی رہا ہے، مباحثوں کی قیادت کرنا) کہ تقریر آگے بڑھانے کے لئے پچھلے مقرر کے کسی ایک نکتے کو پکڑ کر بات آگے بڑھاتے ہیں، یہ مقرر کی مجبوری بھی ہے اور ایک خاصہ بھی ہے کہ انہوں نے کمال حیدر رضوی صاحب کے شعر سے تقریر شروع کی۔ بہر حال یہ ازل سے ہوتا چلا آیا ہے کہ شاعر کا شعر مقرر کو موضوع فراہم کرتا ہے۔ علامہ صاحب کے جملے ہیں کہ ''میر انیسؔ کے مرثیے ہی خطابت کی بنیاد ہیں۔''

اس کے فوری بعد ممبر نیشنل اسمبلی و پارلیمانی لیڈر جناب صفوان اللہ صاحب کو دعوتِ خطاب دیا گیا، جنہوں نے نہایت ٹھہرے ہوئے انداز اور بردبار و متین لہجے میں میر انیسؔ سے اپنی محبت کا اظہار فرمایا۔

جناب صفوان اللہ صاحب

(ممبر نیشنل اسمبلی و پارلیمانی لیڈر، منسٹر آف ہاؤسنگ و پلاننگ)

میر انیس کی عظیم شخصیت، ان کی شاعری کی عظمت، اور ان کی شخصیت کے حوالے سے کچھ تقاریر اور فرمودات سنے، اتنا بڑا نام، اتنا بڑا حوالہ اور پھر میرے جیسے کم مایہ کے لئے یہ حکم دینا کہ میں میر انیسؔ کے سلسلے میں خیالات کا اظہار کروں چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے، بہر حال عقیدت کے طور پر جو کچھ بات سمجھ میں آئی اور جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں آپ حضرات کے گوش گذار کروں گا کہ میر ببر علی انیسؔ کے لئے اگر یہ عرض کروں کہ پیدائشی شاعر تھے تو کچھ غلط بات نہ ہوگی۔ اس لئے کہ ان کے والد میر خلیقؔ خود اپنی ذات اور اپنی حیثیت سے ایک بہت بڑے مرثیہ گو تھے، ان کے دادا مرثیہ گو تھے، میر انیسؔ نے خود اس حوالے سے بات کہی ہے کہ

عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

شاعری، مرثیہ گوئی اور شبیر کی مداحی میر انیسؔ کی شخصیت میں رچی بسی ہوئی تھی اور وہ خیال وہ تصور جس کے دل میں رچ بس جائے، پھر اس حوالے سے بات کوئی کرتا ہے تو وہ دل کی آواز ہوتی ہے اور سننے والے کے دماغ میں اتر جاتی ہے۔ میر انیس کی ساری شاعری، ساری مرثیہ گوئی اسی بات کا حوالہ اور ثبوت ہے۔

اکثر ناقدین نے میر انیسؔ کے حوالے سے یہ بات کہی ہے کہ عرب کے جس دردناک واقعے کا ذکر ہندوستانی حوالے سے جو کیا ہے تو شخصیت کو ہندوستانی بنا دیا، لیکن بات یہ نہیں ہے بلکہ میر انیسؔ اصل میں اس واقعے، اس شخصیت کی بات کر رہے تھے کہ جو ہر انسان کی، ہر سننے والے کی شخصیت کو بنانے کا ذریعہ بنتا ہے، بات کہنے والا اس لہجے میں بات کہے گا، وہ طریقہ اختیار کرے گا کہ سننے والے کی آنکھوں کے سامنے ذکر کردہ شخصیت اور واقعے کی تصویر بنا ڈالے، لفظ وہی استعمال کرنا پڑے گا جس کو ہم پہچانتے ہیں، یہ عرب کے واقعے کو ہندوستانی حوالے سے بیان کرنے کی بات نہیں بلکہ سننے

والے کی شخصیت کو سامنے رکھ کر بات کہی گئی ہے کہ سننے والے کو ساری حقیقت واضح سمجھ میں آسکے۔

ابھی ہمارے بھائی حیدر نے حوالہ دیا رزمیہ نظموں کا تو میں اس میں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں کہ جتنی بھی رزمیہ نظمیں میر انیسؔ کے علاوہ مہابھارت ہو، رامائن ہو، ہیومر کی نظم ہو وہ کسی تصوراتی شخصیت یا واقعے کو سامنے رکھ کر کہی گئی ہے جبکہ میر انیسؔ نے ایک ابدی حقیقت کو سامنے رکھ کر مرثیہ کہا اگر وہ ڈھائی لاکھ اشعار نہ کہتے اور صرف ایک نظم اس حقیقت کو سامنے رکھ کر کہتے تب بھی میری نظر میں وہی سب سے بڑے شاعر قرار پاتے۔ یہ جو محافل کسی بڑی شخصیت کے حوالے سے منعقد کی جاتی ہیں، تذکرے ہوتے ہیں اور پھر بات آئی گئی ہو جاتی ہے بات تو یہ ہے کہ جس شخصیت کی بات کی جارہی ہو وہ اسی قدر رائٹ ہو، ابھی حیدر عباس بھائی نے کہا کہ میں تا عمر کوشش کرتا رہوں گا تو میں بھی بہر حال قومی اسمبلی میں بھیج دیا گیا ہوں، اور انشاءاللہ ان شخصیات کو ہم کم سے کم جو خراجِ عقیدت پیش کر سکتے ہیں، اول تو یہ اس قدر بڑی شخصیات ہیں کہ ہم جیسے چھوٹے لوگ انہیں خراجِ عقیدت پیش ہی نہیں کر سکتے، لیکن ہم کم سے کم یہ تو کوشش کر سکتے ہیں کہ قائم ہو یا نہ ہو وہ تو علیحدہ بات ہے، اربابِ حل و عقد بہتر جانتے ہیں لیکن ہمیں اپنی بساط بھر کوشش کرنی چاہئے کہ یہ جو بڑے لوگ ہیں ان کی شناخت کے لئے، اور اُن سے فیض حاصل کرنے کے لئے کوئی ادارہ ایسا تشکیل پا جائے جہاں سے یہ سرچشمہ بہتا رہے۔ اور انشاءاللہ ہم بھی اپنی چھوٹی سی کوشش اس میں شامل رکھیں گے کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ اس ہی کی برکت سے کچھ ہمیں بھی برکت دے دے۔

تقریر کے اختتام پر ناظم جلسہ کی جانب سے دونوں مہمانوں کو از حد شکریہ ادا کرنے کے ساتھ ان کی مصروفیات کے باعث سامعین کو احساس دلایا کہ دونوں مہمانانِ گرامی جانا چاہتے ہیں....

اس مقام پر جناب حیدر عباس رضوی اور محترم صفوان اللہ صاحب اپنی نشستوں سے کھڑے ہو گئے لیکن سامعین میں سے جناب نسیم حسن پٹن صاحب نے معزز مہمانوں سے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ اگر وہ چند لمحے مزید ٹھہر جائیں تو علامہ صاحب کو مہمانوں کی موجودگی میں سنا جا سکے، لیکن چونکہ علامہ صاحب اور ماجد رضا عابدی صاحب کو مہمانوں کی مصروفیت کا احساس تھا، علامہ صاحب خود بھی اس تجویز کے حق میں نظر نہیں آتے تھے۔ اس دوران ایک دلچسپ واقعہ یوں ظہور پذیر ہوا کہ جناب حیدر رضوی و صفوان اللہ صاحب جس گاڑی میں تشریف لائے ہوئے تھے، وہ کسی فوری ضروری کام کے باعث پٹرول پمپ لے جائی جا چکی تھی جس کا احساس ہوتے ہی جناب عارف رضا صاحب نے اسٹیج پر جا کر حیدر رضوی صاحب کو مجبوری کا احساس دلایا اور دونوں مہمانانِ گرامی نے تمام رد و کد سے دستبردار ہوتے ہوئے فوراً جناب نسیم حسن پٹن صاحب کی خواہش قبول فرما لی، ساتھ ہی علامہ صاحب نے بھی مختصر اظہارِ خیال کرنا قبول کرتے ہوئے ڈائس پر تشریف لا کر چند مختصر مگر انتہائی اہم یادداشتیں پیش فرمائیں۔

علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب کا خطابِ اصغر

میں شکریہ ادا کرنا چاہوں گا، باقی مفصل تقریر تو بعد میں ہوگی اور ظاہر ہے کہ دونوں معزز مہمانوں کی مصروفیت ایسی ہے کہ انہیں وہاں (عزیز آباد) بھی پہنچنا ہے، ان میں ایک اور معزز مہمان جناب فیصل سبزواری صاحب کو بھی آنا تھا لیکن چونکہ وہ وہاں نظامت فرما رہے ہیں لہٰذا نہیں پہنچ پائے، وہ بھی بہت اچھی تقریر کرتے ہیں، جیسا کہ صفوان اللہ صاحب نے کہا کہ ہم کوشش کریں گے کہ ایک مرکز بن جائے، میں یہاں یہ کہوں گا کہ کوئی میری بات کا غلط مقصد نہ لے، برا نہ مانے ......اردو کا مرکز پنجاب ہے، جو ادارے کراچی میں بنے وہ بھی لاہور منتقل کر دیئے گئے، ایسا لگتا ہے کہ زبانِ اردو ہماری ہے ہی نہیں، آپ لوگوں کو حیرت ہوگی کہ جب میں نے ٹیلیویژن سے کہا کہ میر انیس پر

ایک پروگرام تیار کیا جائے تو جواب یہ آیا کہ جب تک ہمیں لاہور اجازت نہیں دے گا ہم میر انیس پر کوئی پروگرام نہیں کر سکتے۔ انڈیا کا طریقہ یہ ہے کہ جب بھی کسی شاعر کی یاد منائی جاتی ہے تو یادگاری ٹکٹ کا اجرائے عمل میں لایا جاتا ہے، اس ضمن میں وہاں غالب، بہادر شاہ ظفر، جوش ملیح آبادی پر ٹکٹ نکالے جا چکے ہیں بلکہ حد یہ ہے کہ وہاں اقبال پر ٹکٹ نکالا گیا جب میں نے پوسٹ آفس کے ہیڈ آفس کو درخواست دی کہ آپ میر انیس پر ٹکٹ کا اجرائے عمل میں لایئے، انہوں نے جواب دیا کہ مرکز اجازت نہیں دے رہا کہ میر انیس پر ٹکٹ نکالا جائے۔

میر انیس پر بہت بڑی بات یہ ہوئی تھی کہ جب بھٹو کا دور تھا، تو ہم نے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو خط لکھا کہ آپ میر انیس کے جلسے کی صدارت کیجئے، انہوں نے جواب دیا کہ میں تو چین کے دورے پر جا رہا ہوں، البتہ تین نائبین مقرر کر رہا ہوں عبدالحفیظ پیرزادہ، بیگم نصرت بھٹو اور مولانا کوثر نیازی، آپ ان تینوں میں سے کسی سے رابطہ کیجئے وہ آجائے گا، ہم نے وزیر اطلاعات مولانا کوثر نیازی کا انتخاب کیا اور اسلام آباد میں جوش ملیح آبادی صاحب سے کہا کہ آپ کوثر نیازی سے کہئے کہ پنڈی کا لیاقت ہال بک کرا دیجئے، جوش صاحب ہمارے ساتھ گئے وہاں تو کوثر نیازی صاحب نے کہا کہ یہ ہال بھر بھی جائے گا یا نہیں، لیکن یقین کیجئے کہ جیسے یہاں اس وقت کرسیاں کم پڑ گئی ہیں ایسے ہی وہاں بھی ہال بھر گیا تھا اور لوگ پیچھے کھڑے ہو کر جلسہ سن رہے تھے تو اس سے اندازہ ہوتا ہے شخصیت کا۔ اسی طرح اجلاس ہم نے بلایا جس میں فیض احمد فیض، زیڈ اے بخاری، سید محمد تقی سمیت کوئی تقریباً پچاس ادیب و شعرا وغیرہ کو بلایا، تو اس اجلاس کو فیض احمد فیض نے یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ ”غالب کی تو لائبریری ہم نے ناظم آباد میں بنوا دی اور غالب سے بڑا شاعر کوئی نہیں ہوا، اب چھوٹے موٹے شاعروں کی تو نہیں بنوائی جا سکتی۔“

علامہ صاحب نے فرمایا کہ لیکن اب خدا کا شکر ہے کہ اردو والے لوگ اسمبلی میں پہنچ گئے ہیں جن سے لوگوں کی بڑی امیدیں وابستہ ہیں اور جیسا کہ ڈاکٹر میتھیوز نے آج انجمن ترقی اردو کے جلسے میں کہا ہے کہ یورپ کی پانچویں بڑی زبان ہے اردو، ایک انگریز آپ کے کراچی میں یہ کہہ کر جارہا ہے۔ تو میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ کب تک اردو کو ذلیل کیا جاتا رہے گا، جو لوگ اردو کا نعرہ لگا رہے ہیں وہ نعرہ تو لگا رہے ہیں لیکن یہ نہیں چاہتے کہ اردو کا کوئی مرکز بن جائے تو جیسا کہ صفوان اللہ صاحب نے کہا ہے کہ ایک ایسا مرکز بننا چاہئے اور انہوں نے مزید کہا ہے کہ "اس توسط سے میرا نام بھی زندہ رہ جائے"۔ یہاں میں یہ دعا کروں گا کہ خدا کرے کہ کراچی میں ایک ایسا اردو مرکز بن جائے اور اس میں اسمبلی کے تمام ممبران کا نام وہاں سنہرے حروف سے لکھا جائے، جہاں پر جس شاعر کی یاد ہم منانا چاہیں آزادی کے ساتھ منا سکیں۔

علامہ صاحب نے جناب حیدر رضوی اور جناب صفوان اللہ صاحب سے مخاطب ہوتے ہوئے اپنی تقریر کو اختتام تک پہنچایا کہ یہ جو آپ کے سامنے بڑے بڑے صاحبانِ علم، علماٗ، شعراٗ تشریف رکھتے ہیں ان کا پیغام لے کر آپ جایئے اسلام آباد میں اور ایک ایسا مرکز بنے جس میں انیسؔ، دبیرؔ، آتشؔ، ناسخؔ، جوشؔ سب کی بڑی بڑی تصاویر آویزاں کی جائیں، جہاں ان پر کتب لکھی جائیں، مقالے لکھے جائیں اور ان کی یاد میں ادبی جلسے، سیمینار منعقد کئے جائیں۔

اس موقع پر چونکہ سامعین علامہ صاحب کی تقریر میں محو ہو چکے تھے اور ایک سحر سا طاری ہو چکا تھا، علامہ صاحب کے بعد جناب ماجد رضا عابدی نے اگلے شاعر جناب کوثر نقوی کو دعوت دینے سے قبل میر انیسؔ کے مرثیوں سے چیدہ چیدہ بند پیش کئے اور اپنے فنِ تحت خوانی کے جوہر دکھاتے ہوئے شاعر موصوف کے لئے ماحول ترتیب دیا، اسی دوران علاقے کے ناظم جناب سجاد حسین دارا صاحب بھی تشریف لے آئے جن کی آمد پر

محترم جعفر محسن صاحب کی ہنگامی خواہش تھی کہ معزز مہمان کو مائیک سے خوش آمدید کہا جائے، انہوں نے سامعین اور ماجد رضا عابدی کے درمیان مخل ہوتے ہوئے اپنی گذارش پیش فرمائی جسے ماجد رضا صاحب نے بہر حال قبول کرتے ہوئے معزز مہمانان کو خوش آمدید کہا اور ساتھ ہی جناب کوثر نقوی کو دعوتِ کلام دی، جناب کوثر نقوی صاحب نے ڈائس پر تشریف لاکر میر انیس کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش فرمایا۔

جناب کوثر نقوی

جبینِ وقت پہ اب تک لکھا ہوا ہے انیس — دلوں کی آج بھی دھڑکن بنا ہوا ہے انیس
بڑے بڑوں کے دلوں میں بڑائی اُسکی ہے — حدودِ ملکِ سخن میں خدائی اُسکی ہے
قصیدے پڑھتا ہے ہر ایک جوہری اُسکے — ہیں اب بھی سینکڑوں شاگردِ معنوی اُسکے
تمسک اُس سے برائے وِلا ضروری ہے — اُسی چراغ سے کسبِ ضیاء ضروری ہے
وہ ذات جو حدِ آلِ عبا میں ہے مدفون — اُس ہی کی منزلِ کسبِ ہنر میں ہے ممنون
نسیم پرتوِ اوج و کمال اُس کا ہے — اس آئینے میں بھی عکسِ جمال اُس کا ہے
حجاب لاکھ ہوں پھر بھی وہ حجاب میں ہے — بہت رُخوں سے وہ چہرہ ابھی نقاب میں ہے
حریمِ ذات کے کتنے غلاف باقی ہیں — بہت ہوئے ہیں بہت انکشاف باقی ہیں

یہ کام ہوگا تو دستِ ''ضمیر اختر'' سے
ہمیں اُمید بہت کچھ ہے اس سُخنور سے

جناب کوثر نقوی صاحب نے مزید فرمایا کہ ''جناب ضمیر اختر نقوی صاحب کا انیس کے حوالے سے بہت کام ہے، بہت Contribution ہے۔ برصغیر کی سطح پر ان کی کتابیں انیس کے لئے Reference book کا درجہ حاصل کرچکی ہیں، اور ہمیں یقین ہے کہ انیس پر جو کام وہ کررہے ہیں اسے یقیناً مزید پذیرائی حاصل ہوگی۔

ان کے بعد پروفیسر حسن اکبر کمال صاحب کو دعوت کلام دی گئی جنہوں نے میر انیس

کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت ان الفاظ میں پیش فرمایا....

پروفیسر حسن اکبر کمال

بجا کہ میر تقی میرؔ ہیں خدائے سخن
سخن انیسؔ کا گویا ہے ماورائے سخن

بجز انیسؔ کہاں قادر الکلام ایسا
مثالِ موجۂ تسنیم جو بہائے سخن

پھر ان پہ کیوں نہ کرے نازِ فنِ شعر و ادب
انیسؔ آئے ہی دنیا میں تھے برائے سخن

ہُنر سے اپنے محبت کدے بنانے کو
دلوں میں اہلِ ولا کے رکھی بنائے سخن

یہ مرثیے نہیں کاغذ پہ اُس سخنور نے
ہیں پارہ ہائے جگر رکھ دیئے، بجائے سخن

کیے جو لفظ مسیحائے لفظ نے زندہ
یہ کارِ عشق ہوا ضامنِ بقائے سخن

سمو دیا ہے سخن میں بیانِ ذبحِ عظیم
ہر ایک مرثیہ ہے گویا کربلائے سخن

وہ آسمان سے لائے تھے جن زمینوں کو
انہی میں پھولی پھلی فصلِ ارتقائے سخن

خیالِ خاطرِ احباب چاہئے ہر دم
بجا ہے مشورۂ رمز آشنائے سخن

کمالِ فن ہے یہی، قوتِ ہُنر ہے یہی
ہو دل پہ نقش جو شاعر کے لب پہ آئے سخن

مصائب آپ نے کیا آنسوؤں سے لکھے تھے
کہ روئے جو بھی سُنے اور جو سُنائے سخن

ملا نہ کاوشِ مداحِ اہلبیتؑ میں عیب
حریف ڈھونڈھا کئے لغزش و خطائے سخن

کمالؔ اہلِ حشم بھی یہ خوب جانتے ہیں
دوام کس کو جہاں میں ملا سوائے سخن

بعدہٗ ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی کو دعوتِ تقریر دینے سے قبل ڈاکٹر ماجد رضا عابدی نے ایک رباعی اور سلامِ انیسؔ پیش فرمائے۔

پُر نور مکاں قبر فرحناک ملے
یارب مری میت کو زمیں پاک ملے
یوں خاکِ شفا میں مل کے رہ جائے انیسؔ

رضوان بھی ڈھونڈے تو نہ کچھ خاک ملے

سلام از میر انیسؔ... بزبانِ ڈاکٹر ماجد رضا عابدی

خوشا زمینِ معلّیٰ زہے فضائے نجف | ریاضِ خلد بھی ہے شائقِ ہوائے نجف

جسے خدا سے محبت ہے اس کو کعبے سے | جسے ولائے علی ہے اسے ولائے نجف

ملی انگوٹھی بھی ویسی ہی تھا نگیں جیسا | نجف برائے علیؑ تھا علیؑ برائے نجف

مریض کے لئے اکسیر ہیں یہ دو نسخے | غبارِ مرقدِ شبیرؑ اور ہوائے نجف

شراب بنتی ہے سرکہ علیؑ کی دہشت سے | یہ انقلاب نہ دیکھا کہیں سوائے نجف

اِدھر سے کوشش کامل ہے اور اُدھر سے کشش

انیسؔ ہم نہ رہیں گے کہیں سوائے نجف

ڈاکٹر ماجد عابدی نے کہا کہ آج جتنی بھی توجہ میر انیسؔ کی طرف ہوئی ہے آج کے معاشرے و دانشوروں اور ادیبوں میں اس کے بانی اور موسس علامہ ضمیر اختر نقوی ہیں، جو حضرات 1970ء سے اب تک کی تاریخ کے گواہ ہیں وہ اس بات کی تائید کریں گے کہ میر انیسؔ پر کام کا آغاز علامہ صاحب کی کوششوں سے ہوا، اسی دوران میر انیسؔ اکیڈمی علامہ صاحب بنا چکے تھے جس میں اس وقت سید ہاشم رضا، رئیس امروہوی، جوش ملیح آبادی، وغیرہ سب شامل تھے اور علامہ صاحب بانی تھے، میر انیسؔ اکیڈمی اور مرکز علوم اسلامیہ دونوں کے بانی علامہ صاحب ہیں، اور میں اگر صرف اپنے ہم عمر نوجوانوں کی بات کروں تو علامہ صاحب واحد خطیب ہیں جن کے سامعین میں میر انیسؔ سے دلچسپی ہے۔ علامہ صاحب کا اصول ہے کہ ہم نے جس سے کچھ حاصل کیا ہے اس کا کچھ احسان اتار دیا جائے، جس کا بھی ہم سمجھتے ہیں کہ معاشرے، شیعت، انیسؔ پر کسی کا کچھ احسان ہے تو اس کا بدلہ دینا چاہئے، مثلاً علامہ رشید ترابی صاحب اپنی تقاریر میں میر انیسؔ کو پڑھتے تھے یہی بات علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب کو متاثر کر گئی، اس احسان کو اتارنے

کے لئے علامہ صاحب نے علامہ رشید ترابی صاحب کی مجالس کے کئی مجموعے شائع کئے، کہ اس شخص نے اپنی مجالس میں میر انیسؔ کا ذکر کیا، وہ اسی بناء کا تسلسل تھا جو اب تک چلا آرہا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ اب میں علامہ صاحب سے گذارش کروں گا کہ وہ تشریف لائیں اور خطاب فرمائیں۔

صدارتی تقریراز: علامہ ضمیر اختر نقوی

علامہ صاحب نے جعفر محسن صاحب اور آلِ عبا ٹرسٹ کی تعریف اور تمام شرکا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمارے سامنے علم دوست احباب تشریف فرما ہیں تو کیوں نہ کچھ کام کی باتیں ہم کریں جو محفوظ ہو جائیں۔ انہوں نے کہا کہ میر انیسؔ کو اللہ نے اتنا بڑا شاعر کیسے بنا دیا کہ وہ دنیا کے بڑے بڑے شاعروں سے آنکھیں ملانے لگے، انہوں نے اردو زبان کو دنیا کی بڑی زبانوں کی صف میں رکھ کر چیلنج کر دیا کہ جو ہماری اردو کے پاس ہے کسی اور کے پاس نہیں ہے۔ اردو کی برتری بعض باتوں میں دنیا کی تمام بڑی زبانوں سے مختلف ہے مثلاً ہمارے حسن اکبر کمال صاحب انگریزی پڑھاتے ہیں لیکن شعر اردو میں کہتے ہیں، کیوں کہ انہیں معلوم ہے کہ اردو شاعری کا جواب دنیا کی کسی شاعری میں نہیں اس کی ایک چھوٹی سی مثال انگریزی سے ہی دے دیں۔ ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز نے لکھا ہے کہ انگریزی میں سب کچھ ہے لیکن یہ نہیں ہے کہ

شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے

سر سلطان جو بہت بڑے قانون دان تھے، اور سروجنی نائیڈو جو انگریزی زبان کی شاعرہ تھیں، یوپی کی گورنر تھیں اور میر انیسؔ کی عاشق تھیں۔ سر سلطان سے انہوں نے کہا کہ میر انیسؔ کے ایک مرثیے کا ترجمہ انگریزی میں کردو، انہوں نے کچھ اشعار کا ترجمہ کیا پھر کہا کہ ترجمہ کیا تھا لیکن یہاں پر رک گیا ہوں اس کا کیا ترجمہ کروں کہ

لاؤ دلہن کو بیاہ کے تاروں کی چھاؤں میں

اب اس کا میں کیا ترجمہ کروں۔ تو اردو کو میر انیسؔ نے ایک ایسے بلند مقام پر لے جا کر جہاں آج سے آٹھ سو برس قبل ہندوستان کی قومی زبان فارسی تھی، عدالت کی اسکول و کالج کی زبان فارسی تھی، بادشاہوں کی زبان فارسی تھی۔ دو اسکالرز ایران سے میرے پاس آئے جو اس موضوع پر تہران یونیورسٹی میں Phd کر رہے تھے کہ ہندوستان سے ایک دم سے فارسی کہاں غائب ہوگئی؟ میں نے کہا کہ میر انیسؔ نے اردو کا قبضہ کروادیا، بس فارسی غائب ہوگئی، اب اردو کے مقابلے میں فارسی چھوٹی زبان ہوگئی، عربی اپنی گرامر، اپنی لغت کے اعتبار سے بہت بڑی زبان ہے لیکن اردو کے سامنے عربی بھی خاموش رہتی ہے۔ اس کی وجہ میں بتادوں کہ دنیا کی ہر زبان جو بولی جاتی ہے وہ آوازوں سے بولی جاتی ہے، آوازیں سینے سے لے کر زبان کی نوک تک چھپی ہوئی ہیں۔ اسے کہتے ہیں مخرج، حرف کو صحیح ادا کرنا، ہر زبان میں بہت سے حرف مشترک ہیں۔ A, B, C, D، ہندی میں آ، با، سا، دا، اردو میں الف، ب، ج، د، اسی طرح سنسکرت میں، عبرانی میں، لاطینی میں لیکن کچھ حرف ایسے ہیں جو پشتو میں ہیں، پنجابی میں نہیں، پنجابی میں ہیں بلوچی میں نہیں، بلوچی میں ہیں تو انگریزی میں نہیں وغیرہ وغیرہ مثلاً ایک حرف ہے ''ڑ'' اس سے کوئی حرف ہی نہیں شروع ہوتا، یہ ''ڑ'' عربی و فارسی میں نہیں، سنسکرت سے ہندی میں اور پھر اردو میں آیا ہے، اسی طرح ''ش'' یا ''ق'' کے لئے کہتے ہیں کہ فلاں کا شین، قاف درست نہیں، تو یہ ہوتا ہے کہ بعض حروف بعض جگہ موجود ہی نہیں، اسلئے بعض لوگ نہیں بول سکتے۔

افریقہ میں حبشی ''ش'' نہیں بول سکتے۔ ایران والے ''ک'' کی جگہ ''ج'' بولتے ہیں۔ اردو والوں کا کمال یہ ہے کہ جہاں جاتے ہیں درست تلفظ کے ساتھ وہ زبان بولنا شروع کردیتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو نے دنیا کے ہر مشکل حرف کو لے لیا، ترکی، چینی، پرتگالی، عربی، فارسی ہر زبان سے لفظ لے لیا۔ اب جو لوگ ''ڑ''، خ نکال لیں ان

کے لئے کوئی زبان مشکل نہیں، اردو میں سب سے زیادہ مخرج ہیں، اسی طرح ''ٹ'' فصیح نہیں لیکن انیسؔ نے ''ڑ'' اور ''ٹ'' کو بھی اس قدر فصیح انداز میں پیش کیا ہے کہ کمال ہے۔

مثلاً:- ''ڑ'' کا استعمال دیکھئے، یہاں تین بار ''ڑ'' آیا ہے۔

رخ کی بلائیں لیتی ہیں پریاں کھڑی ہوئی
سہرے کی ہر لڑی سے ہیں آنکھیں لڑی ہوئی

یہاں چھ مرتبہ ''ڑ'' آیا ہے:-

ڈھالیں لڑیں سپاہ کی یا ابر گڑگڑائے
غصے میں آکے گھوڑے نے بھی دانت کڑکڑائے

شمشیر عدوکش کی ہوا کے وہ تھپیڑے ڈوبے ہوئے تھے خون میں اس فوج کے بیڑے
گھوڑے کو بڑھانے کے لئے کیا کوئی چھیڑے بوچھار سروں کی وہ، لہو کے وہ دڑیڑے
ساون نہیں برسا ہے کہ بھادوں نہیں برسا
مینھ برسا ہے ہر سال مگر یوں نہیں برسا

''ٹ'' کا استعمال دیکھئے:-

ماتھے وہ اور وہ پیچ عماموں کے لٹ پٹے گیسو وہ بنت فاطمہ کے ہاتھ سے بٹے
وہ ابروؤں کے خم کہ ہلالِ فلک کٹے آنکھیں وہ نرگسی کہ نہ جن سے نظر ہٹے
چہرے کسی نے دیکھے ہیں اس آب وتاب کے
رخسار چار پھول کھلے ہیں گلاب کے

یہاں پر ''ٹ'' کی تکرار میں آٹھ مرتبہ ''ٹ'' کا استعمال ہے:-

کیا کیا چمک دکھاتی تھی سرکاٹ کاٹ کے تنتی تھی کیا تنوں سے زمیں پاٹ پاٹ کے
پانی وہ خود پئے ہوئے تھی گھاٹ گھاٹ کے دم اور بڑھ گیا تھا لہو چاٹ چاٹ کے

کیا جانیئے ملا تھا مزا کیا زبان کو
کھا جاتی تھی ہما کی طرح استخوان کو

سوال یہ ہے کہ انیسؔ کو جو اتنی بڑی عظمت ملی، انیسؔ جب نو دس برس کے تھے تو وہاں شاعری کا چرچہ تھا، فیض آباد آباد ہو رہا تھا، دلی لٹ رہی تھی، وہاں روز مشاعرہ ہوتا تھا، انیسؔ اسی ماحول کے پروردہ تھے، دادا، پردادا سب بڑے شاعر تھے، انہوں نے بھی شعر کہنے شروع کیے، باپ سے چھپ چھپ کر شعر کہتے تھے۔ ایک بار مشاعرے میں غزل پڑھی تو قیامت ہوگئی، ان کی ابتدائی غزلوں کے چند شعر یہ ہیں:-

چبھے تلووں میں کانٹے آنکھ سے اشکِ رواں نکلے
یہ کیسے آبلے تھے کس جگہ پھوٹے کہاں نکلے

کھلا باعث یہ اس بے درد کے آنسو نکلنے کا
دھواں لگتا ہے آنکھوں میں کسی کے دل کے جلنے کا

خموش اے بلبلِ شوریدہ اس میں کیا ہے بس میرا
یہ اپنی اپنی قسمت ہے چمن تیرا قفس میرا

اس طرح کے شعر انیسؔ کہتے تھے کہ

تجھی کو دیکھوں گا جب تک ہیں برقرار آنکھیں
میری نظر نہ پھرے گی تری نظر کی طرح

یا

تمہارے حلقہ بگوشوں میں ایک ہم بھی ہیں
پڑا رہے یہ سخن کان میں گہر کی طرح

انیسؔ یوں ہوا حالِ جوانی و پیری
بڑھے تھے نخل کی صورت، گرے ثمر کی طرح

یا وہ غزل

اشارے کیا نگہ نازِ دلربا کے چلے
جب ان کے تیر چلے نیمچے قضا کے چلے
مثال ماہیٔ بے آب موج تڑپا کی
حباب پھوٹ کے روئے جو تم نہا کے چلے
انیسؔ دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

بس اس غزل کے بعد ان کے والد نے اُن سے کہا کہ ان کے لئے شاعری کرو جن کا گھر کربلا میں لٹ گیا، بس جناب بچپن میں یہ بات باپ نے کہہ دی، جانے کیا دل پر اثر کر گئی کہ انیسؔ نے غزل گوئی چھوڑ دی۔

جب انیسؔ کی قبر بنی تو بڑا مجمع تھا آدھی رات کو گورکن نے دیکھا کہ ایک کالا سایہ آیا اور اس نے قبر پر ٹوٹی چوڑیاں رکھیں اور چلا گیا۔

اب وہ جو اندر کا چھپا ہوا غزل گو تھا وہ مر تو نہیں سکتا تھا، تو انیسؔ جو اتنے بڑے شاعر بنے اس کی وجہ یہ تھی کہ کسی شاعر نے اپنے فن کے لئے اللہ سے دعا نہیں کی، بس فن شروع کر دیا، انیسؔ نے ایک عجیب بات کی ہے جو دنیا کے کسی شاعر نے نہیں کی، کہ انیسؔ نے اللہ سے کہا کہ تو وعدہ کر کہ اگر میں بڑوں کے لئے شعر کہوں گا تو تُو مجھے کہاں تک لے جائیگا۔ بس جتنا اس نے عطا کر دیا۔

یارب چمنِ نظم کو گلزارِ ارم کر اے ابرِ کرم خشک زراعت پہ کرم کر
تو فیض کا مبدا ہے توجہ کوئی دم کر گمنام کو اعجاز بیانوں میں رقم کر

جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے
اقلیم سخن میری قلمرو سے نہ جائے

آؤں طرفِ رزم ابھی چھوڑ کے جب بزم خیبر کی خبر لائے میری طبعِ اولو العزم
قطعِ سرِ اعدا کا ارادہ ہو جو بالجزم دکھلائے یہیں سب کو زباں معرکہ رزم
جل جائیں عدو آگ بھڑکتی نظر آئے
تلوار پہ تلوار چمکتی نظر آئے

ہو ایک زباں ماہ سے تا مسکنِ ماہی عالم کو دکھا دے بُرشِ سیفِ الٰہی
جرأت کا دھنی تو ہے یہ چلائیں سپاہی لاریب ترے نام پہ ہے سکۂ شاہی
ہر دم یہ اشارہ ہو دوات اور قلم کا
تو مالک و مختار ہے اس طبل و علم کا

ناقدریٔ عالم کی شکایت نہیں مولا کچھ دفترِ باطل کی حقیقت نہیں مولا
باہم گل و بلبل میں محبت نہیں مولا میں کیا ہوں کسی روح کو راحت نہیں مولا
عالم ہے مکدر کوئی دل صاف نہیں ہے
اس عہد میں سب کچھ ہے پر انصاف نہیں ہے

تائید کا ہنگام ہے یا حیدرِ صفدر امداد ترا کام ہے یا حیدرؑ و صفدرؑ
تو صاحبِ اکرام ہے یا حیدرؑ و صفدرؑ تیرا ہی کرم عام ہے یا حیدرِؑ صفدرؑ
تنہا ترے اقبال سے شمشیر بکف ہوں
سب ایک طرف جمع ہیں، میں ایک طرف ہوں

تھا جوش کچھ ایسا ہی جو دعویٰ کیا میں نے خود سر بگریباں ہوں کہ یہ کیا کیا میں نے
اک قطرۂ ناچیز کو دریا کیا میں نے تقصیر بحل کیجئے بے جا کیا میں نے
ہاں سچ ہے کہ اتنی بھی تعلّی نہ روا تھی

مولا ! یہ کلیجے کے پھپھولوں کی دوا تھی

مقبول ہوئی عرض ، گنہ عفو ہوئے سب   امید بر آئی مرا حاصل ہوا مطلب
شامل ہوا ، افضالِ محمدؐ کرمِ ربّ   ہوتے ہیں علم فوجِ مضامیں کے نشاں اب
پشتی پہ ہیں سب رکن رکینِ دینِ متیں کے
ڈنکے سے ہلا دیتا ہوں طبقوں کو زمیں کے

تو آج تک زمین ہل رہی ہے انیسؔ کے ڈنکے سے، کون ہے انیسؔ کے مقابل کہ لفظوں کی بارات ہے سامنے، دیکھتے اور سناتے چلے جائیں، حسینؑ لڑنے آئے ہیں میدان جنگ میں انیسؔ کی نظر حسینؑ کی آنکھ پر ہے اس لئے کہ ان میں پنجتن کا نور ہے، پھر اس کی تعریف شروع کی۔

آنکھوں کو کہیئے عین تو عین خطا ہے یہ   پردے نہ کیوں ہوں سات کہ نورِ خدا ہے یہ
سب کو ہے چشم داشت کہ عینِ عطا ہے یہ   بیمار خود، پہ سب کے مرض کی دوا ہے یہ
سرخوش بھی جام ان کی محبت کا پی گیا
دیکھا نگاہِ لطف سے جس کو وہ جی گیا

احسان بھی حیا بھی مروت بھی قہر بھی   لو موت بھی حیات بھی امرت بھی زہر بھی
بینا بھی نکتہ سنج بھی دانائے دہر بھی   تسنیم بھی بہشت بھی کوثر بھی نہر بھی
سر شرم سے جھکاتی ہے نرگس ریاض میں
جنّت سواد میں یدِ بیضا بیاض میں

آہو شکار و مست و کماندار و شیر گیر   ہشیار و خوش نگاہ و سخن سنج و دلپذیر
خوں ریز و جاں ستاں و دلآویز و بےنظیر   قبضے میں ابروؤں کی کمانیں مژہ کے تیر
جس سادہ دل کو ان کی سیاہی کی یاد ہو
ناخواندہ بھی اگر ہو تو روشن سواد ہو

آہو فریب و عشوہ فروش و کرشمہ ساز   طناز و شرمگین و گراں خواب و سرفراز
حق بین و پاکباز و خدا بین و بے نیاز   بیدار و داغدیدہ و خونبار و غم طراز

گرد اس کے پھر یہ کعبۂ ایماں کا طوف ہے
بس اے انیسؔ بس نظرِ بد کا خوف ہے

ابھی صفوان اللہ صاحب اور حیدر رضوی صاحب تشریف فرما تھے، اگر وہ ابھی بیٹھے ہوئے ہوتے تو ہم ان سے کچھ اور باتیں کرتے لیکن خیر رکارڈ ہو رہا ہے، جب پاکستان بن رہا تھا اور مسلم لیگ اجلاس کر رہی تھی، مختلف شہروں میں جلسے ہو رہے تھے، سب سے بڑا اجلاس لکھنؤ میں ہوا اور بعد میں شاید کانپور میں ہوا اس میں اسٹیج پر جتنے لوگ بیٹھے ہوئے تھے وہ سب راجہ اور نواب تھے، کیوں کہ پاکستان کی تعمیر میں سب سے زیادہ پیسہ رجواڑوں نے دیا، جس میں راجہ سلیم پور، راجہ جہانگیر آباد، راجہ صاحب محمود آباد، راجہ کٹوارہ اور راجہ پیر پور، ابو جعفر صاحب، وہ لوگ پاکستان آئے نہیں۔

راجہ صاحب محمود آباد کے صاحبزادے راجہ سلیمان نے مجھ سے خود کراچی میں کہا کہ میرے محل کے تہہ خانے میں کئی سو بکسوں میں قائدِ اعظم کے کاغذات اور مسلم لیگ کی تاریخی دستاویزات موجود ہیں۔ ان کاغذات کو کون پڑھے، حالانکہ انڈیا آفس بھی مانگ رہا ہے، لیکن انہوں نے منع فرما دیا، چونکہ راجہ صاحب محمود آباد کی اسٹیٹ کے وکیل تھے، یعنی قائدِ اعظم ان کے شاہی وکیل تھے ان کے مشورے کے بغیر اسٹیٹ میں کوئی کام نہیں ہوتا تھا، راجہ صاحب قائدِ اعظم کو Uncle کہتے تھے، قائدِ اعظم کی ہی وجہ سے راجہ صاحب متوجہ ہو کر خزانچی بنے مسلم لیگ کے، تو ذبیح اللہ صاحب تقریر کر رہے تھے کانپور اجلاس میں، اس میں سارے راجے اور نواب بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے کہا اب تو مسلم لیگ کسی کام کی نہیں رہی اس لئے کہ مسلم لیگ میں سب نواب اور راجہ، پیسے والے لوگ ہیں، یعنی مطلب اب پاکستان نہیں بن سکتا، دولت مندوں نے گھیر لیا ہے، ابھی ذبیح اللہ

صاحب ڈائس سے ہٹے تھے کہ راجہ صاحب محمود آباد اٹھے اور انہوں نے ذبیح اللہ کی پوری تقریر کے جواب میں میر انیسؔ کے مرثیے میں امام حسینؑ کے رجز کا صرف ایک شعر پڑھا کہ۔

بیٹھے نہیں زمیں میں خزانوں کو گاڑ کے
موت آئی اٹھ کھڑے ہوئے دامن کو جھاڑ کے

یہاں معلوم نہیں ہوتا کہ یہ شعر مرثیے کا ہے یا غزل کا، اسی طرح ایک اور اجلاس ہو رہا تھا، اس میں بھی ایک طنز ہوا تو راجہ صاحب نے جواب میں حضرت قاسمؑ کے مرثیے کا ایک شعر پڑھا کہ۔

چتلے ہیں جتنے سانپ وہ ڈستے نہیں کبھی
گرجے ہیں جو بہت وہ برستے نہیں کبھی

میر انیسؔ کا یہ شعر دیکھئے گا کہ جس کو سن کر اندازہ نہیں ہوتا کہ غزل کا شعر ہے یا مرثیے کا۔

غربت میں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا
شمعیں بھی جلاؤ تو اجالا نہیں ہوتا

حالانکہ یہ شعر حضرت مسلم کے دونوں بچوں کے مرثیے سے ہے، غزل میں مرثیے کو بھر دینا ہی میر انیسؔ کا کمال ہے۔

بچہ کی فطرت ہے کہ اگر چھوٹا بچہ زیادہ وقت باپ سے دور رہے اور پھر باپ اسے گود میں لے تو بچے کی آنکھوں میں شکوے کے آنسو آ جاتے ہیں، تو شب عاشور ہے، حضرت علی اصغر رات بھر امام حسینؑ سے نہیں ملے، صبح امام حسینؑ خیمے میں آئے، دیکھئے انیسؔ کیسے ملاقات کروا رہے ہیں کہ۔

روئے ہیں فرقتِ شہہ عالی جناب میں
نرگس کے پھول تیر رہے ہیں گلاب میں

علامہ صاحب نے فرمایا کہ میر انیسؔ کو تسلسل سے پڑھتے چلے جایئے تو احساس نہیں ہوگا لیکن اگر رک رک کر ہر جگہ محسوس کریں کہ انیسؔ کیا کہہ رہے ہیں پھر یہ باتیں آشکار ہوتی ہیں۔

انیسؔ تلوار کے لئے کہتے ہیں

زیبا تھا دمِ جنگ پری وش اسے کہنا
معشوق بنی سرخ لباس اس نے جو پہنا
جوہر تھے کہ پہنے تھی دلہن پھولوں کا گہنا
اس اَوج میں وہ سر کو جھکائے ہوئے رہنا
سیبِ چمنِ خلد کی بو باس تھی پھل میں
رہتی تھی وہ شبیرؑ سے دولھا کی بغل میں

میر انیسؔ کا یہ کمال ہے کہ جب وہ کہتے ہیں کہ پری تھی، معشوق تھی، اور پھر دلہن کہا تو یہاں دولھا کا سوال ہوتا ہے پانچویں مصرعے میں بات پوری کر دی۔

حضرت علی اکبرؑ کی رخصت پر یہ بند دیکھئے :-

بولی وہ عندلیبِ چمن پرورِ بتولؑ
طرّہ وہی ہے سر پہ مہہ سر چڑھے جو پھول
اے نخل باغِ فیضِ گل گلشنِ رسول
داغِ گلِ ریاضِ تمنا بہ دل قبول
شادی سدا نہیں چمن روزگار میں
روئے خزاں میں وہ جو ہنسا ہو بہار میں

ڈاکٹر احسن فاروقی صاحب نے لکھا ہے کہ شاعری میں دو رخ چل رہے ہیں ایک غزل اور ایک نظم، غزل غالبؔ کی پیروی میں چل رہی ہے، نظم انیسؔ کی پیروی میں چل

رہی ہے، جنھوں نے غزل کہا وہ سفر ناصر کاظمی تک آتا ہے، جنھوں نے نظم کہی وہ سفر سردار جعفری اور جوشؔ تک آتا ہے، نظم کے شاعر انیسؔ کی تاسی کر رہے ہیں اور غزل کے جو لوگ ہیں وہ میرؔ اور غالبؔ کی تاسی کر رہے ہیں لیکن اپنی بات کہنے کے لئے غزل ناکافی ہے یہ بات غالب نے بھی کہی تھی کہ غزل اتنی چھوٹی چیز ہے کہ میں بات پوری کہہ ہی نہیں پاتا، میر انیسؔ نے کبھی یہ شکوہ نہیں کیا کہ میں اپنی بات پوری نہیں کہہ پاتا کیوں کہ وہ آرام سے اپنی پوری بات کہہ کر چلے گئے۔

انہوں نے کہا کہ 'میر انیسؔ کی شاعری کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ جہاں زینبؑ یہ چاہتی ہیں کہ سب قربان ہو جائیں میرا بھائی بچ جائے، میر انیسؔ کی شاعری کو بغور پڑھنے پر دیکھیں گے کہ بھائی اور بہن کی محبت جو دنیا کی کسی زبان کی شاعری میں ہے ہی نہیں، یہ صرف اردو داں طبقے میں ہوتے ہیں'۔

مخمور اکبرآبادی نے اپنے مضمون میں یہ بات لکھی ہے کہ:

میر انیسؔ سے پہلے پھوپھی اور بھتیجے کے رشتے کا وجود نہیں تھا، انیسؔ نے ان رشتوں کو مستحکم بنایا۔

آپ کبھی گھر کے بزرگوں سے پوچھیے گا کہ بچپن سے لے کر جوانی تک ،شادی کی رسموں میں پھوپھی کے حق کیا کیا ہوتے ہیں؟ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو پھوپھی نیگ لیتی ہے، کاجل لگتا ہے تو نیگ لیتی ہے، بچہ نہاتا ہے تو نیگ، یہ سب پھوپھی کے حقوق ہیں، میر انیسؔ کے عہد میں یہ رسمیں رائج تھیں، پوری ذمہ داری سے کہہ رہا ہوں، پھر جب اٹھارواں برس ہوتا ہے تو پھر پھوپھی نیگ لیتی ہے اور جب بھتیجا دولھا بنتا ہے تو پھوپھی پھر نیگ لیتی ہے، پھر وہ منزل آتی ہے تو نظر بد نہ لگنے کے لئے پھوپھی سب سے پہلے بڑھ کر بلائیں لیتی ہے، بڑھ کر آنچل کا سایہ کرتی ہے، یعنی میرے بچے کو کوئی بلا نہ لگے، یہ جو آج تک پھوپھی کا آنچل بھتیجے کے سر پر ہے یہ انیسؔ کی دین ہے، اور علی اکبر و زینبؑ کا

رشتہ ہے، مخمور صاحب نے مزید یہ کہا ہے کہ ہندوستان کے معاشرے میں انیسؔ سے قبل بھیا کا لفظ مقبول نہیں تھا، انیسؔ کے مرثیوں سے لوگوں نے بھائی کو بھیا کہنا شروع کیا، تو ان تمام رشتوں کو بھی انیسؔ نے ہی تقویت بخشی ہے، ان کی نزاکتوں کو انیسؔ نے سمجھایا ہے، آج اگر ہم رچ کر میر انیسؔ کو پڑھیں تو یقین کیجئے کبھی بزرگوں کے ادب میں چھوٹوں کی طرف سے کمی نہ ہو۔

قراۃ العین حیدر نے آگ کا دریا ایک ہزار صفحے کے ناول کو انتساب دیا ہے انیسؔ کے شعر پر کہ

انیسؔ دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں، سامنے ہوا کے چلے

لکھتی ہیں کہ ''اگر آپ اپنی زندگی کو درست رکھنا چاہتے ہیں تو میر انیسؔ کے کلام کا مطالعہ کیجئے۔''

رام بابو سکسینہ ہندو تھے، لکھتے ہیں کہ

''میں صبح اٹھ کر جب دفتر جاتا تو پہلے انیسؔ کا مرثیہ پڑھ کر نکلتا تھا اور پوری زندگی ایک ہی مرثیہ پڑھتا رہا ''جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے'' اور روز مجھے ایک نئی بات معلوم ہوتی رہی اور میرے شعبے کے لئے فائدے مند رہتی تھی''

سرتیج بہادر سپرؔو جو قائد اعظم کے استاد تھے کہتے تھے کہ:

''جس نے میر انیسؔ کی اردو کے طاہر و شفاف چشمے کا پانی نہیں پیا ہے اُس کی تعلیم افسوس ناک طریقے پر ناقص ہوگی'' سر سپرؔو نے اپنے بیٹے اور بیٹی کو حافظ انیسؔ بنایا تھا، بہو لانے کے لئے یہ شرط لگائی تھی کہ بیٹے کی شادی اس لڑکی سے کروں گا جسے میر انیسؔ کے مرثیے یاد ہوں۔''

کیسے کیسے عاشق انیسؔ گزرے ہیں، پھر آپ تو مجلسی ہیں، آپ نے اپنے بچوں کو کتنا انیسؔ یاد کرایا ہے؟ اگر نہیں یاد کرایا تو یاد کرائیں، پڑھائیں۔ جب ہم نے انیسؔ کو پڑھا تب پتہ چلا کہ اس میں کتنے راز پنہاں ہیں، حافظ کے دیوان سے فال دیکھتے ہیں، میں

نے وہی دعا پڑھ کر انیسؔ کے مرثیے کھولنا شروع کئے اور سوال کرتا گیا تو حافظؔ کے یہاں تو ویسا جواب نہیں آتا انیسؔ کے یہاں بالکل صحیح جواب آتا ہے۔ ایک صاحب آئے اور کہا کہ ہم آرمی میں پائلٹ ہیں اور آرمی چھوڑنا جرم ہے، لیکن ہم PIA میں آنا چاہتے ہیں، ہم نے درخواست دی ہوئی ہے، کیا ہماری درخواست قبول ہو جائے گی، تو ہم نے انیسؔ کے یہاں فال دیکھی تو صاف صاف جواب نکلا کہ ''فوج کے رسالے سے نام ترا کٹ جائے گا'' اور تیسرے دن ان کا لیٹر آگیا کہ آپ کو فوج سے ہٹا دیا گیا اب وہ PIA کے پائلٹ ہیں۔ بس یوں سمجھئے کہ کم از کم 200 فالیں دیکھ چکا ہوں جو میرے پاس نوٹ ہیں، حبیب پبلک اسکول کے ڈائریکٹر مرحوم حسن اختر صاحب نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا یہ فال دیکھئے کہ میر انیسؔ کا اردو ادب میں کیا مقام و مرتبہ ہے، کلام انیسؔ گواہی دے تو لطف آجائے، میں نے فال دیکھی تو میر انیسؔ نے اپنے بارے میں خود یہ رائے پیش کی:-

دل نے کہا کیوں امرِ فضولی میں یہ کد ہے
دی عقلِ رسا نے یہ گواہی کہ سند ہے

(سید اصغر حسین مرحوم) میر عارفؔ کے پوتے نے بتایا تھا کہ ''آپ سر پر قرآن رکھ کر انیسؔ کی ایک رباعی جو اسم اعظم ہے خاندان والے ایک دوسرے کو بتا دیتے ہیں وہ رباعی پڑھیں اور انیسؔ کا کلام پڑھنا شروع کریں، جب آپ پڑھتے رہیں گے تو ایک بار قرآن سر پر گھومنا شروع کر دے گا جس کی وجہ یہ ہے کہ مفتی میر محمد عباس جو بہت بڑے عالم تھے میر انیسؔ کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے، سب داد دے رہے تھے مرثیہ ختم ہوا تو مفتی صاحب سے پوچھا گیا کہ کیا مرثیہ آپ کو پسند نہیں آیا تو مفتی صاحب نے کہا کہ اگر قرآن اردو میں اترتا تو میر انیسؔ کی زبان میں اترتا۔ تو بڑے بڑے لوگوں نے میر انیسؔ کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے ہم کیا کریں گے۔ ہم تو صرف یہی کر سکتے تھے مل

بیٹھ کر ذکر کر سکتے تھے۔

اصل میں اس پورے پاکستان میں ایک بھی ادیب ایسا نہیں ہے کہ جو میر انیسؔ پر مضمون لکھ سکے، ہم نے جس وقت پہلا جلسہ 1970ء میں رضویہ میں کیا تھا اس وقت کا ایک واقعہ یاد آرہا ہے جلسہ شروع ہونے کا ہم نے 9 بجے کا وقت رکھا تھا ہاشم رضا صاحب، حاتم علوی، زیڈ اے بخاری اور ممتاز حسن صاحب وغیرہ سے صرف خطوط کے ذریعے بات چیت ہوئی تھی، انہوں نے وعدہ کرلیا تھا، جلسے والے روز ہم خود 9 بجے کے بجائے 10 بجے رضویہ پہنچے تو دیکھا کہ جناب ہاشم رضا صاحب اور زیڈ اے بخاری صاحب ٹہل ٹہل کر میر انیسؔ کے اشعار پڑھ رہے تھے، یہ محبتِ انیسؔ تھی پرانے لوگوں کی، اس زمانے میں ہم نے ایک وقت میں اسٹیج پر 50 ادیب بٹھائے تھے، لیکن ان کے بعد نئے لوگ ایسے نہیں آئے جن کو شاعری پر اتنا عبور ہو کہ وہ کسی شاعر پر مقالہ لکھ سکیں۔

علامہ صاحب نے فرمایا کہ 'حیدر رضوی بہت اچھا جوان ہے جسے بے انتہا اشعار یاد ہیں میرؔ و غالبؔ کے، میں نے کہا کہ تم تو بہت اچھے اور پڑھے لکھے آدمی ہو، انگریزی بھی بہت اچھی ہے اور آپ نے دیکھا کہ وہ کتنی اچھی تقریر کر کے گیا ہے، یہی ہے کہ ان ہی میں سے کوئی نہ کوئی دانشور اور ادیب بنیں گے جو اس کارواں کو لے کر آگے بڑھیں گے، یہ جلسے اسی لئے ہوتے ہیں کہ اچھے خطیب بنتے رہیں، اچھے ادیب بنتے رہیں، اچھے دانشور بنتے رہیں۔ ہم امید کریں گے کہ آپ اسی طرح شرکت کرتے رہیں گے۔'

علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب کی تقریر کے بعد پروفیسر سبط حسن زیدی صاحب کو اظہارِ تشکر کے لئے دعوت دی گئی، جنہوں نے مختصر مگر پر اثر انداز میں سامعین، شعراً، دانشور اور خصوصاً علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا!

پروفیسر سبطِ حسن زیدی

''آلِ عبا ٹرسٹ کی تاریخ میں آج کا یہ جشن بسلسلہ یادگارِ انیسؔ یقیناً بڑی طمانیت کا

باعث ثابت ہوااور اس موقع پر میں آلِ عبا ٹرسٹ کے ٹرسٹی کی حیثیت سے عرض کروں گا کہ اس جشن کے انعقاد میں ڈاکٹر ضمیر اختر صاحب کی بڑی کاوشیں ہمارے ساتھ رہیں اور اس سلسلے میں آلِ عبا ٹرسٹ کے تمام ٹرسٹیز آپ کے شکر گذار ہیں اس پروگرام میں جن حضرات نے شرکت کی میں ان تمام حضرات کا آلِ عبا ٹرسٹ کی جانب سے شکریہ ادا کرتا ہوں، جناب ڈاکٹر ضمیر اختر صاحب، مولانا ناصر عباس صاحب، پروفیسر حسن اکبر کمال صاحب، کوثر نقوی صاحب، ڈاکٹر میر محمد علی صاحب، جناب دارا صاحب اور جناب ظفر مہدی صاحب ساتھ میں ماجد رضا عابدی صاحب وغیرہم کا شکر گزار ہوں۔اس کے ساتھ مولانا ناصر عباس صاحب قبلہ سے دعائیہ کلمات کے لئے گذارش کی گئی۔

حجت الاسلام جناب ناصر عباس صاحب

حجت الاسلام جناب ناصر عباس صاحب نے فرمایا کہ ''مجھے دعائیہ کلمات کے لئے یہاں دعوت دی گئی ہے لیکن ابھی تک میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی کہ میں دعا کہاں سے شروع کروں، دعائیہ کلمات کے معنی ہیں کہ کم سے کم تین کلمے ضرور ادا کئے جائیں۔ یہ آج کا کامیاب ترین جلسہ یقیناً ابتدائیہ ہے اور مجھے اس وقت ڈپٹی نذیر احمد کی وہ بات یاد آرہی ہے کہ جس میں انہوں نے میر انیسؔ کے متعلق ایک بہت عظیم فکر کا اظہار کیا اور یہ کہا کہ میر انیسؔ کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے خیالات معصوم کو اس انداز سے پیش کیا کہ عصمت پر حرف نہیں آنے دیا۔

انہوں نے کہا کہ دعا مانگنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں یہ توفیق الٰہی پر منحصر ہے۔ میں بارگاہِ الٰہی میں یہ دعا کرنا چاہتا ہوں کہ پروردگار عالم ان ذواتِ مقدسہ کے صدقے میں جن کے افکار و اذکار وان کے حیات طیبہ کو، فضائل و مصائب کو بیان کر کے میر انیسؔ اس منزل پر پہنچے کہ انہوں نے فخریہ یہ کہا کہ

عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

پروردگارِ عالم ہمارے دانشوروں، خطبا، شعرا کو ہر اس شخص کو جو محبتِ آلِ محمدؐ رکھتا ہے، ہماری نسلوں کو یہ ہمت عطا فرما، کہ ہماری نسلیں بھی یہی کہہ سکیں کہ

پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

پروردگارِ عالم تمام ذواتِ مقدسہ کے صدقے میں تمام مقاماتِ مقدسہ تمام عالم اسلام، محبانِ محمدؐ آل محمدؐ کے جان و مال کی حفاظت فرما، شفا و صحت کاملہ عطا فرما، جن افراد نے میر انیسؔ کی اس یادگار کو قائم و دائم رکھنے کے لئے کوششیں کیں خداوندِ عالم ان کی توفیقات میں اضافہ فرما۔ الٰہی روز قیامت محمدؐ و آلِ محمدؐ کی شفاعت سے بہرہ مند فرما۔ الٰہی وارثِ محمدؐ آل محمدؐ کے ظہور میں تعجیل فرما۔ آمین۔

میر انیس

کو

منظوم خراجِ عقیدت

میر انیسؔ، خود اپنی نظر میں

سبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر مگر ہم نے پلّہ گراں کر دیا

....

مری قدر کر اے زمینِ سخن تجھے بات میں آسماں کر دیا

....

نظم ہے یا گوہر شہوار کی لڑیاں انیسؔ جوہری بھی اس طرح موتی پرو سکتا نہیں

....

کسی نے تری طرح سے اے انیسؔ عروسِ سخن کو سنوارا نہیں

....

صد شکر کہ تو ناظمِ اقلیمِ سخن ہے ہاں موتیوں سے بھرنے کے قابل یہ دہن ہے

....

کس طرح قدر تجھے اپنے سخن کی ہو انیسؔ مرتبہ مُشک کا آہوئے ختن کیا جانے

....

لازم ہے کہ ہو اہلِ سخن تیز زباں تلوار ضروری ہے سپاہی کے لئے

....

گل ہائے مضامیں کو کہاں بند کروں خوشبو نہیں چھپنے کی جہاں بند کروں

....

میں باعثِ نغمہ سنجیٔ بُلبُل ہوں کھولے نہ کبھی منہ جو زباں بند کروں

....

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

تبرّکاتِ انیسؔ

سدا ہے فکرِ ترقّی بلند بینوں کو
ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو

پڑھیں درود نہ کیوں دیکھ کر حسینوں کو
خیالِ صنعتِ صانع ہے پاک بینوں کو

لحد میں سوئے ہیں چھوڑا ہے شہ نشینوں کو
قضا کہاں سے کہاں لے گئی مکینوں کو

یہ جھرّیاں نہیں ہاتھوں پہ ضعفِ پیری نے
چُنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

یہ غل تھا مُہرِ نبوت پہ جب چڑھے حسنینؑ
جڑا ہے ایک انگوٹھی پہ دو نگینوں کو

بھَلا تردّدِ بے جا سے اس میں کیا حاصل
چڑھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو

مزا یہ طُرفہ ہے مضمون دست یاب نہیں
مقابلہ پہ چڑھائے ہیں آستینوں کو

غلط یہ لفظ، وہ بندش بُری، یہ مضموں سُست
ہنر عجیب ملا ہے یہ نکتہ چینوں کو

دہانِ کیسۂ زر بند کر پر اے منعم
خدا کے واسطے وا کر جبیں کی چینوں کو

خیالِ خاطرِ احباب چاہیئے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

....

میر انیسؔ کی وفات پر میر نفیسؔ

کا ایک فارسی مرثیہ

حزیںؔ کے قطعہ پر میر نفیسؔ نے تخمیس کی اور اپنے والد میر انیسؔ کا مرثیہ لکھا

از باغِ جہاں بلبلِ بستانِ سخن رفت در زیرِ لحد نیّرِ تابانِ سخن رفت
ہیہات کہ سر دفترِ ایوانِ سخن رفت افسوس کہ شایستۂ ایوانِ سخن رفت
ویرانیٔ نظم است کہ سلطانِ سخن رفت

فریاد بر آمد ز لبِ ہر گلِ گلشن! بُلبل زغمش کرد بپا نالہ و شیون!
بوداست از و راہِ سخن وادیٔ اِیمن شد تیرگیٔ روز سخن برہمہ روشن
کاں شمعِ فروزاں زشبستانِ سخن رفت

سر دفترِ اہل ہنر و اہلِ زباں بود روشن قمرِ برجِ معانی و بیاں بود
در نظمِ سخن افصح استاد زماں بود سرمایہ دہِ نکتہ فروشانِ جہاں بود
اورفت زعالم سر و سامانِ سخن رفت

رفت آنکہ سرافرازیٔ مجلس زدمش بود تازہ گلِ مضموں زنسیم رقمش بود
سیرابیٔ بزمِ سخن از جامِ جمش بود شادابیٔ معنے زسحابِ قلمش بود
از رفتنِ او فیضِ گلستانِ سخن رفت

در مجلس او بود زبس جوشِ ملائک برخاست و گردید ہم آغوشِ ملائک
بود است بر آواز خوشش گوشِ ملائک می بُرد سخن سازیٔ اوہوشِ ملائک
ہر کس سخنش خواند بقربانِ سخن رفت

پنہاں شدہ خورشید سپہرِ ہمہ دانی　　جاں داد شہِ کشورِ اعجاز بیانی
تاریک شدہ انجمنِ مرثیہ خوانی　　ماتم کدہ شد خطۂ الفاظ و معانی
سلطانِ سخن شانِ سخن جانِ سخن رفت

ہر چند بظاہر بدنش زیرِ زمین است　　روحش بفلک ہم نفسِ روحِ امین است
یاد آورِ او مرثیۂ سرورِ دیں است　　خاموش نفیسؔ از المش طبع حزین است
کان شہرِ سخن بحرِ سخن کانِ سخن رفت

....

میر عشقؔ:

وفاتِ انیسؔ

میر عشقؔ کا تصنیف کردہ قطعۂ تاریخ ''وفاتِ انیسؔ'' غیر مطبوعہ تھا۔ ذخیرۂ مراثیٔ خاندانِ انیسؔ میں ہمارے پاس محفوظ تھا۔ پہلی مرتبہ منظرِ عام پر آیا ہے۔ میر عشقؔ نے اپنے قلم سے لکھ کر میر نفیسؔ کو پیش کیا تھا۔ (ضمیر اختر نقوی)

ممکن نشد ز جورِ سپہرِ بریں مزار ۱ دردا نیافت مالکِ رُوئے زمیں مزار

افسوس کاظمین کجا کربلا کجا ۲ دُور است آں مزارِ مقدس ازیں مزار

شاہی بارضِ طوس شہی دفن در نجف ۳ آنجا چُنین مزار و دریجا چُنیں مزار

پر ظاہر است قصۂ خاصانِ ذوالجلال ۴ پوشیدہ اند از ستمِ اہلِ کیں مزار

دنیا مقام حسرت و اندوہ و عبرت است ۵ یکجا نیافتند امامانِ دیں مزار

صد حیف میر ببرؔ علی کامل و خلیق ۶ بگرفت از مکان سکونت قریں مزار

روز خمیس مُرد شب جمعہ دفن شُد ۷ شُد پُرضیا چُو مغربِ مہرِ مبیں مزار

پیچیدہ است چادرِ مدفن زبادِ غم ۸ دارد بروئے خویش نگر آستیں مزار

شوریست دل منجر غم کشتہ میشود ۹ از مدح خوانِ شاہِ شہید است ایں مزار

مدّاحِ شاہ بود سلیمان ملک نظم ۱۰ چوں خاتم است صحنِ گلستاں نگیں مزار

ای آنکہ در حیاتِ جنابش ندیدئی ۱۱ سر را قدم بساز و بیا و ببیں مزار
از دانہ ہائے اشکِ تلامیذ و دوستان ۱۲ کشت آبروئے معدنِ درِّ ثمیں مزار
وز گیسوان فاتحہ خوانان فتاد عکس ۱۳ در برکشید جامۂ ماتم نشیں مزار
عطرِ گل و وفورِ ضیا و ہجومِ حور ۱۴ ہست از بہار قطعۂ خلدِ بریں مزار
تاثیرِ ذکرِ ذاکرِ مرحوم دید نیست ۱۵ دل را کند بحالِ خموشی حزیں مزار
رمزیست کو ز روشنی شمع روشن است ۱۶ دستِ دعا نمود پئے مومنیں مزار
تنہا چگو نہ میگزرد ہیچ علم نیست ۱۷ وحشت سرا است بہرِ مکیں بالیقیں مزار

۱۸
گفتیم عشق برسرِ مدفن کہ اے انیس
بادِ انیسِ عشقِ حسینؑ اندر ایں مزار

۱۲۹۱ھ

ترجمہ:-

(۱)۔ ممکن نہیں ہوا اس عالمِ جور سے کہ آلِ محمدؐ کے ہر فرد کا مزار بنتا۔ افسوس صد افسوس کہ روئے زمین کے مالک نے مزار نہ پایا۔

(۲)۔ افسوس کاظمین کہاں ہے اور کربلا کہاں ہے دونوں مزاروں میں کس قدر زیادہ فاصلہ ہے۔

(۳)۔ حضرت امام رضا علیہ السلام کی ارضِ طوس میں بادشاہی تھی اُن کا مزار وہاں بنا۔ حضرت علی مرتضیٰؑ نجف میں دفن ہوئے۔ افسوس کہ خاندانِ رسالت کے ایک جگہ پر مزار نہ بن سکے۔

(۴)۔ اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کا ذکر موجود ہے۔ لیکن ان دشمنوں کی وجہ سے مزاروں کو پوشیدہ رکھا گیا ہے۔

(۵)۔ یہ دنیا بہت اندوہ و عبرت کا مقام ہے افسوس ہے۔ اور یہ کتنے بڑے صدمے کی بات ہے کہ آئمہ کے ایک جگہ مزار نہ بن سکے۔

(۶)۔ تعجب ہے کہ میر ببر علی کامل اور خلیق نے اپنے مکان کے قریب ہی مدفن کی جگہ حاصل کر لی۔

(۷)۔ انتقال تو جمعرات کو ہوا لیکن شبِ جمعہ کو دفن ہوئے اور مغرب کے بعد روشنی میں مزار

بن گیا۔

(۸)۔ مدفن (قبر) پر چادر غم کی ڈال دی گئی اور لوگوں نے فاتحہ پڑھا۔

(۹)۔ میر انیسؔ کی میت پر اژدھام ہے۔غم کی زیادتی سے دل بیٹھا جارہا ہے۔اور یہ قبر امام حسینؑ کی مدح کرنے والے کی ہے۔

(۱۰)۔ یہ مرنے والا، شاہ کا مداح تھا۔اور یہ قبر سلیمان کے نگینے کی طرح صحن گلستان میں چمک رہی ہے۔

(۱۱)۔ اے لوگو جنھوں نے ان کو دیکھا نہیں تھا اب عظمت کے ساتھ سر کے بل اس مزار پر آؤ

(۱۲)۔ اس قبر کے اوپر شاگردوں اور استادوں کا سب کا ہجوم ہے اور سب گریہ کررہے ہیں اور یہ مزار بہت قیمتی کھیتی یعنی بہشت کا مالک ہے۔

(۱۳)۔ قبر پر فاتحہ پڑھنے والوں کے گیسوؤں کا عکس پڑرہا ہے لیکن مرنے والے نے اپنی ہستی کو مزار کے اندر چھپالیا ہے۔

(۱۴)۔ مزار پر گل پاشی کی جارہی ہے۔روشنی ہورہی ہے حوروں کا ہجوم ہے اور یہ قبر جنت کے ٹکڑے کی طرح پُر رونق ہے۔

(۱۵)۔ مرحوم کا ذکر کس شان سے کیا جارہا ہے یہ قابلِ دید منظر ہے۔لیکن غم کی وجہ سے دلوں کو خاموش کررہا ہے۔قبر پر شمع روشن ہے اُس سے کسی رمز کا پتہ چل رہا ہے۔لہٰذا اب مومنین فاتحہ کے لیے دعا کو ہاتھ اُٹھائیں۔

(۱۷)۔ اے عشقؔ تنہا اس مزار سے کیسے گزرے گا۔اس بات کا ذرا بھی علم نہیں ہے۔کیونکہ مزار دیکھ کر وحشت طاری ہے۔دل میں غم بھرا ہوا ہے۔

(۱۸)۔عشقؔ نے کہا قبر پر کہ اے انیسؔ اس قبر کے اندر عشقِ حسینؑ والا موجود ہے جو دفن ہو چکا ہے۔

شمس العلماء مولوی الطاف حسین حالیؔ

رباعیاں میر انیسؔ کی شان میں

اُردو! گو رَاج چار سُو تیرا ہے
شہروں میں رواج کُو بکو تیرا ہے
پر جب تک انیسؔ کا سحر ہے باقی
تو لکھنؤ کی ہے لکھنؤ تیرا ہے

○

دِلّی کی زبان کا سہارا تھا انیسؔ
اور لکھنؤ کی آنکھ کا تارا تھا انیسؔ
دِلّی جڑ تھی تو لکھنؤ اس کی بہار
دونوں کو ہے دعویٰ کہ ہمارا تھا انیسؔ

....

علّامہ آرزو لکھنوی:

رئیسِ کشورِ نظم

مشعل اس راہ میں جو ہے وہ سخن ان کا ہے
جس میں تازہ ہیں بہاریں وہ چمن ان کا ہے
لعل شب تاب ہیں جس میں وہ یمن ان کا ہے
جس میں سب ہیں دُرِ مقصد وہ عدن ان کا ہے
صبح امید کا گویا یہ سخن مطلع ہے
جادۂ منزل مقصود ہر اک مصرع ہے

حبذا فکر زہے طبع خوشا نظم سلیس
یہ فصاحت یہ بلاغت یہ مضامین نفیس
کشور نظم میں گذرا ہے یہ بے مثل رئیس
ہاں خدا چاہے تو پیدا ہو کوئی اور انیس
مرحلہ پائے خرد سے یہ کبھی طے نہ ہوا
ناظم ایسا تو نہ ہوگا نہ کوئی ہے نہ ہوا

(طویل نظم سے انتخاب)

مولانا صفؔی لکھنوی:

رباعی

ازل سے گونج رہی ہے یہی صدائے سخن
انیسؔ بندۂ یکتائے رب ، خدائے سخن

جھکا سکا نہ کوئی آج تک کمانِ انیسؔ
عرق عرق ہوئے سب زور آزمائے سخن

ثاقبؔ لکھنوی:

انیسؔ نکتہ داں

یہ جو ہے اردو زباں رائجِ ہندوستاں
ہے رہینِ منت نطق انیسؔ نکتہ داں

چال میں اس کی ہے سب اس ماہر فن کا چلن
یہ زلیخا ہے عزیز یوسف مصرِ سخن

جتنے وہ زیور ہیں جن پر دل ہیں سب آئے ہوئے
اس زباں میں ہیں اُسی ماہر کے پہنائے ہوئے

پھول چھوڑے ہیں بہت دامن میں بھرنے کے لیے
راستہ ہے صاف رہرو کے گزرنے کے لیے

دم بخود تاریک میدانوں میں ہم کو چھوڑ کر
خضر آگے بڑھ گیا نقش قدم کو چھوڑ کر

(طویل نظم سے انتخاب)

پروفیسر حامد حسن قادری:

''مرثیۂ انیس''

اردو میں جو تاثیر ہے جادو ہے اسی سے
ہر طرز دل آویز پہ قابو ہے اسی سے
اس باغ میں جو رنگ ہے، جو بُو ہے اسی سے
آرائشِ کاشانۂ اردو ہے اسی سے
گوہر یہی، یاقوت یہی، لال یہی ہے
تاج سرِ اردوئے خوش اقبال یہی ہے

''ٹیپ کا پہلا مصرع میر انیس کا ہے اور یہ پورا بند انہی کا ''فیض سخن'' (حامد حسن قادری)

نسیم امروہوی:

خسروِ مملکتِ نظم

میرا استاد دمِ فکر سخن طرزِ انیس
وہ انیس ایک جو تھا خالقِ ہر رنگ نفیس
برگِ گل میں ہوں ، وہ اک نخل برو مندِ سخن
خسروِ مملکتِ نظم ، خداوندِ سخن

راہ ڈھونڈی جو نئی میں نے کوئی حسبِ محل
ہر قدم اس کے مراثی نے دکھائی مشعل
عقدۂ فکر و نظر ، مسئلۂ عزم و عمل
بادۂ مرثیہ گوئی میں کیا میں نے حل
شعر دوچار نہ دس بیس کہے ہیں میں نے
مرثیے ایک سو تئیس کہے ہیں میں نے

ضیاءالحسن موسوی

تاریخِ وفات میر انیسؔ

(از مصرعۂ میر انیسؔ)

اپنے بارے میں حسنؔ فرما گئے ہیں جو انیسؔ — اُس سے بہتر سالِ رحلت اور ہو سکتا نہیں

اِک صدی کے بعد بھی تاریخ دیتی ہے صدا — ''جوہری بھی اس طرح موتی پرو سکتا نہیں''

(۱۸۷۴ء)

نجمؔ آفندی

انیسؔ

جو اہلِ دل ہیں سمجھتے ہیں وہ مقامِ انیسؔ
یہ فنِ مرثیہ گوئی میں اہتمامِ انیسؔ
حسینیتؑ کی جو خدمت انیسؔ نے کی ہے
رہے گا تابہ قیامت بلند نامِ انیسؔ

....

انیسؔ غم کدۂ کربلا کے درد شعار
تیرا کلام ہے یا مرثیت کے لیل و نہار
یہ راز تُونے بتایا ہے اہلِ عالم کو
نہ ہو یہ درد جو دل میں تو زندگی بے کار
شعورِ فکر نے غیروں پہ بھی کیا یہ اثر
کہ گوشے گوشے میں انسان ہوگئے بیدار
سُنی سُنائی نہیں بات آنکھوں دیکھی ہے
کہ ہندوؤں کو بھی دیکھا گیا ہے سینہ فگار
خصوصیات بہت کچھ ترے کلام کی ہیں
ترے کلام سے پیدا ہوئے وہ نقش و نگار
ترے کلام سے اُردو زباں کا وزن بڑھا
محاورات کا اِک جا لگادیا اَنبار

جوشؔ ملیح آبادی

انیسِ اعظم

اے دیارِ لفظ و معنی کے رئیس ابن رئیس　　اے امینِ کربلا باطل فگار و حق نویس
ناظمِ کرسی نشین و شاعرِ یزداں جلیس　　عظمتِ آلِ محمدؐ کے مورخ اے انیسؔ
تیری ہر موجِ نفس روح الامیں کی جان ہے
تو مری اُردو زباں کا بولتا قرآن ہے

تجھ میں اندازِ جنوں بھی طرزِ دانائی بھی ہے　　لکھنؤ کا ناز بھی دلّی کی برنائی بھی ہے
آتشِ موسیٰ بھی ہے آبِ مسیحائی بھی ہے　　قیس کی بھی کروٹیں لیلیٰ کی انگڑائی بھی ہے
تجھ میں ذوقِ گریہ بھی شوقِ غزل خوانی بھی ہے
آگ بھی ہے تیرے احساسات میں پانی بھی ہے

اے دبیرِ ملک معنی اے انیسِ محترم　　اے شہنشاہِ سخن اے خُسروِ سیف و قلم
دوش پر تیرے حسینؑ ابن علیؑ کا ہے عَلم　　اے شہہ گیتی وقار و شاعرِ گردوں حشم
رزم کے میداں میں تُو چلتی ہوئی تلوار ہے
بزم کی محرابِ زر میں کلکِ گوہر بار ہے

تیرے شہرِ جاں میں ہے آب و ہوائے کربلا　　چرخ زن تیری صدا میں ہے بکائے کربلا
ثبت ہے تیری جبیں پر ماجرائے کربلا　　نصب ہیں تیری زمیں پر خیمہ ہائے کربلا
خطبۂ زینبؑ کا زیر و بم ہے تیرے ساز میں
شہپرِ جبریل جُنباں ہے تری آواز میں

اعتبارِ نغمۂ تسنیم و کوثر تجھ سے ہے　　طمطراقِ نعرۂ اللہ اکبر تجھ سے ہے
آبروئے مجلس و محراب و منبر تجھ سے ہے　　زندہ ذکرِ پاکِ اولادِ پیمبرؐ تجھ سے ہے

اے امامِ کشورِ جادو بیانی السّلام
اے کلیمِ طُورِ الفاظ و معانی السّلام

اَلاماں تیری عروسِ فکر کے نقش و نگار　　گُل چکاں و گُل فشاں و رنگ بیز و لالہ بار
تیری موجِ طبع پر قربان ابرِ نو بہار　　تیرے لہجے میں جھلکتے ہیں رسولوں کے ستار

ولولوں کا تیرے چہرے پر وہ آب و رنگ ہے
تیری پیری سے زلیخا کی جوانی تنگ ہے

سیّد ہاشم رضا (کراچی)

خطاب بہ رُوحِ انیسؔ

عروجِ مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا
انیسؔ جب تجھے دیکھا بلند تر دیکھا

انیسؔ تیرا دبستاں کھُلا ہے چار طرف
ریاضِ مدحتِ شبیرؑ کا ثمر دیکھا

انیسؔ زندگیٔ جاوداں مبارک ہو
شہیدِ حق کی عنایات کا اثر دیکھا

یہ معجزہ ہے تری مرثیہ نگاری کا
جو کربلا میں ہوا وہ بچشمِ تر دیکھا

سَند ہیں شعر ترے مستند زبان تری
ترے ہنر کا ہے پرتو جدھر جدھر دیکھا

وہ طرزِ خاص ترا سادگی میں پُرکاری
کہ جس کا خواب ادیبوں نے عمر بھر دیکھا

ہر ایک بحر میں تو نے گہر فشانی کی!
ہر ایک بیت میں ہیروں کو منتشر دیکھا

خزاں بھی ہے چمنِ نظم میں بہار کے ساتھ
تری روش کو مسلسل بہار پر دیکھا

جہاں میں سطوتِ شاہی کو مختصر دیکھا
سخن میں تیری خدائی کو معتبر دیکھا

خزانہ تو نے لٹایا ہے فکر و معنی کا
جسے بھی فکر ہوئی اس نے تیرا در دیکھا

دکھائی تو نے فضا گلشنِ محمدؐ کی
کہ دیدہ ور نے سدا جس کو تازہ تر دیکھا

حدودِ شعر ملائے درِ عبادت سے
خدا پرستوں کو مجلس میں جلوہ گر دیکھا

محل سراؤں میں دیکھا نہ خانقاہوں میں
وہ سیلِ نور جو تیرے مزار پر دیکھا

....

احمد ندیم قاسمی

نذرِ انیسؔ

میر انیسؔ کے ایک مشہور سلام کی زمین میں

جہانِ شعر کا ایک ایک نامور دیکھا
انیسؔ! تجھ سا نہ کوئی بھی باہنر دیکھا

کئی اساتذہ گزرے ہیں عہدِ ماضی میں
کوئی نہ ایسا مگر صاحبِ نظر دیکھا

لکھے گئے ہیں ترے بعد مرثیے لاکھوں
ترے ہی فن کو مگر سب میں جلوہ گر دیکھا

ہیں متفق سبھی اہلِ ہنر، کہ تیرا مثیل
نہ تیرے بعد ہی دیکھا، نہ پیشتر دیکھا

جو تیری راہ میں حائل ہوئے غبار ہوئے
کہ اہلِ شعر نے یہ تجربہ بھی کر دیکھا

ابھی ابھی ترے اشعار کیا سُنے میں نے
کہ ایک معرکہ مابینِ خیر و شر دیکھا

ترے کلام کے بینَ السّطور، رَخشندہ
زمانے بھر نے رُخِ سیّد البشر دیکھا

لہُو ٹپکنے لگا کربلا کے ذرّوں سے
کسی بھی عہد نے کب ایسا نوحہ گر دیکھا

چلی جو بحث کبھی مرثیہ نگاری کی
انیسؔ! تو ہی دکھائی دیا، جدھر دیکھا

مولانا نسیم امروہوی (کراچی)

میر انیس

پیامِ اُنس ہے انساں کو داستانِ انیس رجوعِ قلب سے فطرت ہے مدح خوانِ انیس!
ضمیرِ صدق کی آواز ہے زبانِ انیس شہادتوں کی کتابِ مبیں بیانِ انیس!
سخن سے اس کے جو زندہ یہ ذکر ہر دم ہے
وہ مرثیے کی شریعت کا ابنِ مریم ہے
زباں کا اخترِ تقدیر ہے کلامِ انیس بیاں کا جوہرِ شمشیر ہے کلامِ انیس
حدیثِ قدس کی تعبیر ہے کلامِ انیس کلامِ غیب کی تفسیر ہے کلامِ انیس
ملی ہے نظم پہ قدرت، عطائے قدرت سے!
ہوا یہ شاعرِ فطرت شعورِ فطرت سے!
انیس نظم ہے جس کی نظامِ عزم و عمل انیس جس کی سلاست ہے جامِ عزم و عمل
انیس غیر شعوری پیامِ عزم و عمل بنامِ لطفِ فصاحت، قوامِ عزم و عمل
انیس جس سے کسی کا کلام بیس نہیں!!
انیس بعد میں جس کے کوئی انیس نہیں!!

انیسؔ چہرہ نویسِ نگارِ شعر و سخن　　کمالِ فکر کا اک معجزہ انیسؔ کا فن
دماغِ شعر ہے طبعِ انیسؔ سے روشن　　کہ صدق وحق ہے تخیّل میں اس کے جلوہ فگن
شفق ہے رنگِ سخن رفعتِ نظر مطلع !!
جوابِ مطلعِ خورشید اس کا ہر مطلع !!

انیسؔ محرمِ اسرارِ سیرت و کردار　　انیسؔ زورِ بیان و جلالتِ افکار
انیس فطرتِ آدمؑ کا آئینہ بردار　　انیسؔ منبرِ شعر و سخن پہ عرش وقار
فرازِ فن پہ کسی سے بھی زیر دست نہیں
جہاں نشیبِ سخن ہے وہاں بھی پست نہیں

انیسؔ عُقدہ کشائے تصوّراتِ بشر!　　انیسؔ قافلہ سالارِ کاروانِ ہنر
خیال و ذہن کی پیچیدگی سے جس کا گذر　　نفَس نفَس کی نظر نفسیاتِ انساں پر
سخن میں جذبہ و احساس کو رواج دیا
ہر ایک نفس کو بالکل نیا مزاج دیا

انیسؔ ماہرِ رمزِ حیاتِ انسانی　　کتابِ غم کا مرقّع نگارِ لاثانی
مذاقِ شعر میں خلّاقِ ذوقِ ایمانی　　بیانِ واقعہ میں طرزِ فکر کا بانی
فقط تفننِ شعری سے جس کو کام نہیں
دل و دماغ کا ہے آئینہ کلام نہیں

رموزِ مدح کی روح الامیں انیسؔ کی روح　　خدا بھی جس کا ثناخواں وہ ذی شرف ممدوح
کلام وہ کہ ہے درمانِ خاطرِ مجروح　　کیا بہ تیغِ زباں کشورِ سخن مفتوح
بیانِ رزم میں وہ پختہ کار خامہ ہے
ہر ایک مصرعۂ پُر زور شاہنامہ ہے

وہ فرد اُس کے مراثی کہ شاہکار کمال　　زباں میں نطقِ لبِ جبرئیل کا اجلال
وہ حسنِ شعر، وہ حسنِ بیاں، وہ حسنِ مقال　　علوے سدرہ و طوبیٰ، مکانِ پیکِ خیال
عروجِ فکر و نظر کا ہے خاتمہ اُس پر
فرازِ عرش سے اترا ہے مرثیہ اُس پر

وہ نظم، کہتے ہیں تمثیل جس کو یونانی　　کہاں تھی شعر میں اُردو کے یہ سخن دانی
مگر انیسؔ زہے یہ تری گل افشانی　　مکالمے میں سجایا مرقعِ مانؔی
بیک نظر وہ مناظر دکھادیئے گویا
گرادیئے کبھی پردے، اٹھادیئے گویا

کیا بلند بہت تُونے اے ارسطو کار　　عناصرِ اَلمیَہ سے مرثیے کا وقار
سمٹ کے آگئے اخلاق کے وہ کل اقدار　　کہ جن کا مقصدِ اعلیٰ بلندیٔ کردار
ملا تجھے جو یہ ذبحِ عظیم کا صدقہ
دیا ادب کو امامِ کریم کا صدقہ

کبھی جو ذہن محاکات کی طرف لایا　　ترے بیان میں تخیّل نے غضب ڈھایا
کچھ اس ادا سے وہ ماضی کا حال دکھلایا　　وہاں سماں جو بندھا تھا یہاں نظر آیا
ہوا یہ روح کو احساس ایک دم جیسے
کھڑے ہیں معرکۂ کربلا میں ہم جیسے

خوشی، امید، الم، آرزو، نشاط و ہراس　　گمان وہم، یقیں، فکر، دغدغہ، وسواس
پلک، نگاہ، جبیں، چال، وضع قطع، لباس　　ہر اک ادا کا ہر اک ولولے کا نبض شناس
رموزِ جذبہ و احساس کا مبصّر تھا
ضمیر و نفس و دل و روح کا مصوّر تھا

جلال، غیظ، شجاعت، جمال، زہد، ایثار　　وفا، ثبات، متانت، خلوص، حلم، وقار
جہادِ نفس، تحمّل، سکون، ضبط، قرار　　صفات ایک، قلم ایک، مختلف کردار
بیاں کا طرز مگر وہ نہ ہو کہیں دھوکا
کہیں حسینؑ پہ عباسؑ کا نہیں دھوکا

انیسؔ تجھ کو مبارک کہ یہ سخن سارا　　نبیؐ و آلِ نبیؐ کی ہے آنکھ کا تارا
ترا سخن کہ ہے قرآنِ عشق کا پارا　　جو شکل اس کی مسدّس تو قدرداں بارا
بسا ہے ان سے جو بستہ نیاز مندوں کا
ہیں تیرے بند، وظیفہ خدا کے بندوں کا

ہر ایک بندِ حسیں، چھ گلوں کا گلدستہ چہار مصرعِ اوّل، ہر ایک برجستہ
بہم زِروئے سیاق و سباق وابستہ کہ جیسے ہار میں موتی جُدا و پیوستہ
ان ہی سے بیت کا مضمونِ برمحل نکلا
کہ جیسے پھول کھلا، پھر اسی سے پھل نکلا

ہے تیرے چھوٹے سے مضموں میں بھی یہ بات بڑی ملی ہوئی ہے ہر اک لفظ کی کڑی سے کڑی
پروئی ہے وہ مودّت کے موتیوں کی لڑی بناوہ درِّ نجف جس پہ چھوٹ اس کی پڑی
ہر اک جگہ ہے یہی ارتقاع کی صورت
یہ سلسلہ ہے مسلسل شعاع کی صورت

جو بندشوں میں ہے ترکیبِ ظاہری محکم تو عرضِ حال میں اجزائے داخلی محکم
ہر ایک پہلوئے لفظی و معنوی محکم بیانِ واقعہ میں ربطِ منطقی محکم
وہ اعتدال مزاجِ سخن کو حاصل ہے
جو داستانِ حقیقت کی حدِّ فاصل ہے

یہ رُخ انیسؔ کے مضموں کا خود ہے اپنی مثال کہ ہیں تضادِ عمل سے دوچار فکر و خیال
اُدھر ضمیرِ بشر کا وہ انحطاط و زوال اِدھر شرافتِ انسانیت کی حدِّ کمال
جو کربلا کو معلّی بنانے آئی تھی!
بشر کے جسم سے وہ روح کی لڑائی تھی

ہجومِ خبث کے نرغے میں سر بسر تطہیر وفورِ ظلمتِ باطل میں حق نما تنویر
کمالِ کبر و تکبّر میں نعرۂ تکبیر یہ دو زبانِ قلم، اک یزید، اک شبیرؑ
مقامِ معجزہ ہے شاعری کا ذکر نہیں
کہ اس تضادِ نظر میں تضادِ فکر نہیں

عجیب ڈھنگ سے کی، قوم کی مسیحائی پڑھی وہ رزم کہ مُردہ دلوں میں جان آئی
رجز سنا کے ضعیفوں کو دی توانائی فنا کے ذکر سے احساس نے بقا پائی
وہ صور پھونک دیا کہہ کے یا امامِ حسینؑ
اک انقلاب بپا ہوگیا بنامِ حسینؑ

جا کے رزمِ گہ کربلا کا نقارا جو محوِ خواب تھے منبر سے اُن کو للکارا
دکھائی آنچ جو تیغوں کی اُڑ چلا پارا لہو جما ہوا پگھلا، ابل پڑا دھارا
پڑا جو دُرّۂ غیرت وفور غفلت میں
جماہی ڈھل گئی انگڑائیوں کی صورت میں

جو سو رہے تھے یکایک اُٹھے وہ مستانے جو خود ہی جاگے تھے دوڑے ابھار کر شانے
سمٹ کے آگئے مجلس میں اپنے بیگانے جلی جو شمع، گرے ہر طرف سے پروانے
کسی کو جذبۂ عشقِ امام لے آیا!
کسی کو کھینچ کے زورِ کلام لے آیا!

تمام برہمن و شیخ و کافر و دیندار شرابِ ذوقِ فصاحت سے ہوگئے سرشار
وہ مجلسیں تھیں کہ اک اتحاد کا گلزار فضائے گلشنِ انسانیت تھی باغ و بہار
ہزار رنگ کے تھے پھول متصّل گویا
ملے تھے شانوں سے شانے دلوں سے دل گویا

فضا میں گونج رہے تھے انیسؔ کے اشعار دلوں میں بیٹھ رہی تھی جلالتِ افکار
اکادمی نہ کوئی انجمن تھی برسرِکار مگر ترقیٔ اُردو کا گرم تھا بازار
کسی بھی صنفِ سخن نے نہ جتنے لفظ دیئے
زباں کو مرثیہ گوئی نے اتنے لفظ دیئے

ملا انیسؔ کے در سے بفیضِ مدحتِ آلؑ زباں کو نطق، بیاں کو عروج، فن کو کمال
اسی کی شمعِ تجدّد کا نور ہیں فی الحال نسیمؔ و نجمؔ و رضاؔ، جوشؔ و حالیؔ و اقبالؔ
اس انقلاب سے کیا کیا سبق ادب نے لئے
بقدرِ ظرف و بقدرِ مذاق سب نے لئے

جو مرثیہ ہے حکومت، انیسؔ ہے حاکم جو مرثیہ ہے عزیمت، انیسؔ ہے عازم
جو مرثیہ ہے شریعت، انیسؔ ہے عالم جو مرثیہ ہے نبوّت، انیسؔ ہے خاتم
وہ سن رکھیں جنھیں ردّو بدل کی حسرت ہے
پیمبری تو ہوئی ختم، اب خلافت ہے

وہ جو بھی لفظ کرے جس مقام پر تحریر وہ سنگِ میل، وہ پتھر کی اک امٹ ہے لکیر
کبھی جو منظرِ فطرت کی کھینچ دے تصویر تو متن سے بھی وضاحت میں بیش ہو تفسیر
شفق کا رنگ سیاہی میں جب وہ بھرتا ہے
طلوعِ صبح کچھ ایسے شروع کرتا ہے
نقاب رخ سے جو حورِ سحر اُٹھانے لگی خزاں کی تیغ کے کشتوں میں جان آنے لگی
کرامتِ دمِ عیسیٰ صبا دکھانے لگی گلوں کا رنگ جما، صبح رنگ لانے لگی
ہوا سنکنے لگی، ڈالیاں لچکنے لگیں
چمن مہکنے لگا، بلبلیں چہکنے لگیں

....

جمیلؔ مظہری

(۱)

گرچہ دعوت دے رہا ہے بحرِ ذخارِ انیسؔ
اپنی غوّاصی کا بیڑا میں ڈبو سکتا نہیں

اِس کی موجیں یم بہ یم اور اس کی وسعت بیکراں
اس سمندر کو قلم میرا بلو سکتا نہیں

گرمیِٔ گفتار کو، حرکات کو، رفتار کو
اے مصوّر تو لکیروں میں سمو سکتا نہیں

یہ تو ہے اک ساحرِ شامِ اودھ کا معجزہ
مانؔی و بہزاؔد سے یہ کام ہوسکتا نہیں

ڈھل گئی اُردو مثالِ چادرِ حورانِ خُلد
کون کہتا ہے زباں کو کوئی دھو سکتا نہیں

معدنِ فن میں ہیں اب لعل و گہر کے اتنے ڈھیر
دامنِ تنقید جن کا بوجھ ڈھو سکتا نہیں

مرثیہ اک آنسوؤں کا کھیت ہے اس کھیت میں
اس طرح موتی کوئی فن کار بو سکتا نہیں

مرحبا عُقدہ کشائے گیسوئے لیلائے فن
شانگی سے کیا تری آئینہ کو سکتا نہیں

"نظم ہے یا گوہر شہوار کی لڑیاں انیسؔ
جوہری بھی اس طرح موتی پرو سکتا نہیں"

(۲)

بجا کہ تو ہے بہرحال بامراد اے دوست
بجا کہ میں بہر انداز کامیاب نہ تھا
مگر سوال یہ ہے جبکہ کُھل گئیں آنکھیں
تو کیا نتیجۂ ذوقِ طلب سراب نہ تھا
یہ اب کھلا کہ چکا چوندھ جس سے تھیں آنکھیں
وہ اک حقیر سا ذرّہ تھا آفتاب نہ تھا
شعور جب ہوا بالغ تو تشنگی نے کہا
کہ جس کو آب سمجھتے تھے ہم وہ آب نہ تھا
میں پوچھتا ہوں کہ یہ اقتدارِ بے بنیاد
اک اعتبار تھا، کیا اک لطیف خواب نہ تھا
ہمیشہ پیشِ نظر رکھ انیسؔ کا یہ شعر
وہی انیسؔ کہ جس کا کوئی جواب نہ تھا
"نمود و بودِ بشر کیا محیطِ ہستی میں
ہوا کا جب کوئی جھونکا چلا حباب نہ تھا"

(۳)

مال و زر رکھتے نہیں جاہ و حشم رکھتے نہیں
کوئی دولت ہاتھ میں ہم جُز قلم رکھتے نہیں
ہم ہیں شاعر سربسر اخلاص، سر تا پا نیاز
دل میں رکھتے ہیں لچک، گردن میں خم رکھتے نہیں
"در پہ شاہوں کے نہیں جاتے فقیر اللہ کے
سر جہاں رکھتے ہیں سب ہم واں قدم رکھتے نہیں"

....

فضلؔ نقوی

انیسؔ کی یاد میں

ضیائے صبحِ عقیدت چراغ تنہائی   تجلّیاتِ تکلّم میں حد کی رعنائی
تفکّرات کی معراج جادہ پیمائی   تخیّلات کا مرکز حسین انگڑائی
دلوں کو درد دیا ذہن کو سکون دیا
انیسؔ تونے زبان و ادب کو خون دیا

بلندیاں وہ خیالات کی فلک پیما   محاورات کے جادوں میں درد کا دریا
کہیں پہ بحرِ معانی کہیں حدِ صحرا   بدل کے رکھ دیا فکر و خیال کا نقشہ
چمن کو رنگ دیا گل کو تازگی دے دی
روش روش کو حقیقت کی روشنی دے دی

وہ رزم و بزم وہ تیغ و سپر وہ صبحِ بہار   وہ ظلم و جور کا سینہ اُپی ہوئی تلوار
وہ میکدے کی تجلّی وہ جام مے کا نکھار   وہ شورِ دشت و جبل وہ سکوتِ لیل و نہار
سحاب و برق کے جلوے حدودِ گلشن پر
وہ آسماں کے ستارے زمیں کے دامن پر

فصاحت اور بلاغت کے رخ پہ غم کا سحاب　　نسیم صبح کے انداز میں سوال و جواب
ہزار کروٹیں لیتا ہوا دلِ بے تاب　　سحر کے نور میں شبنم کے موتیوں پہ شباب

جھکا دیا سرِ فرشِ ادب جبینوں کو
ضیائیں بخش دیں الفاظ کے نگینوں کو

وہ ارض ماہ کی گردش میں غم کے مہ پارے　　وہ ذہن و فکر کے دامن پہ ڈوبتے تارے
وہ تیغِ تیز کی جنبش میں خون کے دھارے　　کہیں پہ پھول کہیں داغِ دل کے انگارے

رجز زبان سے کہہ کر پیام جنگ دیئے
قلم نے قوسِ قزح کو ہزار رنگ دیئے

رگوں میں خون کی گردش بنا پیامِ حسینؑ　　قلم سے ذکرِ شہادت زباں پہ نامِ حسینؑ
وہ مرثیوں کی روانی میں صبح و شامِ حسینؑ　　دلوں کی روح میں پہنچا دیا سلامِ حسینؑ

بلند کردیا فکر و نظر کی ہستی کو
جوابِ خُلد کیا کربلا کی بستی کو

عبور فن پہ تو قابو اثر کی ندرت پر　　وہ بحرِ طبع وہ مہریں لبِ فصاحت پر
تھا اختیار قلم اور زباں کی طاقت پر　　نگاہیں جم کے رہیں عظمتِ شہادت پر

جو لفظ لکھا تھا دل کی زباں سے بول دیا
تصوّرات کو میزانِ غم میں تول دیا

سخن کا باغ لگایا عمل کے دامن پر　　سجایا لفظوں کو مژگاں کی ہلکی چلمن پر
اثر زبان میں اور اعتماد تھا فن پر　　وفا کے رنگ میں آئی بہار گلشن پر

نگاہ ایسی ستاروں میں ختم راتیں کیں
زبان ایسی کہ فہمِ ملک سے باتیں کیں

رجز میں جوش تو چہرے پہ حسنِ صبحِ بہار　　براقِ فکر سے آگے تھی اسپ کی رفتار
کہیں پہ رات کا عالم کہیں سحر پہ نکھار　　مثالِ ماہیِ بے آب خوں بھری تلوار

قلم نے صنف میں پلٹا دیا جوانی کو
عطش نے روک دیا نہر کی روانی کو

وہ رخصت اور وہ سراپا وہ موت کی آواز　　وہ گفتگو کا طریقہ زبان کا انداز
وہ لفظ لفظ میں پوشیدہ حسنِ فہم کا راز　　محاوروں کا سلیقہ وہ طبع کا اعجاز
حنا کا رنگ قضا کے لبوں کی لالی پر
چمن میں جیسے چراغاں ہو ڈالی ڈالی پر
رہی انیسؔ کے قبضہ ہی میں بہارِ سخن　　انھیں سے ہوگیا وابستہ اعتبارِ سخن
انھیں کے ذہن کو حاصل تھا اختیارِ سخن　　یہ ورثہ دارِ سخن اور یہ تاجدارِ سخن
انھیں سے فضلؔ ہر اک دور کامیاب ملا
اثر زباں کو ملا شعر کو شباب ملا

سخن فتح پوری (کراچی)

شخصیتِ میر انیس

انیس اب بھی تو زینتِ انجمن ہے
انیس اب بھی تو شمعِ بزمِ سخن ہے
تری ذات پر رحمت ذوالمنن ہے
ترا تذکرہ انجمن انجمن ہے
انیس اب تری خوبیاں لکھ رہا ہوں
سراسر جو مقصودِ بزمِ سخن ہے
تری روح ہے مرثیہ ساز گویا
سلام و رباعی ترا جسم و تن ہے
سراپا صنائع مجسم بدائع
فصاحت بلاغت ترا پیرہن ہے
تری چشم ہے چشمہ استعارہ
ترا سر تو گنجینۂ علم و فن ہے
زباں ہے تری موجِ دریائے اُردو
تکلّم کی موجوں میں کیا بانکپن ہے
بنی انگلیاں تیری مضرابِ اُردو
کہ تارِ نفس تیرا سازِ سخن ہے

فقط مرثیہ ہی وہ صنفِ سخن ہے
زمیں جس کی بالائے چرخِ کہن ہے

اسی صنف کا وہ ترے سر ہے سہرا
جو تابش میں رشکِ مہِ ضو فگن ہے
تو سلطانِ اقلیم فکر و تخیل
تری طرزِ گفتار تاجِ سخن ہے
نجانے ہوئے کتنے نذرِ حوادث
نہ خود ہیں نہ ان کا نشانِ وطن ہے
مگر آج میدانِ اردو زباں میں
انیس اب بھی سو سال سے خیمہ زن ہے
گہر فکر کے اس طرح تونے ٹانکے
کہ جس سے مزّین قبائے سخن ہے
نگینہ ہے لفظ اور خاتم ہے مصرع
تری فکرِ نو کا اچھوتا یہ فن ہے
وہ لفظ و معانی کے دریا بہائے
تموّج میں جس کے ادب موجزن ہے

ہے بوئے فصاحت سے اُردو معطّر وہ عطرِ بیاں ہے جو رشکِ ختن ہے
تری رزمیہ نظم اردو زباں میں ادب میں اضافے کی پہلی کرن ہے
جسے فکرِ نو آج کہتی ہے دنیا نگارش کا تیرے وہ نقش کہن ہے
جسے مرثیہ گو سمجھتے ہیں غازہ وہ تیرے تکلّم کی گردِ سخن ہے

فروغِ عزائے حسینی میں تیری
اچھوتی روش ہے اچھوتا چلن ہے

....

سیّد صفی حیدر رضوی دانشؔ (راولپنڈی)

مقامِ انیسؔ

ادب قوم کا سرمایۂ اعزاز انیسؔ　　چمنِ نظم کا اک زمزمہ پرداز انیسؔ
محفلِ شعر میں ممتاز و سرفراز انیسؔ　　قوّتِ نطق کا اک بولتا اعجاز انیسؔ

کارنامہ ہے بہر طور نمایاں اُس کا
آج تک ہستیٔ اُردو پہ ہے احساں اُس کا

سب سے جو پست تھا اُس فن کو ابھارا اُس نے　　سخت دشوار تھا، میدان وہ مارا اُس نے
شعر کے گیسوئے برہم کو سنوارا اُس نے　　دے دیا بازوئے اُردو کو سہارا اُس نے

بزمِ اُردو کو عجب شان سے آباد کیا
شعر کو طعنۂ احباب سے آزاد کیا

اور اصناف میں گو ہوتے تھے یکتا شاعر　　ناز کرتے تھے ہر اک رنگ پہ کیا کیا شاعر
مرثیہ گو کو کہا کرتے تھے بگڑا شاعر　　اس کو دیکھا تو کہا ہوتا ہے ایسا شاعر

بخشی اس صنف کو وہ زینتِ کامل اُس نے
کردیا واقعی اس قول کو باطل اُس نے

تھا وہ اک مرتبۂ شعر بڑھانے والا　　نظم کو منزلِ اعزاز پہ لانے والا
جوہرِ فکر کو پاکیزہ بنانے والا　　دین کے رنگ سے دنیا کو سجانے والا

کیوں نہ رہتا وہ زمانے میں نمایاں ہوکر
غیر کی مدح نہ کی شہؑ کا ثنا خواں ہوکر

شعر کو دولتِ توقیر عطا کی اُس نے قابلِ داد ہے خدمت جو ادا کی اُس نے
موجبِ فخر ہے وہ رسم بنا کی اُس نے قُرۃ العینِ پیمبرؐ کی ثنا کی اُس نے
شان یہ پائی تو موقع نہیں حیرانی کا
خدمتِ حق سے ملا تاج سخن رانی کا

ایک گلدستۂ رنگیں ہے وہ ہے اس کا کلام پند و اخلاق و نصائح کا جسے کہئے نظام
اس میں آتا ہے نظر حسن عمل کا بھی پیام نورونزہت میں سحر ہے تو ادا سی میں ہے شام
نقشِ خوبی ہے جو تحریر نظر آتی ہے
اس میں ہر رنگ کی تصویر نظر آتی ہے

مدح میں یہ ہے قصیدہ تو لطافت میں غزل مثنوی یوں ہے کہ ہے ربط و تسلسل کا عمل
بزمِ جذبات میں روشن ہے تخیّل کا کنول ہے غرض اس میں ہر اک لذّت شعری کا بدل
اس سخنور نے جو کی محنت و سینہ کاوی
مرثیہ ہوگیا ہر صنف سخن پر حاوی

زورِ ابلاغ ہے، رنگینیٔ اظہار بھی ہے وسعتِ دشت ہے، رعنائیٔ گلزار بھی ہے
بزم میں اس کا قلم سلکِ گہر بار بھی ہے صفِ میداں میں چمکتی ہوئی تلوار بھی ہے
راگ کتنے ہیں بھرے اس میں اور اک ساز ہے یہ
بالیقیں قوّتِ تخلیق کا اعجاز ہے یہ

اُس نے کس شان سے برتے ہیں بلاغت کے اصول اس کے گلزارِ سخن میں ہیں فقط پھول ہی پھول
اختصار اپنی جگہ، طول کے موقع پہ ہے طُول بے محل بات ہے کوئی نہ کوئی لفظ فضول
داند آنکس کی فصاحت بہ کلامے دارد
ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

حسن ذرّوں کو دیا مہر منوّر کی طرح جلوہ گر کر دیا قطروں کو سمندر کی طرح
آئینہ لے کے وہ آیا جو سکندر کی طرح اس نے زنگار کو چمکا دیا جوہر کی طرح
قلبِ مومن میں وہ طوفان اُٹھایا اس نے
اشک کو گوہرِ نایاب بنایا اس نے

اس کے گلشن میں ملا حسنِ جہانگیر کا رنگ　　کر دیا اُس نے عطا شعر کو تاثیر کا رنگ
دے دیا خاکۂ تصویر کو تطہیر کا رنگ　　نقشِ فطرت میں بھرا الفتِ شبیرؑ کا رنگ

معجزے حسن تکلّم کے دکھائے اس نے
جام بھر بھر کے مودّت کے پلائے اُس نے

جوش وہ طبع کا بھرپور جوانی جیسے　　لطف وہ ہے کوئی کہتا ہو کہانی جیسے
بات وہ صاف چمکتا ہوا پانی جیسے　　وہ سلاست ہے کہ دریا کی روانی جیسے

بحر اتنا جو یہ پُرشور نظر آتا ہے
پانچ پشتوں کا یہاں زور نظر آتا ہے

استعارات میں پنہاں ہیں اشارے کیا کیا　　حسنِ تشبیہ سے ظاہر ہیں نظارے کیا کیا
بندشیں چُست ہیں الفاظ ہیں پیارے کیا کیا　　توڑ کر چرخ سے لایا ہے وہ تارے کیا کیا

بن گئی بات جو اس طبع رسا تک پہنچی
شعر کی پست زمیں اوجِ سما تک پہنچی

کہیں لفظوں میں تنافر نہیں اشکال نہیں　　کہیں ژولیدہ بیانی نہیں اہمال نہیں
پیچ و خم کچھ نہیں، الجھن نہیں، جنجال نہیں　　صاف شیشہ ہے غرض جس میں کہیں بال نہیں

لذتِ دید کا سب کے لئے پیغام ہے یہ
خاص انداز کی اک جلوہ گہِ عام ہے یہ

سوز کو ساز دیا درد کو لذّت دے دی　　بزم کو رنگ دیا رزم کو صولت دے دی
پیکرِ شعر کو اک روحِ لطافت دے دی　　دلِ افسردہ کو ایماں کی حرارت دے دی

ایسے انداز کو معراجِ ہنر کہتے ہیں
ہم اسے معجزۂ خونِ جگر کہتے ہیں

اس کی محنت کا زمانے میں ثمر آج بھی ہے　　اک صدی ہو گئی زندہ وہ مگر آج بھی ہے
کچھ تو اُس حسنِ تکلّم کا اثر آج بھی ہے　　اس کا اسلوبِ سخن پیش نظر آج بھی ہے

آج اُس کا جو یہاں ذکر کیا ہے میں نے
اُس کا اندازِ بیاں مانگ لیا ہے میں نے

عزؔت لکھنوی (کراچی)

جستجو نام ہے اُردو کا تو حاصل ہیں انیسؔ

مرثیے کا دُرِ شہوار و مجلّی ہیں انیسؔ
موجۂ فکر ہیں مضمون کے دریا ہیں انیسؔ
ذوقِ شعری ہے زمیں عرش معلّیٰ ہیں انیسؔ
مدحتِ شاہ کا دعویٰ ہے کہ یکتا ہیں انیسؔ
برتراز دعبلؔ و فردوسیؔ و مقبلؔ ہیں انیسؔ
نظم شیرازیؔ و حسّانؔ کا حاصل ہیں انیسؔ

ایسا بے مثل سخنور کہیں دیکھا نہ سنا
شوکتِ شعر کا مظہر کہیں دیکھا نہ سنا
مدحتِ آلؑ کا محور کہیں دیکھا نہ سنا
لفظ و معنی کا سمندر کہیں دیکھا نہ سنا
گفتگو ایسی کہ ہر بات سے موتی برسیں
شعر سُن لیں تو چہکنے کو عنادل ترسیں

فن کا وہ اوج کہ حیرت سے نظیریؔ دیکھے
گیسوئے نظم میں لفظوں کی اسیری دیکھے
عرفیؔ اقلیمِ تخیّل کی امیری دیکھے
اس گدائے درِ حیدرؑ کی فقیری دیکھے
قوّتِ طبعِ ظہوری کو حیا آتی ہے
عظمتِ لوح و قلم اس کی قسم کھاتی ہے

ذرّۂ خاک کو گوہر کی جِلادی اس نے
طبعِ خاموش میں ہل چل سی مچادی اس نے
جب بھی فطرت کے مظاہر کو صدادی اس نے
شعر میں نطق کی تصویر دکھادی اس نے
بزم کا رنگ جمایا تو فضا جھوم اٹھی
رزم میں تیغ بیاں کی تو فضا جھوم اٹھی

ذکرِ گل ہو تو فضا رنگِ جوانی مانگے　　سبزہ لہرائے تو دریا کی روانی مانگے
ضربِ شمشیر اگر کوئی نشانی مانگے　　مرحبِ قوتِ کفار نہ پانی مانگے
چہرۂ مہر کو شعروں میں چمکتے دیکھو
تودۂ برف سے شعلوں کو لپکتے دیکھو

یہ سلاست یہ فصاحت یہ خطابت یہ بیاں　　حسن کا شوکتِ الفاظ میں دریا سا رواں
دسترس ایک سی دونوں پہ یقیں ہو کہ گماں　　سادگی ایسی کہ منہ چوم لیں خاصانِ جہاں
خنجرِ فکر و تخیل نے جگر کاٹ دیئے
یوں چلی تیغِ زباں تارِ نظر کاٹ دیئے

جوشؔ و اقبالؔ ہوں یا آرزوؔ و شادؔ و وزیرؔ　　مونسؔ و انسؔ ہوں عارفؔ ہوں کہ ہوں اوجؔ و خبیرؔ
محشرؔ و رشکؔ و صفیؔ بحرؔ و نظرؔ داغؔ و امیرؔ　　سب کا ادراک اسی زمزمہ دانی کا اسیر
شبلیؔ و حالیؔ و آزادؔ کی منزل ہیں انیسؔ
جستجو نام ہے اُردو کا تو حاصل ہیں انیسؔ

....

سیّد فیضی

بیادِ خُدائے سخن

میر انیسؔ اعلی اللہ مقامہ

پروردگارِ شعر، خدائے سخن انیسؔ — نُورِ تخیلات کا ہے بانکپن انیسؔ
مجلس انیسؔ، بزم انیسؔ، انجمن انیسؔ — منبر کی جان، طرزِ خطابت کا فن انیسؔ
حکمت کی روشنی ہے، فصاحت کا ذوق ہے
جادو بیاں انیسؔ دبستانِ شوق ہے

شعر و ادب کی مسندِ عزّت کا تاجدار — معجز رقم، بلند نظر، آسماں وقار
شاعر، ادیب، مرثیہ گو، منقبت نگار — عظمت قلم کی، لوحِ تخیّل کا افتخار
کیا گلستاں انیسؔ نے سینچے ہیں بات کے
بخشے ہیں مرگِ فکر کو تیور حیات کے

وہ آسمانِ شعر پہ ہر سُو ہے ضَو فگن — فکر و نظر سے اُس کی منوّر ہیں علم و فن
لہجہ ہو اُس کا، طرز ہو، تیور ہو یا پھبن — ہر بات میں انیسؔ کی ہے نُدرتِ سُخن
معیارِ فن جو اس نے بنایا نہ رد ہوا
جو لفظ جیسے باندھ دیا، مستند ہوا

بزمِ انیسؔ دانش و بنیش کی برتری — رزمِ انیسؔ معجزۂ تیغِ حیدری
عزمِ انیسؔ اشاعتِ دینِ پیمبری — نظمِ انیسؔ رعب و جمالِ سخنوری
یوں ذوقِ شاعری نے اُسے جگمگا دیا
مدّاحِ اہل بیتِ پیمبرؐ بنا دیا

زورِ بیان ایسا کہ فطرت ہے، خود بھی دنگ مضموں ہے ایک، بخشے ہیں اس کو ہزار رنگ
اسلوب نو بہ نو ہیں، نیا ہے ہر ایک ڈھنگ رخصت ہو، ماجرا ہو، رَجز ہو کہ اذنِ جنگ

ہر واقعہ مشاہدۂ اِعتبار ہے
ہر منظر آئینے کی طرح آشکار ہے

ذرّے اُٹھا کے اس نے بنائے ہیں کہکشاں ساز حیات سے کیئے نغمے رواں دواں
غم آفریں ہے کرب و بلا کی جو داستاں یہ کر گئی انیسؔ کو انسانِ جاوداں

کیا کیا زبانِ شعر میں جوہر دکھائے ہیں
زخموں کو گفتگو کے طریقے سکھائے ہیں

کرب و بلا انیسؔ کی عرفانیت کا نُور کرب و بلا مقامِ نظر، منزلِ شعُور
کرب و بلا ہے عشق کا سرمایۂ غرور کرب و بلا تجلّیِ نظّارہ گاہِ طُور

کرب وبلا کے طُور کا مُوسیٰ انیسؔ ہے
ہر طرزِ گفتگو کا سلیقہ انیسؔ ہے

نغمہ بلب رہا وہ ریاضِ رسُولؐ میں فانُوسِ غم جلادیئے طبعِ ملول میں
خوشبوئے اہلِ بیتؑ بھری پھول پھول میں وہ مرتبہ ملا اُسے حُسنِ قبول میں

دُنیا میں رہ کے دین کی دولت خرید لی
سبطِ نبیؐ کے ذکر سے جنّت خرید لی

فطرت نے جیسا دل اُسے بخشا تھا درد مند موضوعِ فکر ویسا ہی آیا اُسے پسند
اُس کے قلم سے آبروئے غم ہوئی دو چند پرچم حسینیت کا رکھا اس نے سر بلند

فِکر اس کی منجلی ہے پیامِ حسینؑ سے
نامِ انیسؔ زندہ ہے نامِ حسینؑ سے

فضا ابن فیضی

خراجِ عقیدت

اے مدح خوانِ حسینؑ و علیؑ ! تری آواز
ستارہ بھی، ہے شرارہ بھی، گُل بھی شعلا بھی
ترا غم آفریں لہجہ، لہولہاں آہنگ
کہیں بہار کا آنچل، کہیں لہو کی قبا
کہیں دریچۂ خوشبو، کہیں حدیقۂ زخم
کہیں سحر، کہیں سایہ، کہیں سمن، کہیں سنگ
ہزار ڈھنگ سے باندھا ہے ایک مضمون کو
نظر لگے نہ تری شخصیت کے افسوں کو
تو اپنی ذات سے گل زار بھی تھا، صحرا بھی
تجھی پہ ختم ہے تیرا فسون و شیوا بھی
کسے ملا ہے یہ اظہار کا سلیقا بھی

....

غمِ حیات کا چہرا شفق شفق کب تھا
اسے تبسّمِ ماہِ تمام تونے دیا
قبائے مصرعِ موزوں پنہائی لفظوں کو
خراشِ روح کو شعروں کا نام تونے دیا
حدیثِ شوق سُنا کر نویدِ جاں کی طرح

جنوں کا درس، وفا کا پیام تونے دیا
یہاں "حکایت و تلمیح" کے جلو خانے
وہاں "مناظر و کردار" کے شفق پارے
نثار تجھ پہ خوانِ اہل بیتؑ تمام
کہ مرثیے کو ادب کا مقام تونے دیا

....

میں کیا کہوں ترے جذبے کی دردمندی کو
ضمیرِ عشق کو تونے تپ و گداز دیا
وہ بولتا ہوا اسلوب، زر فشاں لہجہ
نفس نفس کو نوائے سحر طراز دیا
وہ "تیری تیغ الوالعزم" کی گہر ریزی
ہنرورانِ تہی دست کو نواز دیا
وہ سادگی وہ صداقت، وہ جوش و برنائی
وہ شیوہ کاری، و صورت گری و صنّاعی
وہ حسن و قوّتِ نظم و بیاں کی گیرائی
سخن وروں کو اک آہنگِ عہد ساز دیا

....

بکھر گئی تو دلِ کربلا کا چاک بنی
وہ اک شکن جو ترے گیسوئے شعور میں تھی
ترا یہ دفترِ معنی حدیثِ کرب سہی
غزل کی بات بھی پنہاں ان ہی سطور میں تھی
سمو لیا اسے کب تونے اپنے سینے میں
جو تازگی نفَسِ جبرئیل و حور میں تھی

....

خوشا ترے المیّہ شعور کی تیزی
زفرق تا بقدم، سوزِ لازوال تھا تو
بیانِ درد میں یہ والہانہ گفتاری
سخن کدوں کا سلگتا ہوا جمال تھا تو
ترے لئے تھے "دوات و قلم بھی طبل و علم"
جہادِ فن میں سرِ جادۂ کمال تھا تو
غزل سے دُور بچھائی بساطِ ذوق اپنی
یہ کون جانے کہ کس دشت کا غزال تھا تو

....

وہ نفسیات کا گہرا، بچا، تُلا ادراک
کہ لفظ لفظ کو اپنے قلم کی جنبش سے
شگفتہ بولتا پیکر بنا دیا تونے
ورق ورق ترا خوانِ جواہرِ یاقوت
وہ شعر لکھے کہ مجموعۂ خجستہ کو
سفینۂ زر و گوہر بنا دیا تونے
کہاں کہاں نہیں تیری زبان کا شُہرہ
سوادِ دلّی ترا، شہرِ لکھنؤ بھی ترا
تری ہی دین ہے "اُردو کی یہ حسیں تہذیب"
غزال بھی ترے، صحرائے مشکبُو بھی ترا
فراتِ لفظ و معانی کی موج بھی تیری
رگِ قلم میں رواں ہے جو وہ لہو بھی ترا

....

بہار تھی شجرِ درد کی، وجود ترا
تپکتے چھالوں کو رشکِ گلاب تونے کیا

تری زباں تھی "کلیدِ خزانۂ تاثیر"
جنوں کو واقفِ شعر و کتاب تو نے کیا
بتاسکے تو بتا اپنی خلوتِ فن میں
فغانِ درد کو کیوں باریاب تو نے کیا
بہت سے دشت تھے، سیاحیٔ سخن کے لئے
اس ایک صنف کو کیوں انتخاب تو نے کیا

....

مگر یہ صنف بھی ہے تیرے معجزے کی نمود
کہ لوگ آج بھی چُنتے ہیں ان نگینوں کو
کسی کی رفعتِ تخیّل جن کو چھُو نہ سکی
تو آسمان سے لایا تھا اُن زمینوں کو
ترے زبان و بیان پر ہمیشہ رشک رہا
دیارِ نظمِ معلّٰی کے نکتہ بینوں کو
ادا ہو کس سے ستائش کا حق، مگر پھر بھی
بہت ہیں اتنے اشارے بھی ہم نشینوں کو
"لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو"

....

شاہد نقوی

جہاں انیسؔ، وہیں مرثیہ، وہیں اُردو

سخنوروں کی کمی ہے نہ کچھ ادیبوں کی
بھرا ہے جوہر قابل سے دامنِ اُردو
کلی کے لب پہ تبسّم گلوں کے رخ پہ نکھار
دل و نگاہ کی جنت ہے گلشنِ اُردو

یہ وہ عظیم چمن ہے کہ باغبانوں نے
روش روش کو جگر کے لہو سے سینچا ہے
یہ گلستاں نہیں دراصل دستِ قدرت نے
زمیں پہ رُوحِ تمنّا کا نقش کھینچا ہے

ورائے حلقۂ تنقید کیوں نہ ہو یہ چمن
رہی ہے اس پہ نظر کتنے باغبانوں کی
ہر اک ذرّہ نہ کیوں رفعتوں پہ ناز کرے
ہے جلوہ گہ یہ زمیں کتنے آسمانوں کی

ولیؔ و آرزوؔ و میرؔ و حاتمؔ و سوداؔ
یقیںؔ و مصحفیؔ و میرؔ دردؔ و سوزؔ و منیرؔ
فغاںؔ و جرأتؔ و انشاؔ و آتشؔ و ناسخؔ
نسیمؔ و راسخؔ و رنگیںؔ و بحرؔ و رشکؔ و وزیرؔ

نصیرؔ و شیفتہؔ و ذوقؔ و غالبؔ و مومنؔ
نظیرؔ و سالکؔ و آزادؔ و حالیؔ و مجروحؔ
امیرؔ و داغؔ و نظامؔ و جلیلؔ و افسرؔ و ہوشؔ
ریاضؔ و فانیؔ و احسنؔ، شہیرؔ و سائلؔ و نوحؔ

صفیؔ و محشرؔ و چکبستؔ و شوقؔ و نظمؔ و عزیزؔ
ظریفؔ و اکبرؔ و فانیؔ و حسرتؔ و اصغرؔ
جلالؔ و ضامنؔ و اقبالؔ و جوشؔ و بزمؔ و فراقؔ
قدیرؔ و ساحرؔ و روشنؔ، ندیمؔ و فیضؔ و جگرؔ

میں کتنے نام گناؤں میں کتنے نام لکھوں
قدم قدم پہ ہے ضَو پاشیٔ مَہ و خورشید
ہر ایک موڑ پہ بکھرے ہیں انگنت تارے
روش روش سے اُبلتے ہیں نور کے دھارے

یہ سب اور ان کے سِوا ان کے کُل رفیق سفر
یہ وہ ہیں جن سے اَدب کا حصار روشن ہے
عظیم فکر و نظر کا سُراغ ہیں یہ لوگ
رہِ شعور و خرد کے چراغ ہیں یہ لوگ

چراغ ہیں یہ مگر اپنی حد میں روشن ہیں
دیارِ غیر میں دھندلی سی کچھ شعاعیں ہیں
فروغ ان کی تجلّی کا اپنے گھر تک ہے
اور ان کا نور بھی اک حدِّ مختصر تک ہے

بہت ہیں کہنے کو اَصنافِ شعر اردو میں
مگر وہ صنفِ سخن جس کو منفرد کہیے
کوئی طویل کوئی مختصر کوئی مجمل
قصیدہ ہے نہ رُباعی نہ مثنوی نہ غزل

نہ جس کی مِثل کہیں عالمی اَدب میں ملے
عظیم صنفِ سخن جس کو مرثیہ کہیے
وہ صرف ایک ہی صنفِ سخن ہے اردو میں
اک امتیاز سے جلوہ فگن ہے اُردو میں

کسی زباں کا بھی دنیا کی جائزہ لیجے
یہ منفرد ہمہ گیری یہ بے کراں وسعت
جو شانِ مرثیہ اُردو میں ہے کسی میں نہیں
کسی زباں کے بھی دامانِ آگہی میں نہیں

وہ صنف جس میں ہر اک صنف کی جھلک مل جائے
وہ ایک آئینہ جس میں ہر آئینہ بولے
اگر ہے اور کسی ملک کے اَدب میں تو لاؤ
کسی زباں کو میّسر ہوا ہو گر تو دکھاؤ

وہ ہو زباں کی لطافت کہ ندرتِ اسلوب
یہ رکھ رکھاؤ یہ وسعت یہ سادگی یہ رچاؤ
ہمارا مرثیہ ہر زاویے سے یکتا ہے
کسی زباں میں نہیں ہے یہ میرا دعویٰ ہے

یہ واقعہ ہے کہ اُردو کی منزلِ رفعت
بقدرِ نقطۂ معراجِ مرثیہ ٹھہری
جو مرثیہ کا، وہی قد زبانِ اُردو کا
جو اُس کی حد ہے وہی اس کی انتہا ٹھہری

سوال یہ ہے کہ خود مرثیہ کہاں ہے آج
یہ صنف تیز قدم کس مقام تک پہنچی
وہ کون تھا جو اسے اس مقام تک لایا
چلی یہ بات تو پھر کس کے نام تک پہنچی

اَدب میں صرف اسی مسئلہ کو حاصل ہے
وہ فیصلہ نہیں جس میں کسی کو جائے کلام
جہاں بھی اُٹھے گا سر خیلِ مرثیہ کا سوال
ہر اک زباں پہ مچل جائے گا انیسؔ کا نام

جو ہیں انیسؔ کی عظمت سے اب بھی ناواقف
انھیں خبر نہیں شاید کہ مرثیہ کیا ہے
جو پُوچھتے ہیں کہ کیا ہے انیسؔ کی منزل
وہ یہ بتائیں کہ اُردو کی انتہا کیا ہے

کمالِ اَوجِ زباں کا اشاریہ ہے انیسؔ
اگر انیسؔ نہیں ہے تو کچھ نہیں اُردو
انیسؔ کے لئے اس کے سوا میں کیا لکھوں
جہاں انیسؔ، وہیں مرثیہ، وہیں اُردو

نشورؔ واحدی (کانپور)

خدائے سخن

جانِ وطن انیسؔ، بہارِ چمن انیسؔ
دنیائے شاعری میں خدائے سخن انیسؔ

ہر واقعہ میں فکر و تخیّل کے ربط سے
ترتیب دے گئے ہیں عجب طرزِ فن انیسؔ

اپنا زمانہ اپنے قلم سے سنوار کر
تنہا رہے ہیں مالکِ ہر انجمن انیسؔ

پہلے ہی دی تھی حافظِ شیراز نے خبر
صد طوطیانِ ہند میں شکّر شکن انیسؔ

زندہ ہے اُن کے فیض سے ہر دورِ شاعری
صورت نگارِ زندگیٔ فن بہ فن انیسؔ

اک بارشِ کمال ہے ان کی قلم کی نوک
صحراؤں میں اُگا گئے کتنے چمن انیسؔ

شیریں کلامیوں کے نمونے ہیں اُن کے شعر
فردوس گوش نغمۂ سرو و سمن انیسؔ

تاریخ شاعری کی فصیلوں کو توڑ کر
دِکھلا گئے ہیں قوّتِ خیبر شکن انیسؔ

شاعر عرب کے گونگے ہیں ذکرِ حسینؑ میں
نطقِ عرب اگر ہے تو ہندی وطن انیسؔ

کعبے کے گرد کس نے بکھیرے ہیں زمزمے
اک طائرِ حرم بہ طوافِ سخن انیسؔ

اجملؔ اجملی (نئی دہلی)

انیسؔ کے مرثیے

اللہ رے یہ معجزۂ فنِ معتبر　　ہر بیت بے پناہ ہے، شہکار ہر سطر
آہنگ پر نگاہ تھی، اصوات پر نظر　　ترتیبِ صرف میں نہیں نا جنس کا گذر
جو لفظ جس جگہ ہے ہلایا نہ جائے گا
ایسا زباں شناس تو پایا نہ جائے گا

کیا قدرتِ بیان ہے کیا حسنِ کار ہے　　موضوعِ شعر ایک ہے، صورت ہزار ہے
ہر بیت واقعات کی آئینہ دار ہے　　مقصود ہو غلو تو ثریا شکار ہے
تخئیل و تجربے کی کڑی ٹوٹتی نہیں
اُڑتا ہے آسماں میں زمیں چھوٹتی نہیں

ہیرو سبھی عظیم، مگر حسنِ ذات اور　　سن مختلف، مزاج الگ، تجربات اور
موصوف ایک سے ہیں بیانِ صفات اور　　زینبؑ کی شان اور ہے، اکبرؑ کی بات اور
تشکیک و شائبے کا سخن درمیاں نہ ہو
عباسؑ بولتے ہوں تو حُر کا گماں نہ ہو

مقصودِ فکر و فن ہے وہ اک جہدِ لازوال　　اُلجھے رہے ہیں جس میں سدا مردِ باکمال
یاں وقت، قوم، ملک و وطن کا نہیں سوال　　باطل یزید، حق کی علامت علیؑ کا لال
جنگِ فرات سارے زمانے کی جنگ ہے
کیا ہے جو لکھنؤ کا مراثی میں رنگ ہے

غم کا بیان فرد کو رفعت عطا کرے　　دل کو سکوں، نظر کو بصیرت عطا کرے
فن کا جمال، ذوق کو راحت عطا کرے　　کردار وہ مثال کہ عظمت عطا کرے
ہر لمحہ یہ سبق پئے طبعِ سلیم ہے
انسانیت ہے پاس تو انساں عظیم ہے

نفیسؔ فتح پوری

اُردوِ پاک کا وقار انیسؔ

شہرِ اُردو کا شہر یار انیسؔ — شعر اقلیمؑ تاجدار انیسؔ
موسیٰ طورِ مجلسِ شبیرؑ — اَوجِ منبر کا ہے وقار انیسؔ
بُلبلِ گُلستانِ شعر و سخن — باغِ اُردو کی ہے بہار انیسؔ
وضعِ اَسلاف کا نمائندہ — قُدما کا ہے افتخار انیسؔ
نازشِ لکھنؤ و فیض آباد — اُردوِ پاک کا وقار انیسؔ
سب ہی شاعر ہیں مقتدر لیکن — علم و فن کا ہے تاجدار انیسؔ
منقبت، نعت، حمد اور سلام — صِنف در صِنف کامگار انیسؔ
درخورِ اعتنا نہ تھی جو غزل — کر گیا اُس کو واگزار انیسؔ
روز مرّہ، محاورا، بندش — اور محاکات کا نکھار انیسؔ
علم و فن کا ہے بحرِ بے پایاں — اِستعاروں کا آبشار انیسؔ
خار کو تازگئ گُل بخشے — گُل کو دے رنگ صد ہزار انیسؔ
بزم لکھے تو جانِ محفل ہے — رَزم لکھے تو ذوالفقار انیسؔ
مرثیوں میں دکھا دیا تو نے — خونِ مظلوم کا نکھار انیسؔ
جسدِ شعر و فن کی رُوحِ رواں — مرثیے کا ہے افتخار انیسؔ
مرثیے کی نگاہ داری کو — سیف اُردو تو اس کی دھار انیسؔ
مرثیہ تاجِ فرقِ شعر و سخن — اور اُس تاج کا وقار انیسؔ

اَے نفیسؔ اُردوِ معلےٰ کا
کتنا مضبوط ہے حصار انیسؔ

ظفر جونپوری

انیسِ خوش بیاں

مرثیہ اک منفرد صنفِ سخن کا نام ہے
شاعری کی شاعری، پیغام کا پیغام ہے

مثنوی کی شان ہے اس میں تسلسل کے سبب
پیکرِ الفاظ میں ہے جلوہ گر رُوحِ اَدب

ہے قصیدے کی جزالت بھی، غزل کا سوز بھی
نالۂ دل دوز بھی، پیغامِ جاں افروز بھی

جلوۂ حفظِ مراتب ہر جگہ سے آشکار
دید کے قابل ہے گلزارِ معانی کی بہار

بزم کی صورت گری ایسی کہ فطرت جھوم اُٹھے
رزم کی منظر کشی پر حق کی نصرت جھوم اٹھے

حسن چہرے کا، تناسب کی ضیاباری کے ساتھ
روشنی پھیلی ہوئی، فطرت کی بیداری کے ساتھ

سحر کاری وہ تخیل کی، وہ ایمائے گریز
بعدِ رخصت وہ فضا رن کی وہ تصویرِ ستیز

بین میں رقت کا وہ پہلو، وہ تاثیرِ سخن
سوگواری میں شجاعت کا سراسر بانکپن

برمحل ہر موڑ ہے، بے ساختہ ہر گفتگو
وہ اَجل کا سامنا، وہ زندگی کی آرزُو

مرثیہ گوئی بھی فن ہے، مرثیہ خوانی بھی فن
جانِ تنہائی وہ ہے اور یہ ہے جانِ انجمن

رزمیہ کہیئے مگر کیوں رزمیہ کہیئے اسے
دل کا اور احساسِ دل کا آئینہ کہیئے اسے

یہ اکائی بھی ہے، اس میں سیکڑوں پہلو بھی ہیں
ولولے کے ساتھ آہیں بھی ہیں اور آنسو بھی ہیں

یہ کسوٹی مرثیے کی، فیض و احسانِ انیسؔ
ایک گُلزارِ ارم ہے یا گلستانِ انیسؔ

وہ انیسؔ خوش بیاں، جس پر فصاحت کو ہے ناز
شاعروں میں جس کو حاصل خاندانی امتیاز

خون بن کر شاعری جس کی رگوں میں ہے رواں
سچ تو یہ ہے جس کے شعروں کی زمیں ہے آسماں

ہے زباں پر جس کو قابو اور بیاں پر اختیار
دید کے قابل ہے اقلیمِ سخن کا اقتدار

ارتقا ہے، انتہا ہے، اوج ہے، معراج ہے
جس کے سر پر کشورِ حسنِ بیاں کا تاج ہے

پھوٹتی ہے، جس کے لفظوں سے حقیقت کی کرن — جس کے لہجے کی کھنک میں ہے نہاں صوتِ حسن

فطرتِ انساں سے واقف، فطرتِ غم کا نقیب — کربلا والوں کا شیدا، اُن کے غم میں غم نصیب

اپنے رتبے کا شناسا، اپنے منصب کا امیں — بے نیازِ اہلِ دُنیا، جاں نثارِ اہلِ دیں

نفس کی عزّت کا جو ضامن ہے ایسا رکھ رکھاؤ — اعتبارِ خاطرِ ایماں، طبیعت کا بناؤ

مرثیے کی استخواں بندی میں بے مثل و نظیر — فکر میں بالغ نظر اور نظم میں روشن ضمیر

خدمتِ شعر و سخن، کی ہے عبادت کی طرح — مستند ہیں مرثیے جس کے حقیقت کی طرح

زندۂ جاوید کے غم کی بدولت زندہ ہے — شاعری جس کی خدا کے فضل سے پائندہ ہے

کہہ سکے ہم ایک مصرع بھی نہ شایانِ انیسؔ
اے ظفرؔ اے کاش ہم پر بھی ہو فیضانِ انیسؔ

ثمرؔ هوشنگ آبادی

ہیں عیاں اشعار سے ایمان کے جوہر انیسؔ

ہر گھڑی رہتے تھے یوں محوِ غمِ سرورؑ انیسؔ
دل کی جا آئے تھے جیسے کربلا لے کر انیسؔ

حاملِ خوشنودیِ اللہ و پیغمبرؐ انیسؔ
ہم نوا و ہم طریقِ فطرتؔ و زعفرؔ انیسؔ

مدح خوانوں میں نہیں تجھ سے کوئی بہتر انیسؔ
تیرا حصّہ تھا ثنائے آلِ پیغمبرؐ انیسؔ

ہیں عیاں اشعار سے ایمان کے جوہر نیسؔ
عاشقِ قرآں محبِّ آلِ پیغمبرؐ انیسؔ

تیری عظمت دیدنی ہوگی سرِ محشر انیسؔ
آئیں گے جس دم ترے اشعار کے دفتر انیسؔ

تیرا ثانی کیا ترے ہم عصر کا ثانی نہیں
کیا سنبھالے گا کوئی شاعر ترا منبر انیسؔ

غم نگارانِ زمانہ ہیں نظر کے سامنے
ٹھوکریں کھاتے ہیں تیری راہ سے ہٹ کر انیسؔ

حق یہ ہے حق خطابت کردیا تونے ادا
تو تھا منبر کے لئے تیرے لئے منبر انیسؔ

ٹھوکروں میں رستم دستاں نظر آنے لگا
یوں لکھی جنگِ علم دارِ شہِ صفدر انیسؔ

واہ کیا کہنا ترا نقاشِ جذباتِ الم
کھینچ دی کاغذ پہ تصویرِ غمِ سرورؑ انیسؔ

خواب کے عالم میں بھی رہتا تھا سرورؑ کا خیال
کربلا میں روح تیری جسم بستر پر انیسؔ

مرثیت کو تازگی بخشی ترے افکار نے
تیرے اک اک لفظ نے برپا کئے محشر انیسؔ

اُسوۂ شبیرؑ تیری فکر کا مرکز رہا
تونے کچھ سوچا نہیں اس فکر سے ہٹ کر انیسؔ

لکھنؤ کی بادشاہت نے دیا تجھ کو خراج
شہر دہلی میں رہی شہرت تری گھر گھر انیسؔ

وجہِ حیرت تھا اسد اللہ غالبؔ کے لئے
مرثیت کو لے کے پہنچے کس بلندی پر انیسؔ

شاہنامہ نامرادی کا فسانہ بن گیا
گوہرِ مقصد کا مخزن ہے ترا دفتر انیسؔ

سوئے گلزارِ تخیّل جب قدم تیرے بڑھے
بوئے گل خود آگئی تیری طرف کھنچ کر انیسؔ

سہل ہو جاتی تھی مشکل بات آسانی کے ساتھ
موم ہو جاتے تھے تیرے سامنے پتھر انیسؔ

کوئی اُردوئے معلیٰ کو مٹا سکتا نہیں
ہے حفاظت کو، ترے الفاظ کا لشکر انیسؔ

ہیں کہاں اتنے ستارے آسماں کی گود میں
تیرے دامن میں ہیں جتنے اشک کے گوہر انیسؔ

خدمت علم واَدب، کی ہے ترے اَجداد نے
مرکزِ علم واَدب ہے اب بھی تیرا گھر انیسؔ

یادِ سبطِ مصطفےٰؐ میں صَرفِ ماتم ہوگئی
آئے تھے دُنیا میں جتنی زندگی لے کر انیسؔ

زندگی بھر یہ سفر جاری رہے گا اے ثمرؔ
شاہراہِ منقبت میں ہیں مرے رہبر انیسؔ

زاہد فتح پوری

آج بھی دُنیا میں قائم ہے دبستانِ انیسؔ

کتنے گلہائے سخن ہیں زیبِ دامانِ انیسؔ
دامنِ شعر و ادب ہے یا خیابانِ انیسؔ

سارے عالم کے لئے ہے عام فیضانِ انیسؔ
حشر تک ہم اہلِ اُردو پر ہے احسانِ انیسؔ

کوششِ موہوم ہے تعریف کی حق تو یہ ہے
کس سے ممکن ہوسکے توصیف شایانِ انیسؔ

چپّے چپّے سے عیاں ہے مرثیہ گوئی کا ذَوق
آج بھی دُنیا میں قائم ہے دبستانِ انیسؔ

منقبت ہوں مرثیے ہوں یا رُباعی اور سلام
مغفرت کے واسطے کیا کیا ہیں سامانِ انیسؔ

ذکرِ اہلِ بیتؑ سے پائی حیاتِ جاوداں
تا اَبد روشن رہے گا مہرِ تابانِ انیسؔ

ایک تو حسنِ بیاں اور اس پہ ذکرِ کربلا
آنکھ ہے مصروفِ گریہ دل ثنا خوانِ انیسؔ

دیکھنا جب مرثیوں کی داد دیں گی سیّدہؑ
حشر میں ہوجائے گی سب پر عیاں شانِ انیسؔ

اُن کے افکار و نظر کا معترف کیسے نہ ہو
قدردانِ فن ہے زاہدؔ ہر ثنا خوانِ انیسؔ

وفاؔ کانپوری

اے لوح و قلم تیرا مقدّر ہے انیسؔ

الفاظ و معانی کا پیمبر ہے انیسؔ
دریائے مضامیں کا شناور ہے انیسؔ
ملتی ہے کسے علم و ہنر کی معراج
اے لوح و قلم تیرا مقدر ہے انیسؔ

بُرج شرف میں تیرا ستارہ کل بھی تھا اور آج بھی ہے
تو پیغمبرِ لفظ و معنیٰ کل بھی تھا اور آج بھی ہے
ایک نئے انداز سے تونے شہرِ سخن تعمیر کیا
تیری تخلیقات کا چرچا کل بھی تھا اور آج بھی ہے
مشکل بات کو نرم زباں میں کہنے کا فن سکھلایا
فخر کے قابل تیرا لہجہ کل بھی تھا اور آج بھی ہے
اک مضموں کے لاکھوں عنواں ہر عنواں کا ڈھنگ نیا
تیری ندرتِ فکر کا شہرہ کل بھی تھا اور آج بھی ہے
اہلبیتؑ کی مظلومی کا کس نے یوں پرچار کیا
تیرے سر تبلیغ کا سہرا کل بھی تھا اور آج بھی ہے
نقش و نگار کرب و بلا میں تونے کچھ ایسے رنگ بھرے
کرب وبلا کا واقعہ تازہ کل بھی تھا اور آج بھی ہے
تیرے دور سے عہدِ وفاؔ تک سب ہی فیض نصیب ہوئے
ہر شاعر خوشہ چیں تیرا کل بھی تھا اور آج بھی ہے

سیّد مصطفیٰ حسین ہمدمؔ فیض آبادی

صد سالہ برسی میر انیسؔ اعلی اللہ مقامہ

ہند میں پیدا ہوا وہ گوہرِ یکتا انیسؔ
ساری دنیا میں نظر آیا نہ پھر ایسا انیسؔ

سب کو آتا ہے نظر اس کا نرالا رنگ و بو
نظم کا وہ پیش کر دیتا ہے گلدستہ انیسؔ

ایک دریا تھا کہ موجیں مارتا تھا سامنے
مجلسوں میں مرثیہ پڑھنے کو جب بیٹھا انیسؔ

باپ ہیں خلقِ حسن بیٹا بھی شاگردِ رشید
ہو نہیں سکتا ترا دنیا میں ہم پلّہ انیسؔ

ساری دنیا کے ادیبوں کا بنا مونسؔ کلام
مرثیہ سے انسؔ ایسا کر گیا پیدا انیسؔ

شاعری میں آج تک پایا ہے کس نے یہ عروج
زینتِ منبر بنا سب سے ہوا بالا انیسؔ

نظم میں مضمون عالی اور ہو پھر بھی سلیسؔ
کیا فصاحت اور بلاغت کا تھا سرچشمہ انیسؔ

ہر مودّب نام لیتا ہے ترا تہذیب سے
غیر نے بزمِ ادب میں کر لیا اپنا انیسؔ

نظم میں ایسا وحیدؔ عصر پیدا ہو گیا
پھر کوئی ثانی نظر آنے نہیں پایا انیسؔ

شاعروں میں سب سے فائق تجھ کو حالیؔ نے کہا
اور شبلیؔ نے بھی مانا ہے تجھے یکتا انیسؔ

محسنِ ملّت بنا اور عالموں کا ہم جلیسؔ
راج دھانی میں اودھ کی وہ ہوا پیدا انیسؔ

مرثیہ گوئی کا اب ایسا کوئی عارفؔ نہیں
مرثیہ کا آلِ احمدؐ کے شناسا تھا انیسؔ

چھپ نہیں سکتا کہیں پر بھی کلام ایسا نفیسؔ
تھا روانی میں عجب بہتا ہوا دھارا انیسؔ

ہر جگہ پر آج تک باقی ہے وہ طرزِ قدیمؔ
ایسی جدّت مرثیوں میں کر گیا پیدا انیسؔ

سن اکہتر میں منائی جائے برسی اس طرح
تاکہ دنیا پھر نہ بھولے کون تھا ایسا انیسؔ

سامنے شاہوں کے بھی اپنی ہوا کھوئی نہیں — تھا زمانے کا سلیماں شک نہیں اصلا انیسؔ

مدح کرتے عمر گزری پانچ پشتیں ہو گئیں — پنجتنؑ کے باغ کا تھا بلبلِ شیدا انیسؔ

شاہنامے سے کہیں بڑھ کر ہے اس کا مرتبہ — طمعِ دنیا کے لئے کہتا نہ تھا اصلا انیسؔ

حق نے بخشی تھی وہ کوثر کی زباں دھوئی ہوئی — مرثیہ کے واسطے پیدا ہُوا گویا انیسؔ

کس طرح کرتا ہے طے شب کی مسافت آفتاب — جو نہ ثابت ہو کبھی کرتا نہ تھا دعوا انیسؔ

جاں سپاہی کی اگر ہے، آبرو شاہوں کی ہے — کہہ گیا تلوار کی تعریف میں کیا کیا انیسؔ

مست تھے طائر ہوا میں دشت پھولوں سے بسا — کھینچتا تھا اس طرح سے صبح کا نقشہ انیسؔ

سارے عالم کو مسخّر کر لیا اک نظم سے — بن گیا ہے ثانیٔ اسکندر و دارا انیسؔ

صاف کہتا ہے یہ ہمدمؔ شاعروں کے سامنے
اب نہ ہوگا پھر کہیں ایسا کوئی پیدا انیسؔ

سیّد فیضی (راولپنڈی)

خدائے سخن میر انیسؔ

خلّاقِ حسنِ شعر، خدائے سخن انیسؔ　　زینت فزائے مملکتِ فکر و فن انیسؔ
مجلس انیسؔ، بزم انیسؔ، انجمن انیسؔ　　نورِ تخیّلات کا ہے بانکپن انیسؔ
حکمت کی روشنی ہے، فصاحت کا ذوق ہے
جادو بیاں انیسؔ دبستانِ شوق ہے

شعر و ادب کی مسندِ عزّت کے تاجدار　　اے نازشِ زمانہ و اے فخرِ روزگار
شاعر، ادیب، مرثیہ گو، منقبت نگار　　تیری زباں پہ عظمتِ لوح و قلم نثار
غم کو بھی دے کے ایک سلیقہ حیات کا
دروازہ تونے کھول دیا ہے نجات کا

تو آسمانِ شعر پہ ہر سُو ہے ضو فگن　　روشن ہے تیرے نور سے تاروں کی انجمن
لہجہ ہو تیرا، بات ہو، تیور ہو یا سخن　　اہلِ ادب کو خضر ہے تیرا ہر اک چلن
معیارِ فن جو تونے بنایا نہ رد ہوا
جو لفظ تونے باندھ دیا مستند ہوا

تیرا کمال نظم کے چہرے کی دلکشی　　تیرا کمال دانش و بینش کی روشنی
تیرا کمال معجزۂ تیغِ حیدری　　تیرا کمال مظہرِ دینِ محمدیؐ
تیرے کمال نے تجھے یوں جگمگادیا
مدّاحِ اہلِ بیتِؑ پیمبرؐ بنادیا

نغمہ بلب رہا تو ریاضِ رسولؐ میں فانوسِ غم جلائے ہیں طبعِ ملول میں
خوشبوئے اہلِ بیتؑ بھری پھول پھول میں پایا ہے کس نے اوج یہ حسنِ قبول میں

سبطِ نبیؐ کے ذکر سے جنّت خرید لی
دنیا کے ساتھ دین کی دولت خرید لی

زورِ بیان ایسا کہ فطرت ہے خود بھی دنگ مضمون ایک، بخشے ہیں اس کو ہزار رنگ
اسلوب نو بہ نو تو نیا ہے ہر ایک ڈھنگ رخصت ہو، ماجرا ہو، رجز ہو کہ اذنِ جنگ

ہر واقعہ مشاہدہَ اعتبار ہے
ہر منظر آئینے کی طرح آشکار ہے

ذرّے اُٹھا کے تونے بنائے ہیں کہکشاں فکر رسا کو بخشی ہے تنویر جاوداں
غم آفریں ہے کرب و بلا کی جو داستاں احسان ہے یہ تیرے تخیّل کا بے گُماں

تونے غمِ حسینؑ کے پرچم اُڑائے ہیں
زخموں کو گفتگو کے طریقے سکھائے ہیں

تیری زباں ہے غم کا قرینہ لئے ہوئے دل ہے تو وہ الم کا دفینہ لئے ہوئے
آنکھیں ہیں آنسوؤں کا خزینہ لئے ہوئے نوکِ مژہ ہو جیسے نگینہ لئے ہوئے

تیری نظر بلند ہے، مقصد عظیم ہے
تو حادثاتِ کرب و بلا کا کلیم ہے

سچ ہے ترے سوا سخن آرا کوئی نہیں اقلیمِ شاعری کا سہارا کوئی نہیں
دریا ہے تُو وہ جس کا کنارا کوئی نہیں وہ آگ ہے کہ جس میں شرارا کوئی نہیں

تیری ضیا ہے نورِ شہِ مشرقین سے
دُنیا نے تجھ کو جانا ہے نامِ حسینؑ سے

....

ڈاکٹر مسعود رضا خاکی (لاہور)

شاعرِ اعظم انیسؔ

(انیسؔ کی صد سالہ برسی کے سلسلے میں یہ نظم ہے)

عنوانِ نظم عظمت و شانِ انیسؔ ہے
اعجازِ فکر و نطقِ بیانِ انیسؔ ہے
اُردو ہے جس کا نام زبانِ انیسؔ ہے
ہم جس کے ریزہ چیں ہیں وہ خوانِ انیسؔ ہے
خیرات مانگ مانگ کے اس کے کلام سے
ہم رشتہ جوڑتے ہیں بقائے دوام سے

دنیا میں اب انیسؔ کا ممکن نہیں جواب
وہ شاعرِ حسینؑ وہ مدّاحِ بوترابؑ
انیسویں صدی کے افق کا وہ آفتاب
اب تک کھِلا رہا ہے چمن در چمن گلاب
اُردو کے اس چمن میں اسی کی بہار ہے
اس کا کلام نعمتِ پروردگار ہے

صدیوں اسی کی راہ کو تکتے ہیں بحر و بر
صدیوں کے بعد آتا ہے اس شان کا بشر
بنتی ہے کہکشانِ ادب جس کی رہگذر
تاریخ نام لکھتی ہے جس کا بہ آبِ زر
بڑھتا ہے اس کے دَم سے زباں کا وقار بھی
کہتے ہیں اس کو نابغۂ روزگار بھی

معراجِ شاعری ہے بلاغت انیسؔ کی
سرمایۂ زباں ہے وضاحت انیسؔ کی
سو سال سے ہے عزّت و شہرت انیسؔ کی
بڑھتی ہی جارہی ہے یہ دولت انیسؔ کی

نظریں ہماری کیسے کسی اور پر پڑیں
سورج غروب ہو تو ستارے نظر پڑیں

کوثر سے بھر کے لایا تھا وہ فکر کا سبو
استادہ بادشاہ رہے اس کے رُوبرو
سکّہ انیسؔ کا ہے رواں اب بھی کُو بکو
ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں اس میں نہیں غلو

پہلے بھی وہ رئیس تھا اب بھی رئیس ہے
اُردو زباں کا شاعرِاعظم انیسؔ ہے

خلشؔ پیراَصحابی (بھکرؔ)

میر انیسؔ کی شاعرانہ عظمت

بڑے نصیب تھے یاور، زبانِ اُردو کے ۔۔۔ انیسؔ رہبر و دمساز و چارہ ساز ملے
ہر اک زباں کا ادب چومتا ہے منھ اس کا ۔۔۔ یہ ناچتی ہے خوشی سے کہ دل نواز ملے

....

انیسؔ کون؟ سخن کے جواہرات کا کھیت ۔۔۔ انیسؔ کون جواں مرد کارزارِ سخن
انیسؔ کون؟ مضامیں کا دشت لا محدود ۔۔۔ انیس کون روانیٔ جوئبارِ سخن
انیس کون؟ اُجالا دیارِ اُردو کا ۔۔۔ انیسؔ کون گلِ دشتِ خارزارِ سخن
انیس کون؟ فرازِ سخن کی برف کی دھوپ ۔۔۔ انیس کون کہستانِ اعتبارِ سخن
انیس کون؟ خداوندگارِ طرزِ سخن ۔۔۔ انیس کون جمالِ رخِ نگارِ سخن

....

انیس کون؟ تخیّل کی بزم کا ساقی ۔۔۔ انیسؔ کون، نگہدارِ اقتدارِ سخن
انیسؔ کون؟ ریاضِ سخن کا ابرِ بہار ۔۔۔ انیسؔ کون؟ حبیبِ لبیبِ یارِ سخن
انیسؔ کون؟ شناورِ سرابِ ہستی کا ۔۔۔ انیسؔ کون سلیمانِ روزگارِ سخن

انیسؔ شعر کے دریا کی موجِ تیز خرام　　انیسؔ داورِ پہنائے روزگارِ سخن
انیسؔ لفظ و معانی کا ارتباطِ حسیں　　انیسؔ جلوۂ حسن و جمالِ یارِ سخن
انیسؔ دفترِ مضموں کا گنجِ بے پایاں　　انیسؔ خالقِ ابیات و کردگارِ سخن
انیسؔ فقر و قناعت کی عظمتوں کا پہاڑ　　انیسؔ باغِ شرافت میں جوئبارِ سخن

خلشؔ سناتے فسانہ انیسؔ کا سب کو
مگر ہے وقت کو مطلوب اختصارِ سخن

سید محمد جعفری (کراچی)

انیسؔ اور دبیرؔ

خلد میں پنجتنؑ پاک کی جو ہے جاگیر   ہیں رسولؐ اور علیؑ اور حسنؑ اور شبیرؑ
فاطمہؑ بیٹھی ہیں سر پر ہے ردائے تطہیر   اور حضوری میں ہیں موجود انیسؔ اور دبیرؔ

دونوں شاعر شہِ والا کی ثنا کہتے ہیں
حور و غلمان و ملک صلِّ علیٰ کہتے ہیں

دونوں سرکارِ حسینی کی محبّت کے اسیر   ان کو دنیا میں ملی شعر و سخن کی جاگیر
اِن میں سے ایک یہ بولا زہے میری تقدیر   "میں ثناخوانِ شہ دیں ہوں قیامت میں دبیرؔ"

"مُنہ بھرا جائے گا گوہر سے مقرّر میرا"
"خلد مسکن ہے مرا حصّہ ہے کوثر میرا"

اِس پہ بولے یہ انیسؔ آپ کی یہ فکرِ سخن   مستحق اِس کی ہے گوہر سے بھرا جائے دہن
ہے پُر از سوز و گداز اور بلیغ آپ کا فن   مدحتِ پنجتنؑ پاک میں سینچا ہے چمن

"اپنے موقع پہ جسے دیکھئے لاثانی ہے"
"لطف حضرت کا یہ ہے رحمت یزدانی ہے"

"نمکِ خوانِ تکلم ہے فصاحت میری"   "ناطقے بند ہیں سُن سُن کے بلاغت میری"
"رنگ اُڑتے ہیں وہ رنگیں ہے عبارت میری"   "شور جس کا ہے وہ دریا ہے طبیعت میری"

"عمر گذری ہے اسی دشت کی سیّاحی میں"
"پانچویں پشت ہے شبیرؑ کی مدّاحی میں"

بولے یہ مرزا کہ اے سیّدِ والا توقیر مدحتِ پنجتنؑ پاک کی ہے یہ تاثیر
کہ تمہیں اور مجھے حق سے ملی خیر کثیر "نذرِ زہرا کے لئے مجلسِ ماتم میں دبیرؔ"
"صدفِ چشم سے کیا کیا دُرِ شہوار آئے"
"میرے لینے کے لئے حیدرؑ کرار آئے"

روضۂ خلد میں بیٹھے تھے دبیرؔ اور انیسؔ ہمدم و ہم نظر و ہم سخن و یار و جلیس
یہ شہنشاہِ سلاست وہ بلاغت کا رئیس یہ سلیمان ہیں اور فکرِ رسا ہے بلقیس
"ذکرِ خالق میں لب اُن کے جو ہلے جاتے تھے"
"غنچے فردوس کے شادی سے کھلے جاتے تھے"

سیّد محمد جعفری (کراچی)

میر انیسؔ اور غالبؔ

میرؔ صاحب نے یہ فردوس میں غالبؔ سے کہا صفِ اوّل کے ادیب اور بہت سے شعرا
معترف ہیں کہ تمہیں حق سے ملی فکرِ رسا لکھؤ آئے مگر مرثیہ تم نے نہ پڑھا
اس قدر سلطنتِ فکر میں سیّاحی کی
کیوں نہ پھر حضرتِ شبیرؑ کی مدّاحی کی

بولے غالبؔ کہ مرا رنگِ سخن ہے تو نفیس میں سلیمانِ غزل فکرِ رسا ہے بلقیس
ہے تخیل مرا فردوس نشینوں کا جلیس غازۂ روئے ادب ہیں مرے اشعارِ سلیس
لیکن اندازِ سخن آپ کا کیسے پاؤں
شہپرِ حضرتِ جبریلؑ کہاں سے لاؤں

آپ کو ہے یہ سہولت کہ ہیں ممدوحِ امام جن کی توصیف میں آیا لبِ کوثر پہ پیام
ان کو تسنیم کی موجوں نے کیا اُٹھ کے سلام شوقِ مدّاحیٔ شبیرؑ کا یہ ہے انجام
عرشِ اعظم پہ ملک صلِّ علیٰ کہتے ہیں
آپ کو ذاکرِ شاہِؑ شہدا کہتے ہیں

نمکِ خوانِ تکلّم ہے فصاحت کس کی ناطقے بند ہیں سُن سُن کے بلاغت کس کی
رنگ اڑتے ہیں وہ رنگیں ہے عبارت کس کی شور جس کا ہے وہ دریا ہے طبیعت کس کی
آپ کا رنگ جدا اور مرا رنگ جدا
کس سے ہو سکتی ہے مدّاحیٔ ممدوحِ خدا

میر انیسؔ اس پہ یہ بولے کہ نہیں بھائی نہیں　　منقبت آپ نے مولا کی لکھی ہیں وہ حسیں
جن کو تسلیم کریں لوح و قلم، قلب و جبیں　　اُن سے ہو سکتی ہے آرائشِ فردوسِ بریں
مل ہی جاتا ہے جو ہوتا ہے کسی کا مقسوم
لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم

توسنِ طبع کو جب تم نے کیا ہے مہمیز　　مرثیے میں نکل آئے ہیں سخن دل آویز
تم نے اللہ سے کی تھی یہ دعا درد انگیز　　"غمِ شبیرؑ میں سینہ ہو یہاں تک لبریز"
"کہ رہیں خون جگر سے مری آنکھیں رنگیں"
جو ملا تم کو کسی کو کبھی ملتا ہے کہیں

گفتگو جاری تھی اور غیب سے آئی یہ صدا　　کردیا حقِ غزل حضرتِ غالبؔ نے ادا
میر صاحب کے لئے مرثیہ انعامِ خدا　　باغِ فردوس میں ہر پھول کی رنگت ہے جدا
"جس طرح کا بھی کسی میں ہو کمال اچھا ہے"
"کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے"

سیّد سردار حسین نقوی (کراچی)

نذرِ انیسؔ

رہے تا بہ حشر جو ضو فگن وہ مہِ دوام انیسؔ ہیں
جو دے مجلسوں کو حیاتِ نو وہ نیا نظام انیسؔ ہیں
گو وفات کو ہوئے سو برس ہے دلوں پہ نقش یہ ہر نفس
جو سخن کو بخش دے رفعتیں وہ بس ایک نام انیسؔ ہیں
ہے زبان پر یہ خطیب کے ہیں بیان سارے ادیب کے
جو ہے صحنِ شعر میں گامزن وہ مئے خرام انیسؔ ہیں
ہیں حقیقتوں کے یہ راز داں ہیں صداقتوں کے یہ ترجماں
وہ جو ہے زبانِ حسینؑ پر وہی ایک کلام انیسؔ ہیں
تھا حسینؑ جس کی نظر میں وہ سو وہی ہے مرکزِ لافنا
ہے خدا گواہ وہ باصفا وہ صد احترام انیسؔ ہیں
یہی فیض تو ہے حسینؑ کا یہ کرم ہے شاہِ حنین کا
قطعہ و رباعی و مرثیہ کا بس اختتام انیسؔ ہیں
جنھیں تابہ حشر نہ ہو فنا جنھیں ہر قدم پہ بقا بقا
جنھیں حق نے بخشی ہے فوقیت وہی لاکلام انیسؔ ہیں
میں لکھوں انیسؔ کی کیا ثنا تو ہی نقویؔ اب تو بتا ذرا
جو ہیں کربلا کی سحر انیسؔ تو نجف کی شام انیسؔ ہیں

سیّد نواب افسر (لکھنؤ)

میر انیسؔ

السلام اے چمن آرائے سخن میر انیسؔ
عزّتِ لفظ و بیاں شعر کی توقیر انیسؔ
فکرِ صالح تری صورت گرِ وجدانِ جمال
آئینہ خانۂ فطرت تری تعمیر انیسؔ

....

وہ طلاقت وہ فصاحت وہ ترنم وہ گداز
موج در موج ہے دریا کی روانی تو ہے
وہ تری قدرتِ اظہار وہ حسنِ بندش
روحِ الفاظ ہے خلّاقِ معانی تو ہے

....

ترے اشعار میں جذبات کی تصویریں ہیں
عالمِ دل کا ہے صد رنگ مرقّع ترا فن
سادگی بھی ہے سجاوٹ بھی ہے صنّاعی بھی
کہیں فطرت کے مناظر کہیں لفظوں کا چمن

....

صبح خود جھوم اٹھی اپنا قصیدہ سن کر
ایسا رعنائیِ فطرت کا سماں کھینچ دیا
نور و نکہت کا وہ عالم وہ چہکتے طائر
تو نے الفاظ میں جنّت کا سماں کھینچ دیا

....

روح بالیدہ ہو وہ حسن کا احساسِ لطیف
وہ مناظر وہ جمالِ رخِ زیبائے سحر
وہ تنوّع وہ تری جدّتِ فکر و اسلوب
کی ہے سو رنگ سے آرائشِ سلمائے سحر

....

ذکر گرمی کا جو نکلا تو بڑھا زورِ سخن
زندگی جلنے لگی شعلوں نے ڈیرے ڈالے
آگ برساتی ہوئی مہر کی سیدھی کرنیں
وہ فضا ڈال دے جو "پائے نظر میں چھالے"

....

کہیں شبنم کی تراوش تو کہیں بارش خوں
شفقِ شام کہیں طلعتِ ناہید کہیں
تند جھونکا کہیں صرصر کا، کہیں موجِ نسیم
نرمیٔ صبح کہیں گرمیٔ خورشید کہیں

....

تیری کردار نگاری ہے سخن کا اعجاز
جیسے تصویر کو ذی روح بنادے کوئی
گفتگو کا وہ سلیقہ وہ ادا وہ تاثیر
جیسے دل چیر کے جذبات دکھادے کوئی

....

کس کو ہے شرح وبیاں پر یہ تصرّف حاصل
کون کہہ سکتا ہے "قطرے کو میں قلزم کردوں"
ہے یہ دعویٰ تری خلاّقی فن کی آواز
"گنگ کو ماہرِ اندازِ تکلّم کردوں"

....

ہے سروکار نہ ہومر سے نہ ورجل سے تجھے
تیرے ہیرو ہیں نہ دیوتا نہ خیالی افراد
تو مقلّد ہے نہ ملٹن کا نہ اسپنسر کا
تیرے کردار حقیقی ہیں، ترا فن آزاد

....

تیرے عالم میں کوئی فرد نہیں فوق بشر
تونے احساس و تاثر کی سنواری ہے جبیں
تونے انسان کی عظمت کے جلائے ہیں چراغ
لیکن انسان کی فطرت سے الگ جاکے نہیں

....

تجھ سے روشن ہوا ہر شعبۂ تہذیبِ حیات
حسنِ اخلاق کے گیسو بھی سنوارے تونے
جس طرح طاق سے گلدستہ اٹھالے کوئی
بڑھ کے یوں توڑلئے عرش کے تارے تونے

....

قدرتِ فن کی نمائش نہیں مقصد تیرا
نہ ہیں پارینہ فسانے ترا موضوعِ سخن
تونے تخئیل کے ایواں بھی سجائے ہیں مگر
تیرے فانوس میں ہے شمعِ حقیقت روشن

....

تیرا اسکول ہے خود اپنی جگہ اک معیار
غم کی روداد بھی ہے جنگ کا ہنگامہ بھی
تونے اس طرح عناصر کو دیا ہے ترتیب
مرثیہ اک المیّہ بھی ہے رزمیّہ بھی

....

ہمہمہ ہے ترے لہجہ میں کہیں، سوز کہیں　　عرصۂ جنگ ترا عرصۂ قربانی ہے
چند پیاسے ہیں جو ٹکرائے ہیں طوفانوں سے　　اک تصادم ہے جو تاریخ میں لاثانی ہے

....

یادگار آج مناتا ہے تری تیرا وطن　　آج دنیا تجھے دیتی ہے عقیدت کا خراج
تو ہے وہ شاعر فطرت کہ ہمیشہ تجھ کو　　مہر و مہ پیش کریں گے تری عظمت کا خراج

....

صفیہ شمیم ملیح آبادی (اسلام آباد)

نذرِ میر انیس

سلام شاعرِ اعظم انیس نکتہ بیاں
جبینِ مرثیہ کو بخش دی ضیا تُونے
افق پہ، فکر کے تارے سجادیئے تونے
مزاجِ شعلہ و شبنم کو تولنے والے
بہارِ شامِ اودھ تجھ سے ارغوانی ہے
فروغِ بزمِ ادب شعلۂ بیاں تیرا
ترے کلام میں کلیوں کا بانکپن دیکھا
وہ مرثیہ ہو رباعی، سلام ہو کہ غزل
سلام گیسوئے اُردو سنوارنے والے
ترے چراغِ تخیّل میں نُورِ روئے حسینؑ
سلام صاحبِ لفظ و معانی و گفتار
ہر ایک موڑ پہ فطرت سے ہم کنار ہے تو
ترا علم بر عرش بریں جھمکتا ہے
سخن طراز بھی تو ہے سُخن نواز بھی تُو
ترے سبوئے سخن میں شرابِ عرفانی

سخن سخن میں ترے موجِ چشمۂ حیواں
سرودِ شعر کو بخشی نئی صدا تُونے
زمیں پہ نُور کے دریا بہا دیئے تُونے
چمن چمن میں نیا باب کھولنے والے
نئے چراغوں میں تیری ہی ضو فشانی ہے
نہ رُک سکا کسی منزل پہ کاررواں تیرا
ہر ایک موڑ پہ داغوں کا اک چمن دیکھا
ہر ایک بحرِ سخن میں کھلائے تونے کنول
بہارِ شعر و ادب کو نکھارنے والے
ہر ایک پھول میں تیرے ہے رنگ و بوئے حسینؑ
متاعِ اہلِ نظر تیری تابشِ افکار
کبھی گلوں کبھی شبنم کا رازدار ہے تو
تری شمیمِ سخن سے چمن مہکتا ہے
دلِ حیات میں تو سوز بھی ہے ساز بھی تُو
ترا کلام متاعِ حیاتِ رُوحانی

ترا کلام گلستاں پہ بارشِ الہام
ترے سخن پہ تصدّق سرورِ بادہ و جام

سلام میرِ سخن میرِ بزم میر انیسؔ
ترا کلام زمانے میں بے نظیر انیسؔ

ترا ہے لہجۂ شیریں کہ چشمۂ انوار
ترا بیانِ تصوّف کہ ابرِ گوہر بار

دیارِ فکر میں چھٹکی ہے چاندنی تیری
ہر ایک موڑ پہ ملتی ہے روشنی تیری

نہ تجھ سا کوئی سخن ساز نکتہ بیں دیکھا
ترے چمن کا زمانے کو خوشہ چیں دیکھا

گلوں سے دامنِ اُردو بسا دیا تونے
کلی کلی کو چٹکنا سکھا دیا تونے

ترے سخن کا ہیں عنواں حسینؑ ابنِ علیؑ
ترا یقیں ترا ایماں حسینؑ ابن علیؑ

ترا کلام فصاحت کا شاہکارِ حسیں
ترا بیان لطافت کا لالہ زارِ حسیں

غمِ حسینؑ نے بخشی ہے زندگی تجھ کو
علیؑ کے عشق نے بخشی ہے روشنی تجھ کو

چمن میں رنگ بدلتا رہے گا تیرا سخن
سُتونِ شعر و ادب بن چکا ہے تیرا فن

ملا ازل ہی سے تاجِ سخنوری تجھ کو
سلام کہتی ہے لیلائے شاعری تجھ کو

سلام صاحبِ عرفان صاحبِ ایجاد
ہر ایک موڑ پہ آتی رہے گی تیری یاد

وقارِ میرؔ بھی غالبؔ کا افتخار بھی تو
ادب کا فخر، فصاحت کا تاجدار بھی تو

سلام تجھ پہ کہ مدّاحِ بُوترابؑ ہے تو
غروب ہو نہ سکے ایسا آفتاب ہے تو

دیا ہے مرثیے کو رنگِ ارتقا تونے
عروسِ شعر کو بخشی نئی ادا تونے

ابد کی راہ میں ضو بار ہے چراغ ترا
چمن چمن میں فروزاں رہے گا داغ ترا

ہر ایک ساغرِ نو میں تری شرابِ کہن
سلام کہتی ہے تجھ کو بہارِ شعر و سخن

ہر ایک بزم میں چلتا رہے گا جام ترا
گُلوں کی طرح مہکتا رہے گا نام ترا

نئے چراغ جلاتی رہے گی تیری صدا
چمن کی رُوح جگاتی رہے گی تیری نوا

سلام ملکِ فصاحت کے تاجدار سلام
سلام آلِ محمدؐ کے جاں نثار سلام

سلام مدح سرائے رسولؐ ابنِ رسولؐ
تری لحد پہ ابد تک ہو رحمتوں کا نزول

زمیں سے تا بفلک گونجتا ہے تیرا کلام
انیسؔ میرِ سخن تجھ کو شاعروں کا سلام

نیساںؔ اکبر آبادی (اسلام آباد)

تاجدارِ اقلیمِ سخن

ہاں اے قلم انیسؔ کی مدحت میں ہو رواں
ہاں اے خرد وہ جوشِ بیاں ہو کہ نکتہ داں
یہ کہہ اٹھیں زمینِ سخن بھی ہے آسماں
مثلِ نجوم لفظ ہوں کاغذ پہ ضوفشاں
محفل سخن کی نورِ معانی سے جگمگائے
ہر اہلِ ذوق لطفِ کلامِ انیسؔ پائے

ہاں وہ انیسؔ جس نے نکھارا رُخِ سخن
ہاں وہ انیسؔ جس کا ہے شُہرہ چمن چمن
لفظوں کی آن بان سے شعروں میں ہے پھبن
اسلوبِ شاعری ہے کہ مصرعوں کا بانکپن
قدرت بیاں کی ایسی کسی کو ملی نہیں
جیسی انیسؔ کی ہے کوئی شاعری نہیں

اقلیمِ علم و فن کا درخشاں وہ تاجدار
میدانِ شاعری کا نمایاں وہ شہسوار
ایک ایک شعر جس کا ادب میں ہے شاہکار
وہ گل کھلائے اس نے کہ ہے آج تک بہار
سادہ بیانِ شعر میں اک رنگ بھر دیا
اُردو ادب کو زندۂ جاوید کردیا

اُردو کی اس سے پہلے یہ وُقعت ہوئی نہ تھی
تھی شاعری ضرور مگر زندگی نہ تھی
نبضِ سخن کو گویا حرارت ملی نہ تھی
ہاں نقطۂ عروج پہ یہ شاعری نہ تھی

حسنِ بیاں سے کیف کے دریا بہادیئے
اک جنبشِ قلم سے گلستاں کِھلادیئے

تھی مرثیہ کی صِنف زمانہ میں بے وقار
اس صِنف کا جہاں میں نہ تھا کوئی دوستدار
لطفِ بیاں سے ہو نہ سکی تھی یہ ہمکنار
اس صنفِ شاعری کو اسی کا تھا انتظار

جو اس خزاں نصیب چمن میں بہار لائے
اقلیمِ شعر و فن میں جو اک تاجدار لائے

آیا وہ تاجدار، فصاحت کا بادشاہ
جس کے بیاں میں زور تھا اور زور بے پناہ
لفظوں کے انتخاب پہ رکھتا تھا جو نگاہ
نورِ سخن سے جس کے پڑا ماند نورِ ماہ

ہر اک چراغِ شہرتِ شاعر بجھادیا
اپنے سخن کا سکّہ جہاں پر بٹھادیا

اس مرثیہ کی صِنف کو ایسا دیا کمال
اب تابقائے شعر نہ ہوگا اِسے زوال
جیسا انیسؔ کہہ گئے کہنا ہے اب محال
ہر بند بے نظیر ہے ہر شعر بے مثال

اک آفتاب بن کے جو چمکا انیسؔ ہے
شب کو دیا ہے جس نے اجالا انیسؔ ہے

رابعہ نہاںؔ (اسلام آباد)

انیسؔ تو ہے دبستانِ لکھنؤ کا سنگھار

ترے کلام کی ضو سے ہے شمعِ جاں روشن
کہ تیرا رنگِ بیاں فکر و فن کا ہے مینار
سخن میں ترے ابنِ بوتراب کا حسن
کہ لفظ لفظ میں پاتی ہوں کربلا کا وقار

ہے تجھ سے زندہ روایاتِ سوزِ دل کی بہار
انیسؔ تو ہے دبستانِ لکھنؤ کا سنگھار

تو استعاروں کا خالق، علامتوں کا امام
حدیثِ فکر ہے اہلِ سخن کو تیرا سلام
پہنچ سکا نہ کوئی تیرے غم کی عظمت تک
لکھا گیا نہ کسی صاحبِ قلم سے سلام

عظیم تر ہے ترا اہلِ فن میں نام و مقام
کہ تجھ کو ماتمِ شبیرؑ، دے گیا ہے دوام

پروفیسر حسن اکبر کمالؔ

”نذرِ انیسؔ“

بجا کہ میر تقی میرؔ ہیں خدائے سخن
سخن انیسؔ کا گویا ہے ماورائے سخن

بجز انیسؔ کہاں قادرالکلام ایسا
کہ مثلِ موجۂ تسنیم جو بہائے سخن

پھر اُن پہ کیوں نہ کرے ناز فنِ شعر و ادب
انیسؔ آئے ہی دنیا میں تھے برائے سخن

ہُنر سے اپنے محبت کدے بنانے کو
دِلوں میں اہل وِلا کے رکھی بِنائے سخن

یہ مرثیے نہیں ، کاغذ پہ اُس سخنور نے
ہیں پارہ ہائے جگر رکھ دیئے بجائے سخن

کیے جو لفظ ، مسیحائے لفظ نے زندہ
یہ کارِ عشق ہُوا ضامنِ بقائے سخن

سمودیا ہے سخن میں بیانِ ذبحِ عظیم
ہر ایک مرثیہ ہے گویا کربلائے سخن
وہ آسمان سے لائے تھے جن زمینوں کو
اُنہی میں پھولی پھلی فصلِ ارتقائے سخن
''خیالِ خاطرِ احباب چاہیئے ہر دم''
بجا ہے مشورۂ رمز آشنائے سخن
کمالِ فن ہے یہی ، قوّتِ ہُنر ہے یہی
ہو دل پہ نقش ، جو شاعر کے لب پہ آئے سخن
مصائب آپ نے کیا آنسوؤں سے لکھے تھے؟
کہ روئے جو بھی سُنے ، اور جو سُنائے سخن
مِلا نہ کاوشِ مدّاحِ اہلِ بیتؑ میں عیب
حریف ڈھونڈا کیے لغزش و خطائے سخن
کمالؔ ، اہلِ حشم بھی یہ خوب جانتے ہیں
دوام کس کو جہاں میں مِلا سوائے سخن

رہبر ہاشمی (کراچی)

بہ شانِ حضرت ببر علی میر انیسؔ

نقوشِ فطرتِ انساں اُبھار کر تُونے
بڑھادی حق کی قسم عظمتِ بشر تونے

حیات و موت کی واللہ لذّتوں سے انیسؔ
کیا ہے عالمِ انساں کو باخبر تونے

بیان کرکے شہِ دیں کے کارناموں کو
جہادِ حق کو کیا اور معتبر تونے

زمین کیا ہے فلک کے بھی واقعات لکھے
جہاں میں پائی ہے کیا وسعتِ نظر تونے

سُخن وروں سے خدائے سخن لقب پایا
وہ چھوڑا محفلِ ارباب میں اثر تونے

ثنائے آلِ محمدؐ رہا شعار ترا
خدا سے پائی ہے فکرِ رسا دگر تونے

انیسؔ میں بھی انھیں کا غلام ہوں رہبرؔ
رہِ وفا میں جو دیکھے ہیں راہبر تونے

سعیدہ نازؔ (کراچی)

بیادِ انیسؔ

شاعرِ اہلبیتؑ کیا کہنا — چاہیئے تجھ کو رہ نما کہنا
تو جہاں میں بہ آب و تاب آیا — شاعری میں اِک انقلاب آیا
ایسی فکرِ بلند ایسا دماغ — تیرے لفظوں کے جل رہے ہیں چراغ
کیا مزیّن ہے پردۂ تحریر — سرورِ کربلا کی ہے تصویر
تیرے لفظوں کا لشکرِ جرّار — اشقیا سے ہے برسرِ پیکار
یہ حسیں لفظ یہ تیرے اشعار — جیسے حورانِ خلد کی ہو قطار
اِس طرف تو چراغِ محفل ہے — اُس طرف رزم گاہ کا دِل ہے
صفِ اہلِ سخن کا تو ہے رئیس — اور آلِ رسولؐ کا ہے انیسؔ
تیرے شعروں کو ہے بقائے دوام — دعوتِ انقلاب تیرا کلام
کیا فصاحت ہے کیا بلاغت ہے — کیا روانی ہے کیا سلاست ہے
سیلِ جذبات میں سکوں پیہم — بادبانِ سخن ہے تیرا قلم
تیرا ہر مرثیہ ہے تابندہ — اُن سے ہی نام تیرا ہے زندہ

نازؔ کو ہے تیرے کلام پہ ناز
وہ سمجھتی ہے رفعتِ پرواز

سکندر حیاؔ بریلوی (کراچی)

میر انیسؔ

زمینِ شعر نظر آرہی ہے آئینہ
انھیں عروض و معانی کا آسماں کہئے

مہک اٹھے ہیں گلِ رحمتِ ولائے حسینؑ
جہانِ عقدِ ثریا کا بوستاں کہئے

ثنائے آلِ محمدؐ ہے نقطے نقطے میں
حدیثِ آلِ محمدؐ کا قصہ خواں کہیے

انیسؔ نے جو لکھا ہے وہ مستند ہے کلام
لکھا انھوں نے ہے جو کچھ اُسے زباں کہیے

انھیں جو لکھئے زمانے کا نکتہ داں لکھئے
انھیں جو کہئے تو سرمایۂ زباں کہیے

یہ کس کی جان کہ لے نام نکتہ چینی کا
زمینِ شعر کو پھر کیوں نہ آسماں کہئے

تمہاری فکر سے اعزاز بڑھ گیا اس کا
ہر ایک شعر کو سرمایۂ بیاں کہئے

حیاؔ جو لکھنا ہے تو مدحِ پنجتنؑ لکھئے
جو کچھ بھی کہنا ہے اس غم کی داستاں کہئے

اعجاز رحمانی (کراچی)

انیسؔ بزمِ سخن بلبلِ ریاضِ رسولؐ

میں آج روح سے تیری ہوں ہم کلام انیسؔ
ہے میری نظم کا عنوان تیرا نام انیسؔ

تو اپنے عہد میں یکتائے روزگار رہا
فروغِ مذہب و ملت ترا شعار رہا

خدا کی حمد لکھی نعت مصطفیٰؐ لکھی
اِس التزام سے تاریخ کربلا لکھی

ترے سخن میں بلاغت کی آب و تاب رہی
زبان شہدِ فصاحت سے کامیاب رہی

ہر ایک تیرِ بلاغت تری کمان میں تھا
فصاحتوں کا سمندر تری زبان میں تھا

بھرے شرابِ سخن سے دل و نظر کے ایاغ
ہر انجمن میں جلائے حسینیت کے چراغ

ہر اک چمن میں بکھیرے ہیں تو نے فکر کے پھول
انیسؔ بزمِ سخن بلبلِ ریاضِ رسولؐ

سخن سے تو نے مسخّر ہر ایک دل کو کیا
لیا وہ کام قلم سے جو تیغ سے نہ ہوا

صدا کسی کی ترے سامنے اُبھر نہ سکی
کوئی زباں ترے لہجے میں بات کر نہ سکی

ہے تیرے سر کے لئے تاجِ مرثیہ گوئی
ترا کلام ہے معراجِ مرثیہ گوئی

اُن ہی میں فکرِ سخن اب ہے نکتہ چینوں کو
تو آسمان سے لایا تھا جن زمینوں کو

جو مجلسوں میں خواص و عوام پڑھتے ہیں
ترا کلامِ بلاغت نظام پڑھتے ہیں

چراغِ مرثیہ گوئی ہے جب تلک روشن
رہے گا تیری قلمرو میں یہ جہانِ سخن

میں اپنے فکر کے خاکے میں رنگ بھرتا ہوں
تجھے خراجِ عقیدت میں پیش کرتا ہوں

اعجاز رحمانی (کراچی)

یہ ملکِ سخن تری قلم رو میں رہے گا

تجھ سا نہیں انیسؔ کوئی مرثیہ نگار　　ہر مرثیہ ہے تیرا حقیقت میں شاہکار
ایک ایک شعر تیرا نہ ہو کیوں جگر فگار　　تلوار سے بھی تیز ہے تیرے قلم کی دھار
تجھ سے رہے گی دور زمانے کی ہر بلا
لکھی ہے تونے خون سے تاریخِ کربلا

بزمِ سخن میں اہلِ سخن کا ہے تو امام　　روشن ہے آفتاب کی مانند تیرا نام
مدّاحِ اہل بیتؑ میں افضل ترا مقام　　مقبولِ بارگاہِ حسینی ترا کلام
اشعار تیرے غم کے چھلکتے ایاغ ہیں
روشن ترے خیال سے کتنے دماغ ہیں

ملتی نہیں ہے بزمِ سخن میں تری مثال　　تیرا عروج وہ ہے نہیں ہے جسے زوال
روشن ہے تیری فکر سے ہر جادۂ خیال　　تیری روش پہ چلتا ہے ہر صاحبِ کمال
روشن ہیں بزمِ اہل سخن میں عجب چراغ
تیرے چراغ ہی سے جلاتے ہیں سب چراغ

ذرّے کو آفتاب کا ہمسر بنادیا　　قطرے پہ کی نظر تو سمندر بنادیا
کانٹے کو رنگ دے کے گلِ تر بنادیا　　دنیائے علم و فن کا مقدّر بنادیا
جامِ کہن سے خوب مئے نو کشید کی
بنیاد تونے ڈال دی نظمِ جدید کی

شہرِ سخن میں ترے طرف دار ہیں بہت آئینہ تو ہے آئینہ برادر ہیں بہت
تیرے جلو میں حق کے پرستار ہیں بہت غم خوارِ کربلا ترے غم خوار ہیں بہت
تاجِ سخنوری کا سزاوار کون ہے؟
گر تُو نہیں تو قافلہ سالار کون ہے؟
تجھ سا سخنوروں میں نہیں کوئی محترم تیرا قلم ہے حضرتِ عباسؑ کا علم
کاٹ اس کی ذوالفقارِ علیؑ سے نہیں ہے کم بے شک نشانِ فتح و ظفر ہے ترا قلم
خورشید جس طرح ہے تگ ودو میں آج بھی
مُلکِ سخن ہے تیری قلمرو میں آج بھی

اعجاز رحمانی (کراچی)

سخن ہے جس کا ہر اک کان میں گہر کی طرح

ضیائے بزمِ ادب شمعِ ذی وقار انیسؔ برائے شعر و سخن وجہِ افتخار انیسؔ
جہانِ فکر میں یکتائے روزگار انیسؔ انیسؔ کون وہی مرثیہ نگار انیسؔ

وہ جس کی فکر پہ احساسِ برتری ہے نثار
وہ جس کے نام پہ اقلیمِ شاعری ہے نثار

وہی انیسؔ کہ معیار ہے قلم جس کا وہی انیسؔ کہ معمار ہے قلم جس کا
وہی انیسؔ کہ گل زار ہے قلم جس کا وہی انیسؔ کہ تلوار ہے قلم جس کا

خطوط وہ دمِ تحریر کھینچ دیتا ہے
کہ رزم و بزم کی تصویر کھینچ دیتا ہے

وہ جس کا رنگ کبھی فق نہیں سحر کی طرح نہیں وہ حسن جو ڈھل جائے دوپہر کی طرح
سخن ہے جس کا ہر اک کان میں گہر کی طرح وہ جس کی فکر میں وسعت ہے بحر و بر کی طرح

غریق موجِ سخن تھا کہ سر اٹھا کے چلا
حباب پھوٹ کے روئے جو وہ نہا کے چلا

تمام عمر جو مدّاح اہل بیتؑ رہا قصیدہ غیر کا جس نے کبھی کہا نہ پڑھا
کبھی نہ کھوئی سلیمانِ فن کے اپنی ہوا دل و نظر میں رہے واقعاتِ کرب و بلا

بہرِ اصول جو کانٹوں میں پھول بن کے رہا
وہ عندلیبِ ریاضِ رسولؐ بن کے رہا

ذرا جو دامنِ افکار کو نچوڑ دیا   دل و نگاہ کے احساس کو جھنجھوڑ دیا
ہر ایک نقطہ کو آپس میں ایسے جوڑ دیا   کہے وہ شعر کہ جیسے قلم کو توڑ دیا

کوئی جواب فصاحت میں ہو نہیں سکتا
کلام اس کی بلاغت میں ہو نہیں سکتا

تھے کل بھی اور ہزاروں ہیں آج بھی فنکار   سخن شناس، سخن فہم، صاحبِ اشعار
بہت سے لیلیٰ فن پر ہیں جان ودل سے نثار   ہے اب بھی باغِ سخن میں طرح طرح کی بہار

بدلتے جائیں گے عنوان ہر فسانے میں
کوئی انیسؔ نہ ہوگا مگر زمانے میں

انیسؔ مرثیہ گویوں میں بے مثال ہے تو   کمال جس پہ فدا ہے وہ باکمال ہے تو
برائے علم و ادب مہرِ لازوال ہے تو   سخنوروں کے لئے آج بھی سوال ہے تو

ترے خیال کا جادہ بدل نہیں سکتا
تری روش پہ کوئی اب بھی چل نہیں سکتا

....

ہلال نقوی (کراچی)

انیسؔ! خُلقِ خلیقؔ و دبیرِؔ پاک ضمیر
رئیسِؔ فکر! نفیسؔ و سلیسؔ ہر تحریر
بہ فیضِ اُنسؔ و غمِ آلِ، مونسِؔ شبیرؑ
امیرِ شعر و ادب، خادمِ جنابِ امیرؑ
عروجِ فکر و تخیّل کی انتہا ہیں انیسؔ
پیمبرِ سخن و دینِ مرثیہ ہیں انیسؔ

باقر رضوی امانت خانی (حیدر آباد دکن)

میر انیسؔ

مردِ میدانِ سخن تھے فن کے ماہر تھے انیسؔ
جس کو فطرت نے سنوارا تھا وہ شاعر تھے انیسؔ

ان کے جوہر نے کیا احساں سخن کے تاج پر
مرثیہ گوئی کو پہنچایا حدِ معراج پر

نطق کی قوت زباں کھلتے ہی بلبل بن گئی
اِن کی ہر نازک خیالی خود رگِ گُل بن گئی

نقش مضموں کے بنائے ہیں نرالے رنگ سے
ایک منظر کو دکھاتے ہیں یہ سو سو ڈھنگ سے

شعر خود صورت گرِ رنگیں بیانی ہو گیا
لفظ جو کاغذ پہ لکھا نقشِ مانی ہو گیا

جنگ کا نقشہ دکھایا ہے عجب عنوان سے
تیغ کی جھنکار آئی رزم کے میدان سے

ان کے باغِ فکر میں ملتا نہیں ہے کوئی خار
آئی پھولوں کی مہک جس وقت لکھی ہے بہار

مدحتِ عباسؑ کی آبِ بقا میں ڈوب کر
لکھے کیا کیا مرثیے رنگِ وفا میں ڈوب کر

چشمِ حق آگاہ میں ان کا بڑا معیار ہے
ان کا ہر اک مرثیہ اُردو کا اک شہکار ہے

رکھتے ہیں خاکِ زمین شعر یہ چھانی ہوئی
ان کے گھر کی ہے زباں آفاق میں مانی ہوئی

آئینہ، اقسامِ صنعت کا بنا ان کا کلام
جانتے تھے وہ صنائع اور بدائع کا مقام

دلربائی کا سلیقہ ہے ادائے پند میں
روزمرہ کی مثالیں ملتی ہیں ہر بند میں

بھر دیئے ہیں مرثیوں میں اپنے فن کے سب ہنر
دیکھ کر بندش کی چستی چست ہوتی ہے نظر

نظم میں تشریح کر دی صنعتوں کے نام کی
شعر میں تصویر کھینچی صنعتِ ایہام کی

ان کو حاصل تھی بلاغت صرف کرنے کی تمیز
کہتے ہیں جس کو فصاحت ان کے گھر کی تھی کنیز

لیتی ہے تشبیہ ان کے جوہرِ قابل کا دل
استعاروں کے اشاروں نے لیا محفل کا دل

کیا سنوارا صنعتِ تفصیل کی تسبیح کو
ہوں عرب حیراں جو دیکھیں صنعتِ تلمیح کو

آئینہ افکار کا طرزِ بیاں کیوں کر نہ ہو
صیقلِ تیغِ زباں ان کی زباں کیوں کر نہ ہو

سیکڑوں الفاظ سے، دامن زباں کا بھر دیا
یعنی اردو کے خزانے میں اضافہ کر دیا

لفظیں ڈھلتی ہیں جہاں وہ ہی دبستانِ انیسؔ
کیوں نہ ہو اردو زباں پر بارِ احسانِ انیسؔ

جب قلم چلنے لگا ان کا تو مستانے گرے
شمعِ کاغذ پر جو لکھا آ کے پروانے گرے

نطق کی طاقت کو اعجازِ تخیّل کر دیا
فن کی صنعت سے گُلِ مضموں کو بلبل کر دیا

کس قیامت کا اثر انگیز ہے طرزِ بیاں
آشیاں لکھتے ہی بجلی گر گئی اُٹھا دھواں

پھول الفت کا تغزل کی نشانی ہو گیا
رنگ یوں نکھرا زلیخا کی جوانی ہو گیا

اُلجھنیں طرزِ ادا میں اُن کی آئیں گی کہاں
ان کے ہی افکار ہیں مشاطۂ زلفِ زباں

ان کے لفظوں کے جو نقطے تھے وہ مہ پارے بنے
اِس طرح ذرّے زمینِ شعر کے تارے بنے

اک نمونہ یہ ہے ان کی جدّتوں کے ذکر کا
آشیاں کے ہے گلے میں ہار برقِ فکر کا

درد کی دنیا میں احساسات کو پالا کئے
قلب کے جذبات کو اشعار میں ڈھالا کئے

حالِ خیبر ان کی جب فکرِ رسا لکھنے لگی
خود قلم چلتے ہوئے پڑھنے لگا نادِ علیؑ

رنگ ان کا گلستاں کے رنگ سے پیوستہ ہے
مرثیہ ہر ایک ان کا خوشنما گلدستہ ہے

صبحِ عاشورا کے منظر سے سویرا ہو گیا
ذکر سے شامِ غریباں کے اندھیرا ہو گیا

رہ گئی باقی نہ اُلجھن درد کے دستور میں
کس قدر شانہ کیا زلفِ شبِ عاشور میں

کربلا کا ذکر دریا کی روانی ہو گیا
تشنگی کے حال پر پتھر بھی پانی ہو گیا

کر دیا بے شک زمینِ شعر کو یوں آسماں
فخرِ موسیٰؑ اور وہ طورِ شہادت کا بیاں

مرثیوں کے بین نے یوں جوش پیدا کر دیا
شاہ کے غم میں ہر اک آنسو کو دریا کر دیا

درد کی تاثیر میں آپ اپنی یہ تمثال ہیں
ہیں پرانے مرثیے لیکن نئے ہر سال ہیں

آب رکھتے ہیں یہ مضموں کے گہر اب تک وہی
پڑھتے ہیں ہر سال باقی ہے اثر اب تک وہی

کیا قیامت کا اثر ہے بین کے آہنگ میں
ڈھل گئی ہیں مجلسیں ان مرثیوں کے رنگ میں

قدرتی باندھا سماں روشن نظر ہونے لگی
صبح کا منظر دکھاتے ہی سحر ہونے لگی

مرثیوں میں جمع کر دی کائناتِ تشنگی
چند لفظوں میں بہائی ہے فراتِ تشنگی

جم گئی تھی نظم پر ان کی زلیخائی نظر
ذکر پیری میں جوانیٔ سخن آئی نظر

رکھ لیا ان کی زباں نے آج اردو کا بھرم
مرثیے لکھتے ہیں ایسے توڑ ڈالا ہے قلم

بات جوان میں تھی وہ اب تک کسی میں بھی نہیں — سیکڑوں آئے نظران کے سخن کے خوشہ چیں
بند لکھے مرکبِ شبیرؑ کی توصیف میں — فکر کے جوہر دکھائے تیغ کی تعریف میں
ختم ہوتی ہے کہاں جاکر کمالِ فن کی حد — مرثیہ ان کا لغت ہے ان کا فرمانا سَنَد
فکر کا ان کی نتیجہ ہے کہ اک اعجاز ہے — شاعری پر ان کی خود اردو زباں کو ناز ہے

قول ہے باقرؔ دبیرِؔ خوش بیاں کا کیا نفیس
طورِ سینا ہے کلیم اللہ منبر ہے انیسؔ

قاسم شبیر نقوی نصیر آبادی (دہلی)

شاعرِ اعظم انیسؔ

اے مرے ہندوستاں کے شاعرِ اعظم! سلام
تیری روحِ پاک پر انسان کا پیہم سلام

کم نظر کہتے ہیں جس کو صرف قومی شاعری
اہلِ دل پاتے ہیں اُس میں زندگی ہی زندگی

تیرا فن اک سحر تھا، اعجاز تھا، الہام تھا
تیرا اِک اِک لفظ ادب کی زیست کا پیغام تھا

کتنی تصویریں دکھادیں درد کے جذبات کی
تھی ترے دستِ قلم میں نبض نفسیات کی

زندگی احساس کو بخشی ہے غم کے ذکر سے
ذہن و دل روشن ہوئے تیرے عُلوئے فکر سے

یوں بنائی صبح لفظوں میں سویرا کردیا
ذہنِ انسانی کے گوشوں میں اُجالا کردیا

جب تصوّر نے ترے شامِ غریباں دیکھ لی
چشم و دل میں عظمتِ احساسِ غربت بڑھ گئی

تیرا مصرع قطرۂ خوں، بیت تیری غم کدہ
کرب کے اظہار میں تھا ہر نفَس خود سانحہ

رچ گئی تھی کربلا کی روح احساسات میں
کتنے افسانے نکلتے تھے تری اک بات میں

معجزہ تخئیل کا تھا، یا تری منظر کشی
کربلا کی جنگ اک تصویرِ زندہ بن گئی

تھی زباں ہندی شعور و فکر کی آماج گاہ
جس میں آئینہ بنی قومِ عرب کی رسم و رَاہ

عشق کی روداد، دردِ دل کا سارا تذکرہ
کیسے پتھریلے دلوں پر نقش بن کر رہ گیا

اللہ اللہ تیری تفسیرِ حقیقت کی زباں
قہقہوں سے آنسوؤں تک ایک سا زورِ بیاں

"بزم" کی تکمیل جیسے فکرِ سعدؔی کی بہار
"رزم" کی تفصیل جیسے "شاہنامے" کا نکھار

مرثیے ہیں عشق کی اِک دولتِ بیدار بھی
آدمیت کے لئے گنجینۂ اسرار بھی

مخزنِ شعری ترا اعجاز بھی، جادو بھی ہے
اِس خزانے میں بقائے عزّتِ اُردو بھی ہے

....

حسین اعظمی (کراچی)

انیسؔ

یہ امر واقعی ہے مرا اِدّعا نہیں شاعر انیسؔ کا سا کوئی دوسرا نہیں
اُس کا کلام گو کہ کلامِ خدا نہیں پھر بھی جواب اس کا کوئی لاسکا نہیں
اشعارِ آبدار میں موتی پروئے ہیں
کوزوں میں علم و فکر کے قلزم سموئے ہیں

○

انسانی نفسیات کا وہ تھا مزاج داں فطرت کا ترجمان، حقیقت کا ہم زباں
جو بات اُس نے نظم کی ہوتا ہے یہ گماں موجود خود تھا جیسے کہ وہ خوش بیاں وہاں
لفظوں کے قالبوں میں بشر ڈھالتا تھا وہ
عیسیٰ نفس تھا مُردوں میں جاں ڈالتا تھا وہ

○

مشّاطۂ عروسِ جمالِ سخن تھا وہ پارکھ تھا نقد شعر کا، میزانِ فن تھا وہ
بانی تھا طرزِ نو کا، روایت شکن تھا وہ خود بوستانِ نظم تھا، اک انجمن تھا وہ
تحریر اُس کی سحر کا نعم البدل بنی
جو بات اُس نے کہہ دی وہ ضرب المثل بنی

○

اُس کا قلم تھا حق و صداقت کا آئینہ   انسان دوستی کا شرافت کا آئینہ
کردار ساز علم و ہدایت کا آئینہ   تبلیغ دیں کا جوشِ شہادت کا آئینہ
وہ ترجمانِ مقصدِ ذبحِ عظیم تھا
وہ طورِ دشتِ کرب و بلا کا کلیم تھا

○

حق کوش و حق فروغ و حقیقت نگار تھا   دینی صداقتوں کا وہ آئینہ دار تھا
مظلوم کا رفیق تھا، ظالم شکار تھا   اُس کا قلم بھی ہم روشِ ذوالفقار تھا
باطل شکن تھا ضربِ یداللہ کی قسم
مرحب فگن تھا حربِ یداللہ کی قسم

○

رفیق رضوی (کراچی)

میر انیسؔ

دشت و دریا، درو دیوار کی آواز انیسؔ　　گوہر و خشت، گل وخار کی آواز انیسؔ
ہمت و جرأت و افکار کی آواز انیسؔ　　یعنی ہر قوتِ اظہار کی آواز انیسؔ

فکر فانی ہے نہ افکار ہیں فانی اس کے
ہم نوا ہیں لغت و لفظ ومعانی اس کے

اس کی آواز ہے ہر غنچہ دہن کی آواز　　اس کی آواز ہے ہر صنفِ سخن کی آواز
اس کی آواز ہے ہر سروِ سمن کی آواز　　اس کی آواز ہے یارانِ چمن کی آواز

مثنوی شوکتِ الفاظ و معانی مانگے
مرثیہ اس کے تکلّم سے جوانی مانگے

اس کی آواز ہے گلزار و صبا کی آواز　　اس کی آواز ہے طوفان و ہوا کی آواز
اس کی آواز ہے انعام و وفا کی آواز　　اس کی آواز ہے مردانِ خدا کی آواز

نیزہ و دمدمہ و تیغ و تبر کی آواز
اس کی آواز ہے جبریل کے پر کی آواز

دہر سے جہل کے اثرات کو کم اس نے کیا　　ایک ہی بات کو سو طرح رقم اس نے کیا
وادی و دشت کو فردوس وارم اس نے کیا　　حد تو یہ نوکِ قلم کو بھی قلم اس نے کیا

نازکی ہے نہ مضامین میں بارکی ہے
جس جگہ اس کی تانئی نہیں تاریکی ہے

لفظ کے کاکل و گیسو کو سنوارا اس نے　　حرف کے نقطہ و پہلو کو سنوارا اس نے
غازۂ فکر سے گل رو کو سنوارا اس نے　　نظم کے چہرہ و ابرو کو سنوارا اس نے
نونہالانِ زباں اس کے سبب شیر ہوئے
متند اس کے سخن سے زبرو زیر ہوئے

حلم، اوصاف، کرم، فہم، متانت، اطوار　　علم، ادراک، عمل، ذہن، تبحّر، کردار
بین، آداب، فنِ حرب، خموشی، گفتار　　نیمچہ، تیغ، تبر، گُرز، کٹاری، تلوار
اس کی محفل نہ کسی چیز سے خالی پائی
اس کی اقلیم سخن سب سے نرالی پائی

مصحفِ رخ کی اُسے قوّتِ تفسیر ملی　　نور سے پنجتنؑ پاک کے تنویر ملی
اس کو دربارِ محمدؐ سے یہ توقیر ملی　　دہر میں نام ملا، خلد میں جاگیر ملی
"دردِ سر ہوتا ہے بے طور نہ فریاد کریں"
"بلبلیں اس سے گلستاں کا سبق یاد کریں"

اس کا بے مثل ہے اندازِ بیاں اے رضوی　　ڈال دی اس نے تنِ بیت میں جاں اے رضوی
اس نے ذروں کو کیا کاہکشاں اے رضوی　　مستند دہر میں ہے اس کی زباں اے رضوی
حرف و الفاظ کے لشکر کا علمدار ہوا
فوج ایسی نہ ہوئی، ایسا نہ سردار ہوا

ڈاکٹر مقصود زاہدی (راولپنڈی)

مقامِ انیسؔ

فن جس پہ ہے ناز اں وہ سخنور ہے انیسؔ　　افکار کے گلشن کا گُلِ تر ہے انیسؔ
اصنافِ سخن رہتی ہیں اس کی جویا　　دریائے فصاحت کا شناور ہے انیسؔ

....

فنکار کہاں تجھ سا حق آگاہ انیسؔ　　ہے عرش سے بھی آگے تیری راہ انیسؔ
شاہوں کی مدح تجھ کو گوارا نہ ہوئی　　ہے ملکِ سخن کا تو شہنشاہ انیسؔ

....

ہے رزم کی شاعری میں نایاب انیسؔ　　آمد ہے کہ دریا کا ہے سیلاب انیسؔ
مضمون چلے آتے ہیں موجوں کی مثال　　ہر بحر میں ہوجاتا ہے پایاب انیس

....

ہر نوع کے ہر رنگ کے افکار دیئے　　کیا تازہ مضامین کے انبار دیئے
اُردو کا خزانہ تہی دامن تھا بہت　　تونے اسے لاکھوں دُرِ شہوار دیئے

....

تاثیرِ سخن کی ہے سند تیرا کلام　　ہے رفعت تخیل میں بالا ترا نام
ہے مرثیے کی صنف کا حرفِ آخر　　ہے رزمیہ شاعری کا تو ماہِ تمام

....

ہیں صوت و حرف کے جال بننے والے　　　لیکن ہیں کہاں خیال چُننے والے
اللہ ترے سخن کی تاثیر انیسؔ　　　سر دھنتے ہیں باکمال سننے والے

....

فطرت کے مظاہر تھے نہ موسم کا سماں　　　قدرت کے مناظِر کا نہ تھا نام و نشاں
اردو کا چمن تونے سنوارا ہے انیسؔ　　　تھے اس میں یہ گلہائے مضامین کہاں

....

ہر مرثیے سے شان نرالی ہے عیاں　　　ہے آج بھی تازہ تر اندازِ زباں
ہر رنگ کو سو رنگ سے باندھا تونے　　　ہر بندشِ مضمون ہے معراجِ بیاں

....

پیدا کوئی تجھ سا دُرِ یکتا نہ ہوا　　　شاعر تو ہوئے لاکھ پہ تجھ سا نہ ہوا
یہ پوری صدی دے نہ سکی تیرا جواب　　　پھر تجھ سا کوئی فن میں یگانہ نہ ہوا

....

لاریب کہ رشکِ مہ و انجم تھا انیسؔ　　　افکار کی موجوں میں سدا گم تھا انیسؔ
جو صورتِ دریا ہمہ تن جوش رہا　　　وہ بحرِ معانی کا تلاطم تھا انیسؔ

....

کیوں بحرِ ادب میں نہیں گوہر پیدا　　　کیوں تیغِ زباں میں نہیں جوہر پیدا
کیوں لا نہ سکی ایک صدی تیرا جواب　　　کیوں ہو نہ سکا تجھ سا سخنور پیدا

....

دنیائے سخن میں ہے اُجالا تجھ سے　　　ہے شاعری کا اوج دوبالا تجھ سے
ہے فن کے لئے فخر کے قابل تری ذات　　　فنکار کہاں ہوتے ہیں اعلیٰ تجھ سے

....

کیا مرثیے کا حسن نکھارا تونے　　　ہے بیت و رباعی کو سنوارا تونے
پہنچایا اسے فرش سے تا منزلِ عرش　　　جس صنف پہ بڑھ کے ہاتھ مارا تونے

....

کبیر انورؔ جعفری (جھنگ)

یادِ انیسؔ

کتنے پیارے شعر ہیں مہکی سی گفتاروں کے بیچ
پھول بھی بکھرے ہوئے ہیں تیری رفتاروں کے بیچ

تیرے فنِ شاعری کی پیروی کرتے ہوئے
مرثیہ خواں سب نظر آتے ہیں درباروں کے بیچ

تو نظر آتا نہیں آنکھوں سے اوجھل ہے مگر
ہو رہی ہیں محفلیں تیرے پرستاروں کے بیچ

رنگ لایا تھا مگر تیرے قلم کا معجزہ
مرثیے لکھے گئے کوفے کی دیواروں کے بیچ

مجلسِ شاہِ شہیداں پر نہیں موقوف کچھ
ذکر ہوتا ہے ترا دنیا کے بازاروں کے بیچ

رہتی دنیا تک یہی ہوتا رہے گا روز و شب
نام ہے زندہ ترا تا حشر اخباروں کے بیچ

ہے کبیرؔ انور انیسؔ نکتہ پرور کا غلام
نام کیوں چمکے نہ اس کا آج فنکاروں کے بیچ

سیّد مرتضیٰ حسین فاضلؔ (لاہور)

فی البدیہہ

انیسی دور کی پہلی صدی میں　　یہ بھاول پور کو عزت ملی ہے
پہل کردی سکندر نے یہاں سے　　نظر کی بحث کی دعوت ملی ہے
انیس بے بدل اردو کا ہومر　　کہ جس سے شعر کو سطوت ملی ہے
ادب کا شاہِ والاجاہ تھا وہ　　خدا سے کیا اسے عظمت ملی ہے
جہانِ لفظ و معنی زیر فرماں　　ستاروں تک اسے قدرت ملی ہے
نظر میں طرفگی لہجہ میں تیور　　ادب کو ندرت و جرأت ملی ہے

انیسؔ ملتِ فکر و نظر سے
ہماری فکر کو وسعت ملی ہے

جعفر طاہر (جھنگ)

نذرِ انیسؔ

نہ پوچھ ہم سے جو دنیا میں گھوم کر دیکھا
نگار خانۂ کونین کس قدر دیکھا

نہ پوچھ کشورِ ہستی میں کس طرح گذری
قدم قدم پہ یہاں جلوۂ دِگر دیکھا

فرازِ دار پہ مطلوب عیسیٰؑ مریم
وہ گرم ریت پہ سلطان بحر و بر دیکھا

علیؑ پہ مسجد کوفہ میں ایک تیغ اٹھی
لہو میں رُوئے پیمبرؐ کو تر بتر دیکھا

خمیر و خاصیتِ خونِ کوفیاں دیکھی
سرِ حسینؑ بھی نیزے کی نوک پر دیکھا

نظر پڑے کبھی حسرت سرشتگاں کے مزار
سوئے فرات جو دیکھا بہ چشمِ تر دیکھا

ہوا مخالف و طوفانِ تیز و بحرِ بلا
نہنگِ زخم رسیدہ بھنور بھنور دیکھا

رہِ وفا میں جلاتے گئے لہو سے چراغ
خلوص و جذبۂ یارانِ ہم سفر دیکھا

یہ چند شعر زمینِ انیسؔ میں طاہرؔ
لہو لگا کے شہیدوں میں نام کر دیکھا

....

قیصرؔ بارہوی (لاہور)

انیسؔ

کاروانِ فکر ہے ممنونِ اِحسانِ انیسؔ — آبروئے نظم باقی ہے بہ فیضانِ انیسؔ
کیا گھٹا سکتی ہے دُنیا عظمت و شانِ انیسؔ — ہم عزاداروں کے سینے ہیں خیابانِ انیسؔ
کروٹیں لے گی نسیمِ لفظ و معنی جس قدر — پھیلتی جائے گی خوشبوئے گلستانِ انیسؔ
سو برس سے جستجو میں ہے عقابِ شاعری — کوئی تو انساں بتائے حدِّ اِمکانِ انیسؔ
مرثیہ بزمِ ادب کی رُوح کہلانے لگا — فکر کے پردے پہ یوں اُبھرا قلم دانِ انیسؔ
دیکھنے والے تعصّب کے جھروکوں سے نہ دیکھ — آسماں سے گفتگو کرتا ہے دیوانِ انیسؔ
اے قلم کارِ تغیّر تو مٹا سکتا نہیں — داستانِ کربلا ہے شرحِ دیوانِ انیسؔ
ہوشیار اے اختلاف انگیز نظروں کے ہجوم — کربلا والے بہتّر ہیں نگہبانِ انیسؔ
جن کی تابانی سے شرماتا ہے سورج کا بدن — وہ ستارے دیکھتا ہوں زیبِ دامانِ انیسؔ
جوشؔ نجمؔ آلِ رضاؔ قیصرؔ نسیمؔ امروہوی — یہ عنادِل آج بھی ہیں نغمہ سنجانِ انیسؔ
آیئے اور ذہن کی دنیا منوّر کیجئے — روشنی تقسیم کرتا ہے دبستانِ انیسؔ

مرثیہ لکھتے ہیں قیصرؔ ہم بھی لیکن حق یہ ہے
مدحتِ شبیرؑ زندہ ہے بعنوانِ انیسؔ

عطاالله عطاؔ (ڈیرہ اسماعیل خان)

بَیادِ میر انیسؔ

زبحرِ فیضِ حسینؑ است یک جہاں سیراب ۔۔۔ حسینؑ بر لبِ دریا نیافت جُرعۂ آب

حسینؑ ماہیٔ بحرِ شہادتِ کبریٰ ۔۔۔ امامِ عالمِ اسلام و زینتِ محراب

حسینؑ ملتِ مرحوم را سبق آموخت ۔۔۔ ہمیں کہ در رہِ حق جاں بدہ و جنّت یاب

ہزار داغِ سیاہِ جبینِ ملّتِ خود ۔۔۔ بشست خونِ حسینؑ شہیدِ فیض مآب

انیسؔ در غمِ شبیرؑ اشکِ خوں مے ریخت ۔۔۔ زدیدہ شام و سحر پے بہ پے چو لعل مذاب

دگر بہمری ءِ اشکِ خوں، چکید بروں ۔۔۔ زراہِ دیدہ دلش پارہ پارہ ہم چو عناب

زبسکہ خور و زجام حسینؑ بادۂ عشق ۔۔۔ بجائے شعر زلب ریخت لولوئے شاداب

فروغ زد بہ دلش نورِ آفتاب حسینؑ ۔۔۔ ازاں انیسؔ بہ سیناستؔ ہم عدد بحساب

زبسکہ چشمۂ فیض است از حسینؑ رواں ۔۔۔ ازاں ز شعر انیسؔ اند تشنگاں سیراب

چہ چشمہ ایست محبّت کہ خورد ہر کہ ازاں ۔۔۔ دو قطرہ آب رواں شد ز چشم او سیلاب

شکایت است ز مہتاب و آفتاب مرا ۔۔۔ کہ ایں خسف نگرفت است و آں نہ شد بے تاب

زچشم خود نہ چکایند دردبانِ حسینؑ ۔۔۔ دو قطرہ اشک بمیدانِ کربلا مہتاب

ویاندید ستم بر حسینؑ و آلِ عباؑ! ۔۔۔ ویا کشیدہ بہ رُخ داشت از نظارہ نقاب

ویا نبود بہ چشمش نم محبّت و رحم ۔۔۔ ازآں نریخت بہ مظلومِ کربلا مہتاب

نبود زار مگر درغمِ حسینؑ علیؑ ۔۔۔ خسف وگرنہ گرفتے بہ قُرصِ خود مہتاب

بما کشود خلا بازِ چرخِ آخرِ کار ۔۔۔ حقیقتے کہ بجز سنگ نیست ایں مہتاب

بہ کوفیاں کہ نگر دید خشک آبِ فرات ۔۔۔ غلط بُوَد کہ بُوَد آفتاب آفتِ آب

گرفتہ کاسہ بکف چوں گدا بماہِ رجب ۔۔۔ انیسؔ بردرِ شبیرؑ بس غنی بہ نصاب

بس ایں دلیلِ نجابت بہ دود مانِ انیسؔ — "حسینؑ" "وجد" "انیسؔ" اند ہم عدد بہ حساب

میانِ مرثیہ گو شاعران و میر انیسؔ — تفاوت است عیاں چوں میانِ زمزم و آب

کسے ز مرثیہ گویانِ ہند نکشوداست — کشود از رخِ اندیشہ چوں انیسؔ نقاب

بہ بابِ مرثیہ گوئی و منقبت در ہند — کشودہ میر انیسؔ است مختلف ابواب

امیرِ مرثیہ گویانِ ہند میر انیسؔ — بدیں مہیں لقبش کردہ خود دبیرؔ خطاب

انیسؔ یافت ز شبلیؔ لقب خدائے سخن — ز اوستادِ سخن ایں لقب بس است صواب

انیسؔ غوطہ بہ بحرِ بیاں زد و آورد — ہزار لولوئے لالا برون و گوہر ناب

زچوبِ طورِ قلم وز حریرِ قرطاسش — زمشکِ ناب سیاہی زہے چنیں آداب

روانیٔ سخنش آب بروز آبِ رواں — نہاں بہ شعر معانی نہاں چو بُو بہ گلاب

بیانِ قصۂ شبیرؑ و کربلا کرد است — انیس عاقبت اندیش در چہار کتاب

چہ شد بہ زر نوشتم اگر کلامِ انیسؔ — نوشتہ ام چو بہ اوراقِ دل بشکلِ کتاب

چہ ممکن است کہ زاید دگر چو میر انیسؔ — زبطن مادرِ ایام تا بہ یوم حساب

بعمرِ خود نوشت است غیرِ چند غزل — ہم آں کہ کس نوشت است آنچناں بہ شباب

زِ بے وفائیٔ اہل جہاں بہ آل عباؑ — کشیدہ داشت زشرم و حیا بہ چہرہ نقاب

انیسؔ دید بزیرِ نقاب جنگِ حسینؑ — بچشمِ معرفت خویش نے بحالت خواب

کشیدہ عکسِ مصافِ حسینؑ در الفاظ — کہ ہر کہ خواند بہ تصدیق مے شدے بے تاب

سرودہ است نظامیؔ بہ نظم و فردوسیؔ — گر از سکندرؔ و داراؔ و رستمؔ و سہرابؔ

انیسؔ آں صفِ دوگانہ راسہ ضرب دہد — دلیل بایدت ار از کلام اُو دریاب

بہ پنجگانہ صفات یگانگی موصوف — بہ ہفت و ہشت و شش آراستہ چہار کتاب

بہ نہ فلک چو کلامش رسید اہلِ فلک — برقص آمدہ گفتند مرحبا بہ جواب

حسینؑ خواست مگر خود انیسؔ را کہ کند — بیان و شرحِ مہماتِ کربلا بہ کتاب

غاند و گر نہ سراید کلامِ خویش انیسؔ
چہ شد ہنوز چو گویاست از زبانِ کتاب

سیّد علی حسن اختؔر امروہوی (راولپنڈی)

برائے دبستانِ انیسؔ

کمالِ فکر کے جوہر دکھا رہے ہیں انیسؔ
فلک سے توڑ کے تاروں کو لا رہے ہیں انیسؔ

سخن کو گلشنِ جنّت بنا رہے ہیں انیسؔ
زبانِ نطق سے کوثر بہا رہے ہیں انیسؔ

ادب کے ملک میں آداب کا فلک بن کر
سخن کی ساری زمینوں پہ چھا رہے ہیں انیسؔ

ہم ان کو کس طرح پیغمبرِ سخن نہ کہیں
پیامِ خالق اکبر سنا رہے ہیں انیسؔ

بلند ہونے لگی ہر طرف صدائے درود
سلام پڑھنے کو منبر پہ جا رہے ہیں انیسؔ

بنیں گے اہل خرد جس کو پی کے متوالے
وہ جامِ الفت ِ ساقی پلا رہے ہیں انیسؔ

ہر ایک شعر ہے گویا کہ آیتِ منظوم
زبانِ اردو میں قرآں سنا رہے ہیں انیسؔ

سنا سنا کے شہِ کربلا کے افسانے
ہمیں نجات کے قابل بنا رہے ہیں انیسؔ

ہر ایک نہج سے کر کر کے ذکر آل عبّا
عبادتوں کا طریقہ بتا رہے ہیں انیسؔ

محبّتِ غمِ شبیرؑ میں فنا ہو کر
دوامِ زیست کا رستہ دکھا رہے ہیں انیسؔ

گئے مسیح وہ اعجاز ان کے ساتھ گیا
دلوں کے آج بھی مردے جلا رہے ہیں انیسؔ

وہ مر بھی سکتا ہے جس کا نہ مر سکے ذاکر
یہ راز زیست کا اختؔر بتا رہے ہیں انیسؔ

....

سیّد آغا حسین ارسطو جاہی

سلامِ عقیدت

تیری آنکھوں میں بھی اک رنگ کا طوفاں ہوتا — آئینہ بھی ترے انداز پہ حیراں ہوتا!

میرے شاعر یہ ترا زندۂ جاوید کلام — اِن اشارات میں اک سورۂ قرآں ہوتا!

ننھے طائر ترے باغوں میں چہکتے پھرتے — آہوئے دشت مگر اور گریزاں ہوتا!

اے کہ قرآن بکھرے ہوئے اوراق ترے — کیوں نہ میں بھی یوں ہی انگشت بدنداں ہوتا!

تیرے گونجے ہوئے نغموں کی صدائیں آتیں — کہیں جنگل تو کہیں اور بیاباں ہوتا!

مجھ کو عباسؑ کی اس شانِ جلالت کی قسم — اور میرے لئے کیا باعثِ ایماں ہوتا!

اشک بھی روح کی تسکین کا باعث ہوتے — زخمِ دل وجہِ بنائے چمنستاں ہوتا!

تیری رنگینیٔ گفتار، تبسّم تیرا — کچھ تو اِس طرح سے تو اور بھی خنداں ہوتا!

سُرخ اور سبز ستارے یہ پر افشاں ہوتے — میں بھی اے کاش ادا فہم و غزل خواں ہوتا!

کربلا کی مری قسمت میں زیارت ہوتی — کتنا خوش رنگ مرے نامے کا عنواں ہوتا!

یہ فصاحت تری، اندازِ بلاغت تیرا — میری تصویر کے پردوں پہ نمایاں ہوتا!

تو مرے پاس اگر اشک بہانے کے لئے — آہی جاتا تو نہ ایسے کبھی حیراں ہوتا!

چاند کے پاس کہیں چاند سے کچھ دور کہیں — یا علیؑ کیا میں اسی طرح پریشاں ہوتا!

کیوں نہ اب خاکِ شفا پر مجھے نیند آجاتی — کیوں نہ اب سوئے نجف میں بھی گریزاں ہوتا!

سُرخ ڈورے پہ کسی کے لبِ میگوں کی طرح — شفقِ سُرخ کا کچھ اور بھی طوفاں ہوتا!

سکّہ نظم ترا سلطنتِ بزم تری
مدح کرتا جو فرزدقؔ سا سخن داں ہوتا!

اے کہ اب یوں ترا شاہینِ ترازوئے خیال
اور بھی مائلِ پروازِ گلستاں ہوتا!

بلبلوں کی یہ صدائیں یہ پپیہے کی ندا
شوخیٔ گل کے لئے کیا یہی ساماں ہوتا!

چاندنی بحر کی موجوں میں پر افشاں ہوتی
تو بھی ہم مرتبۂ بوذر و سلماں ہوتا!

ان ستاروں کی کشاکش سے الجھتا تو یہ
دردِ دل میرے لئے سلسلہ جنباں ہوتا!

سُرخ پھولوں کی طرح لُولُو و مرجاں کی مثال
تیرے قرآن کا یہ راز نہ پنہاں ہوتا!

تیرے دریائے تخیّل کے سمن زاروں میں
وہ مرا مہرِ جہاں تاب درخشاں ہوتا!

اے کہ تجھ پر ترے اربابِ وفا پر ہو سلام
تو نہ ہوتا تو میں کیا خاک مسلماں ہوتا!

تیرے فانوس پہ آآکے ستارے گرتے
دل دھڑکنے سے ذرا اور پریشاں ہوتا!

آنکھیں واللیل کے سورے کی یہ تفسیر ہوئی
لب لعلیں ترا یاقوتِ بدخشاں ہوتا!

چاندنی میں کہیں، دریا کے کناروں پہ کہیں
اب گریزاں میں سوئے دشت و بیاباں ہوتا!

اور غالبؔ کے تخیل کی میں پرواز کے ساتھ
تیری رنگینیٔ گفتار پہ حیراں ہوتا!

یہ ترا حفظِ مراتب یہ فصاحت یہ کمال
تیرا ممدوح مگر تیرا ثنا خواں ہوتا!

ہے مجھے یاد ترے ناز اُٹھائے کس نے!
گوشۂ قبر ترا گوشۂ ایماں ہوتا!

چپّئی پھول پہ اعجازِ تکلّم ہوتے!
برگِ گل کیوں نہ حجابِ دُرِ دنداں ہوتا!

گھُل گیا فکر میں کیسے شفقِ سرخ کا رنگ
کاش ہر لفظ تری شان کے شایاں ہوتا!

جنگلوں میں کہیں یا دُور بیابانوں میں!
اپنے معبود کی قدرت کا ثنا خواں ہوتا!

خامہ میرا بھی کہ ہے باربدِ بزمِ سخن!
نقشِ بہزادؔ کچھ اورنگِ سلیماں ہوتا

سیّد آباد محمد نقوی زائرؔ امروہوی (کراچی)

انیسؔ

مرثیہ گوئی ہے مسلک اس کے پیغمبر انیسؔ — مرثیہ گوئی ہے دُنیا خالقِ اکبر انیسؔ
فطرتِ انسانیت کے معتبر محضر انیسؔ — واقعاتِ کربلا کا مستند دفتر انیسؔ
مرثیہ نے ان کے بخشی ہے انہیں گویا حیات — ذاکرِ شبیرؑ ہیں بعد از فنا گھر گھر انیسؔ
منتخب گلدستۂ شعر و سخن ہر مرثیہ — رکھ گئے لفظوں کے کیا کیا پھول چُن چُن کر انیسؔ
محوِ نظارہ ہے ذہنِ سامعیں سن کر کلام — کھینچتے ہیں نظم میں فطرت کے وہ منظر انیسؔ
نذرِ مولا کے لئے اعلیٰ تبرک چاہیے — یوں لٹاتے ہیں مضامیں کے دُر و گوہر انیسؔ
اللہ اللہ شاعرِ آلِ نبیؐ کا یہ شرف — شاہؔ ہیں فرشِ عزا پر اور برِ منبر انیسؔ
ذکر کیا بندوں کا خالق نے پڑھا پیہم دُرود — جب ہوئے آلِ پیمبرؐ کے ثنا گستر انیسؔ

ہے زباں دانی میں زائرؔ ان کی یہ ادنیٰ ثنا
شعر کی جنّت انیسؔ اور نظم کا کوثر انیسؔ

سیّد سرفراز احمد سہیلؔ بنارسی (لاہور)

صفاتِ انیسؔ

کسے یہ تاب رقم کر سکے صفاتِ انیسؔ
شعور بخشِ روایات ہے حیاتِ انیسؔ

مثال ایک صدی بھی نہ لا سکی کوئی
ہوائے تند میں روشن ہے شمعِ ذاتِ انیسؔ

یہ بے نیازِ تحفظ رہیں گے تا محشر
غمِ حسینؑ کی دنیا ہے کائناتِ انیسؔ

ہے بارگاہِ نبوت میں ان کی اِک منزل
یہ بے ثبات جہاں اور یہ ثباتِ انیسؔ

بدل سکے گا زمانہ نہ اِس بہار کو اب
خزاں جھجھکتی ہے آتے لبِ فراتِ انیسؔ

ثنا میں ان کے لبِ شاعری پہ ہیں مُہریں
حیاتِ فن کی ضمانت ہے کلیّاتِ انیسؔ

کوئی مٹا نہ سکے یہ سنوار دیں جس کو
اثر طرازِ زمانہ ہیں وارداتِ انیسؔ

بڑھا دے رنگِ متانت گلاب کی رنگت
نثار شہد ہو وہ حسنِ نمکیاتِ انیسؔ

یہ مرثیہ ہے کہ "وہ ایک مرثیہ گو تھے"
لئے ہیں بند کئی دفترِ نکاتِ انیسؔ

ہے شہرِ لکھنؤ اب بھی ادب کا گہوارہ
خراج لیتے ہیں اب بھی تخیلاتِ انیسؔ

ہر ایک مرثیہ ہے مشعلِ طریقِ سخن
ہیں حرزِ جانِ فصاحت نوادراتِ انیسؔ

دیئے بیان کے آہنگِ نو زمانے کو
بنے ادب میں اِضافہ تصرفاتِ انیسؔ

ہزار رنگ سے باندھیں یہ ایک رنگ سہیلؔ
لئے ہیں لاکھ مضامیں تصوّراتِ انیسؔ

سیّد ظہورؔ حیدر رضوی جارچوی (لاہور)

کربلا گئے ہیں انیسؔ

سخنوری کا سلیقہ سکھا گئے ہیں انیسؔ
ہمیں حسینؑ کا شاعر بنا گئے ہیں انیسؔ

تخیلات کی دنیا پہ چھا گئے ہیں انیسؔ
سخن کو اپنی قلم رو بنا گئے ہیں انیسؔ

کسی کا حسن سماتا نہیں نگاہوں میں
حسینیت کے وہ جلوے دکھا گئے ہیں انیسؔ

میں کیا کسی کے مذاقِ سخن کی بات کروں
رہِ شعور میں تا انتہا گئے ہیں انیسؔ

فضائے کون و مکاں میں ہے جن کی گونج اب تک
کمالِ فن کے وہ ڈنکے بجا گئے ہیں انیسؔ

یہ جیسے آپ تھے موجود روزِ عاشورہ
کچھ اس ادا سے کہانی سنا گئے ہیں انیسؔ

مفکروں کی جہاں فکر جا نہیں سکتی
بلند اتنے بزورِ ولا گئے ہیں انیسؔ

کلام میں نہیں ملتی جھلک تعصب کی
مؤدب اور ادب کو بنا گئے ہیں انیسؔ

نظر سے ان کی نہ کوئی مقامِ غور بچا
برائے سیرِ ہنر جا بجا گئے ہیں انیسؔ

قلم سے کھینچ کے اچھے بروں کی تصویریں
حقیقتوں کے مرقعے دکھا گئے ہیں انیسؔ

یہ کربلائے معلیٰ کا فیض اُردو پر
زبان کو بھی معلیٰ بنا گئے ہیں انیسؔ

کلام سنتے جو ان کا یہی سمجھتے تھے
ملک ہیں عرش کی محفل سے آ گئے ہیں انیسؔ

جلائی جاتی ہیں جس سے ہزار ہا شمعیں
وہ شمع بزم ادب میں جلا گئے ہیں انیسؔ

سلام کیوں نہ کریں طالبانِ اوج ان کو
بنا کے شاہرہِ ارتقا گئے ہیں انیسؔ

وہاں وہاں یہ رہیں گے جہاں جہاں ہیں حسینؑ
ظہورؔ جانتا ہے کربلا گئے ہیں انیسؔ

حسن سرمد (پٹنہ)

یادِ انیسؔ

زہے یہ کوششِ صد سالہ یادگار انیسؔ
کریں گے پھول عقیدت کے سب نثار انیسؔ

وہ اہلبیتؑ کا عاشق، محبِ آلِ رسولؐ
وہ خاندانِ نبوّت کا دوستدار انیسؔ

وہ سیّد الشہداء کے غموں کا فریادی
وہ کربلا کے شہیدوں کا سوگوار انیسؔ

انیسؔ مونسِ حضرت حسینؑ ابن علیؑ
انیسؔ بنتِ محمدؐ کا غمگسار انیسؔ

انیسؔ تھا غمِ جاناں، غمِ امامِ شہید
غمِ امام تھا اندوہِ روزگار انیسؔ

شہیرِ ملکِ سخن، شاعرِ فقید مثال
جو سرزمینِ ادب کا ہے شہریار انیسؔ

وہ جس نے شام و سحر کی مصوّری کی ہے
وہ ہے مظاہرِ قدرت کا رازدار انیسؔ

کھنچی ہے صفحۂ کاغذ پہ درد کی تصویر
کہ تھا رثائے شہیداں میں دل فگار انیسؔ

تمام حرف کے نقطے ہیں اشک کے موتی
ہر ایک لفظ میں ہے قلبِ داغدار انیسؔ

لگائے اس نے مضامین کے نئے انبار
چنے اُسی کے ہیں خرمن سے خوشہ خوار انیسؔ

بلند اس نے کیا ذوقِ شعر کا معیار
نہیں انیسؔ فقط مرثیہ نگار انیسؔ

بھرا ہے دامنِ اُردو کو رزم نامے سے
جہانِ شعر میں اُردو کا افتخار انیسؔ

سلام ہو کہ غزل، مرثیہ، رُباعی ہو
ہر ایک صنفِ سخن میں ہے شاہکار انیسؔ

بہا تھا خون غریب الدّیار کا سرمدؔ
بیان کرنے کو جس کے تھا انتظار انیسؔ

....

صبا نقوی (مونگیر، بہار)

ارمغانِ عقیدت

اے انیسِ ادب، فدائے سخن ناز بردارِ مہ لقائے سخن
صاحبِ فضل، شاعرِ فطرت جادوئے چشمِ سُرمہ سائے سخن
زینتِ بوستانِ شعر و ادب فاتحِ رزمِ کربلائے سخن
ساقیٔ محفلِ زبان و بیاں گردشِ ساغرِ وفائے سخن
ہر نظر فنِ شعر کی معراج ہر نفس لذّت آشنائے سخن
گُلِ مضموں کی عطر بیزی سے نکہتِ گیسوئے دوتائے سخن
تیری کاوش سے بزمِ عرفاں میں رقصِ پیمانۂ ولائے سخن
تیری قدرت سے رشکِ باغِ جناں گوشۂ دامنِ قبائے سخن
تیری عظمت سراجِ شعر و ادب تیری حکمت سے رنگ ہائے سخن
کوچۂ فکر سے ترے گذری بارہا با ادب صبائے سخن
قصرِ علم و ہنر کے کام آئی تونے ڈالی تھی جو بنائے سخن

ارمغانِ عقیدت و تحسیں
کیوں نہ ہو نذرِ رہ نمائے سخن

....

ساجدؔ رضوی (حیدر آباد دکن)

نذرِ انیسؔ

اے عظمتِ کلام کی رُوحِ رواں انیسؔ
باقی ہے تیرے نام سے اُردو زباں انیسؔ

تیرا کلام ایک خزانہ ادب کا ہے
جو لفظ ہے وہ ایک فسانہ ادب کا

بعدِ ضمیرؔ مرثیے کو فن بنادیا
کچھ برگ و بار تھے جنھیں گلشن بنادیا

تصویر جب مناظرِ قدرت کی کھینچ دی
رنگینیٔ سخن میں نظر آئی زندگی

رزمیہ شاعری نے تری دل ہلادیئے
دنیا کو معجزاتِ شجاعت دکھا دیئے

سچ تو یہ ہے کہ تیری گراں مایہ شاعری
تاریخ معتبر ہے اک اردو زبان کی

ہر شعر تیرا درد کی تاثیر بن گیا
تفسیرِ کارنامۂ شبیرؑ بن گیا

مقصد سمجھ لیا تھا جہادِ حسینؑ کا
مقصودِ کربلا ترے پیشِ نظر رہا

سمجھایا رازِ سوزِ دروں کائنات کو
روشن کیا ہے تونے چراغِ حیات کو

حق کا سبق سنا بھی ہے، تونے دیا بھی ہے
شبیرؑ کے جہاد میں حصّہ ترا بھی ہے

تیرے کلام میں جو روایاتِ سجدہ ہیں
ساجدؔ کی وہ نگاہ میں آیاتِ سجدہ ہیں

ذاؔبر محمد قاسم (کراچی)

درصنعت توشیح

ب۔ بفیضِ عامِ مصطفےٰؐ بفضلِ خالقِ جہاں
س۔ سجا کے شعر کی زمیں بنائے میں نے آسماں

ب۔ بلندیوں سے ماورا، ہے فنِ شاعری مرا
ی۔ یقیں مرا ہے پاسباں، بیاں مرا نگاہباں

ر۔ رئیسِ ملکِ فکر ہوں، امیرِ شہرِ ذکر ہوں
ن۔ نظیرِ شاعری مری، دیارِ شعر میں کہاں

ع۔ عطا کیا ہے شعر کو وہ رنگ و نور و کیفِ نو
ا۔ ادب رہے گا جاوداں، بہر زماں بہر مکاں

ل۔ لہو سے دل کے سینچ کر، زمینِ فنِ شعر کو
ی۔ یہاں وہاں بکھیر دی بہارِ حسنِ جاوداں

ی۔ یہ کارنامۂ قلم وہ رشحِ نور بار ہے
ل۔ لپک میں جس کی ہے رواں، شعورِ فن کا کارواں

ا۔ ادیب ہوں کہ فلسفی، طبیب ہوں کہ جوہری
ع۔ عدو اڑا نہ پائیں گے، مرے بیاں کی دھجیاں

ن۔ نبیؐ کے عزمِ پاک کا، خدا کے دینِ خاص کا
ر۔ رسالت و کتاب کا میں پاسباں ہوں بے گماں

ی۔ یہاں وہاں، اِدھر اُدھر، زمیں پہ آسماں پر
ب۔ بلند ہے حسینؑ کے عمل سے دین کا نشاں

س۔ سلیقہ سے رواں دواں ہے مرثیوں کی راہ میں
ب۔ بلاغتوں کا قافلہ، فصاحتوں کا کارواں

سخنوروں سے ناقدوں سے کہہ دو ذاؔبر آج تم
انیسؔ کی زمینِ شعر، ہے ادب کا آسماں

تجمّلؔ لکھنوی (کراچی)

تاجدارِ سخن

انیس ملکِ فصاحت کے تاجداروں میں
کلام ان کا ادب کے ہے شاہکاروں میں

اشاعتِ غمِ سرورؑ کے قصہ داروں میں
انیسؔ سبطِ پیمبرؐ کے بے قراروں میں

ہزار جان سے سرورؑ کے جاں نثاروں میں
تھا اپنی شان کا ایک آدمی ہزاروں میں

لٹائی دولتِ غمِ شہہ کے سوگواروں میں
انیسؔ ہی کی ضرورت تھی دل فگاروں میں

وہ جس کا زورِ فصاحت تھا بحرِ بے پایاں
نظر نہ آیا یہ دریا کبھی کناروں میں

بڑے بڑوں سے وضاحت نہ ہو سکی جن کی
ادا کئے ہیں مطالب وہ استعاروں میں

یہ بزمِ اہلِ سخن میں انیس منزل تھی
فلک پہ چاند ہو جس طرح سے ستاروں میں

ہیں ایک ہی گلِ مضموں کے سیکڑوں جلوے
ہے باغِ فکر ہمیشہ نئی بہاروں میں

لقب اگر ہے خدائے سخن مناسب ہے
انیسؔ انیسؔ ہے سو میں نہیں ہزاروں میں

بہ شکلِ نظم بہائے ہزار ہا آنسو
تھا ایک دل جو بہتّر کے سوگواروں میں

غمِ حسینؑ میں کیا کیا نہ اہتمام کئے
پروئے لختِ جگر آنسوؤں کے تاروں میں

تھیں سلسبیلِ غمِ شہ انیسؔ کی آنکھیں
تھا آبِ چشمۂ کوثر ان آبشاروں میں

انیسؔ سامنے جیسے لگی تھی دل پہ سناں
تھے اس طرح علی اکبرؑ کے سوگواروں میں

وقارِ گلشنِ جنّت میں دیدنی ہوگا
ابھی انیسؔ کے جلوے ہیں رہ گزاروں میں

تجمّلؔ اب بھی زمانے کا فیصلہ ہے یہی
ہیں سر بلند انیسؔ آج بھی ہزاروں میں

آغا صادق حسین (راولپنڈی)

السّلام

اے انیسِ نغز گو یکتا سخنور السّلام
ناز کرتی ہے زباں تیرے سخن پر السّلام

السّلام اے شارحِ کردارِ حیدرؑ السّلام
السّلام اے مادحِ سبطِ پیمبرؐ السّلام

اے ترے شیریں بیاں میں شہد و شکر کا مزہ
اے تری طبع رواں میں موجِ کوثر السّلام

حبذا تیرا کلامِ نرم و نازک آفریں
مرحبا تیرا بیانِ روح پرور السّلام

زندۂ جاوید ہے تیری حدیثِ غم فزا
داستانِ کربلا ہے تجھ کو ازبر السّلام

اس طرح ہے نکتہ سنجوں میں ترا ارفع مقام
محفلِ انجم میں جیسے ماہِ انور السّلام

تیرے اندازِ سخن میں تیر و نشتر کی خلش
تیری درد انگیز لے میں صُورِ محشر السّلام

یُوں زباں کو آنسوؤں کے ہار پہناتا ہے تو
صفحۂ قرطاس ہے پھولوں کا بستر السّلام

خود فصاحت اور بلاغت چُومتی ہے منہ ترا
تیرے دریائے سخن کے ہیں یہ گوہر السّلام

خوش بیانی نکتہ سنجی ختم تیری ذات پر
اے تری طرزِ ادا اعجاز یکسر السّلام

ہے شہیدوں کی وفا کا ذاکر بے مثل تو
مرثیے تیرے ہیں کیا تفسیر والنحر السّلام

تیرے جذباتِ حسیں سرمایۂ سوز و گداز
نطق تیرا درد کا گہرا سمندر السّلام

عرصہ شعر و سخن کا فارسِ یکتا ہے تُو
تیری ٹکر کا نہیں کوئی سخنور السّلام

نقطے نقطے میں جھلکتا ہے شہادت کا لہو
سطر سطر اس کی ہے اشکِ دیدۂ تر السّلام

سخت مشکل ہے تری مدح و ثنا میرے لئے
السّلام اے بحرِ معنی کے شناور السّلام

فیض گوہر جعفری (جھنگ)

خدائے سخن

خدیوِ مملکتِ فکر و فن خدائے سخن
ترے کلام سے زندہ ہے ارتقائے سخن

تمام عمر بسر مدح اہل بیتؑ میں کی
بلند کرتا رہا تیرا مدعائے سخن

قلمروِ ادب و شعر میں ترے ڈنکے
ہیں خوشہ چیں، ترے افکار کے گدائے سخن

تو اپنے دور کا فردوسی ونظامی ہے
ہوئی ہے تیرے تخیّل پہ انتہائے سخن

ترے مقام کے قائل ہیں شبلی و حالی
ہر آشنائے ادب ہے ترا فدائے سخن

حسینیت نے اسے زندگی عطا کی ہے
بندھی رہے گی جہاں میں تری ہوائے سخن

تری نظر میں تھے ابلاغِ فکر کے اسلوب
اسی لئے ہے تو مشہور رہنمائے سخن

وجود باقی ہے جب تک زبانِ اردو کا
رہے گا ایک زمانہ ترا فدائے سخن

تھی مرثیہ میں جو جدّت پسند طبع تری
نہ چھوڑا گوشہ کوئی بھی نیا برائے سخن

محال ہے کہ کوئی اس پہ کر سکے ایزاد
جو تونے ڈالی تھی اک مستقل بنائے سخن

اسی کو فن نے ترے بحرِ بے کنار کیا
زمانہ جس کو سمجھتا تھا تنگنائے سخن

زبانیں گنگ تری قادر الکلامی پر
رہے گی زندہ ابد تک تری نوائے سخن

ہے نام تیرا درخشندہ مہر و مہ کی صفت
نہ ہو سکے گی کبھی کم تری جلائے سخن

ترے بیاں کا مزہ اہل ذوق لیتے ہیں
تری زبان سمجھتے ہیں آشنائے سخن

نکھرتی جائے گی اُردو کے ارتقا کے ساتھ
جو فکر نے ہے تری وضع کی فضائے سخن

انیسؔ! گوہرِ کانِ سخنوری تو ہے
نہ پیدا ہوگا کوئی تجھ سا دلربائے سخن

قمرؔ لکھنوی (کراچی)

جہانِ انیسؔ

بلند کیوں نہ ہو ہر ایک سے بیانِ انیسؔ
ہے کربلا و نجف کی زمیں جہانِ انیسؔ

ہیں کربلا کے بہتر شہید راہ نما
کبھی نہ راہ سے بھٹکے گا کاروانِ انیسؔ

کوئی امامِ سخن، کوئی ناخدائے سخن
سخنوروں میں ہیں ممتاز پیروانِ انیسؔ

کسے نصیب ہوئی یہ زباں کی شیرینی
ڈھلی ہے کوثر و تسنیم میں زبانِ انیسؔ

ہمیشہ اشکوں سے ہوتے رہیں گے نَم دامن
نہ ہوگی بند کبھی چشمِ خونفشانِ انیسؔ

بھریں گے پھولوں سے دامن سخنورانِ جہاں
سدا بہار رہے گا یہ گلستانِ انیسؔ

لبوں کو بارہا بوسے دیئے ہیں منبر پر
ہے جبرئیل کو معلوم کیا ہے شانِ انیسؔ

تمام عمر رہے کربلائے ہستی میں
تمام عمر لیا غم نے امتحانِ انیسؔ

قمرؔ انیسؔ نے وہ غم دیا ہے دنیا کو
رقم رہے گی ہر اک دل پہ داستانِ انیسؔ

عباسؔ نظیر (راولپنڈی)

انیسؔ

مرثیے، منقبت، سلامِ انیسؔ　　مخزنِ علم ہے کلامِ انیسؔ
باوضو پڑھتے ہیں کلامِ انیسؔ　　اللہ اللہ یہ احترامِ انیسؔ
خاک سمجھیں گے خاک کے پتلے　　مدحتِ نور ہے کلامِ انیسؔ
حور و غلماں درود پڑھتے ہیں　　جب کوئی پڑھتا ہے کلامِ انیسؔ
ذکر و اذکار تشنہ کاموں کے　　یوں گذرتے تھے صبح و شامِ انیسؔ
آسماں جھک کے داد دیتا ہے　　دیکھئے عظمتِ کلامِ انیسؔ
بات چھڑ جائے گر زباں کی کہیں　　پیش کردیجئے کلامِ انیسؔ
تم بہرحال حق کے ساتھ رہو　　درس یہ دے گئے امامِ انیسؔ
ہے یہ فرمانِ حالیؔ و شبلیؔ　　مستند ہے تو ہے کلامِ انیسؔ
دوستو آج ہم پہ لازم ہے　　صورۂ فاتحہ بنامِ انیسؔ

بندۂ بوتراب ہوں میں نظیرؔ
مجھ سے پوچھے کوئی مقامِ انیسؔ

نصیر رضا رضوی (لکھنؤ)

اُردو اور انیسؔ

دوسَوسالہ یادگارِ خدائے سخن میر انیسؔ

اے انیسِ محترم اے کارسازِ شاعری   تیری طرزِ با صفا بندہ نوازِ شاعری
خادمِ دیرینہ تیرے اوج و نازِ شاعری   ہے تری آہنگ میں پنہاں وہ رازِ شاعری
جس کا ڈنکا آج ہے نقارۂ اُردو بنا
دم کے دم میں اتحادِ ضیغم و آہو بنا

جو بھی تجھ کو پا گئے اردو کے شہ پارے بنے   آسمانِ شاعری کے ضو فگن تارے بنے
مونسؔ و اُنسؔ و عروجؔ محترم سارے بنے   قلزمِ شعر و سخن کے کچھ رواں دھارے بنے
اک رئیسؔ علم و فن ہے ایک رشیدؔ محترم
اک نفیسؔ شاعری ہے ایک وحیدِؔ محترم

تو خدائے شاعری پیغمبر شہر و وطن   تو امامِ فن ترے مصرعے ہیں آیاتِ سخن
جز و کل تیرا تلاش و فکر کا شستہ چمن   جدت و ایجاد کا ہر دور میں شاہِ زمن
تیرا سکہ آج بھی چلتا ہے ملکِ نظم میں
فرق سمجھایا ہے تو نے وہ زبر میں جزم میں

تیری کشتِ شاعری بھی کس قدر زرخیز ہے　　جو تری تصنیف ہے وہ شرح دستاویز ہے
بزم میں لہجہ ترے شعروں کا دل آویز ہے　　رزم میں تیغِ عمل کی دھار کتنی تیز ہے

یوں دبستانِ سخن تو نے مرتب کر لیا
جس سے اہلِ ذوق نے جی بھر کے دامن بھر لیا

اس طرح روشن کیا ہے علم کی قندیل کو　　کر لیا تو نے مقید سرحدِ تکمیل کو
پیکرِ معنی میں ڈھالا لفظ کو تخئیل کو　　یوں کیا آگاہ ہر اک رمز سے جبریل کو

جب ہی ہر تخلیق تیری اک حقیقی نور ہے
صور ہے باطل کو اور مومن کے دل کو طور ہے

جو تری تحریر ہے وہ اک نشانِ سنگ ہے　　اور تصویرِ سخن کی روح بھی خوش رنگ ہے
جو جہاں پر موڑ ہے وہ مقطعِ ارژنگ ہے　　جس میں عقلِ معنی و بہزاد اب تک دنگ ہے

سب تری جوشِ ادا کا بانک پن ہے اے انیسؔ
اور کچھ طبعِ رسا کا بانک پن ہے اے انیسؔ

تیرے حِلم و عِلم سے اردو کو برنائی ملی　　گنگ مضمونوں کو کیا کیا حسن گویائی ملی
انتہائے تیزگامی کو شکیبائی ملی　　ترے باعث مبتدی ذہنوں کو دانائی ملی

ایک عارفؔ بن گیا اور اک شہیدؔ خوش بیاں
اک جلیسؔ اور ایک فائقؔ اک شدیدؔ خوش بیاں

پڑھ لیا جب بھی کلامِ معتبر جس نے جہاں　　لے کے انگڑائی ہوئی طبعِ رسا اُس کی جواں
ہر زمیں میں باندھے اُس نے سونرالے آسماں　　اپنے طبقہ میں ہوا بے شک وہ شاعر خوش بیاں

مرثیہ گویوں میں کیا کیا ہیں دبیریؔ معتبر
معتبر عشقؔ و تعشقؔ ہر انیسیؔ معتبر

کربلا کے آئینہ پر کی ہے تو نے یوں جلا ہے کہیں پر صبر کا ایثار کا گلشن سجا
ہے کسی جا مخلصانہ گفتگو حسنِ وفا اور کہیں با رنگ ہے قربانیٔ جوشِ وغا
ہر طرح ہر شان کی قرطاس کو تحریر دی
خون کو سرخی عطا کی اشک کو تنویر دی

لکھنؤ سے تو نے جو طوفاں اٹھایا اشک بار جانبِ مغرب بڑھی تب جھومتی بادِ بہار
سرخ ہیں ذرّوں کے چہرے غیض بھی ہے آشکار دھانی دھانی سب ہوا ہے کربلا کا ریگ زار
تیرا لہجہ تیغ ہے آواز ہے جادو اثر
تری ہر تصنیف کا انداز ہے جادو اثر

روح نورانی ہے تیری تو ہے وہ روشن ضمیر کرسی و لوح و قلم تیری بزرگی کے اسیر
شاعروں کی بزم میں ہے تو امیر ابن امیر تجھ سے گویا ہے دمِ تحریر یوں نطقِ صریر
فکر و فن کا ہر نظر میں موجدِ اعظم ہے تو
مرثیہ گوئی کا گویا خاتم و آدم ہے تو

لفظ ہوں مُغلق تو سمجھو شاعری آسان ہے ویسے سہلِ ممتنع اردو زباں کی شان ہے
جو نہ مشکل ہو ذرا بھی وہ حسیں عنوان ہے تیری ہر تصنیف مدحِ آلؑ کا قرآن ہے
یہ ترے فن کی بلاغت ہے انیسؔ خوش بیاں
جو بھی تیرا ہوگیا وہ ہے سلیسؔ خوش بیاں

تجھ سے نسبت پا کے رضویؔ ہو رہا ہے باغ باغ دل میں روشن کر لئے روحِ حقیقی کے ایاغ
ہر طرح تو نے کئے ہیں طاقِ عصیاں بے چراغ اہلِ ایماں کو ملا ہے رجس و باطل سے فراغ
جس نے کچھ جانا تجھے وہ علم پرور بن گیا
نکتہ داں وہ بن گیا ہے اور شاگر بن گیا

ڈاکٹر ماجد رضا عابدی

ہر اک صدی کا شاعرِ اعظم انیسؔ ہے

ہر اک صدی کا شاعرِ اعظم انیسؔ ہے مشہور و معتبر ہے، معظّم انیسؔ ہے
اردو ہے جس کا قلعہ وہ پرچم انیسؔ ہے ہاں مرثیے کا اوّل و آدم انیسؔ ہے
اظہارِ درد کا نیا آہنگ دے دیا
جس نے رثا کو مرثیے ڈھنگ دے دیا

ثانی نہیں ہے جس کا کوئی وہ انیسؔ ہے اسلوب ہے سلیسؔ تخیُّل نفیسؔ ہے
وہ بالیقین بزمِ علیؑ کا جلیسؔ ہے اردو کی مملکت کا وہ یکتا رئیسؔ ہے
آبِ غدیر بھرتا ہے ہر ایک جام میں
رطب اللساں ہے مدحِ شہِ خاص و عام میں

بخشے ہیں جس نے مدح کو سب نکتہ ہائے حق ملک سخن پہ اس کا ہی ہے نظم اور نسق
جن بلبلوں کے دل میں شرافت کی ہے رمق کرتے ہیں یاد انیسؔ سے گلشن کا ہر سبق
یہ مرثیوں کا رنگ سبق تیرا ہے انیسؔ
ہر مرثیہ نگار پہ حق تیرا ہے انیسؔ

نفسِ شریف رکھتا ہے جو مرثیہ نگار　　فن کا خراج انیسؔ کو دیتا ہے زینہار
بڑھتا ہے اس شعار سے فنکار کا وقار　　ہر اک سخن شناس یہ کہتا ہے بار بار
راہِ انیسؔ پر جو چلے فن میں طاق ہے
جس کو یہ عاق کر دیں ادب سے وہ عاق ہے

مغرب میں دیکھو شیکسپیئر کی ہے قدر کیا　　کس اوج پر ہے ملٹنؔ و ہومرؔ کا مرتبہ
فارس میں بھی ہے ایک گلستاں عجب کھلا　　فردوسیؔ اور رومیؔ و سعدیؔ کی ہے ضیا
گو اپنے اپنے فن کے یہ سارے رئیس ہیں
سب ایک سمت جمع ہیں اک سمت انیسؔ ہیں

تصویر ہے خیال مصور انیسؔ ہے　　آئینِ فن کا باطن و ظاہر انیسؔ ہے
دینِ سخن کی آیتِ طاہر انیسؔ ہے　　چاہِ ہنر کی وسعتِ غائر انیسؔ ہے
کاغذ پہ یہ قلم کے جو دُر رولنے لگے
تصویر بھی قسم بخدا بولنے لگے

جذبات کے وفور کا مظہر انیسؔ ہے　　ہاں فاتحِ درِ فنِ خیبر انیسؔ ہے
تلوار گر ہنر ہے تو جوہر انیسؔ ہے　　گویا کہ ذوالفقارِ دو پیکر انیسؔ ہے
لکھ کر رجز وہ جنگ کی جانب جو مڑتے ہیں
قرطاس پر سروں کی طرح حرف اُڑتے ہیں

جذبوں پہ ہے عبور وہ جذبہ نگار ہے　　جذبات کے بیان کا یہ شہسوار ہے
پاسِ ادب اسی کے سخن کا شعار ہے　　رشتوں کا احترام انیسی بہار ہے
کردارِ زینبؑ و علی اکبرؑ عیاں کیا
ایسے پھپھی بھتیجے کا رشتہ بیاں کیا

شاعر بظاہر اس کو کہیں لفظیات کا ماہر ہے لیکن آدمی کی نفسیات کا
اس کو ہے علم نفس کی ساری صفات کا پورا کلام درس ہے اخلاقیات کا
ایسا کلام سر بسر ایماں دکھائی دے
کافر اگر پڑھے تو مسلماں دکھائی دے

چشمِ غزال دیکھے جسے وہ غزل نگار ان کو رباعیات کا کہتے ہیں تاجدار
صنفِ سلام ان کے سلاموں سے پُر بہار ہے پنجتنؑ کا فیض مخمّس پہ ہے نکھار
یوں مرثیے پہ صنفِ مسدّس بیاں ہوئے
چھ۶ دن میں جیسے خلق یہ کون و مکاں ہوئے

صنفِ غزل انیسؔ کے فن کی ہے ابتدا تھی ابتدا ہی ایسی کہ جس طرح انتہا
گویا رُخِ سخن پہ غزل کا نقاب تھا لیکن تھا انتظار کسی کو انیسؔ کا
جب مرثیے کا نور دکھایا نقاب نے
تب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے

آمد دکھاتے ہیں جو نیستاں میں شیر کی میداں میں بند ہوتی ہے ہر راہ پھیر کی
فوجِ عدو نے بھاگنے میں کچھ نہ دیر کی ابنِ علیؑ نے فوجِ ظفر موج زیر کی
غازی کے رعب و داب سے رن کانپ جاتا ہے
رستم کا جسم زیرِ کفن کانپ جاتا ہے

کمال حیدر رضوی

اردو اور انیسؔ

میخانۂ اردو ترے ساقی کا بیاں ہے — آمادۂ مئے نوشی ہر اک اہل زباں ہے
کیا مجمعِ رندانِ فصاحت ہے جو یاں ہے — کیا نہرِ مئے ذکرِ انیسؔ آج رواں ہے
اس مئے سے ہے جو بیر عداوت کی یہ خو ہے
ساقی کا جو دشمن ہے وہ تیرا بھی عدو ہے

پیاسے ترے پیتے ہیں جو ساغر سے لغت کے — عارف نہ کبھی ہونگے سخن دانی میں ست کے
واقف نہیں وہ ذائقے سے تیری صفت کے — پیمانے نہ پائیں گے وہ لفظوں کی بھرت کے
جب تک لب مینائے انیسؔ آ نہیں جاتے
خود اہل زباں تیرا مزا پا نہیں جاتے

تجھ کو لب و لہجے کی توانائی دی کس نے — یہ عشوہ و انداز یہ رعنائی دی کس نے
سادات کے گھر آئی یہ یکتائی دی کس نے — زیور دیا، گہنے دیئے، زیبائی دی کس نے
تیری گل الفاظ سے کھیتی جو ہری ہے
ضاحکؔ کے پروتے نے تری مانگ بھری ہے

اردو کی زباں ایسی سلیسؔ اور ہے کوئی — اس طرح کی لہجہ میں نفیسؔ اور ہے کوئی
جز ببر علی اس کا انیسؔ اور ہے کوئی — منہ بھر دیا اردو کا رئیسؔ اور ہے کوئی
اے ببر علی تجھ سا درخشندہ نہ ہوگا
جو تیری زباں بولے وہ شرمندہ نہ ہوگا

تھی ہند نشیں کچھ نہ تھا اردو کا حوالہ خسرؔو نے اسے گھٹی دی اور آپ ہی پالا
میرؔ آئے تو گمنامی کے گوشے سے نکالا دیتے رہے پھر ناسخؔ و آتشؔ بھی سنبھالا
تب جا کے کہیں اہل فصاحت پہ کھلی ہے
جب کوثر مدحت سے ترے گھر میں ڈھلی ہے

تھی سحر بیاں میر حسنؔ کی یہ امانت فرزند خلیقؔ اس کی بڑھاتے رہے عزت
کیا انسؔ تھا کس چاؤ سے کی اس کی حفاظت مانوسؔ تھی وہ ان سے انہیں اس کی تھی چاہت
ڈھونڈے گی تو یہ خانۂ مجلس نہ ملے گا
اردو کو اب ایسا کہیں مونسؔ نہ ملے گا

موزوں تھی محرم کے لئے اس کی بناوٹ کی تعزیہ کی طرح سے اردو کی سجاوٹ
پھر اس میں بھری ذکر سے مولا کے لگاوٹ اشکِ غمِ سرورؑ سے اسے بخشی تراوٹ
سب نرم روی گریہ و رقت سے عطا کی
ممتا اسے زہراؑ کی مودت سے عطا کی

جب مرثیہ پڑھیئے تو یہی ہوتا ہے محسوس پہنے ہوئے اردو ہے عزاداری کا ملبوس
خدمت میں جو عرصہ سے ہے سب اس سے ہیں مانوس اپنا ہی سمجھتے ہیں شہؑ والا کے ناموس
کرتی ہے کنیزی جو گھرانے میں علیؑ کے
فضہؑ کی طرح سوگ میں ہے سبطِ نبیؐ کے

افراد ہیں جو خیمۂ سلطان جہاں میں سب گفتگو کرتے ہیں اسی اردو زباں میں
ڈھل جاتی ہے جب یہ لغتِ غنچہ دہاں میں آیات نظر آتی ہیں اصغرؑ کے بیاں میں
بے وجہ نہیں، اس پہ جو قرآں کا گماں ہے
معصوم کے لب پہ ہے تو معصوم زباں ہے

❀ ❀ ❀

عمر انصاری (لکھنؤ)

نذرِ انیسؔ

نقشِ کفِ بوتراب ہوجاتا ہے
ہر آنکھ میں باریاب ہوجاتا ہے
چھُو کر جو نکل جائے ذرا کلکِ انیسؔ
نقطہ بھی وہ آفتاب ہوجاتا ہے

○

گنجینۂ افکار و معانی ہیں انیسؔ
کوثر ہیں انیسؔ اس کی روانی ہیں انیسؔ
کہتی ہی رہے گی جس کو دنیا تا حشر
دنیائے ادب کی وہ کہانی ہیں انیسؔ

میر رضی میر کہیر تلوی

انیسؔ ایسے تھے

علیؑ خدا کی خدائی کے مالک و مختار
حسنؑ حسینؑ جوانانِ خُلد کے سردار
اُنھیں کے فیض و عطا و ولا سے عالم میں
انیسؔ مرثیہ گویوں کے قافلہ سالار

-----✧-----

مرثیہ جیسے پڑھ گئے دُولہا
مرثیہ ویسے کوئی پڑھ نہ سکا
مرثیہ میں انیسؔ سے آگے
ہاں ابھی تک تو کوئی بڑھ نہ سکا

-----✧-----

کہنے والوں پڑھنے والوں سننے والوں کی ہے بزم
مرثیہ برداشت کرلیتا ہے کیسا ہی پڑھو
ہاں اجازت ہو تو دوہرا دوں میں یہ قولِ انیسؔ
مرثیہ جیسا لکھا ہے اُس کو ویسا ہی پڑھو

-----✧-----

ہر ایک رُخ سے تھے یکتا انیسؔ ایسے تھے
جو جس طرح سے بھی سمجھے انیسؔ ویسے تھے
کلیم و طور کی نسبت کوئی مذاق نہیں
دبیرؔ سے کوئی پوچھے انیسؔ کیسے تھے

-----✧-----

کہی ہیں خوب عراق و حجاز کی باتیں — بتائیں صلح و جہاد و نماز کی باتیں
نہ جانے مرثیہ کہتے تھے یا پیمبرؐ سے — انیسؔ کرتے تھے راز و نیاز کی باتیں

-----◆◆-----

ہیں بے مثال جو کی ہیں مثال کی باتیں — زوال سے نہیں واقف کمال کی باتیں
کہیں اُڑا دیئے ہوش اور کہیں پر جبریلؑ — یہ تھیں علیؑ کے جمال و جلال کی باتیں

-----◆◆-----
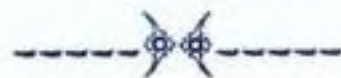
حق نے بخشا انیسؔ کو جو شعور — پھر کسی اور کو عطا نہ ہوا
آج تک مرثیہ کا بعدِ انیسؔ — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

-----◆◆-----
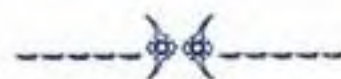
سیّد فیضی (راولپنڈی)

نذرِ انیسؔ

گنجینۂ افکار کا زیور ہے انیسؔ
پائندہ بہاروں کا گلِ تر ہے انیسؔ
آئینہ ہے شبیرؑ کی مدّاحی کا
اقلیمِ سخن کا وہ سخن ور ہے انیسؔ

....

ہر سوچ انیسؔ کے جگر کا خوں ہے
افکار کا یہ باغ جبھی بو قلموں ہے
سر خم ہے ترے در پہ فصاحت کا انیسؔ
طوفان بھف تیرا ہر اک مضموں ہے

....

شبیرؑ نے خود جس کو لہو سے سینچا
وہ باغ انیسؔ ہی نے شاداب کیا
پیغامِ حسینؑ عام کرنے کے لئے
اُردو کو انیسؔ کے سوا کون ملا

....

تنویر سدا شعر کے پرتو میں رہے گی
اقلیم سخن تیری قلم رو میں رہے گی
ہر ذوقِ تجسس تجھے ڈھونڈے گا انیسؔ
ہر عظمتِ فن تیری تگ و دو میں رہے گی

....

ہو فکر رسا تو عرش تک جاتی ہے
جمتی ہے جہاں بزم دمک جاتی ہے
ہوتا ہے بیاں رزم کا تو آنکھوں میں
تلوار کی بجلی سی چمک جاتی ہے

تحسینؔ جعفری (راولپنڈی)

کمالِ انیسؔ

گلہائے رنگ رنگ سے گلزارِ شعر کو
جس نے سجا کے رُوکش باغِ جناں کیا
تحسینؔ وہ تھا انیسؔ، خدائے سخن انیسؔ
مدّاحِ آلِ حضرتِ محبوبِؐ کبریا

....

زمینِ شعر جو ہم پایۂ فلک ہے آج
انیسؔ کا ہے یہ صدقہ، انیسؔ کا ہے کمال
مبالغہ نہیں تحسینؔ یہ حقیقت ہے
انیسؔ کی نہیں دنیائے شاعری میں مثال

....

ماہرِ علم و فن تھے میر انیسؔ
ہاں خدائے سخن تھے میر انیسؔ
مدحِ آلِ نبیؐ میں عمر کٹی
عاشقِ پنجتنؑ تھے میر انیسؔ

حلمی آفندی (حیدرآباد دکن)

انیس گلشنِ اردو

ہے گلشنِ ادب میں جو خوشبو انیس کی
شہرت ہے باغِ ہند میں ہر سو انیس کی
حلمی ہیں دونوں لازم و ملزوم بالیقیں
اردو کے ہیں انیس، ہے اردو انیس کی

ہے تذکرہ زبان پہ ہر آں انیس کا
کیونکر رہے نہ نام درخشاں انیس کا
محسن کو اپنے کیسے فراموش ہم کریں
اردو زباں پہ جب کہ ہے احساں انیس کا

کیوں فزوں تر نہو مقامِ انیس
جب ہے جانِ ادب کلامِ انیس
تاقیامت رہے گا وابستہ
نام اردو کے ساتھ نام انیس

دریائے معانی کے شناور تھے انیسؔ
اور باغِ فصاحت کے گُل تر تھے انیسؔ
شاہد ہے ہر اک اُن کا مسدّس علمیؔ
لاریب کہ بے مثل سخنور تھے انیسؔ

شاہنشہِ اُردوئے معلّیٰ تھے انیسؔ
گویا کہ سخن دانوں میں یکتا تھے انیسؔ
تھا علم کا لاریب خزینہ سینہ
دُرہائے مضامین کا دَریا تھے انیسؔ

....

تحسین جعفری (سیالکوٹ)

قطعات

زمینِ شعر جو ہے رُوکشِ سپہرِ بریں
انیس کا ہے تصدق، انیس کا ہے کمال
مبالغہ نہیں تحسین، یہ حقیقت ہے
انیس کی نہیں دنیائے شاعری میں مثال

....

ماہرِ علم و فن تھے میر انیس
ناخدائے سخن تھے میر انیس
مدحِ آلِ نبیؐ میں عمر کٹی
عاشقِ پنجتنؑ تھے میر انیس

....

شائق زیدی

پڑھنے کو وہاں مرثیہ گر جائے انیس　　خوش ہو کے کہیں لوح و قلم آئے انیس
اے ربِّ عُلیٰ رفعتِ کرسی کی قسم　　منبر ہو ترے عرش پہ بھی جائے انیس

....

برائے میر تھا غالب کے لب پہ ہائے غزل　　وہ کہنا چاہتا تھا اور کچھ بجائے غزل
انیسِ درد ترے مرثیے کی وسعت پر　　سلام کر رہا ہے ظرف تنگنائے غزل

....

سیّد نجم الحسن شمیم رجز (لاہور)

قطعات

خم برائے انیس ہیں ہم لوگ
ہم نوائے انیس ہیں ہم لوگ
ہم سے ملتے ہیں جُھک کے اہلِ فلک
خاکِ پائے انیس ہیں ہم لوگ

....

آغا سکندر مہدی (بہاولپور)

مدحِ سرکار حسینی سے بڑھی شانِ انیس
بے خزاں آج بھی ہے گلشنِ ایمانِ انیس
ذکرِ حضرت کو لئے میں سرِ منبر آیا
مرکزِ مجلس مولا ہے دبستانِ انیس

....

الطاف حسین نیرؔ محمود آبادی (راولپنڈی)

قطعات

انیسؔ ہم نے نہ تجھ سا کوئی بشر دیکھا
نہ تیری طرح کوئی صاحبِ نظر دیکھا
ہم اہلِ دل کے لئے آئینہ ہے تیرا کلام
حسینیت نظر آئی جدھر جدھر دیکھا

○

نظارہ ہم نے کیا مہر کا، قمر دیکھا
زمانہ دیکھا ہے ہم نے بشر بشر دیکھا
زوال ذاتِ خدا کے سوا ہے سب کے لئے
عروج جس کا بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا

....

سخن فتح پوری (کراچی)

رباعیات

ہے ذات تری مصدرِ اصنافِ سخن
اور طبع تری مخزنِ اوصافِ سخن
ہے دم سے ترے انیس پائندہ بہار
پھر کیوں نہ ہو ہر جا گلِ الطافِ سخن

....

ہے میر انیس میر احبابِ سخن
اس باب سے کھلتے گئے ابوابِ سخن
خالق ترا رب ہے تو ہے ربِ اُردو
ممنون ہیں دل سے ترے اربابِ سخن

....

جو منتظم ہیں یہاں وہ ہیں میزبانِ انیس
جو میہمان ہیں وہ سب ہیں میہمانِ انیس
زمینِ ہند ہو یا سرزمینِ پاکستان
مہک رہا ہے ہر اک سمت گلستانِ انیس
یہ اوج تجھ کو ملا اے زمینِ بھاولپور
کہ تیری خاک پہ بستے ہیں قدردانِ انیس
ادب کے لالہ و گل کی زباں پہ ہے یہ سخن
سلام قلب ہے اور مرثیہ ہے جانِ انیس

....

عابد حشری:

رباعی

فکر و فن کی روشنی سے ہے بہارِ مرثیہ
اعتبارِ آگہی ہے اعتبارِ مرثیہ

محترم یوں تو ہے جو بھی مرثیہ گو ہے مگر
ہے انیسؔ اپنی جگہ پروردگارِ مرثیہ

مرید حسین شائقؔ (راولپنڈی)

نذرانۂ عقیدت

ہزار انیسؔ کی شاعر کیا کریں تقلید
مگر انیسؔ کی منزل رسائی سے ہے بعید
انیسؔ آج بھی ہے میر کاروانِ ادب
وہی ہے راہبرِ جادۂ قدیم و جدید

....

اونچا ہے مرثیہ میں مقامِ ببر علی
پُر درد پر اثر ہے کلامِ ببر علی
ہر دل میں جاگزیں ہے پیامِ ببر علی
مشہور ہے فرشتوں میں نامِ ببر علی
مقبولِ پنجتنؑ ہے تخلص انیسؔ ہے
شائقؔ وہ شہرِ شعر و ادب کا رئیس ہے

میر انیسؔ

کی زمین میں

سلام

سخنؔ فتح پوری (کراچی)

سلام بر زمینِ انیسؔ

ولا کے عطر سے ہم دل کو یوں بسا کے چلے
کہ جیسے ساتھ شمیمِ چمن ہوا کے چلے

جو حق پرست تھے ان کو تو اپنے ساتھ لیا
جو غیر تھے انھیں ہم راستہ بتا کے چلے

جہاں بھی بادِ مخالف کے تند جھونکے تھے
وہیں چراغِ حسینؑ کو ہم جلا کے چلے

وہیں پہ سارے زمانے کے جھک گئے پرچم
جہاں سے پرچمِ عباسؑ ہم اٹھا کے چلے

ولائے آلِ نبیؐ ضامنِ بقا ورنہ
فنا کی بات کہاں سامنے بقا کے چلے

شبیہہِ روضۂ شبیرؑ ہم اُٹھا کے چلے
زمانہ ساتھ چلا لوگ سر جھکا کے چلے

نظر جو آیا جلوسِ عزائے سرورِؑ دیں
ملائکہ بھی قدم سے قدم ملا کے چلے

جس آئینے میں ہیں بے مثل صورتیں چودہ
زمانے بھر کو وہی آئینہ دکھا کے چلے

نظر میں کھنچ گئی تصویرِ حضرتِ عباسؑ
کسی مقام پہ جب تذکرے وفا کے چلے
شبیہہِ احمدِؐ مرسل نے دینِ احمدؐ پر
شباب کی جو بہاریں تھیں سب لٹا کے چلے
قدم اٹھائے نہ اٹھتے تھے خیمہ گہ کی طرف
حسینؑ ننھی سی تربت کو جب بنا کے چلے
صدا یہ تربتِ بے شیر سے سنی شہؑ نے
ہمیں زمین میں بابا کہاں چھپا کے چلے
علیؑ امامِ من است و منم غلامِ علیؑ
دمِ اخیر یہ مصرعِ سخن سنا کے چلے

وحید اختر (علی گڑھ)

سلام

وہ در بدر ہوں جو قبلہ نُما نہیں رکھتے
وہ سب کو مانیں خدا جو خدا نہیں رکھتے

ہم آپ ملتے ہیں بڑھ کر ہر ایک مشکل سے
اُنھیں ہو خوف جو مشکل کشا نہیں رکھتے

علیؑ پہ ناز ہے ہم ایسے بے نیازوں کو
دماغِ شکوہ و دستِ دعا نہیں رکھتے

زماں مکاں ہیں اُن ہی کے لئے اٹوٹ حصار
جو زورِ بازوئے قلعہ کشا نہیں رکھتے

خدائی بخشتے ہیں سائلوں کو فاقہ گزار
جو مال رکھتے ہیں، دستِ عطا نہیں رکھتے

سفر ہے اُن پہ حرام، اُن سے منزلیں بیزار
جو پاؤں شوقِ رہِ کربلا نہیں رکھتے

کرے تقاضا کسی سے بھی اب نہ ذبحِ عظیم
حسینؑ قرض یہ کل پر اُٹھا نہیں رکھتے

ٹپکنے میں بھی نہیں کھوتے آبرو آنسو
"کہ ٹوٹنے میں یہ شیشے صدا نہیں رکھتے"

مژہ سے چُنتا ہے کوئی ان آفتابوں کو
خطرِ غروب کا اشکِ عزا نہیں رکھتے

زباں امیر، قلم زر نگار، دل صابر
علیؑ کے بندے تصرّف میں کیا نہیں رکھتے

نازش پرتاب گڑھی (انڈیا)

سلام

عیش کرتی تھی سلامی، صفِ اعدا کیا کیا
اور تڑپا تھا محمدؐ کا نواسہ کیا کیا

رہے راضی برضا سیدِ والا کیا کیا
دشت سے ورنہ اُبل سکتے تھے دریا کیا کیا

جب لکھا فردِ شہادت پہ حسینؑ ابن علیؑ
تو مشیّت کا قلم ہاتھ میں کانپا کیا کیا

لے کے اصغرؑ کو جو مقتل سے پھرے شاہِؑ امم
دل پہ گزرا ہے گراں پھول سا لاشہ کیا کیا

سجدۂ شکر الگ، ماتم ہر لمحہ الگ
کام انجام دیئے شاہؑ نے تنہا کیا کیا

قتل بیٹے بھی ہوئے بھائی بھتیجے بھی ہوئے
بنتِ حیدرؑ نے مگر خود کو سنبھالا کیا کیا

خاک پر ایک بھی آنسو جو گرا دیتے حسینؑ
حشر ہو جاتا پھر اس دہر میں برپا کیا کیا

قاسمؑ و عونؑ و محمدؑ سے جیالے نہ ملے
ڈھونڈھنے کو فلکِ پیر نے ڈھونڈا کیا کیا

شانِ حق گوئی و بے باکی و عزم و جرأت
ابنِ حیدرؑ نے بڑھائی تنِ تنہا کیا کیا

نہ ملا حرؑ کے سوا حق کا طرف دار کوئی
فوجِ اعدا میں رہے یوں تو شناسا کیا کیا

کربلا والوں کا ایثار، کہ ہمت کہ خلوص
وہ ہی آنکھیں تھیں بھلا دیکھتی دنیا کیا کیا

سن سکا اتنا کہ نازش بھی ہے مدّاحِ حسینؑ
جانے دُنیا نے اُسے اور کہا تھا کیا کیا

میکشؔ اکبرآبادی (میوہ کٹرہ، آگرہ)

سلام

قدم قدم پہ ملک مجھ پہ بھیجتے ہیں سلام
رہِ فنا میں چلا لے کے میں حسینؑ کا نام

خدا کا نام نہ لیتا کوئی زمانے میں
اگر نہ لیتے دمِ ذبح وہ خدا کا نام

بھلائے کیسے جنابِ انیسؔ کو وہ شخص
کرے جو ذکرِ امامِ حسینؑ عرش مقام

جواب مل نہ سکا شرق و غرب میں جس کا
جلائی مشعلِ خورشید صبح نے تا شام

حسن حسینؑ کے نعروں سے دشت و در گونجے
کچھ اس خلوص سے اس نے لیا حسینؑ کا نام

وہ سوگوارِ شہیداں، غریقِ حبِّ حسینؑ
علیؑ کی نسل کا مدّاحِ اہلبیتِ عظام

امیرِ لفظ و معانی، فصیحِ سحر بیاں
زباں کنیز، مضامین اس کے گھر کے غلام

کسی سے نقل بھی اُس کے کلام کی نہ بنی
وہ بے مثال سخنور وہ مرثیے کا امام

"قبولِ خاطرِ لطفِ سخن" خدا کی ہے دین
ہے فیضِ آلِ نبیؐ کا جسے ملے یہ مقام

انیسؔ تم بھی ہو مدّاحِ آلؑ میکشؔ بھی
سلام تم پہ، تمہاری طرف سے مجھ پہ سلام

شیر افضل جعفری (جھنگ)

سلام

محتاجِ سکندر و دارا نہ چاہیئے
"غیر از خدا کسی پہ بھروسہ نہ چاہیئے"

نے راگ چاہیئے نہ پری خانہ چاہیئے
فقرِ غنی کو نعرۂ مستانہ چاہیئے

الفا و ناد و کاسہ و کنبھٹا تو ہو مگر
تاج و قبا و تخت کی پروا نہ چاہیئے

میری سرودگاہ تو عرشِ عظیم ہے
مجھ عندلیبِ ذات کو سدرا نہ چاہیئے

اس شمعِ کائناتِ شبِ قدر میں تجھے
پروانۂ جمال سے پردا نہ چاہیئے

جو تشنۂ شرابِ ولائے شہید ہیں
اُن کو فرات چاہیئے گنگا نہ چاہیئے

آنکھیں ترس گئی ہیں طلوعِ حبیبؑ کو
اتنا طویل و تار اندھیرا نہ چاہیئے

مجھ شکریہ طراز و اطاعت گزار سے
اے دستِ غیب! وعدۂ فردا نہ چاہیئے

پچھلے پہر کی مست و شرابی دعاؤں کا
یزداں پہ روز حملۂ ترکانہ چاہیئے

افضل! ازل سے مولا علیؑ کا مرید ہوں
مجھ کو دیارِ پیر میں کاشانہ چاہیئے

سیّد علی حسنین نقوی شیداؔ فتح پوری (راولپنڈی)

سلام

کافی ہے فقر منصبِ اعلیٰ نہ چاہیئے
پُوری نہ ہو سکے وہ تمنا نہ چاہیئے

رَگ رَگ میں بَس گیا ہے گلستانِ کربلا
اپنی نظر کو کوئی نظارا نہ چاہیئے

مدّاحِ اہلِ بیتؑ، علیؑ کا غلام ہوں
اب تو خیالِ اعلیٰ و اَدنیٰ نہ چاہیئے

ہوں وقف میں تو پنجتنِ پاک کے لئے
غیروں کے عشق کا مجھے سَودا نہ چاہیئے

سَو بار دے چکی ہے فریب اپنی زندگی
اِس عمرِ بے وفا کا بھروسہ نہ چاہیئے

بے حبِّ اہلبیتؑ شفاعت کا آسرا
غافلِ تجھے نجات کا دعویٰ نہ چاہیئے

نامِ علیؑ کے لینے سے ہوتے ہیں ہم جواں
پابندئ دعائے زلیخا نہ چاہیئے

بولی سکینہؑ نہر سے عمّو کو لائیں آپ
پانی کی ایک بوند بھی بابا نہ چاہیئے

روئے جو وقتِ عصر حَرم شاہ نے کہا
زِندہ ابھی حسینؑ ہے ایسا نہ چاہیئے

قُدرت عطا کی قبضۂ خالق میں کیا نہیں
اظہارِ نا اُمیدی بھی شیداؔ نہ چاہیئے

شیر افضل جعفری (جھنگ)

سلام

زمزمہ پرداز سیلابِ بلا میرے لئے
موت سروِ دار پر نغمہ سرا میرے لئے

نیمچوں کا بانکپن ہے دلربا میرے لئے
ایک عشوہ کار دلھن ہے قضا میرے لئے

لافتا الاّ علیؑ لاسیف اِلاّ ذوالفقار
حیدرِ کرّار ہیں مشکل کشا میرے لئے

میں سیہ کردار میرا مالک و مولا کریم
میں خطاؤں کے لئے ہوں اور عطا میرے لئے

پاس تک جنّت کے جاؤں گا نہ صحرا چھوڑ کر
غیرتِ باغِ ارم ہے کربلا میرے لئے

راس آتی ہے مجھے رنج و الم کی تازگی
ہے علاجِ قلب دردِ لادوا میرے لئے

موسمِ گل کو عدو کے واسطے مخصوص کر
اور اشک و آہ کی آب ہوا میرے لئے

بے ضمیروں کے لئے لات و منات و بولہب
کبریا و مصطفیٰؐ و مرتضیٰؑ میرے لئے

میں کہ اک مدّت سے ہوں آوارۂ دشتِ جنوں
نعرۂ شبیرؑ ہے بانگِ درا میرے لئے

سج گئی ہے سرزمینِ جنگ تیغ و تیر سے
آج مقتل کا سماں ہے جانفزا میرے لئے

میں چٹکتا ہوں نہالِ دار پہ گل کی طرح
جرعۂ زہراب ہے آبِ بقا میرے لئے

....

سیّد علی حسنین نقوی شیدا فتح پوری (راولپنڈی)

سلام

غیرتِ جنت ہے دشتِ کربلا میرے لئے
ذرّہ ذرّہ خاک کا خاکِ شفا میرے لئے

مجرئی اکسیر ہے خاکِ شفا میرے لئے
قطرۂ اشکِ عزا آبِ بقا میرے لئے

جان و دل سے کیوں نہ ہوں قربانِ آلِ مصطفےٰؐ
ہے قبالہ خلد کا اُن کی ولا میرے لئے

مدحتِ شبیرؑ میں گذرے گا جو وقتِ عزیز
کارگر ہوگا وہی بعدِ فنا میرے لئے

ہاتھ آتے ہیں یہاں پر لعل و گوہر بے طلب
مجلسِ شبیرؑ ہے بحرِ عطا میرے لئے

اسوۂ شبیرؑ پر چلنا جو آجائے کہیں
سہل ہو جائے گا غم روزِ جزا میرے لئے

بو ترابی ہوں مری میت پہ ہنگام فِشار
قبر میں آجائیں گے مشکل کشا میرے لئے

منکشف ہوتے ہیں کتنے رازہائے معرفت
درس گاہِ طُور ہے بزمِ عزا میرے لئے

اے علمدارِ حسینی رہ روِ راہِ رضا!
نقش پا تیرا ہے تعویذِ وفا میرے لئے

کھا کے پیکانِ ستم اصغرؑ نے یہ ہنس کر کہا
مدّعائے زیست ہے تیرِ جفا میرے لئے

جاں کے بدلے اپنی مرضی حق نے کی جس کو عطا
ماحصل ہے زیست کا اس کی رضا میرے لئے

دے کے مرنے کی رضا اکبرؑ کو یہ بولے حسینؑ
بار ہے اب زندگی اے مہ لقا میرے لئے

لذّتِ شیون غمِ شبیرؑ میں شیدا نہ پوچھ
ہے پیامِ عزمِ نو آہ و بکا میرے لئے

....

سیّد علی حسنین نقوی شیدؔا فتح پوری (راولپنڈی)

سلام

تڑپ اُٹھا کسی مظلوم کو اگر دیکھا
غمِ حسینؑ کا ہر دل میں یہ اثر دیکھا

بنادیا اُنھیں خالق نے زندۂ جاوید
جنھیں حسینؑ نے اُلفت سے اِک نظر دیکھا

حسینؑ بن کے جہاں میں نہ آیا کوئی نظر
بشر کو بنتے خدا کا پیام بر دیکھا

حسینؑ آپ سا پایا نہ صابر و شاکر
فلک نے عرش پہ، ہم نے زمین پر دیکھا

یقیں ہے عاقبت اُس کی بخیر ہوگی وہاں
یہاں حسینؑ کے روضے کا جس نے دَر دیکھا

عجب مقام ہے میدانِ کربلا کہ یہاں
عروجِ مہرِ یقیں بعدِ دوپہر دیکھا

سکون ملتا ہے تیغِ جفا کا پھل کھا کر
یہ ہم نے الفتِ شبیرؑ کا ثمر دیکھا

قدم اُکھڑ گئے پسپا ہوئی سپاہ اُدھر
نگاہِ غیظ سے عباسؑ نے جدھر دیکھا

ملی تھی دوشِ پیمبرؐ پہ کل جسے معراج
اُسی حسینؑ کا نیزہ پہ آج سر دیکھا

جوابِ تیرِ سہ پہلو دیا تبسّم سے
نہ ایسا دل نظر آیا نہ یہ جگر دیکھا

حُرِّ جری کے مقدر کا ذکر کیا شیدؔا
فلک نے بھی کہاں اس طرح کا بشر دیکھا

....

ماہر آفغانی (راولپنڈی)

"دیکھا"

"عروجِ مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا" یہ اک عجیب تماشائے رہگذر دیکھا
وہ ایک شمعِ فروزانِ بزم ہے ساقی نظر میں اُس کی رہا جس نے اک نظر دیکھا
وہ ایک دل کہ ہے صورت میں جو گُلِ لالہ اُسے بھی شامِ غریباں کا مستقر دیکھا
سرِ حسینؑ جو نیزے پہ سر بلند ہوا جسے کہ وقت نے دوشِ رسولؐ پر دیکھا
بنا وہ سُرخیٔ مضمونِ کربلا ایسا کہ اُس کی شان کا عنواں نہ پھر دگر دیکھا
ہوئے شہید کچھ اس طرح کربلا والے کہ سب نے موت کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا
شفق نے خونِ جگر کا بہادیا دریا جو خون میں علی اکبرؑ کو تر بہ تر دیکھا
اَٹی وہ گرد میں زینبؑ کی چادرِ زہراؑ کہ آسماں نے جسے خاک پھانک کر دیکھا
وہ اہل بیتؑ پہ کوہِ گرانِ غم ٹوٹا کہ یہ فلک نے نظارا نہ عمر بھر دیکھا
ہوئیں جو گوشِ سکینہؑ سے بالیاں غائب جلا کے شمع ستاروں نے رات بھر دیکھا
کٹے جو بازوئے سالارِ کاروانِ حسینؑ ملائکہ نے یہ منظر بہ چشمِ تر دیکھا
بساطِ دہر پہ ایسا یہ واقعہ گزرا کہ جس پہ ایک خدائی کو نوحہ گر دیکھا

قیاس، عقل نے کیا کیا نہیں کیا ماہرؔ
علیؑ کو جب متولّد خدا کے گھر دیکھا

....

رابعہ نہاںؔ (راولپنڈی)

سلام

غمِ حسینؑ میں جب مجھ کو چشمِ تر دیکھا
نہ میرا نامۂ اعمال اک نظر دیکھا

حسینؑ جب تھے بلندی پہ نوکِ نیزہ کی
تو اپنی بہنوں کو بلوے میں ننگے سر دیکھا

ملائکہ کو بھی حیرت ہوئی شبِ عاشور
نگاہِ خلق نے ایسا تھا کب بشر دیکھا

بجھائی شمع دیا سب کو اذن جانے کا
رہِ جہاد میں کس کا یہ دل جگر دیکھا

زمانے بھر میں ہے مشہور صبرِ ایوبی
خدائے صبر نہ تم سا کوئی بشر دیکھا

اُٹھایا دوش پہ لاشہ جوان بیٹے کا
رضائے حق میں کسی کو نہ یوں نگر دیکھا

نہاںؔ کو دعویٰ ہے وہ تیری نام لیوا ہے
نہ اس پہ تیرے اصولوں کا کچھ اثر دیکھا

رباعی

آئینے پر گرد آسکے گی نہ انیسؔ
دنیا تجھ کو بُھلا سکے گی نہ انیسؔ
تاریخ ہزار اپنے کو دُہرائے گی
پر تیرا جواب لاسکے گی نہ انیسؔ

....

شیر افضل جعفری (جھنگ)

سلام

"عروجِ مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا"
فرازِ شاہ کو دنیا نے عمر بھر دیکھا

جسے بھی موت کے مستوں نے اک نظر دیکھا
اُسے پھر ہم نے سدا غیرتِ خضَر دیکھا

ملنگ کو جو درِ بُوتراب پر دیکھا
مقام اُس کا فلک سے بلند تر دیکھا

سناں پہ دھوم سے جب زمزمہ طراز ہوا
سرِ حسینؑ کو یزداں نے جھوم کر دیکھا

فرس کی زین پہ، فرشِ زمیں پہ، نیزے پر
جری امامؑ کو ہر حال میں امر دیکھا

نصیب ہو نہ سکا اُس کو حُسنِ مرگِ شہید
امیرِ شام نے سو سو طرح سے مر دیکھا

زمیں پہ جس کو ید اللہ کا خطاب دیا
اُسی کا ہاتھ پیمبرؐ نے عرش پر دیکھا

اجل کے باغ میں نرگس نے چشمِ حیراں سے
علیؑ کے سروِ تمنّا کو با ثمر دیکھا

سخی نے اپنے چمن کے حَسین غنچوں کو
شگفتہ خنجر برّاں کی شاخ پر دیکھا

فلک نے شامِ غریباں میں سوگواروں کے
اک ایک اشک میں ایمان کا شرر دیکھا

خدا کو زندۂ جاوید کردیا جس نے
نگاہِ وقت نے ایسا بھی اک بشر دیکھا

فرات شرم سے لہروں کی آڑ لینے لگی
جب اس نے خشک لبوں کو لہو سے تر دیکھا

بیاضِ عشق میں حُسنِ الم کی عظمت نے
مری فقیر غزل کو بچشمِ تر دیکھا

....

تجمّل لکھنوی (کراچی)

سلام

مزہ لڑائی کا آجائے گا لعینوں کو
علیؑ کا شیر اُلٹتا ہے آستینوں کو

مظاہرہ کیا امّت نے بے وفائی کا
ملا کے خاک میں زہرؑا کے مہ جبینوں کو

جو اب، عرشِ الٰہی ہے اہلبیتؑ کا گھر
ملی مکاں کو بلندی شرف مکینوں کو

یہ بات انیسؔ میں دیکھی کہ جن میں شعر کہے
فلک پہ رکھ دیا لے جا کے ان زمینوں کو

رہے گا جانِ عبادت حسینؑ کا سجدہ
ملک ہزار جھکایا کریں جبینوں کو

حسینؑ دین کے اقدار کردیئے زندہ
ابھارا آپ نے ڈوبے ہوئے سفینوں کو

ملے جو خاک میں مل کے حبیبؑ کو رتبے
وہ مرتبے نہیں حاصل فلک نشینوں کو

صفیں الٹ کے صدادی یہ شاہ والا نے
کہاں گئے جو چڑہاتے تھے آستینوں کو

تجمّل ارض و سما روئے شہؑ کی غربت پر
ہوا نہ رنج مگر کلمہ گو لعینوں کو

نفیسؔ فتح پوری (کراچی)

سلام

جب ہوا ذکرِ حسینؑ اہلِ ولا کے سامنے
کھچ گئی تصویرِ غم دردِ آشنا کے سامنے

جن کا ایماں ہے کہ جانا ہے خدا کے سامنے
خم نہیں کرتے وہ سر ظلم و جفا کے سامنے

حرصِ دنیا ہو تو ناممکن ہے ایماں کا ثبات
شمع کی لو کب ٹھہرتی ہے ہوا کے سامنے

ہوگیا حرؑ زندۂ جاوید شاہِ دیں کے ساتھ
کربلا میں ورنہ پہلو تھے فنا کے سامنے

عرصۂ محشر میں اک مجلس بپا ہوجائے گی
فاطمہؑ شکوہ کریں گی جب خدا کے سامنے

مل کے خوں چہرے پہ اصغرؑ کا یہ کہتے تھے حسینؑ
سرخرو ہو کے چلا ہوں کبریا کے سامنے

تو ہی پردہ بن کے آجا درمیاں اے گردِ راہ
بی بیوں کے سر کھلے ہیں اشقیا کے سامنے

ہم نے خود دیکھا ہے اکثر یا علیؑ کہہ کر نفیسؔ
تھم گئے ہیں بارہا طوفان آ کے سامنے

زاہد فتح پوری (کراچی)

سلام

یوں رفیقوں کے لئے سبطِ پیمبرؐ نکلے
جیسے تاروں کی جلو میں مہِ انور نکلے

نصرتِ دیں کو جو نکلے تو بہتر نکلے
کبھی قاسمؑ ، کبھی اکبرؑ کبھی اصغرؑ نکلے

کربلا والے قیامت کے شناور نکلے
ڈوب کر اپنے لہو میں لبِ کوثر نکلے

ہائے بازار میں یوں زینبِؑ مضطر نکلے
وارثِ چادرِ تطہیر کھلے سر نکلے

یوں لڑے عونؑ محمدؑ کہ ہے تاریخ گواہ
طفل اس گھر کے جوانوں کے برابر نکلے

اشقیا چھوڑ کے دریا کی ترائی بھاگے
غیظ میں خیمے سے جب ثانیٔ حیدرؑ نکلے

تشنگی شاہ کے بچّوں کی جو تھی جو پیشِ نگاہ
نہر سے پیاسے ہی عباسِؑ دلاور نکلے

لوگ سمجھے کہ ہے قرآں تہ دامانِ حسینؑ
لے کے جب اصغرِؑ معصوم کو سرورؑ نکلے

یاد آئی جو سکینہؑ تو بہت روئے اسیر
قید خانے سے رہا ہو کے جو باہر نکلے

یہی کام آئیں گے محشر میں ترے اے زاہد
غم شبیرؑ میں آنکھوں سے جو گوہر نکلے

تحسینؔ جعفری (راولپنڈی)

سلام بر زمینِ انیسؔ

ہیچ ہے آبِ بقا اشکِ عزا کے سامنے
گرد ہے اکسیر خاکِ کربلا کے سامنے

بابِ خیبر تھا ہی کیا خیبر کشا کے سامنے
ایک برگِ کاہ جیسے ہو ہوا کے سامنے

آندھیوں کی زد میں تھا دینِ محمدؐ کا چراغ
کون آسکتا تھا طوفانِ بلا کے سامنے

یا علیؑ کہہ کر مگر شیرِ خدا کا لاڈلا
ڈٹ گیا خم ٹھونک کر مہلک ہوا کے سامنے

حفظ ناموسِ شریعت کے لئے شبیرؑ نے
رکھ دیا ہنس کر گلا تیغِ جفا کے سامنے

موت سے ڈرتے نہیں جو حق پہ ہوتے ہیں فدا
سرخ رو ہو کر وہ جاتے ہیں خدا کے سامنے

محوِ حیرت تھے یزیدی، مسکراتا دیکھ کر
اصغرؑ بے شیر کو تیرِ قضا کے سامنے

دیکھ کر اُم البنینؑ کے شیر کو بھاگے عدو
کیا ٹھہرتے وارثِ خیبر کشا کے سامنے

عابدؑ بیمار غیرت سے گڑے جاتے تھے آہ
جب ہوئی پیشی یزیدِ بے حیا کے سامنے

ننگے سر ماں بہنیں، پھوپھیاں، اشقیا کا اژدھام
مرحلہ تھا سخت یہ زین العباؑ کے سامنے

اس طرح کھنچتا ہے دل مومن کا سوئے کربلا
گھاس کا تنکا ہو جیسے کہربا کے سامنے

میں گدائے کوئے حیدرؑ ہوں، نہیں تجھ سے غرض
زالِ دنیا جا کسی زر آشنا کے سامنے

خانہ زادِ کبریا سے بغض ہے تحسینؔ جنھیں
کون سا منہ لے کے جائیں گے خدا کے سامنے

سیّد فیضیؔ (راولپنڈی)

سلام

حسینؑ تجھ سا جہاں میں نہ راہبر دیکھا
ترا مقام جو دیکھا بلند تر دیکھا

یہ تیری عظمتِ کردار کا کرشمہ ہے
ہر اک نے تجھ کو بہ اندازۂ نظر دیکھا

ترے ہی جلوؤں سے روشن ہے وسعتِ کونین
زمیں پہ دیکھا کبھی تجھ کو عرش پر دیکھا

سمجھنے والے تری شان کو سمجھ ہی گئے
وگرنہ دیکھنے والوں نے عمر بھر دیکھا

ترے ثبات کو حاصل ہوئی توانائی
گلا جو خون سے اصغرؑ کا تونے تر دیکھا

اندھیرے چھا نہیں سکتے تری فضاؤں میں
ضیا فروز ترے خون کا اثر دیکھا

شہیدِ جلوۂ غم پر سلام ہو فیضیؔ
مصیبتوں نے بھی اس کو خدا نگر دیکھا

....

ڈاکٹر ماجد رضا عابدی:

سلام بر زمینِ انیسؔ

نہ جنت نہ اُس کے مکاں کھینچتے ہیں — ہمیں کربلا کے نشاں کھینچتے ہیں
جو گردن کو تا آسماں کھینچتے ہیں — انھی کو فنا کے نشاں کھینچتے ہیں
ابھی عمر کیا اور زورِ سخن کیا — عبث لوگ مجھ پر کماں کھینچتے ہیں
یہ میرا مقدّر کہ جاؤں خراساں — زمینوں کو اب آسماں کھینچتے ہیں
جو ہم یاعلیؑ کا لگاتے ہیں نعرہ — مصیبت میں اپنی کماں کھینچتے ہیں
علیؑ یاعلیؑ کہہ رہے ہیں نُصیری — یہ چلّہ بجائے اذاں کھینچتے ہیں
علیؑ نے بتایا کہ شمشیرِ برحق — کہاں روکتے ہیں کہاں کھینچتے ہیں
خرد ، عشق پر جبکہ آجائے غالب — تو پھر ہم رہِ لا مکاں کھینچتے ہیں
جو آلِ عبؑا سے ہوں رہبر میّسر — تو منزل کو پھر کارواں کھینچتے ہیں
بھنور میں جو کشتی پھنسے تو عدو بھی — علیؑ نام کا بادباں کھینچتے ہیں
جو دم بھر رہے ہیں ہم آلِ نبیؐ کا — کڑی دھوپ میں سائباں کھینچتے ہیں
فقط اک تبسّم نے فوجوں کو اُلٹا — کہیں تیغ بھی بے زباں کھینچتے ہیں
جو زہرؑا کے قلب و نظر کی ہیں ٹھنڈک — گُہر ایسے گریہ کناں کھینچتے ہیں
ہوا جب سے پامال زہرؑا کا گلشن — گلستاں نقوشِ خزاں کھینچتے ہیں
لگا کر طمانچے سکینہؑ کے منہ پر — لعیں اس کی اب بالیاں کھینچتے ہیں
ارے سیدالساجدینؑ جیسے لاغر — کہیں وزنِ طوقِ گراں کھینچتے ہیں

یہ سانسیں نہیں اس زمانے میں ماجؔد
یہ گویا ہم آتش فشاں کھینچتے ہیں

تضمین
بر سلامِ انیسؔ

سیّد محمود الحسن نیرنگؔ بھوپالی (کراچی)

تضمین بر سلام انیسؔ

دارِ محنت تھی یہ دنیا کی سرا میرے لئے
دمبدم تھی تازہ ایذا و جفا میرے لئے
ہو گیا دردِ اجل آخر دوا میرے لئے
"خود نویدِ زندگی لائی قضا میرے لئے"
"شمع کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لئے"

تھی تجھے زر سے مجھے مولائے بوذر سے وِلا
ربّ عالم نے دیا دونوں کی محنت کا صلا
تجھ کو سونا، مجھ کو سونا زیرِ خاکِ کربلا
اے مہوّس قسمت اپنی اپنی اس کا رشک کیا
"کیمیا تیرے لئے خاکِ شفا میرے لئے"

جب تلک جیتا یوں ہی آنسو بہاتا مثلِ شمع
جس کے ہاتھ آتا وہی مجھ کو جلاتا مثلِ شمع
سوزشِ دل کے سوا کیا اور پاتا مثلِ شمع
نام روشن کر کے کیوں کر بجھ نہ جاتا مثلِ شمع
"ناموافق تھی زمانہ کی ہوا میرے لئے"

حشر میں کیا بارِ عصیاں نے کیا ہے سرنگوں
سامنے آنکھوں کے ہے فہرستِ اعمالِ زبوں
میرے مالک میں بھلا اس کے سوا اب کیا کہوں
"بھیج دے دوزخ میں یا جنّت میں ہاں مجرم تو ہوں"
"تو ہے عادل جو مناسب ہو سزا میرے لئے"

ہجر میں جب دخترِ شبیرؑ کرتی ہے بکا
مادرِ عباسؑ کہتی تھیں نہ روؤ میں فدا
دل سنبھالو ہوش میں آؤ پیو بی بی دوا
کہتی تھی صغراؑ ٹھنڈائی سے نہ ہو وے گی شفا
"شربتِ دیدارِ اکبرؑ ہے دوا میرے لئے"

سیّد محمد امیر امام حُر (لندن)

تضمین

ہم اپنے دل سے فرائض کو یوں بُھلا کے چلے　　روا روش میں حقوقِ بشر مٹا کے چلے
نہ جانے کتنے دلوں کو یہاں دُکھا کے چلے　　گنہ کا بوجھ جو گردن پہ ہم اٹھا کے چلے
خدا کے آگے خجالت سے سر جھکا کے چلے

نہ غم گیا نہ طبیعت ہوئی بحال کبھی　　دُکھے دلوں کا نہ دل سے گیا خیال کبھی
کسی کے دل کو نہ ہم سے ہوا ملال کبھی　　کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی
چلے جو راہ تو چیونٹی کو بھی بچا کے چلے

کدورتوں سے بَرَی ہیں قلوبِ اہلِ ولا　　کہ خاکساری سے پائی ہے آئینوں نے جِلا
علوِ نفسِ بشر ہے فروتنی کا صلا　　جنھیں مِلا انہیں افتادگی سے اوج ملا
انھوں نے کھائی ہے ٹھوکر جو سر اٹھا کے چلے

تھا گاہوارۂ ہیجا زمین کا طبقہ　　ہلا نہیب سے سارا زمین کا طبقہ
فلک لرز گئے، کیا تھا زمین کا طبقہ　　ملک پکارے کہ الٹا زمین کا طبقہ
حسینؑ فوج پہ جب آستیں چڑھا کے چلے

عجب ہوا وہ تھی اس دشتِ پُر بلا کی ہوا　　وِلا کا پھول جہاں موسمِ خزاں میں کِھلا
ہوائے خلد لئے تھی فضائے کرب و بلا　　خیال آگیا دنیا کی بے ثباتی کا
چلے جہاں سے جو اصغرؑ تو مسکرا کے چلے

ہجومِ حزن میں جب بھی لیا حسینؑ کا نام — کئے نثار گہر آنسوؤں کے بہرِ امام
وقارِ صبر یہ تھا، نام کو نہ تھا کہرام — ملی نہ پھولوں کی چادر تو اہلبیتِؑ امام
مزارِ شاہ پہ لختِ جگر چڑھا کے چلے

بہت عزیز ہے دنیا نگاہِ دنیا میں — یہ عبرتیں بھی ہیں شام و پگاہِ دنیا میں
فنا ہے جلوۂ ہر گاہ گاہِ دنیا میں — قیام یوں ہوا اس کارگاہِ دنیا میں
کہ جیسے دن کو مسافر سرا میں آ کے چلے

غرض نے رسمِ مروت مٹائی عالم سے — وہ کچھ امید جو باقی تھی عشق کے دم سے
اب اٹھتی جاتی ہے وہ خُو بھی نسلِ آدم سے — تمام عمر جو کی سب نے بے رخی ہم سے
کفن میں ہم بھی عزیزوں سے منہ چھپا کے چلے

بقا کی فکر میں اب خضر اِدھر اُدھر جاؤ — فنا کے جھونکوں سے بچ کر بھلا کدھر جاؤ
عدم کی رات ہے گھیرے ہوئے جدھر جاؤ — انیسؔ دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

....

تجسّس اعجازی لکھنوی (لکھنؤ)

تضمین بر سلام انیسؔ

تلاشِ اشکِ غمِ شہ ہے آستینوں کو در حسینؑ کی ہے جستجو جبینوں کو
ہے کربلا کی تمنّا حرم نشینوں کو "سدا ہے فکرِ ترقّی بلند بینوں کو
ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو"

گلوں سے بھر دیا قدرت نے جب زمینوں کو گہر بنادیا شبنم کے آبگینوں کو
سنوارا قاسمؑ و اکبرؑ سے مہ جبینوں کو "پڑھیں درود نہ کیوں دیکھ کر حسینوں کو
خیالِ صنعت صانع ہے پاک بینوں کو"

ضیائے چہرۂ شبرؑ سے تھا حسینؑ کو عشق شبیہہ ساقیٔ کوثر سے تھا حسینؑ کو عشق
جمالِ عکسِ پیمبرؐ سے تھا حسینؑ کو عشق "بجا ہے اس لئے اکبرؑ سے تھا حسینؑ کو عشق
کہ دوست رکھتا ہے اللہ بھی حسینوں کو"

تھے آفتابِ امامت علیؑ کے نور العین چھلک رہا تھا تجلّی سے دامنِ کونین
حسنؑ کے ساتھ ہی معراج پا رہے تھے حسینؑ "یہ غل تھا مُہرِ نبوّت پہ جب چڑھے حسنینؑ
جڑا ہے ایک انگوٹھی پہ دو نگینوں کو"

مہک رہا ہے شمیمِ بہشت سے گلزار ہر ایک غنچے کی رگ رگ میں دوڑتی ہے بہار
ہے میرے پیشِ نظر مدحِ حیدرؑ کرار "لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو"

پلا رہا ہوں میں حبِ علیؑ کے ساغر مفت بجا ہے تلخیٔ الفاظ گر نظر ہو درست
مزاجِ ناقدِ کج فہم ہے ازل سے دُرشت "غلط یہ لفظ، وہ بندش بری یہ مضموں ست
ہنر عجیب ملا ہے یہ نکتہ چینوں کو"

صدائے طبل جب آئی عدو کے حلقے سے نگاہ تیغ پہ ڈالی جری نے غصے سے
بپھر کے شیر برآمد ہو جیسے بیشے سے "علم لئے ہوئے عباسؑ نکلے خیمے سے
چڑھالیا علی اکبرؑ نے آستینوں کو"

چھڑی ہے جنگ قیامت کی کفر و ایماں میں پڑی ہے تھرتھری باطل کے قصر و ایواں میں
ہے شورِ نعرۂ تکبیر دشتِ امکاں میں "حسینؑ جاتے ہیں بہرِ نبرد میداں میں
چڑھائے مثلِ یداللہ آستینوں کو"

حبیبؓ بولے کیا کام خوش ضمیری نے حجاب اٹھادیئے موجِ مئے غدیری نے
جواں بنادیا سرورؑ کی دستگیری نے "یہ جھرّیاں نہیں، ہاتھوں پہ ضعفِ پیری نے
چُنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو"

صدا حبیبؓ کی آئی، اٹھائے شہؑ نے قدم بلند کردیا کچھ اور بھی وفا کا علم
بتا رہا ہے یہ کردارِ سیدِ عالم "خیالِ خاطرِ احباب چاہیئے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو"

....

سیّد مظہر حسین زیدی اظہر (راولپنڈی)

تضمین

نہ پاؤگے مہ و انجم میں مہ جبینوں کو　　شرف ہے مسکنِ انوار کا خزینوں کو
تو کربلا و نجف جیسی سرزمینوں کو　　سدا ہے فکرِ ترقی بلند بینوں کو
ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو

خدا کی حمد سکھائی فلک نشینوں کو　　سجایا آکے عجب طور سے زمینوں کو
سلامِ اہلِ زمیں عرش کے مکینوں کو　　پڑھیں درود نہ کیوں دیکھ کر حسینوں کو
خیالِ صنعتِ صانع ہے پاک بینوں کو

یہ سچ ہے داورِ محشر سے تھا حسینؑ کو عشق　　حبیبِ خالقِ اکبر سے تھا حسینؑ کو عشق
ہر ایک صاحبِ محضر سے تھا حسینؑ کو عشق　　بجا ہے اس لئے اکبرؑ سے تھا حسینؑ کو عشق
کہ دوست رکھتا ہے اللہ بھی حسینوں کو

خدا کے حکم سے واضح کیا یہ نصب العین　　یہی ہیں سبطِ نبیؐ اک حسنؑ ہے ایک حسینؑ
متاعِ دیں سے جو بھر دیں گے دامنِ کونین　　"یہ غل تھا مُہرِ نبوت پہ جب چڑھے حسینؑ
جڑا ہے ایک انگوٹھی پہ دو نگینوں کو

زمینِ نظم ہے مظہر کہ ہے چمن میں بہار　　بنا مزاجِ سخن شوخیوں سے لالہ زار
یہ کر رہا ہے بیاں عندلیبِ خوش گفتار　　لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

زمینِ نظم سے آئی جو العطش کی پکار   چلی ہوائے سخن بن کے ابرِ ژالہ بار
ہے برقِ فکر بھی دُرّہ لئے ہوا پہ سوار   لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

گماں ہے ناقدِ کج فہم کو کہ میں ہوں درست   زبان صورتِ مقراض ہے رواں پسِ پشت
ہنر ہے یہ بھی کہ تنقید میں ہے شہرتِ مفت   غلط یہ لفظ وہ بندش بُری یہ مضموں سُست
ہنر عجیب ملا ہے یہ نکتہ چینوں کو

عدو نے تیر چلائے جو اپنے دستے سے   سنبھالے تیغ کو اُٹھے امامؑ سجدے سے
بپھر گئے بنی ہاشم کے شیر غصّے سے   علم لئے ہوئے عباسؑ نکلے خیمے سے
چڑھالیا علیؑ اکبر نے آستینوں کو

بقائے دیں کی ہے تدبیر قلبِ ایماں میں   کلامِ حق کی ہے تصویر شکلِ انساں میں
بشر کو فرق بتانا ہے کفر و ایماں میں   حسینؑ جاتے ہیں بہر نبرد میداں میں
چڑھائے مثلِ یداللہ آستینوں کو

حبیبؑ کو بھی لبھایا مئے غدیری نے   بنایا تیغ خمیدہ کمر کو پیری نے
عجب کمال کیا شہ کی دستگیری نے   یہ جھُرّیاں نہیں ہاتھوں پہ ضعفِ پیری نے
چُنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو

جو اہل بیتؑ پہ اُمت نے ڈھائے ہیں وہ ستم   ہزار سال بھی لکھے نہ لکھ سکے گا قلم
وِلائے آلؑ میں کوثر ہے مختصر سی رقم   خیالِ خاطر احباب چاہیئے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

سفر میں شہؑ کے ہوا سدِّ راہ حُر جس دم   کیا تھا پیاسوں کو سیراب بن کے ابرِ کرم
حبیب ہوگا مرا جانتے تھے شاہِ امم   خیالِ خاطرِ احباب چاہیئے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

....

سیّد شاکر علی جعفری (کراچی)

تضمین بر اشعارِ میر انیسؔ

نہ کر سکا کوئی خاموش نکتہ چینوں کو عبث ہے روکنا خود کار ان مشینوں کو
یقیں دلاتے ہیں کیوں آپ بے یقینوں کو سدا ہے فکر ترقی بلند بینوں کو
ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو

انیسؔ، تونے تراشا ہے ان نگینوں کو کہ جن پہ ناز سخن کی ہے نازنینوں کو
سکھائے تونے وہ آداب ہیں جبینوں کو پڑھیں درود نہ کیوں دیکھ کر حسینوں کو
خیالِ صنعتِ صانع ہے پاک بینوں کو

یوں حرّیت کو قلم زد کیا اسیری نے نہ حرف آنے دیا جس پہ حرف گیری نے
کیا وہ سحر انیسؔ آشنا دبیری نے یہ جھرّیاں نہیں ہاتھوں پہ ضعف پیری نے
چُنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو

خزاں سے آشنا ہرگز نہ ہوگی تیری بہار وہ بحرِ فیض ہے تو اور وہ ابرِ گوہر بار
ہے اب بھی کہہ رہا ہر اک سے جو پکار پکار لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

یوں آئے خانۂ زہراؑ سے قبلۂ کونین کہ اک طرف تھے حسنؑ دوسری طرف تھے حسینؑ
تھے دونوں گود میں آنے کے واسطے بے چین یہ غل تھا مہرِ نبوت پہ جب چڑھے حسنینؑ
جڑا ہے ایک انگوٹھی پہ دو نگینوں کو

شعورِ قابوئے اعصاب چاہیئے ہر دم وہ تاب اے دلِ بے تاب چاہیئے ہر دم
عدو بھی پانی ہوں وہ آب چاہیئے ہر دم خیالِ خاطرِ احباب چاہیئے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

سیّد محمد امیر امام حرؔ:

تخمیس سلام میر ببر علی انیسؔ

محتشم ہیں گو کہ ہم جاہ و حشم رکھتے نہیں ہیں غنی دل کے خیال بیش و کم رکھتے نہیں
غیر از درد محبت اور الم رکھتے نہیں رنج دنیا سے کبھی چشم اپنی نم رکھتے نہیں
جز غم آلِ عبؑا ہم اور غم رکھتے نہیں

صاحبان دل ہیں بندے علم کی درگاہ کے اہل حق بھوکے نہیں اعزاز و مال و جاہ کے
وہ غنی ہیں راہرو ہیں جو وفا کی راہ کے در پہ شاہوں کے نہیں جاتے فقیر اللہ کے
سر جہاں رکھتے ہیں سب ہم واں قدم رکھتے نہیں

اہلِ ثروت سیم و زر پر مارتے ہیں چن کے ہاتھ کھینچ لیتے ہیں کلام اہلِ حاجت سُن کے ہاتھ
آتش زر سے نہ رہ جائیں کہیں جل بھن کے ہاتھ جو غنی ہیں مالِ دنیا سے ہیں خالی ان کے ہاتھ
اہلِ دولت جو ہیں وہ دستِ کرم رکھتے نہیں

تیغِ حرّیت سے کٹ جائیں گے استبداد و شر ہوں گے جنباں انقلاب دہر سے سب دشت و در
کانپ اُٹھیں گے جلال عدل سے سب اہلِ زر دیکھنا کل ٹھوکریں کھاتے پھریں گے ان کے سر
آج نخوت سے زمیں پر جو قدم رکھتے نہیں

مدح سے آلِ محمدؐ کی مشرف ہے زباں ثبت کر دی ہے دلوں پر شہ کے غم کی داستاں
فکر کے جلووں سے روشن ہیں زمین و آسماں یہ دوات و خامہ ہے ملکِ فصاحت کا نشاں
کون کہتا ہے کہ ہم طبل و علم رکھتے نہیں

یہ فصاحت یہ روانی یہ مضامینِ نفیس یہ تخیّل کی بلاغت حرؔ یہ الفاظ سلیس
شعر سے ظاہر ہے تھا سب شاعروں کا وہ رئیس مرثیہ اک دن میں کیا سب کہہ کے اُٹھو گے انیسؔ
ہاتھ سے کیوں آج قرطاس و قلم رکھتے نہیں

میر انیسؔ

کے کلام

کے منظوم ترجمے

شاعر شہیر ایران آقای حسین عاطف تہرانی

ترجمہ : منظوم دعای ءِ میرانیسؔ

یارب چمنِ نظم کو گلزارِ ارم کر اے ابرِ کرم خشک زراعت پہ کرم کر
تو فیض کا مبداء ہے توجہ کوئی دم کر گمنام کو اعجاز بیانوں میں رقم کر
جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے
اقلیمِ سخن میری قلم رو سے نہ جائے

○

یارب چمنِ نظم مُرا باغ ارم کن بر مزرع خُشکم کرم ای ابرِ کرم کن
تو مبداءِ فیضی بہ توجہ نجہم کن گمنام در نادرہ گویانم علم کن
تا نور ز خورشید جدائی نپذیرد
اقلیمِ سخن فاصلہ از بند نگیرد

رقم

امیر عباس حیدری ایرانی
(استاد دانش گاہ کیمرج یونیورسٹی)

فارسی ترجمہ منظوم رباعیات میر انیسؔ

فارسی	اُردو
ماکودکی و شباب دیدیم و گذشت	طفلی دیکھی شباب دیکھا ہم نے
ہستی چو حباب دیدیم و گذشت	ہستی کو حبابِ آب دیکھا ہم نے
تا چشم ببستیم معمّا بگشود	جب بند ہوئی آنکھ تو عُقدہ یہ کھلا
یک عمر تمام خواب دیدیم وگذشت	جو کچھ دیکھا سو خواب دیکھا ہم نے

....

فارسی	اُردو
چون مردم دیدہ از نظر پنہانی	پُتلی کی طرح نظر سے مستور ہے تو
آں نور کہ دیدہ جوہرش خود آنی	آنکھیں جسے دیکھتی ہیں وہ نور ہے تو
نزدیک ترستی ازرگ جان و ہنوز	نزدیک رگِ جاں سے ہے اس پر یہ بُعد
دور آنقدری کہ خود فقط می دانی	اللہ اللہ کس قدر دُور ہے تو!

....

فارسی	اُردو
بادِ سحر آشفتہ تُرا می جوید!	گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے
بلبل بہ چمنِ وصف تُرا می گوید	بلبل کی زباں پر گفتگو تیری ہے
ہر رنگ کہ ہست جلوۂ قدرت تست	ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا
ہر کس کہ گُلے چید تُرا می بوید	جس پھول کو سونگھتا ہوں بُو تیری ہے

....

سیّد شاکر علی جعفری (کراچی)

انیسؔ کے کلام کا انگریزی ترجمہ

سلام

سدا ہے فکرِ ترقّی بلند بینوں کو
ہم آسمان سے لائے ہیں اِن زمینوں کو

A lofty pursuit aims at high.

These grounds we bear down from the sky.

پڑھیں درود نہ کیوں دیکھ کر حسینوں کو
خیالِ صنعتِ صانع ہے پاک بینوں کو

Worship I do each pretty face:

The Art Supreme, supreme I Place

یہ جھرّیاں نہیں ہاتھوں پہ، ضعفِ پیری نے
چُنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو

These Wrinkled arms?_Nay,Old age Weaves

This fashion-wear of crinkled sleeves

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

Thoughts unborrowed in heaps I pile
For free-lancers for their free style

خیالِ خاطرِ احباب چاہیئے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

Anees! to friends be always fair:
These glass-wares need handling with care

....

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے
بلبل کی زباں پر گفتگو تیری ہے

The Breeze searcheth for Thee amid the Bower.
The Nightingale too praiseth of Thine Power.

ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا
جس پھول کو سونگھتا ہوں بُو تیری ہے

Each Colour bears attraction but for thee.
Thine clue it gives, I smell whichever Flower.

....

گُل سے بلبل کی خوش بیانی پوچھو
ذی فہم سے لطفِ نکتہ دانی پوچھو

Ask of the Rose what nightingale singeth about.

The Virtuous delight to seek the Virtue out.

توقیرِ کلامِ حق سمجھتا ہے کلیم
موسیٰؑ سے رموزِ لن ترانی پوچھو

None Knows save Moses of the Tongue at Mount Sinai

That spoken unto him beyond Shadows of Doubt.

....

شاکر علی جعفری (کراچی)

رباعیاتِ انیسؔ کا انگریزی ترجمہ

نافہم سے کب دادِ سخن لیتا ہوں
دشمن ہو کہ دوست سب کی سن لیتا ہوں

I seek the unpoetic not for word of praise.
The foe or Friend, I welcome what he says

چھپتی نہیں بوئے دوستانِ یکرنگ
کانٹوں کو ہٹا کے پھول چُن لیتا ہوں

The honey from hemlock I set apart:
I get not lost in thorns and flowers maze.

....

طفلی دیکھی شباب دیکھا ہم نے
ہستی کو حبابِ آب دیکھا ہم نے

The childhood and the youth, at a wink they flew;
And there at last the Bubble burst and blew

جب آنکھ ہوئی بند تو عُقدہ یہ کُھلا
جو کچھ دیکھا سو خواب دیکھا ہم نے

The sightless eyes then visualized too well.
The dream deceitful and the awakening true.

....

گلشن میں پھروں کہ سیرِ صحرا دیکھوں
یا معدنِ کوہ و دشت و دریا دیکھوں

In Flowers I stroll, or stare at wilderness,
Or look at rocks' and sands' and seas' riches,

ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

A myriad sight to speak that beauty of;
And me, but a pair of eyes to possess.

ماں باپ سے بھی سوا ہے شفقت تیری
افزوں ہے ترے غضب سے رحمت تیری

More loving than parents, O Lord, Thou art!
Forgiveness far More than wrath, at thine heart!

جنّت انعام کر کہ دوزخ میں جَلا
وہ رحم ترا ہے، یہ عدالت تیری

Reward Heaven, or me to Hell condemn.

This would be mercy, that just, to my part.

....

ڈاکٹر احمد تمیم داری:
مدیر مرکزِ تحقیقات فارسی، اسلام آباد

کلامِ انیسؔ کا منظوم ترجمہ (فارسی)

انیسؔ:-

گرمی کا روزِ جنگ کی کیوں کر کروں بیاں
ڈر ہے کہ مثلِ شمع نہ جلنے لگے زباں

ترجمہ:-

گرمیِ روزِ جنگ چگونہ کنم بیان
ترسم چو شمع آب شود در دھان زبان

انیسؔ:-

پانی تھا آگ گرمیٔ روزِ حساب تھی
ماہی جو سیخِ موج تک آئی کباب تھی

ترجمہ:-

گرمیِ آب ، آتشِ روز حساب بود
ماھی بہ سیخِ موج چو آمد کباب بود

غزلیں
برزمینِ میرانیسؔ

علامہ نجمؔ آفندی (کراچی)

غزل

نہ پوچھئے غمِ دوراں میں کیا اثر دیکھا
خود اپنے حال پہ کس کس کو نوحہ گر دیکھا

منازلِ غمِ ہستی کو عمر بھر دیکھا
مآل یہ ہے کہ جیسے بیک نظر دیکھا

مزاجِ دوست نے بُھولے سے جب ادھر دیکھا
نگاہِ شوق میں اک حسن جلوہ گر دیکھا

رہِ وفا میں سہارے بغیر چل نہ سکے
بڑے بڑوں نے مرا ہاتھ چھوڑ کر دیکھا

کچھ ایسے نقش مری خستگی نے چھوڑے ہیں
غرورِ حسن بھی تھرّا گیا جدھر دکھا

گناہ گاروں کے اتنے کثیر مجمع میں
خدا کا شکر مجھے اُس نے اک نظر دیکھا

قصیدے جن کی زبانوں پہ دردِ دل کے رہے
انھیں بھی ہم نے گرفتارِ دردِ سر دیکھا

خدا بھلا کرے احباب کی نگاہوں کا
ہمارا حال تھا نادیدنی مگر دیکھا

عمل کی حد میں وفا کا بڑا مقام سہی
جب اُس نے کون و مکاں دیکھ کر اِدھر دیکھا

اسے بھی خلقت انسانیت پہ ناز ہوا
جب اُس نے کون و مکاں دیکھ کر ادھر دیکھا

ملا جو عیب کہیں ہم نے چشم پوشی کی
ہنر جہاں نظر آیا بصد نظر دیکھا

مجھے انیسؔ کی عظمت پہ رحم آیا نجمؔ
وہ رنگ چہرۂ یوم انیسؔ پر دیکھا

عرشؔ ملسیانی (دہلی)

غزل

تلاش سجدوں سے کرتی ہیں جو خزینوں کو
میں دیکھتا ہوں تحیّر سے ان جبینوں کو

کسی طرح یہ زمانے کی زد سے بچ نہ سکے
بچایا لاکھ محبّت کے آبگینوں کو

ہنر شناس گئے، فن کے جوہری نہ رہے
کسے دکھاؤں خیالات کے نگینوں کو

حسینؑ ابن علیؑ کا ہے نام پائندہ
زمانہ بھول گیا شمر سے لعینوں کو

ہمارا سینہ نظر آئے مرکزِ اسرار
دکھائیں کھود کے اک بار اگر دفینوں کو

بزعمِ خویش بڑے مدّعی ہوئے لیکن
کوئی سمجھ نہ سکا عشق کے قرینوں کو

بہت ہوئے ہیں یہاں ماہرانِ گلشنِ راز
دکھا سکا نہ کوئی تہ نشیں خزینوں کو

بنے ہوئے ہیں وہی داعیانِ امنِ جہاں
چڑھائے پھرتے ہیں ظالم جو آستینوں کو

جو فاش کردیں اشارے سے کائنات کاراز
زمانہ ڈھونڈتا ہے آج ان ذہینوں کو

ذرا انیسؔ کی جدّت طرازیاں دیکھو
بلند جس نے کیا شعر کی زمینوں کو

....

شمیم کرہانی (دہلی)

غزل

یہ کس نے توڑ کے پھینکا ہے آبگینوں کو
ملا ہے ایک تماشا، تماش بینوں کو

ہمارے شہر میں ایسی بھی ایک رات آئی
ملی نہ بھیک اجالوں کی مہ جبینوں کو

مکاں تو آج بھی موجود ہیں کھنڈر ہی سہی
مگر کہاں سے کوئی لائے اُن مکینوں کو

قدم جو چاند پہ رکھا تو یہ ہوا معلوم
کہ زندگی ابھی طے کر رہی ہے زینوں کو

ہمارے سر تو قلم ہوگئے مگر ہم نے
خدا کا شکر جھکایا نہیں جبینوں کو

سحر قریب ہے اب کون آنے والا ہے
بُجھادو شمع کو، پھینک آؤ آبگینوں کو

تمام شہر میں برپا ہے کیسا ہنگامہ
چڑھائے پھرتے ہیں کیوں لوگ آستینوں کو

ذرا مورّخِ فردائے فکر و فن لکھ لے
کہ پتھرّوں سے خریدا گیا نگینوں کو

جو اعتبارِ نوا سنجیٔ ہنر ہے شمیم
تو نکتہ چینیاں کرنے دو نکتہ چینوں کو

....

حیاتؔ لکھنوی (نئی دہلی)

غزل

فریبِ شوق کا منظر بجز سراب نہ تھا
مُراد پا کے میں سمجھا کہ کامیاب نہ تھا

کوئی سزا ہے ابھی اور حشر کے مالک
تمام عمر کا جینا کوئی عذاب نہ تھا

مرے خیال میں پھر کس کی تھی یہ رعنائی
مرا وجود اگر تجھ سے انتساب نہ تھا

بُجھے بُجھے سے چراغوں نے روشنی دے دی
تھکی تھکی سے نگاہوں میں اضطراب نہ تھا

عمل کے ساتھ ارادے بھی صاف تھے پہلے
وفا کے رنگ میں ڈُوبا ہوا عتاب نہ تھا

مزاج پوچھ رہے ہو تو بات بھی سُن لو
کہ اب سے پہلے مرا حالِ دل خراب نہ تھا

حیاتؔ اور کسی کو تلاش کیا کرتا
خود اپنے آپ کو ڈھونڈا تو دستیاب نہ تھا

....

گوپی ناتھ امنؔ (دہلی)

غزل

انیسؔ شاعرِ یکتا زبانِ اُردو کا
عجیب اُس کے ہر اک شعر میں اثر دیکھا

کلام اس کا بصیرت فروزِ عالم ہے
نہ اور اَیسا کوئی صاحبِ نظر دیکھا

ہر ایک شعر ہے گویا کہ سلکِ مروارید
ہر ایک نظم کو گنجینۂ گہر دیکھا

کہیں کہیں تو ہر اک کے یہاں ہے کچھ جادو
خدا گواہ کہ ایسا نہ سحر گر دیکھا

یہی بہت ہے کہ اشعار انیسؔ کے دیکھے
نہ یوں تو ہم نے کوئی خلد کا ثمر دیکھا

بڑھائی آبرو اُس نے زبانِ اُردو کی
کلام اُس کا جو معیارِ نقد پر دیکھا

یہ دل میں تھا کہ کہوں اس کو میں خدائے سخن
میں چپ رہا جو میاں شیخ نے اِدھر دیکھا

سلیمان اریب (حیدر آباد دکن)

غزل

نگاہِ یار کا ہر دل پہ یہ اثر دیکھا
کہ ایک پل کو سہی غم سے بے خبر دیکھا
زِ فرق تا بقدم ہے وہ شعلہ و شبنم
اُسے نہ دیکھنا چاہا بھی تو اُدھر دیکھا
نہ دیر و کعبہ ملے اور ملا نہ میخانہ
جدھر جدھر میں گیا تیرا رہ گزر دیکھا
"عروج آدمِ خاکی" سے کون منکر ہے
مگر یہی کہ اُسے میں نے خود نگر دیکھا
وہ ایک بار تو آیا تھا زندگی بن کر
اس ایک خواب کو بس ہم نے عمر بھر دیکھا
اریبؔ، خونِ جگر صرف کر کے بھی ہم نے
ہنر کو اپنے خجل پیشِ بے ہنر دیکھا!

ریورنڈ ہینسن ریحانی (حیدر آباد دکن)

غزل

جمالِ دوست کے طالب نے اس قدر دیکھا
فروغِ جلوہ کو اک پردۂ نظر دیکھا

بنایا دل کو خضر جادۂ محبت میں
نہ مڑ کے ہم نے کبھی سوئے راہبر دیکھا

نہ جانے شیخ و برہمن ہیں کیوں خفا اتنے
خدا کو ہم نے اگر خود کو دیکھ کر دیکھا

بنادے تاج جو لے کر سہارا دولت کا
جہاں میں حسن نے ایسا نہ تاجور دیکھا

ہوس ہے، مفت میں کیوں وقفِ سعیٔ لاحاصل
نہ دیکھا شام کو وہ ہم نے جو سحر دیکھا

جو تشنگی کے بجھانے کو بادہ خوار چلے
ہر ایک موڑ پہ، وا میکدے کا در دیکھا

نشاں، جگر کے لہو سے بنادیئے ہم نے
جہاں جہاں بھی تقاضائے رہ گزر دیکھا

پکارتی رہی دنیا مگر وہ رک نہ سکا
کسی کو تم نے جو ناگاہ اک نظر دیکھا

نظر نہ آیا کوئی پھر گناہ گار ہمیں
جو منھ کو اپنے گریباں میں ڈال کر دیکھا

عنادل آپ ہی اُڑ اُڑ کے سوئے دام چلے
خدا کی مار یہ انجامِ بال و پر دیکھا

گری جو صحنِ گلستاں میں برقِ ریحانی
تو اس سے اپنا نشیمن قریب تر دیکھا

....

تاثیرؔ صدیقی (حیدر آباد دکن)

غزل

سوائے دل نہ کوئی اپنا ہم سفر دیکھا
نہ راہزن کوئی دیکھا نہ راہبر دیکھا

سکوں میں درد دیا درد میں سکون دیا
ستم گر آپ سا دیکھا نہ چارہ گر دیکھا

نظر نہ آئے گا اہلِ خرد کو محفل میں
وہ ایک جلوہ جسے ہم نے دار پر دیکھا

وہ اعتبارِ مکمّل ہے اپنی نظروں میں
جو معتبر نہ تھے اُن کو بھی معتبر دیکھا

ہر ایک ٹکڑے میں اک انجمن ملی ہم کو
جب اپنے آئینۂ دل کو توڑ کر دیکھا

یہی تو کارِ نمایاں ہے ناخداؤں کا
کنارے بیٹھ کے موجوں کو عمر بھر دیکھا

کسی کو میکدۂ زندگی میں اے ساقی
نہ ہوشمند ہی پایا نہ بے خبر دیکھا

کبھی طویل نہ پائی مسرتوں کی عمر
کبھی نہ سلسلۂ غم کو مختصر دیکھا

چمن ہے ایک مگر اختلافِ منظر ہے
اِدھر جو گل نظر آیا اُدھر شرر دیکھا

ہر ایک ذرّہ ہے صد دعوتِ نگاہ لئے
کسی نے بھی نہ جہاں کو بہ یک نظر دیکھا

ہم، اہلِ دل کی حقیقت شناس نظروں نے
سحر سے پہلے ہی اک جلوۂ سحر دیکھا

کہاں کہاں نہ گئے ہم تلاش میں تیری
کہاں کہاں نہ تجھے ہم نے جلوہ گر دیکھا

قفس بنے کئی تاثیرؔ اور دام بچھے
چمن میں نغمۂ بلبل کا یہ اثر دیکھا

ساجد رضوی (حیدر آباد دکن)

غزل

شب فراق میں بھی جلوۂ سحر دیکھا
نئے چراغ جلے عشق نے جدھر دیکھا

جو دل کا حال اِدھر تھا وہی اُدھر دیکھا
کہاں کہاں اثرِ آہِ بے اثر دیکھا

کہیں خوشی سے نہ ہو جائے اس کا حال تباہ
وہ خوش نصیب جسے تم نے اک نظر دیکھا

محال ہے کہ میں دیکھوں تمہیں بقیدِ نگاہ
حجاب ہی نظر آیا جدھر جدھر دیکھا

قریب و دور کا باقی ہے امتیاز ابھی
ابھی نظر نے کہاں عالمِ نظر دیکھا

چھپالیا ترے جلووں نے دامنِ دل میں
مری نظر میں جو ہنگامۂ نظر دیکھا

یہ رازِ دید کوئی کم نگاہ کیا جانے
گھڑی بھر آپ کو دیکھا تو عمر بھر دیکھا

نظر ملی ہے تو پھر مصرفِ نظر کیا ہے
یہ کوئی جرم نہیں آپ کو اگر دیکھا

پہنچ کے جب تری منزل پہ ہم ٹھہر نہ سکے
نگاہِ یاس سے منزل کو لوٹ کر دیکھا

جو آستانِ محبت پہ سر جھکا نہ سکا
اسی کو آج زمانے میں در بدر دیکھا

قدم قدم پہ جو ساجد ملے جبیں کے نشاں
قدم قدم پہ تماشائے رہ گذر دیکھا

قائم جعفری (حیدر آباد دکن)

غزل

بلند کر کے خودی کو جو اک نظر دیکھا
خود اپنے آپ کو ہر سمت جلوہ گر دیکھا

رہِ وفا میں کسی نے وفا کی داد نہ دی
ہر ایک گام پہ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا

یہ ہے تمدّن و تہذیب و ارتقا کا عروج
بشر کے خون سے رنگیں کفِ بشر دیکھا

جنونِ جبر و تشدّد ارے معاذ اللہ
خمیدہ شرم سے انسانیت کا سر دیکھا

نویدِ مرگ ہوئی تلخیٔ حیات جنھیں
رہِ حیات میں اُن کو بھی بے خبر دیکھا

خیال و خواب کی تسکینِ عارضی ہی سہی
جو دُور تھے اُنھیں اپنے قریب تر دیکھا

ریاضتوں کا تسلسل ہے یا تماشہ ہے
دعائے نیم شبی کو بھی بے اثر دیکھا

نظر نواز اجالے کا تھا یقین ہمیں
بڑی اُمید سے ہم نے رُخِ سحر دیکھا

جو معترض مری تر دامنی کی شان پہ تھے
اُنھیں بھی محفلِ ساقی میں تر بتر دیکھا

بچھڑ کے رہ گئے رستے میں قافلے والے
بس ایک اپنے ارادے کو ہم سفر دیکھا

مرے سخن میں ہیں قآئم تصرّفاتِ انیسؔ
شعورِ شعر و سخن کو عُروج پر دیکھا

ڈاکٹر اسد انصاری

غزل

جو بے نقاب اُنھیں میں نے جلوہ گر دیکھا
نظر میں تابِ نظارہ نہ تھی مگر دیکھا

اُنھیں کو میں نے بہ ہر ذرّہ جلوہ گر دیکھا
اُدھر، اُدھر نظر آئے جدھر، جدھر دیکھا

مآلِ کارِ شعورِ نظر وہی ٹھہرے
کسی کو میں نے نہ پھر اُن کو دیکھ کر دیکھا

ہمیشہ مجھ کو وہ اپنے سے دور ہی سمجھے
اُنھیں تو میں نے ہمیشہ قریب تر دیکھا

تمام عمر کہیں پھر اُسے اماں نہ ملی
جو اُن کے در سے اٹھا اس کو دربدر دیکھا

چلا وہ چند قدم اور تھک کے بیٹھ گیا
رہِ حیات میں جس کو بھی ہم سفر دیکھا

ہمیشہ مجھ کو شکست اپنی ماننا ہی پڑی
ہزار بار زمانے سے روٹھ کر دیکھا

نہ باریاب ہوئی التجائے چشمِ کرم
نہ بھول کر بھی کبھی اس نے اک نظر دیکھا

سبب زوالِ اثر کا ہی، دن کے ہنگامے
جب اپنے آپ کو میں نے نہ معتبر دیکھا

بھلا کسی کو بھی میں کیسے معتبر سمجھوں
سکوتِ شب کی دعاؤں کو با اثر دیکھا

دکھائے اس نے اسدؔ اپنے نت نئے جلوے
اُسے فریب دیا جس کو دیدہ ور دیکھا

سیّد علی اصغر ایم اے (حیدر آباد دکن)

غزل

نظر نے عالمِ ظلمات میں جدھر دیکھا
خیالِ صبحِ درخشاں کو جلوہ گر دیکھا
دیارِ دردِ محبت کی دلکشی مت پوچھ
ہر ایک چشمِ تمنّا کو خوں میں تر دیکھا
حریمِ شب میں اجالوں کی بات کیا کرتے
فسونِ تیرہ شبی ہم نے رات بھر دیکھا
شعورِ عشق کی راہوں میں میرے اشکوں نے
نمودِ حسن کے جلووں کو ہم سفر دیکھا
وہ ایک موڑ تھا افسانۂ محبت کا
کسی نے جب مجھے حسرت سے اک نظر دیکھا
شکستہ دل کی صداؤں کو میں نے بھی اصغؔر
شکستِ ساز کے نغموں سے بہرہ ور دیکھا

رفعت سلطان (راولپنڈی)

فغانِ دل

ابھی وہ آگ میسّر نہیں ہے سینوں کو
جو جُھکنے دے نہ کسی حال میں جبینوں کو

بہت قدیم ہے دنیا میں رسمِ سنگ زنی
چھپائے کوئی کہاں اپنے آبگینوں کو

مرے دکھوں کا مداوانہ کرسکیں گے کبھی
جو دیکھتے ہیں بہ اوجِ فلک زمینوں کو

سکوں پذیر نہیں ہے ابھی انا میری
ابھی وفا کا سلیقہ نہیں حسینوں کو

چلی سموم تو ویران ہوگئے دیہات
مگر خبر نہ ہوئی شہر کے مکینوں کو

خلوص، جذبۂ ایثار، ذوقِ دل سوزی
چھپائے پھرتا ہوں مدّت سے اِن خزینوں کو

فغانِ دل کو سمجھتے ہیں شاعری میری!
خدا معاف کرے میرے نکتہ چینوں کو

خود اپنی ذات پہ ہوگا جنہیں یقیں رفعتؔ
جلائیں گے سرِ ساحل وہی سفینوں کو

رشید نثار (راولپنڈی)

نذرِ انیس

شبِ حیات میں رقصاں رہے شرر کی طرح — ملا تھا اذنِ نفس مہلتِ نظر کی طرح
کبھی گذر گئے پہلو سے مثلِ موجِ صبا — کبھی ملے ہیں زمانے کو ہم سفر کی طرح
کسی کی آگ، کسی کا لہو، کسی کا الم — لگا لیئے ہیں گلے سے غمِ جگر کی طرح
خرابہ ہائے وفا سے گذر گئے تو کھلا — کہ زندگی ہے فقط گردِ رہ گذر کی طرح
وفا شعار بھی دیکھے وفا طلب بھی مگر — کوئی بھی کام نہ آیا دل و نظر کی طرح
کہاں کہاں نہ غمِ زیست کو اُٹھائے پھرے — کہیں سکون میسّر ہوا نہ گھر کی طرح

علاجِ زندگیٔ غم اثر یہی ہے نثار
کہ مسکراتے رہو انجمِ سحر کی طرح

عاصم گیلانی (راولپنڈی)

غزل

وہ جو اُکتا کے چلے آئے تھے بزمِ ہُو سے
کیا ملا اُن کو بھلا عالمِ رنگ و بو سے

شاخِ گل اوڑھ لے پتّوں کی گھنیری چادر
رنگ اُڑ جائے نہ پھولوں کا جھلستی لُو سے

دردِ دل دے کے مزہ لیتے ہیں میرے احباب
کنکری پھینک کے تکتے ہیں کنارِ جُو سے

کس کی آنکھوں سے برستی رہی شب بھر شبنم
عارضِ گل پہ نظر آئے ہیں کچھ آنسُو سے

بکھری خوشبو تو نظر آئے چمن میں گلچیں
پھول کی جان گئی آپ ہی اپنی خُو سے

زندگی زندہ حقیقت کے سوا کچھ بھی نہیں
اب نہ بہکیں گے جنوں کیش، کسی جادو سے

اس کو ورثہ میں میسّر ہے تب و تابِ انیسؔ
کیسے ٹکرائے کوئی اور زباں اردو سے

تو نے دنیا پہ کیا پھول کا کھلنا ظاہر
بیر تھا کب سے تجھے بادِ صبا خوشبو سے

جب بڑھا دستِ طلب غیر کی جانب عاصمؔ
چھن گئی ساری توانائی مرے بازُو سے

کرامت علی کرامتؔ (اڑیسہ)

غزل

دلوں سے اپنے کرو دُور پہلے کینوں کو
جھکاؤ تب کہیں سجدوں میں تم جبینوں کو

یتیم جان کے موجوں نے جن کو پھینک دیا
بھنور میں ڈال دیا ہم نے ان سفینوں کو

متاعِ ذات لٹکتی ہے جو صلیبوں پر
دعائیں دیتی ہے درد و الم کے زینوں کو

سنائی دیتی نہیں چاپ مجھ میں صدیوں سے
میں وہ کھنڈر ہوں ترستا ہے جو مکینوں کو

یہ سوچ کر کہ دھڑکتا ہے کرچیوں میں بھی دل
میں توڑ پھوڑ کے رکھ دوں گا آبگینوں کو

وہ ذات ہو کہ ہو فطرت، کہ دوسرا ہم جنس
جہادِ زیست میں کرتا ہوں زیر تینوں کو

جہاں ہے عشق، وہیں جلوہ گاہِ حُسن بھی ہے
تجلّیوں سے کرو طُور اپنے سینوں کو

نشاطِ کرب کے لمحوں کا فیض جاری ہے
خبر کرو میرے شعروں کے نکتہ چینوں کو

طلسمِ لفظ و معانی کے نو بہ نو انبار
"ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو"

ظہیر صدیقی (پٹنہ)

غزل

ہم اپنے دل کو بچائیں کہ دل نشینوں کو
بجھائیں آگ کہ باہر کریں مکینوں کو

خلوصِ سجدہ یہاں رایگاں ہی جائے گا
یہ سنگِ در نہیں پہچانتے جبینوں کو

نظارہ کون کرے حیرتِ نظارہ نے
بنادیا ہے تماشا تماش بینوں کو

عجیب حال ہے سب جی رہے ہیں ماضی میں
اُلٹ چکے ہیں رہِ زیست کے قرینوں کو

کہاں کے نورِ مجسّم ہیں داغدار سبھی
بہت قریب سے دیکھا ہے مہ جبینوں کو

یہی ہوا ہے جو رفتار کا سبق دے گی
یہی ہوا ہے ڈبوئے گی جو سفینوں کو

بلند کس کو کہیں مہر و ماہ و انجم کو؟
کہ آسمان کو چھوتی ہوئی زمینوں کو؟

اگرچہ ہاتھ سبھی خنجروں سے خالی ہیں
ظہیرؔ غور سے دیکھیں تو آستینوں کو

....

سیدہ فرحتؔ (علی گڑھ)

غزل

یہ فکر آج بہت کم ہے ہم نشینوں کو
لگے نہ ٹھیس کہیں دل کے آبگینوں کو

کبھی جو باعثِ تہذیبِ نفسِ انساں تھے
زمانہ بھولتا جاتا ہے ان قرینوں کو

جو سطحِ آب پہ رقصاں ہیں کیا ملے گا انھیں
ملے ہیں جو دُرِ نایاب تہہ نشینوں کو

نشانِ جادۂ ہستی جو ہیں زمانے میں
ڈبو سکا کوئی طوفان ان سفینوں کو

جنھوں نے دامنِ تاریخ مالا مال کیا
زمیں چھپائے ہے ایسے بھی کچھ دفینوں کو

حضورِ حق کے سوا خم کہیں ہو نا ممکن
نہ ظلم و جبر جھکا پائے ان جبینوں کو

یہ سرکشا کے زمانے میں سر بلند ہوئے
شرف ملا یہ محمدؐ کے جانشینوں کو

وہ جن سے خاتمِ ایماں کو آب و تاب ملی
حسینؑ لائے تھے چُن کر ان ہی نگینوں کو

یہ حسن و خیر کا آئینہ ہیں ستم گارو
ہدف بناتے ہو تیروں سے جن کے سینوں کو

وہ لاکھ عالم و فاضل سہی انیسؔ مگر
دماغِ شعر کہاں تیرے نکتہ چینوں کو

زمیں پہ رہ کے جو تھے عرش آشیاں فرحتؔ
سلام نذر ہے ایسے بلند بینوں کو

محسنؔ زیدی (دہلی)

غزل

کچھ اور زور سے موجِ بلا اُچھال مجھے
اسیر کب سے تہہ آب ہوں نکال مجھے

جکڑ چکا ہے زمان و مکاں کا جال مجھے
خود اپنے گھر سے نکلنا بھی ہے مُحال مجھے

فلک سے فرش کا رستہ بڑے نشیب میں ہے
کہیں میں گر نہ پڑوں اے زمیں سنبھال مجھے

پھرا کروں گا ترے ساتھ کب تک آوارہ
ہوائے وقت کسی راستے پہ ڈال مجھے

میں اپنے قد سے اٹھا ہوں تو گھٹ گیا ہوں بہت
مرا عروج ہوا باعثِ زوال مجھے

میں بے کراں تھا مگر کر لیا گیا محصور
قبول کب تھی کوئی قیدِ ماہ و سال مجھے

زمانہ سُن کے مری بات ہو گیا خاموش
ملا جواب میں واپس مرا سوال مجھے

نشانِ راہ نہیں تھا کہ مجھ کو غم ہوتا
میں خاکِ پا تھا بکھرنے کا کیا ملال مجھے

گزر رہا ہوں تصوّر میں کن مقاموں سے
کہاں کہاں لئے پھرتا ہے اِک خیال مجھے

ہر ایک جادے پہ محسنؔ تھے نقشِ پا موجود
گیا جدھر بھی ملی راہِ پائمال مجھے

....

بسمل سعیدی (دہلی)

غزل

میکدے کی شام کیا خلدِ نظر ہوتی نہیں
یہ فضا صبحِ چمن میں جلوہ گر ہوتی نہیں

عشق کی منزل میں آتے ہیں کچھ ایسے مرحلے
راہ رَو کیا، رہ گزر بھی ہم سفر ہوتی نہیں

مدّتوں ہم پر رہا وہ عالمِ بیگانگی
عشق میں دل کو بھی جب دل کی خبر ہوتی نہیں

عشق جب تک ہو نہ شام اور عشق جب تک نہ ہو صبح
زندگی شائستۂ شام و سحر ہوتی نہیں

گریۂ غم موج زن رہتا ہے قلب و روح میں
یہ وہ رونا ہے کہ جس سے آنکھ تر ہوتی نہیں

کتنے مستحکم ہیں اس انسان کے غفلت کدے
زلزلوں سے جنبشِ دیوار و در ہوتی نہیں

گرمیٔ جذبات سے دل میں بھڑک اٹھتی ہے آگ
آتشِ گُل سے مگر شبنم شرر ہوتی نہیں

اک بہانہ جانیئے تجدیدِ ظلمت کے لئے
صبح ہونے سے شبِ غم کی سحر ہوتی نہیں

کتنی ہی سر سبز ہو شاداب ہو شاخِ اُمید
گُلفشاں ہوتی ہے لیکن بارور ہوتی نہیں

جب نہ ہو زورِ کماں شامل تو کیا پروازِ تیر
آہ میں تاثیر بے دردِ جگر ہوتی نہیں

عشق کے ظلمت کدوں میں چاندنی کا ذکر کیا
دھوپ بھی اُن کے درودیوار پر ہوتی نہیں

حلقۂ بیرونِ در ہے یہ نظامِ کائنات
میکدوں میں گردشِ شام و سحر ہوتی نہیں

رہ نوردِ عشق! مقتل سے گزرنا ہے تجھے
"یہ مہم جب تک نہ سر کٹ جائے سر ہوتی نہیں"

اُن کی برقِ حسن کا بسمل یہ عالم ہے کہ وہ
دل پہ گر سکتی ہے، محسوسِ نظر ہوتی نہیں

....

جرّم محمد آبادی (اعظم گڑھ)

غزل

اہتمامِ زندگی اتنا ہوا میرے لئے
مبتلا گردش میں ہیں ارض و سما میرے لئے

رنج سہتا ہے دلِ درد آشنا میرے لئے
خود تلاطم میں پھنسا ہے ناخدا میرے لئے

کون ایسا ہے جو دیوانہ ہوا میرے لئے
ان کا یہ کہنا قیامت ہو گیا میرے لئے

مُدّعا کچھ اور حرفِ مدّعا کچھ اور ہے
ہے بہت دشوار شرحِ مُدّعا میرے لئے

میں تو کیا ڈھونڈوں گا اپنی زندگی کا راستہ
کچھ تُمہی اپنی جگہ پر سوچنا میرے لئے

جو کڑی زنجیر کی ٹوٹی وہ دل میں گڑ گئی
بن گئی ہر سانس اک تیرِ قضا میرے لئے

ہر روش پر پھولتے پھلتے ہیں اے جرّم اہلِ باغ
ناموافق ہے گلستاں کی ہوا میرے لئے

سالکؔ لکھنوی (انڈیا)

غزل

سمجھ لے سوچ لے اور خود کو آزما کے چلے
جو میرے ساتھ چلے، اپنا گھر لٹا کے چلے

بتائیں کیا کہ لُٹا کیسے قافلہ اپنا
بس اتنی بات کہ ہم ساتھ رہنما کے چلے

نہیں غرور کہ اونچا ہے اپنا سر لیکن
جو کھیلے دار سے وہ کیسے سر جھکا کے چلے

چلو چلو ابھی آتے ہیں راہ میں اپنی
یہ دار ہے، یہ رسن ہے بس آزما کے چلے

چراغِ آرزو سے آگ لگ نہ جائے کہیں
ہوا کو چاہیے دامن ذرا بچا کے چلے

نقوشِ پا جو پُرانے تھے محترم تھے ہمیں
اسی لئے نئے نقشِ قدم بنا کے چلے

ہزاروں بار بنائے ہیں نقشِ پا ہم نے
ہزاروں بار وہی نقشِ پا مٹا کے چلے

دلِ خلوص روش اور فضائے حرص و ہوس
"چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے"

جو غم ملا اُسے اپنا بنالیا سالکؔ
جو کوئی راہ میں پتھر ملا، ہٹا کے چلے

....

حسن نعیم (نئی دہلی)

غزل

بیانِ شوق بنا، حرفِ اضطراب بنا
وہ اک سوال کہ جس کا نہ کچھ جواب بنا

میں ایک باب تھا افسانۂ وفا کا مگر
تمہاری بزم سے اُٹھا تو اک کتاب بنا

بہت قریب سے دیکھا تو کھوگئے جلوے
نظر ہی پردہ بنی، حسن ہی حجاب بنا

مجھے نہ خاک میں ملنے دے اے غمِ پنہاں!
جو بن سکوں تو مجھے نقشِ لاجواب بنا

سرائے دل میں جگہ دے تو کاٹ لوں یہ رات
نہیں یہ شرط کہ مجھ کو شریکِ خواب بنا

امیرِ چرخ کا احساں نہیں ہے مجھ پہ نعیم
مجھے ہے ناز کہ ذرّے سے آفتاب بنا

....

مظہر امام (پٹنہ)

غزل

جانے کیا بیتنے والا ہے ترے دھاروں پر
زخم طوفانوں کے ہیں آہنی پتواروں پر

یوں بھی ہیں تیری عنایات گنہ گاروں پر
رحمتیں بھیج شبِ غم کے عزاداروں پر

روح کے گرد رہا اپنے ہی شعلوں کا حصار
پڑ گئی اوس دھڑکتے ہوئے انگاروں پر

زیست تاریک رہی گاؤں کی راتوں کی طرح
دھوپ تھی جلوہ فشاں شہر کی دیواروں پر

جانے کب چشمِ بصیرت سے لہو پھوٹ پڑے
ناخنوں کے ہیں نشاں وقت کے رخساروں پر

اپنے ہی فن کے تلے دفن ہے ہر صاحبِ فن
بوجھ بھاری ہے عمارات کا معماروں پر

کون یہ سادہ قبا کوچۂ دل سے گزرا
صبح کی چھوٹ پڑی، رات کی دیواروں پر

شوخ دستی ہی نہ ہو اک نئے موسم کی امامؔ!
پھوار رنگوں کی پڑی تشنہ بہ لب خاروں پر

....

مخمورسعیدی (دہلی)

غزل

کوئی نہ تھا جو کسی سے قدم ملا کے چلے
تمام ہم سفروں کو ہم آزما کے چلے

گھٹی گھٹی سی فضائیں دھوئیں سے بوجھل ہیں
ہمارے شہر میں جھونکے یہ کس ہوا کے چلے

تمہاری بزم کی رونق کا ذکر تھا لیکن
اداس شام تھی قصے جگہ جگہ کے چلے

کب اُن کی تھیں وہ باتیں جو کہنے آئے تھے ہم
کب اُن سنے تھے وہ قصے جو ہم سنا کے چلے

وہ راہ گیر جسے راستہ نہ دے کوئی
ہجومِ شہر سے کب تک قدم ملا کے چلے

اِدھر بھی آئے تو تھے قافلے بہاروں کے
مگر کچھ اور بھی ویرانیاں بڑھا کے چلے

سفر حیات کا دشوار تو نہیں لیکن
کوئی ہماری طرح بارِ غم اُٹھا کے چلے

تمہاری نذر کو کیا لائیں سوچتے رہے ہم
سب اپنے نام کے تحفے سجا سجا کے چلے

ہمیں تھے حسنِ گریزاں ادا شناس ترے
تو پھر یہ کیا ہے کہ تو ہم سے منہ چھپا کے چلے

جو لوگ لُوٹنے آئے تھے شہرِ دل مخمور
وہ حسرتوں کی نئی بستیاں بسا کے چلے

....

مصوؔر سبزواری (ہریانہ)

غزل

منجمد اک درد ہوں تحلیل ہو سکتا نہیں
راہِ ناپرساں کا پتھر ہوں میں رو سکتا نہیں

اجنبی جھونکا کوئی زنجیرِ در کھڑکا نہ جائے
ورنہ ساری رات یہ دروازہ سو سکتا نہیں

چھو نہ پائے گا اسے کوئی بھی لمسِ آخری
فاصلہ ان قربتوں کا ختم ہو سکتا نہیں

جھانک کر کیا دیکھتا ہے میری آنکھوں سے پرے
خواب ان بنجر زمینوں میں تو بو سکتا نہیں

رت جگوں کے شہر میں میں ہی بجھا بیٹھا ہوں صرف
شام سے گُل کر کے شمعیں شہر سو سکتا نہیں

دیکھتا ہوں تیرے خال و خد میں اپنی شکل کو
آئینہ خود اپنا چہرہ دیکھ تو سکتا نہیں

کس قدر مخلوق کے سیلِ رواں سے ہوں الگ
ایک قطرے کو سمندر بھی سمو سکتا نہیں

عصرِ نو کا یہ بشر خود اپنے حق میں خود غرض
ایک بنجارہ جو اپنی لاش ڈھو سکتا نہیں

فن میں ہو جاؤں مصوؔر میں بھی ہم رنگِ انیسؔ
معجزہ مجھ سے کبھی سر زد یہ ہو سکتا نہیں

....

یوسف جماؔل (اڑیسہ)

غزل

جلا کے خود کو یہ منظر عجب دکھا کے چلے
دِوانے شعلۂ دل سے دھواں اُڑا کے چلے

مورخوں کے قلم کو یوں ہم جگا کے چلے
ہر ایک سانس کو اک حادثہ بنا کے چلے

زکات اپنے لہو کی نہ مل سکی اُن سے
جو میرے قتل سے شہرت کا زر کما کے چلے

نہ رہنے پایا کوئی بوجھ روح اور تن پر
جو قرض سانسوں کا ہم پر تھا وہ چُکا کے چلے

بنایا بُلبلہ پانی کا یہ کیا اچھا
مری حیات کی وُقعت ہے کیا بتا کے چلے

کدھر ہے دھیان؟ ذرا سر پھروں سے پوچھو تو
"چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے"

سلگتی رات کی چادر کی سلوٹوں میں جماؔل
ہم اپنے کرب کے ہر زخم کو چھپا کے چلے

مہدی پرتاب گڑھی

غزل

خود نمائی کا رہا تم کو سلیقہ کیا کیا
اپنے ہونے کا دکھایا ہے تماشا کیا کیا

دو قدم چل بھی نہ پایا مرے غم کے ہمراہ
تھا مُصر ہم سفری پر غمِ دنیا کیا کیا

اِس قدر تیز تھی بے مہری ایام کی دھوپ
مجھ سے کترایا کیا، خود مِرا سایہ کیا کیا

ایک اک کرکے سبھی ہوتے رہے نذرِ صلیب
شہرِ بیمار میں آئے تھے مسیحا کیا کیا

میرا دل، میری انا، میرا نفَس، میرا ضمیر
صفِ اعدا میں ملے میرے شناسا کیا کیا

پتھروں کو بھی جگہ ہیروں کی صف میں بخشی
میری فطرت مجھے دیتی رہی دھوکا کیا کیا

پیاس ہی ٹھہری ہے ہم سب کا مقدّر ورنہ
"سامنے آنکھوں کے لہراتا ہے دریا کیا کیا"

کون جانے کہ قدم رکھتے ہیں کس منزل پر
کیا کہوں! ہے مری وحشت کا تقاضا کیا کیا

مجھ کو آئی نہ کسی طرح زمانہ سازی
مجھ سے منہ پھیر گئے میرے شناسا کیا کیا

میری غزلوں میں نئی صبح کی ضو ہے مہدی
میں نے لفظوں میں سمویا ہے اُجالا کیا کیا

..... کلامِ انیسؔ سے انتخاب .....

منزلِ تسلیم و رضا

گذرِ منزلِ تسلیم و رضا مشکل ہے　　　سہل ہے عشقِ بشر، عشقِ خدا مشکل ہے
وعدہ آسان ہے، وعدے کی وفا مشکل ہے　　　جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے

یہ فقط امر ہوا فاطمہؑ کے جانی سے
مشکلیں جتنی پڑی کاٹیں وہ آسانی سے

مقامِ شبیرؑ

عزتِ دیں، شرف کون و مکاں ہیں شبیرؑ　　　جان زہراؑ کی، محمدؐ کی زباں ہیں شبیرؑ
سنگ پانی ہو، وہ اعجاز بیاں ہیں شبیرؑ　　　جان کیوں ہو نہ اُدھر، جانِ جہاں ہیں شبیرؑ

مہرباں ہوں تو ابھی عقدہ کشائی ہووے
وہ نہ بخشیں تو خدا تک نہ رسائی ہووے

انصارِ حسینؑ

ظاہر میں گرچہ تھے رُفقاء شاہ کے قلیل　　　پیشِ خدا مگر وہ حقیقت میں تھے جلیل
جرأت میں بے نظیر، شجاعت میں بے عدیل　　　سرگرم جان دینے پہ سب صورتِ خلیل

فاقوں میں صبر و شکر سے دل ان کے سیر تھے
جانباز تھے، جری تھے، مجاہد تھے، شیر تھے

کربلا کے غازی

ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہوائیں وہ بیاباں وہ سحر
دم بدم جھومتے تھے وجد کے عالم میں شجر
اُوس نے فرشِ زمرّد پہ بچھائے تھے گہر
لوٹی جاتی تھی لہکتے ہوئے سبزے پہ نظر
دشت سے جھوم کے جب بادِ صبا آتی تھی
صاف غنچوں کے چٹکنے کی صدا آتی تھی

مہمانِ کربلا

ہفتم کو ہوا بند جو پانی شہِ دیں پر
مچھلی سے تڑپنے لگے معصوم زمیں پر
صدمہ تھا عجب بادشہِ عرش نشیں پر
اِک کوہِ الم ٹوٹ پڑا جانِ حزیں پر
گلبرگ سے لب خشک تھے، سر زانو پہ خم تھا
پردیسیوں کی فکر تھی ، اطفال کا غم تھا

شہیدانِ کربلا

دیندار و سرفروش و شجاع و خوش اعتقاد
ہاتھوں میں تیغیں اور دلوں میں خدا کی یاد
زخموں کو نخلِ قد پہ وہ سمجھے گُلِ مراد
مردانگی یہ پیاس میں فاقوں میں یہ جہاد
تیغوں سے بند کون سا ان کا کٹا نہ تھا
پر معرکے سے پاؤں کسی کا ہٹا نہ تھا

پرچمِ حسینؑ

جب رن میں سر بلند علیؑ کا علم ہوا
فوجِ خدا پہ سایۂ ابرِ کرم ہوا
چرخِ زبرجدی پئے تسلیم خم ہوا
پنجے پہ سات بار تصدق حشم ہوا
دیکھا نہ تھا علم جو کبھی اس نمود کا
دونوں طرف کی فوج میں غُل تھا درود کا

طلوعِ سحر

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نُور — دیکھے تو غش کرے ارنی گوئے اوجِ طُور
پیدا گلوں سے قدرتِ اللہ کا ظہور — وہ جابجا درختوں پہ تسبیح خواں طیور
گلشن خجل تھے وادئ مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

آغازِ صبحِ غم

پھاڑا جو گریباں شبِ آفت کی سحر نے — پردے میں چھپایا رُخِ روشن کو قمر نے
پیمانۂ خورشید لگا نُور سے بھرنے — گردوں سے سفر فوجِ کواکب لگی کرنے
تاباں جو رُخ نیّرِ افلاک ہوا تھا
ذرّوں سے زرافشاں ورقِ خاک ہوا تھا

شبِ عاشور

ہشتم کو مصیبت تھی ، قیامت تھی نہم کو — اک حشر تھا خیمے میں یہ رقّت تھی نہم کو
بچوں پہ عجب پیاس کی شدّت تھی نہم کو — اللہ نہ دکھلائے جو آفت تھی نہم کو
وہ دن بھی کٹا جب تو مصیبت کی شب آئی
کھولے ہوئے بالوں کو شہادت کی شب آئی

امام حسینؑ بارگاہِ عجز و نیاز میں

عرض کرتے ہیں یہ خالق سے کہ اے ربِّ غفور — تو ہے عالم کہ نہیں کچھ ترے بندے کا قصور
کرتے ہیں یہ مجھے بے جرم و خطا تیغوں سے چُور — ہاتھ اُمت پہ اُٹھانا نہیں مجھ کو منظور
جانتے ہیں کہ محمدؐ کا نواسا ہوں میں
پانی دیتے نہیں ، دو روز کا پیاسا ہوں میں

میدانِ کربلا کی گرمی

وہ لُو، وہ آفتاب کی حدّت، وہ تاب وتب کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثالِ شب
خود نہر علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب خیمے جو تھے حبابوں کے، تپتے تھے سب کے سب
اُڑتی تھی خاک، خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

کربلا کی پیاس

چلتی ہوئی کمانِ کیانی کی وہ ترنگ رہ رہ کے ابرِ شام سے تھی بارشِ خدنگ
وہ شور و صیحۂ فرسِ ابلق و ترنگ وہ لُون، وہ آفتاب کی تابندگی وہ جنگ
پھنکتا تھا دشتِ کیں، کوئی دل تھا نہ چین سے
اس دن کی تاب وتب کوئی پوچھے حسینؑ سے

فوجِ یزیدی

یہ ذکر تھا کہ دور سے ظاہر ہوئے نشاں انداز میں یہ ظلم کا دریائے بیکراں
موجوں کی طرح سب تھیں صفیں پیش وپس رواں لہراتے تھے ہوا سے علم مثلِ بادباں
ہلتا تھا دشتِ کیں، دہل اس طرح بجتے تھے
باجوں کا تھا یہ شور کہ بادل گرجتے تھے

ذوالفقار

کاٹھی تھی ذوالفقار کی یا تھا اجل کا گھر حجلہ تھا یا نقاب رُخِ لیلیٰ نظر
گھونگھٹ اُٹھا کے برق سے چمکی اِدھر اُدھر دولھا دُلھن حجاب سے نکلے جھکائے سر
دکھلائی سب کو منہ کی صفائی لڑائی میں
جانیں ہزار وجہ سے لیں رونمائی میں

گھوڑے کی تعریف

بجلی کبھی بنا ، کبھی رہوار بن گیا　　آیا عرق تو ابرِ گُہربار بن گیا
گہہ قطب گاہ گنبدِ دوّار بن گیا　　اَلقط کبھی بنا ، کبھی پرکار بن گیا
حیراں تھے اس کے گشت پہ لوگ اس ہجوم کے
تھوڑی سی جا میں پھرتا تھا کیا جھوم جھوم کے

جنگ

نکلی جو رَن میں تیغِ حسینؑ غلاف سے　　اُڑنے لگے شرر دمِ خارا شگاف سے
بجلی بڑھی چمک کے جو دشتِ مصاف سے　　صاف آئی الاماں کی صدا کوہِ قاف سے
طبقے فلک کے صورتِ گہوارہ ہل گئے
دب کر پہاڑ خاک کے دامن سے مل گئے

دنیائے بے ثبات

دنیا بھی عجب گھر ہے کہ راحت نہیں جس میں　　وہ گُل ہے یہ گُل، بوئے محبت نہیں جس میں
وہ دوست ہے یہ دوست، مروّت نہیں جس میں　　وہ شہد ہے یہ شہد، حلاوت نہیں جس میں
بے درد و الم شامِ غریباں نہیں گذری
دنیا میں کسی کی کبھی یکساں نہیں گذری

سلام

غمِ شہؑ کا گر داغ دل پر رہے　　سلامی لحد بھی منوّر رہے
ایک افسانۂ بے کسی رہ گیا　　نہ قاتل رہا اور نہ سرورؑ رہے
فقیروں کی کیا موت ! کیا زندگی　　جگہ جس جگہ مل رہی مر رہے
قیامت ہے کفار سیراب ہوں　　مگر تشنہ مختارِ کوثر رہے

وہ ہے آدمی جس سے ہو کارِ خیر بشر وہ جو دنیا میں بے شر ہے
کبھی لاش اُٹھائی کبھی رو دیئے اسی شغل میں شاہؑ دن بھر رہے
نہ پھیلائیو ہاتھ ہرگز انیسؔ
فقیری میں بھی دل تونگر رہے

گذر گئے تھے کئی دن کہ گھر میں آب نہ تھا مگر حسینؑ سے صابر کو اضطراب نہ تھا
اگر بہشت میں ہوتے نہ کوثر و تسنیم؟ تو رونے والوں کی آنکھوں کا پھر جواب نہ تھا
نہ جانے برق کی چشمک تھی یا شرر کی لپک ذرا جو آنکھ جھپک کر کھلی شباب نہ تھا
حسینؑ اور طلبِ آب اے معاذ اللہ تمام کرتے تھے حجت سوالِ آب نہ تھا
انیسؔ عمر بسر کر دو خاکساری میں
کہیں نہ یہ کہ غلامِ ابوترابؑ نہ تھا

آبِ خنجر سے گلا جب شاہ کا تر ہوگیا پانی پانی اے سلامی! غم سے کوثر ہوگیا
پوچھتی تھیں راہ گیروں سے یہ زینبؑ شام میں کربلا میں دفن فرزندِ پیمبرؐ ہوگیا؟

مرا رازِ دل آشکارا نہیں وہ دریا ہوں جس کا کنارا نہیں
وہ گُل ہوں جدا سب سے ہے جس کا رنگ وہ بُو ہوں کہ جو آشکارا نہیں
بہت زالِ دنیا نے دیں بازیاں میں وہ نوجواں ہوں کہ ہارا نہیں
فقیروں کی مجلس ہے سب سے جدا امیروں کا یاں تک گذارا نہیں
گئے پہنے نعلین واں مصطفیٰؐ فرشتے کا جس جا گذارا نہیں
جہنم سے ہم بے قراروں کو کیا؟ جو آتش پہ ٹھہرے وہ پارا نہیں
پھرے دوست جب ہوگئی قبر بند کھلا اب کہ کوئی ہمارا نہیں
گرے ڈگمگا کر زمیں پر حسینؑ فرس سے کسی نے اُتارا نہیں

کسی نے تری طرح سے اے انیسؔ
عروسِ سخن کو سنوارا نہیں

خیال آگیا دنیا کی بے ثباتی کا	چلے جہاں سے جو اصغرؑ تو مسکرا کے چلے
ملی نہ پھولوں کی چادر تو اہلِ بیتِ امامؑ	مزارِ شاہ پہ لختِ جگر چڑھا کے چلے
تمام عمر جو کی سب نے بے رخی ہم سے	کفن میں ہم بھی عزیزوں سے منہ چھپا کے چلے
انیسؔ دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

ہوا جو عشقِ ثنائے ابوترابؑ مجھے	خدا نے کردیا ذرّے سے آفتاب مجھے
زمینِ ہند میں مٹی مری خراب نہ ہو	کرو نجف میں طلب یا ابوترابؑ مجھے
کئے جو آکے نکیرین نے سوال انیسؔ
بتا دیئے مرے مولا نے سب جواب مجھے

گھٹا زور، مشقِ سخن بڑھ گئی	ضعیفی نے ہم کو جواں کردیا
مری قدر کر اے زمینِ سخن	تجھے بات میں آسماں کردیا
سبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر	مگر ہم نے پلّہ گراں کردیا

بیکسیٔ شہ کا چرچا رہ گیا	مجرئی مہماں پیاسا رہ گیا
جب شکستہ ہوگیا تارِ نفس	کون سا الفت کا رشتہ رہ گیا
شست و شو سے گو ہوا اُجلا ذلیل	جامۂ اصلی میں دھبّا رہ گیا
اس قدر تھا خشک سرورؑ کا گلا	خنجرِ قاتل بھی پیاسا رہ گیا
سب ہوئے سیراب تجھ سے اے فرات	قافلہ یثرب کا پیاسا رہ گیا

کیا پوچھتے ہو حال مرے دستگیر کا — بازو نبیؐ کا ہاتھ خدائے قدیر کا
کیا پوچھتے ہو مذہب و مشرب فقیر کا — شیشہ بغل میں ہے مئے خمِ غدیر کا
خیبر کا دَرا اُکھاڑے وہ، اے جلّ شانہٗ — ٹکڑا نمک سے کھائے جو نانِ شعیر کا
اس کے پسر کو پانی کا قطرہ ملا نہ ہائے — قاتل کو جس نے بھیج دیا جام شِیر کا
جب مر گئے علیؑ تو مدینے میں شور تھا — آج اُٹھ گیا شفیق یتیم و یسیر کا

پوچھے پتہ کوئی تو یہ کہہ دیجیو انیسؔ
ہے وادی السّلام میں بستر فقیر کا

سوالِ آب جو کرتے تھے شہؑ تو دشمنِ دیں — لگا کے تیرِ ستم کہتے تھے، جواب یہ ہے
رسولؐ کہتے تھے بازو پکڑ کے حیدرؑ کا — خزینہ علم کا تو میں ہوں اور باب یہ ہے
جسے پہنچنا ہو مجھ تک وہ اس سے راہ رکھے — خطا کے اور ہیں رستے رہِ ثواب یہ ہے
سوارِ دوشِ رسولِؐ خدا کی چھاتی پر — چڑھا ہے شمر، زمانے کا انقلاب یہ ہے

دشتِ پُرخار سے جاتے تھے جو پیدل سجادؑ — پھوٹ کر روتا تھا ہر آبلۂ پا کیا کیا؟
رو کے کہتی تھی یہ صغراؑ کہ کہے جا قاصد — تو نے کیا کیا کہا اور بابا نے پوچھا کیا کیا؟
ساتھ جاتا نہیں کچھ جز عملِ خیر انیسؔ — اس پہ انسان کو ہے خواہشِ دنیا کیا کیا؟

علیؑ کو حق نے اُتارا تو عین کعبے میں — کھلی جو آنکھ تو پہلے خدا کا گھر دیکھا
کسی کی ایک طرح پر بسر ہوئی نہ انیسؔ — عروجِ مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا

سیاہ دیدۂ شبیرؑ میں زمانہ ہوا — ہوائے ظلم سے جب گل چراغ خانہ ہوا
حسینؑ کہتے تھے شکوہ کیا نہ اُمّت کا — گلہ ہوا بھی کسی سے تو دوستانہ ہوا
بچھا ہے قاف سے تا قاف جس کا خوانِ کرم — نصیب اُسے نہ کئی روز آب و دانہ ہوا

شباب تھا کہ دمِ واپسیں کی آمد و شُد	یہ مضطرب ادھر آیا اُدھر روانہ ہوا
کیا قبول قناعت سے بحرِ عالم میں	صدف کی طرح میسر جو آب و دانہ ہوا
سحاب سائے میں رکھتا تھا جس کے نانا کو	لحد کو اس کی میسّر نہ شامیانہ ہوا

پیاس ، فاقہ ، بے کسی ، ایذائے قید	ظلم تھے آلِ رسولؐ اللہ پر
اہلِ دنیا سے نہیں مطلب انیسؔ	یاں توکّل ہے فقط اللہ پر

ضبطِ گریہ ماتمِ سرورؑ میں ہوسکتا نہیں	سر جھکا کر بیٹھ مجلس میں جو روسکتا نہیں
رات اندھیری ، پُرسشِ اعمال ، ایذائے فشار	قبر میں بھی چین سے انسان سوسکتا نہیں
کارِ ذاتی میں ہیں عاجز کارسازانِ جہاں	اپنے منھ کی گرد پانی آپ دھوسکتا نہیں

نبود و بود کو عاقل حباب سمجھے ہیں	وہ جاگتے ہیں جو دنیا کو خواب سمجھے ہیں
کبھی بُرا نہیں جانا کسی کو اپنے سوا	ہر ایک ذرّے کو ہم آفتاب سمجھے ہیں
کریم مجھ کو عطا کر وہ فقر دنیا میں	کہ جس کو فخر رسالت مآب سمجھے ہیں
خدا کی راہ میں ایذا سے جن کو راحت ہے	زمینِ گرم کو وہ فرشِ خواب سمجھے ہیں

انیسؔ مخمل و دیبا سے کیا فقیروں کو
اسی زمین کو ہم فرشِ خواب سمجھے ہیں

علامہ سید ضمیر اختر نقوی کی کتابیں

عشرۂ مجالس

معجزہ اور قرآن
عظمتِ صحابہ
احسان اور ایمان
ولایتِ علیؑ
امام اور اُمت
حضرت علیؑ میدانِ جنگ میں
عظمتِ حضرتِ زینبؑ
عظمتِ حضرتِ فاطمہؑ
عظمتِ امام جعفر صادقؑ
مجالسِ محسنہ (جلد اوّل)
مجالسِ محسنہ (جلد دوم)
ظہورِ امام مہدیؑ

تاریخ

ذوالجناح
پوری دنیا کی عزاداری
شہید علمائے حق

سوانحِ حیات

حضرت علیؑ مرتضیٰ
حضرت فاطمہ زہراؑ
حضرت قاسمؑ ابنِ حسنؑ
حضرت اُمّ البنینؑ
حضرتِ جعفر طیارؑ

ادبیات

شعرائے اردو اور عشقِ علیؑ
خاندانِ میر انیسؔ کے نامور شعرا
میر انیسؔ (انگریزی)
کلامِ انیسؔ میں رنگوں کا استعمال

مجالس ترابی

علمِ معصوم
قیامت اور قرآن
کتاب، حکمت اور ملکِ عظیم
توحید اور شرک